ترجمہ تبریز ابریز

اوّل

(۱)

مواعظ وارشادات

قطب الواصلین، غوث العارفین حضرت عبدالعزیز دبّاغ قدس سرّہ

مترجمہ: حضرت مولانا مولوی محمد عاشق الٰہی میرٹھی نوراللہ مرقدہ

ناشر: مدینہ پبلشنگ کمپنی مسمور محل

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول المخلوقات ہیں صفحہ ۱۹۲

اہم حوالوں کی فہرست
آخری صفحہ تک ہے
363 pdf

مکتبہ نعمانیہ
اقبال روڈ سیالکوٹ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

قطب الواصلین غوث العارفین حضرت عبد العزیز دباغ رح کے کلمات

طیبات اور مبارک ارشادات

بنام

تبریز

(ترجمہ)

ابریز

حصہ اول

قدوۃ العلماء زبدۃ الفضلاء مولانا الحافظ احمد بن مبارک السلجماسی رح

حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (مرحوم)

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم-اے-جناح روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ نبیہ الکریم + رب یسّر ولا تعسّر وتمّم بالخیر

قدوۃ العلماء العارفین زبدۃ الاصفیاء الواصلین المحقق المدقق العلامۃ مولانا الحافظ احمد بن المبارک السلجماسیؒ حمد وصلوٰۃ کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے شیخ دوراں غوث زماں قطب السالکین حامل لواء العارفین مولانا سید عبد العزیز دباغ قدس سرہ العزیز کی زیارت معرفت مجھے نصیب فرمائی تو وہ علوم و معارف اور شمائل ولطائف مشاہدہ میں آئے کہ میں حیران ہو گیا۔ ممدوح کو سید الوجود سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع سے اتنا آگاہ پایا کہ جب سے پیدا ہوا نہ کسی سے سنا نہ کسی کتاب میں دیکھا۔ اللہ جل جلالہٗ کی ذات وصفات اور اسماء کی وہ خداداد معرفت آپ میں پائی جس کی کیفیت ناقابل بیان ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کے حالات علیہ سے اتنا واقف پایا کہ گویا ہر نبی کے ہم عصر ہیں اور زمانہ نبوت میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔ اسی طرح حضرات ملائکہ کے حقائق اور انواع کے اختلاف اور مراتب کے تفاوت کا آپ کو اتنا علم پایا کہ بشر کے مبلغ علم سے باہر تھا۔ کتب سماویہ اور انبیاء سابقین کی شریعتوں سے اتنی واقفیت دیکھی کہ جو بھی سنے وہ ممدوح کے سید العارفین اور امام الاولیاء ہونے کا اعتراف کرے۔ روز قیامت اور اس کے وقائع حشر ونشر وپل صراط وجنت و جہنم وغیرہا کی ایسی واقفیت دیکھی کہ گویا ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر بیان کر رہے ہیں۔ چونکہ ان ہی چیزوں کی معرفت ہر مومن کا مقصود منتہائے مراد ہے کہ سیدنا جبریل علیہ السلام نے جب سیدنا مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی حقیقت دریافت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حقیقت ایمان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اس کے پیغمبروں اور روز قیامت اور تقدیر پر ایمان لائے کہ بھلی ہو یا بری سب اللہ کی طرف سے ہے" اس سے معلوم ہوا کہ جس کو ان امور کی معرفت زیادہ نصیب ہو گی وہی ایمان میں افضل اور عرفان میں اکمل ہو گا۔ لہٰذا ممدوح کی ولایت عظمیٰ کا یقین ہو گیا اور میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا۔ رجب ۱۱۲۵ھ میں بیعت ہوا اور دس برس آپ کی خدمت میں رہا کہ بے شمار معارف ہر وقت میرے کان میں پڑتے رہتے تھے مگر کبھی خیال نہ ہوا کہ ان کو قلم بند کروں۔ ہاں جو کچھ آپ سے سنتا اور جتنا سمجھتا تھا بعض اصحاب وخاص احباب سے نقل کر دیا کرتا تھا۔ پھر جو بھی سنتا وہ تعجب کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ایسے بے مثل حقائق و معارف

ہمارے کانوں میں کبھی نہیں پڑے۔ زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ حضرت ممدوح اُمّی محض تھے کہ علم ظاہری سے کبھی مس ہی نہیں ہوا تھا۔ بخوف طوالت میں اُن حضرات کے نام نہیں گنواتا جو علماء و فقہا ہونے کے ساتھ خود بھی ولایت میں مشہور اور بکثرت صلحا۔ اولیاء کی صحبتوں میں رہ چکے اور ان کے فیوضات عالیہ سے مستفیض ہو چکے تھے مگر جب ممدوح کی کوئی تقریر میرے ذریعہ سُنتے تو دو دو ہفتے اُس کی لذت لیا کرتے کہ واللہ یہ شخص ولی کامل اور عارف واصل ہے تم ان کی صحبت و محبت کبھی نہ چھوڑنا۔ اور جب مجھ سے ملتے تو بڑے شوق سے پوچھا کرتے کہ شیخ سے سُنے ہوئے معارف و لطائف میں کوئی نئی بات سُنی ہو تو سناؤ۔ رجب ۱۱۲۹ھ میں حق تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا کہ جو سنوں وہ قلم بند کرلوں کہ نفع تام اور فائدہ عام ہو۔ چنانچہ رجب، شعبان، رمضان، شوال، اور ذیقعدہ پانچ مہینہ کے سُنے ہوئے کلام کو میں نے جمع کیا تو ۵ اُجز کے قریب ہوگئے۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ گذشتہ چار سال کے مسموعات کو اگر جمع کرتا تو دو سو جزو سے زیادہ ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ کے سینہ میں جو علوم موجود تھے ان کا شمار تو صرف اسی خدا کو ہے جس نے وہ عطا فرمائے تھے۔ مگر بحر ذخار کے چند قطرات میں نے جمع کئے ہیں جن کو پیش کرتا ہوں۔ ہاں بطور مقدمہ حضرتؒ کے ابتدائی حالات اور اُن مشائخ کا تذکرہ جن سے ممدوح کو ظاہری و باطنی لقاء حاصل اور ذکر کی تلقین ہوئی ہے تین فصلوں میں بیان کر دینا ضروری ہے۔

فصل اوّل حالات قبل از ولادت

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ مولانا العربی فشتالی رح اولیاء اللہ میں سے تھے۔ اوّل شیخ محمد بن ناصر کی صحبت میں رہے اور ان کے بعد حضرت مبارک بن علی کی صحبت پائی صورت یہ ہوئی کہ شہر فاس کی مسجد قرویین میں حضرت عربی فشتالی نے حضرت مبارک احمد کو دیکھا اور آثار صلاح و بزرگی پا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضرت مجھے بتلائیے اہل بصیرت کو بصیرت کس حد حاصل ہوتی ہے۔ حضرت احمد بن مبارک نے فرمایا اچھا چھینکو۔ فشتالی نے کہا چھینک تو اس وقت مجھے نہیں آرہی فرمایا اسی طرح مجھے نہیں آرہا کہ تمہیں بتاؤں بصیرت کیسے حاصل ہوتی ہے (مطلب یہ ہے کہ چھینک آنا جس طرح غیر اختیاری ہے اسی طرح حصول نور باطنی بھی وہبی اور محض عطاء رب ہے)۔ یہ جواب حضرت فشتالی کو ایسا بھایا کہ ان کے خادم و محب بن گئے حضرت فشتالی کی ایک بہن تھی راضیہ نام اور راضیہ کی ایک لڑکی تھی فارحہ۔ راضیہ کے شوہر علال تمارتنی کا جو کہ امیر کبیر تھے انتقال ہوگیا تو راضیہ نے مکناسہ کے ایک شخص سے نکاح کرلیا اور

فارحہ کو اُن کے ماموں حضرت فشتالی نے لے لیا اور نہایت محبت کے ساتھ پرورش کیا۔ حضرت فشتالی درویش و ولی ہونے کے ساتھ عالم فقیہ اور معلّم قرآن مجید بھی تھے کہ طلبہ کو درس دیا کرتے اور بچّوں کو تجوید سکھایا کرتے تھے۔ میرے والد ماجد سیدنا مسعود دباغ بھی منجملہ طلبہ کے ایک طالب علم اور ان کے شاگرد تھے۔ ایک دن بھری مجلس میں حضرت فشتالی نے میرے والد کو آواز دی اور فرمایا کہ میں اپنی بھانجی کو تمہاری زوجیت میں دینا چاہتا ہوں۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر عطا فرماتے ہیں تو میں قبول کرتا ہوں۔ فشتالی نے فرمایا اچھا میں نے فارحہ کو تمہاری زوجیت میں دیا۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ میں نے قبول کیا۔ حضرت فشتالی نے فرمایا مہر اور جہیز سب میرے ذمّہ ہے۔ تم کو کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ والد صاحب کو اس کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس سے پہلے بھی حضرت فشتالی کو میرے والد صاحب سے بہت محبّت تھی اور جب بھی والد صاحب اُن کے پاس آیا کرتے تو وہ خوش ہو کر پاس بٹھاتے اور روپیہ پیسہ جو کچھ بھی حسب گنجائش وقت میسّر ہوتا والد صاحب کو دیا کرتے تھے۔ چنانچہ عقد نکاح تمام ہونے کے بعد حضرت فشتالی نے بھانجی کے جہیز کا انتظام کیا اور رخصتی کر کے والد صاحب کے گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد والد صاحب سے ملے اور فرمایا کہ میری نشستگاہ پر آیا کرو۔ چنانچہ والد صاحب روزانہ عصر کے بعد جایا کرتے اور حضرت فشتالی روزانہ اُن کو دو موزونہ دیا کرتے تھے (جو کہ اس ملک کا نقرئی سکۂ رائج الوقت تھا۔) فارحہ کو ترکۂ پدری سے علاقہ زواغہ میں کچھ اراضی ملی تھی جو کثیر الزراعت تھی۔ ایک دن حضرت فشتالی نے میرے والد سے فرمایا کہ مسعود تمہاری بیوی ماشاء اللہ بڑی نیک اور سمجھ دار ہے۔ وہ زواغہ کے تمامی دیہات فروخت کرنے کے متعلق تم کو وکیل بنا دے گی اس لئے جاؤ اور سب کو فروخت کر آؤ۔ چنانچہ والد صاحب نے گھر میں آ کر ذکر کیا اور والدہ نے ان کو بخوشی وکیل بنا دیا۔ میری والدہ کی ایک باپ کے شامل علاتی بہن تھی۔ والد صاحب ان کے پاس بھی گئے اور خواہش کی کہ وہ بھی وکیل بنا کر اختیار دے دیں تو اس علاقہ کی ساری جائداد فروخت کر آویں مگر انہوں نے منظور نہ کیا اس لئے والد صاحب صرف میری والدہ کا حصّہ فروخت کر آئے اور میری علاتی خالہ اپنے حصّہ کے محاصل وصول کرتی رہیں۔ تین ہی سال گزرے تھے کہ دُوَیہ فرقہ کا عروج ہوا اور اس نے زواغہ کے تمام علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا کہ اسی میں میری خالہ کی بھی تمام اراضی چلی گئی۔ لہٰذا اس دن سے ان کو ایک حبہ بھی وہاں سے نہ ملا۔ اس وقت علم ہوا کہ

حضرت فشتالی کا کشف تھا۔ غرض حضرت فشتالی میرے والد صاحب کے ساتھ تا زیست محبّت کا برتاؤ فرماتے اور قسم قسم کے کھانے لاتے اور کھلاتے رہے حتّٰی کہ میں نے خود اپنی والدہ محترمہ سے سنا کہ فرمایا کرتی تھیں " ماموں صاحب کی وفات کے بعد ہم نے طنجیہ ہی نہیں کھایا (کوئی خاص قسم کا طعام ہے) ماموں صاحب روزانہ ہمارے لئے اس کو تیار کراتے اور جب سب لوگ نماز عشا پڑھ کر ان کی مسجد سے چلے جاتے تو ماموں صاحب ہمارے دروازے پر آکر دستک دیتے اور جب ہم کواڑ کھولتے تو طنجیہ میرے ہاتھ میں دے کر چلے جاتے تھے۔ مرتے دم تک ان کا یہ معمول قائم رہا وہی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فارحہ تمہارے ایک لڑکا ہوگا جن کا نام عبدالعزیز ہوگا اور ولایت میں ان کی بڑی شان ہوگی۔ والدہ محترمہ نے یہ بھی سُنایا کہ ماموں صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے فرما رہے ہیں تمہاری بھانجی کو ایک بڑا ولی کامل عطا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر اللہ کا صلوٰۃ وسلام اس کے باپ کا کیا نام ہے۔ فرمایا مسعود دباغ۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ حضرت فشتالی نے میرے والد کو نکاح کے لئے انتخاب کیا اور اُن کے ساتھ بہت محبّت رکھتے تھے۔ ان کی تمنّا تھی کہ کاش حضرت عبدالعزیز کی ولایت کا وقت پائیں مگر سنہ ۱۰۹۰ھ میں جو عام وبا پھیلی تھی اس میں ان کا انتقال ہوگیا جب وقتِ وفات قریب آیا تو انہوں نے والد صاحب کو بلوایا اور جب وہ آئے تو پوچھا تمہاری بیوی کہاں ہے۔ چنانچہ والدہ بھی آئیں اور حضرت فشتالی نے ایک ٹوپی اور ایک پاپوش سیاہ رنگ کہ اس وقت صلحاء یہی پہنا اوڑھا کرتے تھے دونوں کے حوالہ کر کے فرمایا کہ یہ اللہ کی امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں جب عبدالعزیز تم کو عطا ہو تو اس کو دے دینا چنانچہ والدہ صاحبہ نے اس کو لے کر بحفاظت رکھ دیا۔ حتّٰی کہ پہلے حمل میں لڑکی پیدا ہوئی اور پھر کچھ مدّت بعد دوسرے حمل میں میری ولادت ہوئی۔ جب میں بڑا ہوا اور میں نے ماہ رمضان کا روزہ رکھا تو حق تعالیٰ نے والدہ صاحبہ کو امانت یاد دلائی اور وہ جاکر اُسے لے آئیں اور فرمایا کہ بیٹا مولانا فشتالی نے یہ امانت تم کو پہونچانے کی مجھے وصیّت فرمائی تھی اس کو لو اور مجھے سبکدوش کرو۔ چنانچہ میں نے لے کر ٹوپی کو سر پر رکھ لیا اور جوتہ کو پاؤں میں پہن لیا۔ اس وقت مجھے ایسی شدید گرمی معلوم ہوئی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اس وقت میں نے حضرت فشتالی کے اشارہ کا مطلب سمجھا۔ فالحمد للہ رب العلمین۔

سیدا حمد بن عبد اللہ جن کی ولایت و معرفت کامل مشہور اور کشف و کرامات و بصیرت کا عوام و خواص کو اعتراف ہے حضرت فشتالی کے شاگرد تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ دیکھنے والا کسی طرح بھی ان کو ولی نہ سمجھتا تھا۔ اگر ان کی وفات نہ ہو چکی ہوتی تو میں بھی ان کا کوئی حال زبان سے نہ نکالتا۔ آپ ایک مرتبہ موضع سالس میں تھے کہ دفعتہً فرمانے لگے بڑا سانحہ پیش آیا میں نے پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا اس وقت سید محمد بن ناصر کا انتقال ہو گیا۔ میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ فرمایا بس انتقال ہو گیا اس کے بعد مجھ سے فرمایا دیکھو یہ شخص جو سامنے نظر آرہا ہے ان کی خبر مرگ ہی لا رہا ہے۔ حالانکہ وہ شخص بہت دور تھا اور خیال سا نظر آرہا تھا مگر جب قریب آیا تو ہم سب اس کے پاس آجمع ہوئے اور پوچھا کیا خبر ہے؟ اس نے کہا سید محمد بن ناصر کا انتقال ہو گیا۔
ایک دن میں مسجد قرویین میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت فشتالی آئے اور فرمایا کہ عورت بہت مُبارک ہے۔ میں نے کہا کہ کون عورت۔ فرمایا وہی جس سے تم نکاح کرو گے۔ چونکہ اس وقت مجھے نکاح کا خیال بھی نہیں تھا اس لئے میں نے کہا کہ میرا ارادہ تو نکاح کا نہیں ہے۔ فرمایا کہ نکاح تو ہو کر رہے گا۔ چنانچہ سات ہی دن گزرے تھے کہ میرے قلب میں نکاح کی حرکت پیدا ہوئی اور میں نے نکاح کیا۔ ایک دن حضرت ممدوح کچھ اولیاء کا تذکرہ فرمانے لگے تو میں نے بھی چند بزرگوں کا نام لیا۔ فرمایا میں تو تم سے اکابر اولیاء کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ رہے چھوٹے درجے کے اولیاء سو شہر فاس اور بنی بازغہ کے درمیان (جو کہ ایک منزل پر ہے) قریب چار سو کی تعداد کے مجھے معلوم ہیں۔ حضرت ممدوح باوجود اتنا صاحب کشف ہونے کے اپنے آپ کو بے حد چھپاتے تھے۔ ایک دن طلبہ سے فرمانے لگے تم سمجھتے ہو گے کہ کشف کوئی کمال ہے حالانکہ وہ تو ذکاوت اور سُرعت فہم ہے۔ اور اگر تمہیں یقین نہ آوے تو دیکھو تم کو معلوم ہے کہ میں نہ ولی ہوں نہ بزرگ۔ سب نے کہا جی ہاں ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ ولی نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ایک طالب علم کی طرف توجہ فرمائی اور کہا تمہارا ارادہ فلاں وقت فلاں کام کرنے کا ہے۔ اس نے کہا ہاں صحیح ہے۔ فشتالی نے فرمایا اب تو تم نے سمجھ لیا کہ کشف محض ایک سرعتِ فہم ہے۔ سب کو یقین آگیا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ایک روز میں مسجد قرویین میں گیا تو حضرت فشتالی کو دیکھا کہ چہرہ کا رنگ زرد ہے اور نہایت بدحواس و سراسیمہ ہیں مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ اس وقت نہ تم سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی دوسرے سے۔ میں نے پوچھا آخر سبب کیا؟ فرمایا اس وقت میری زبان پر ابن فارض کے قصیدۂ تائیہ کا یہ شعر آیا ؎

فلو خطرت لی فی سواک ارادۃ ✝ علی خاطری سھوا قضیت بردتی

اگر تیرے سوا کسی کا خیال بھولے سے بھی میرے دل میں گزرے تو میں اپنے مرتد ہونے کا حکم لگاؤں۔ اور چونکہ میرے دل پر دوسرے کا تخیل آتا ہے اس لئے میں گیا گزرا ہو گیا۔ میں نے کہا یہ تو غلبہ کا حال تھا جو ابن فارض پر طاری ہوا تھا مگر جاتا رہا اور اس کو بقاء اور قرار نہ ہوا تھا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ ممدوح کو سکون ہو گیا اور فرمایا اللہ تم کو جزائے خیر بخشے تمہاری تقریر سے گھٹا چھٹ گئی اور بڑا بوجھ اُتر گیا۔ جس زمانہ میں زیدان نے سلطان اسمٰعیل سے باغی ہو کر شہر فاس کا محاصرہ کر لیا اور رسد بند کر دی تو ...... باشندگانِ فاس کو سخت مصیبت کا سامنا ہوا حضرت فشتالی اُس زمانہ میں بار بار فرمایا کرتے کہ اویر ہو یا سویر سلطان اسمٰعیل کے بغیر چارہ نہیں چنانچہ انجام یہی ہوا کہ باغیوں نے سلطان سے امان چاہی اور صلح کا پیام پہنچا کر بغاوت سے تائب ہوئے حضرت ممدوح کے ہمسایہ پڑوسی کہا کرتے تھے کہ حضرت فشتالی رات کا اکثر حصہ نماز و تلاوت قرآن میں گزارا کرتے ہیں اور شروع رات میں تو سکون کے ساتھ ان کی تلاوت سُنائی دیتی ہے مگر اخیر شب میں بجز تڑپنے اور زمین پر لوٹنے کے کوئی آواز نہیں آتی۔ شریعت محمدیہ کا ظاہری ادب بھی ممدوح میں حد کو پہونچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مسجد قرویین میں وہ اور میں دونوں بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ مؤذن نے اذان دی۔ حضرت فشتالی اٹھے اور مسجد سے باہر جا کر تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ میں نے کہا باہر کیوں تشریف لے گئے تھے میری سمجھ میں تو کوئی ضرورت نہیں آئی جو آپ کو بیرونِ مسجد لے گئی۔ ممدوح چُپ ہو گئے اور بات کو ٹالا مگر میں نے اصرار کیا کہ آخر کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ فرمایا تم کو بڑی کُرید ہے۔ میں باہر اس لئے گیا تھا کہ چلنا خانۂ خدا کی طرف ہو جائے کیونکہ پہلے قدم تو تمہارے پاس بیٹھنے کے لئے اٹھے تھے۔ ممدوح کے پڑوسیوں کا بیان ہے کہ حضرت فشتالی جب اپنے گھر کے لئے گوشت خریدا کرتے تو ہمسایوں کے لئے بھی ضرور خریدتے اور فرمایا کرتے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اکیلا گوشت کھاؤں اور میرے پڑوسی گوشت نہ کھاویں۔ ایک مرتبہ آپ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے جو مسجد کے قریب تھی۔ جہاں اس وقت مسجد کا بڑا دروازہ ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر فرمانے لگے۔ یہاں ایک بڑا دروازہ کھلنے والا ہے چنانچہ کچھ ہی مدت کے بعد اسی جگہ دیوار میں دروازہ کھولا گیا اور وہ یہی دروازہ ہے جس میں سے آنے والے وضو پر پہونچتے ہیں غرض ممدوح کے کشف و کرامات اتنے کثیر ہیں کہ مستقل کتاب کی ضرورت ہے باقی آپ کی جلالت شان

اور فخر و مباہات کے لئے تو صرف یہی رابطہ کافی ہے جو آپ کے اور غوث الزمان حضرت عبدالعزیز قدس سرہ کے درمیان قائم ہوا کہ اپنی تربیت دادہ بھانجی کو سید مسعود کی زوجیت میں دیا جن کے بطن سے اپنے وقت کا جلیل الشان غوث پیدا ہوا۔

فصل دوم

(سلوک کی تدریج اور اُن مشائخ کا بیان جن سے آپ کو روحانی میراث ملی)

نسب طاہر حضرت شیخ کا یہ ہے۔ مولانا السید عبدالعزیز بن سید مسعود بن سید احمد بن سید محمد بن سید محمد بن سید احمد بن سید عبدالرحمن بن سید قاسم بن سید محمد بن سید احمد بن سید قاسم بن سید محمد بن سید ابراہیم بن سید عمر بن سید عبدالرحیم بن سید عبدالعزیز بن سید ہارون بن سید قنون بن سید علوش بن سید مندیل بن سید علی بن سید عبدالرحمن بن سید عیسیٰ بن سید احمد بن سید محمد بن سید عیسیٰ بن سید ادریس بن سید ادریس بن سید عبداللہ کامل بن سید حسن مثنیٰ بن سیدنا و مولانا حسن السبط بن سیدنا و مولانا علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جس وقت سے میں نے اس امانت کو جس کی میرے لیے حضرت فشتالی نے وصیت فرمائی تھی بدن پر پہنا اور جو انہوں نے میرے متعلق فرمایا تھا اس کو سمجھا اسی وقت حق تعالیٰ نے میرے دل میں اپنی عبودیت خالصہ کا شوق و انتظار ڈال دیا۔ اور میں اس کی حد درجہ کریدا اور تلاش میں لگ گیا کہ جس کو بھی سنتا لوگ اس کو پیر بتاتے اور ولی بتاتے ہیں اس کی خدمت میں حاضر ہوتا اور درود و ذکر تلقین فرمانے کی درخواست کیا کرتا تھا۔ مگر جب ان کے بتائے ہوئے ادرادو اذکار کو پابندی سے چند روز کرتا مجھے تنگ دلی پیش آتی اور انشراح و انبساط نہ ہوتا۔ آخر اس کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس جاتا اور جب وہاں بھی یہی ضیق پیش آتی تو تیسرے کی خدمت میں حاضر ہوتا اسی سرگردانی میں ۱۱۰۹ھ سے لے کر ۱۱۲۱ھ تک کامل بارہ برس گزر گئے۔ میری عادت تھی کہ جمعہ کی رات سید علی بن حرزہم کے مزار پر گزارا کرتا تھا۔ رات بھر وہیں رہتا اور دوسرے شب بیدار صلحاء کے ساتھ قصیدہ بُردہ پڑھا کرتا تھا جب عادت ایک شب جمعہ میں جب ہم لوگ ختم سے فارغ ہوئے تو میں روضہ سے باہر نکلا اور دروازہ کے قریب بیری کا درخت تھا۔ اس کے نیچے میں نے ایک شخص کو بیٹھا پایا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے اور جو باتیں میرے دل میں تھیں ان کو ظاہر فرمانے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اولیاء عارفین میں سے ہے اور میں نے عرض کیا کہ مجھے خادمیت میں قبول فرمائیے اور ذکر و ورد کی تلقین کیجیے۔ انہوں نے بات ٹلا کر دوسری باتوں میں مجھے لگانا شروع کیا مگر میں

بار بار وہی سوال کرتا رہا ان کا مقصود میری طلب صادق کا جانچنا تھا کہ ان کی تلقین پر مواظبت کروں گا یا نہیں۔ ان کے تغافل اور میرے اصرار و الحاج کو دیر گزر گئی حتیٰ کہ صبح نمودار ہو گئی اس وقت انہوں نے فرمایا کہ جب تک عہد و پیمان نہ دو گے کبھی ترک نہ کروں گا اس وقت تک کوئی وظیفہ نہ بتاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اللہ کا عہد و میثاق دیا کہ پوری پابندی کروں گا اور کبھی نہ چھوڑوں گا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ایسا ہی کوئی وظیفہ بتائیں گے جیسا کہ ان سے پہلے دوسرے بتا چکے ہیں۔ مگر انہوں نے وظیفہ بتایا تو یہ کہ روزانہ سات ہزار مرتبہ پڑھا کرو۔ اللھمّ بجاہ سیّدنا محمّد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجمع بینی و بین سیّدنا محمّد بن عبد اللہ فی الدنیا قبل الآخرۃ۔ الٰہی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا واسطہ مجھے سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی لقاء آخرت سے پہلے دُنیا ہی میں نصیب فرما۔ اس کے بعد ہم اُٹھے ہی تھے کہ ناظم روضہ حضرت عمر بن ہواری آ گئے۔ ان کو خطاب کر کے انہوں نے فرمایا یہی ہے وہ "شخص" اور پھر فرمایا کہ میں تم کو تاکید کرتا ہوں۔ سید عمر نے جواب دیا کہ حضور یہ میرے سر کے تاج ہیں۔ سید عمر نے اپنی وفات کے وقت مجھ سے پوچھا تمہیں معلوم بھی ہے کہ بیری کے درخت کے نیچے تم کو ذکر کس نے تلقین کیا تھا۔ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ فرمایا وہ سیدنا خضر علیہ السّلام تھے۔ اور جب حق تعالیٰ نے مجھے بصیرت بخشی تو خود بھی اس کا علم ہو گیا۔ غرض میں نے وظیفہ شروع کیا۔ مگر پہلے دن تو رات ہو گئی اور تمام نہ ہو سکا لیکن اس کے بعد کچھ کچھ ہلکا پڑتا رہا اور میری ذات اس کی مصاحب بنتی رہی۔ حتیٰ کہ زوال تک پورا کر لیتا تھا۔ پھر ہلکے ہونے میں ترقی ہوتی رہی حتیٰ کہ اشراق کے وقت پورا ہونے لگا۔ پھر ثقل میں اور کمی ہوئی حتیٰ کہ طلوع آفتاب تک پورا پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں میں حضرت عمر بن محمد ہواری کے پاس بیٹھتا رہا اور وہ بھی میرے ساتھ خاص محبت فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۱۲۵ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔ بوقت وفات میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ فرمانے لگے جانتے بھی ہو میرے پیر کون تھے۔ میں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں۔ فرمایا سید فشتالی قدس سرہٗ اور یہ بات دُنیا سے رُخصت ہوتے وقت ہی بتائی۔ اس سے پہلے کبھی کچھ ذکر نہ فرمایا۔ سو الحمد للہ حضرت فشتالی کے تمامی اسرار و کیفیات بواسطہ سید عمر مجھے حاصل ہوئیں اور ان کا مشاہدہ مجھے نورِ بصیرت نصیب ہونے کے بعد ہوا۔ حالانکہ سید عمر بھی حضرت فشتالی کے تمامی اسرار کے حامل نہ تھے بلکہ چند ہی کے حامل تھے۔ مگر مجھے حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کے

تمامی اسرار عطا فرما دیتے بلکہ ان سے بھی زیادہ اور اتنے زیادہ کہ میں اپنے مولائے کریم کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ حضرت فنستالیؒ عارف باللہ اور اپنی زندگی میں دیوان الصالحین (وہ مجلس جس میں اقطاب عالم و اغوات کا روزانہ اجتماع ہوا کرتا ہے) کے حاضر ہونے والوں میں تھے۔ میں نے عرض کیا اور بعد وفات؟ فرمایا نہیں۔ اور ایسا ہی سیدنا منصورؒ کی بابت فرمایا کہ وہ اقطاب میں سے تھے اور صرف بحالت حیات اہل دیوان میں سے تھے۔ انتقال کے بعد اس مجلس میں حاضر نہیں ہوتے۔ اور اس کا ایک خاص سبب بیان فرمایا جو اثناء کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ سید عمر کی وفات کے تین دن بعد مجھے فتح عطا ہوئی۔ (یعنی مشاہدۂ مخلوقات و مشاہدۂ جلال و جمال الٰہی کی قابلیت جو اقطاب، اغوات اور مکمل اولیاء کو دی جاتی ہے اور آئندہ ہم اس کو فتح ہی سے تعبیر کریں گے جس کا حقیقی مفہوم مطالعۂ کتاب بالخصوص انا فتحنا لک فتحا مبینا کی تفسیر کے ضمن میں سمجھا جا سکے گا) اور ہم نے حقیقت نفس سے اللہ کو پہچانا فلہ الحمد ولہ الشکر۔ اور یہ پنجشنبہ کا دن تھا۔ ۸ رجب ۱۱۲۵ھ صورت یہ ہوئی کہ میں اپنے گھر سے نکلا اور حق تعالیٰ نے ایک صاحب خیر کے ہاتھ سے مجھے چار موزونہ دلائے چنانچہ میں نے مچھلی خریدی اور اس کو لے کر گھر آیا۔ میری بیوی نے کہا کہ علی ابن حرزہم تک جا کر روغن زیتون ہمیں اور لا دو کہ مچھلی بھون اور پکا لیں۔ میں باہر نکلا اور باب الفتوح تک میرے جسم میں رعشہ پیدا ہوا اور بڑے زور کی کپکپی طاری ہوئی۔ اس کے بعد سارے گوشت کے اندر بکثرت چیونٹیاں سی چلتی محسوس ہوئیں مگر میں آگے قدم بڑھاتا رہا۔ یہ حالت افزوں ہوتی رہی حتیٰ کہ سید یحییٰ بن علال کے مزار تک پہونچا تو میرا سینہ اتنا لرزنے لگا کہ ہنر گردن میری واڑھی سے ٹکراتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بے شک موت آ گئی۔ اس کے بعد دھویں کی طرح ایک چیز میرے بدن سے نکلی اور میری ذات (جس کا اطلاق روح کے مقابلہ میں جسم کے ظاہری و باطنی مجموعہ پر ہوتا ہے) طویل ہونے لگی حتیٰ کہ بہت ہی زیادہ لمبی ہو گئی اس کے بعد دنیا کی چیزیں منکشف ہو کر میری نظروں کے سامنے آنے لگیں کہ تمامی شہر اور قصبے اور دیہات اور جو کچھ بھی بر زمین پر ہے۔ سب کو میں نے دیکھا اور میں نے نصرانیہ کو دیکھا کہ اپنے بچہ کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے (شاید آئندہ کے غلبہ نصرانیت و حکومت نصاریٰ کا مشاہدہ ہوا ہو) اور

تمامی سمندر مجھے نظر آئے۔ ساتوں زمینوں کو اور جو کچھ بھی ان میں چرند پرند کی مخلوقات آباد ہے سب کو میں نے دیکھا۔ آسمان کو میں نے دیکھا کہ گویا میں اس کے اوپر ہوں اور جو کچھ بھی اس میں مخلوقات ہے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر دفعتہً ایک نور عظیم کوندنے والی بجلی کی طرح ہر جانب سے آنے لگا۔ میرے اوپر سے بھی نیچے سے بھی داہنے سے بھی بائیں سے بھی اور آگے سے بھی پیچھے سے بھی۔ اور مجھے شدید لرزہ چڑھ آیا کہ مجھے موت کا گمان ہوا اور میں اپنے منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا تاکہ اس روشنی کو نہ دیکھوں۔ مگر جب لیٹ گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری ذات سب کی سب آنکھ بنی ہوئی ہے کہ آنکھ بھی (باوجود بند ہونے کے) اور سر بھی دیکھ رہا ہے اور پاؤں بھی دیکھ رہے ہیں غرض تمامی اعضا میں قوت باصرہ موجود ہے۔ میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی جن کو بدن پر پہنے ہوئے تھا تو دیکھا کہ وہ نظر کو روک نہیں سکتے اور میری نگاہ ان سے پار ہو کر ساری ذات میں دوڑتی ہے۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ اوندھا پڑنا اور کھڑا رہنا دونوں برابر ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہ حالت رہی مگر پھر جاتی رہی اور میں اپنی پہلی حالت پر آ گیا۔ اس وقت میں گھر واپس آیا اور زینت کے بازار تک نہ پہونچ سکا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہوا اور میں رونے لگا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے پھر وہی حالت طاری ہوئی اور پھر جاتی رہی۔ غرض اس کا تار بندھ گیا کہ ایک ساعت کے لئے عود کرتی اور دوسری ساعت میں منقطع رہتی یہاں تک کہ میری ذات کی مصاحب بن گئی اور دن بھر میں صرف تھوڑی دیر کے لئے اور رات میں تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد دائمی ہو گئی کہ کسی وقت بھی غائب نہ ہوتی تھی۔ اور اللہ کریم نے مجھ پر بڑا رحم فرمایا کہ اپنے اولیاء میں سے ایک عارف سے مجھے ملا دیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ فتح کے اگلے روز صبح ہوئی تو میں مولانا مولانا ادریس کے مزار پر حاضری کے لئے چلا۔ محلہ سماط العدول میں مولانا سید حاج احمد اوندی مجھے مل گئے۔ میں نے وہ واقعہ جو مجھے پیش آیا تھا ان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اچھا میرے گھر چلو۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان کا مکان غسالین کے متصل سقایہ کے قریب محلہ صفارین میں تھا۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے اور خلوت خانہ میں بیٹھ کر کہا اب سناؤ کیا دیکھا تھا۔ میں نے سارا واقعہ پھر دوہرایا مگر ان پر جو میری نظر پڑی تو دیکھا وہ رو رہے ہیں۔ واقعہ سن کر فرمایا لا الہ الا اللہ۔ یہ چار صدیاں گزریں کہ ایسا واقعہ بیان کرنے والا ہم نے کوئی سنا بھی نہیں۔ اس کے بعد مجھے بہت سا روپیہ دیا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ پانچ اشرفیاں دیں اور کہا کہ ان کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو اور جب ختم ہو جاویں تو دوسرے کے پاس نہ جانا میرے ہی پاس آنا کہ جو ضرورت ہوگی میں تم کو دوں گا اور

میں تم سے بتاکید کہتا ہوں کہ سید عبداللہ تاودی کے پاس ضرور جانا انشاء اللہ خیر نصیب ہوگی۔ غرض میں اُن سے رُخصت ہوا اور اُس دن کے بعد پھر مجھے سید احمد جراوندی کی ملاقات نصیب نہ ہوئی کیونکہ ان کو دفعتہً مرض الموت لاحق ہوا اور وہ انتقال کر گئے۔ مگر میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا اور سید عبداللہ تاودی کی جانب چلا۔ باب الجیہ پہ پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ سے باہر ایک سیاہ فام شخص اُس بڑے پتھر کے پاس کھڑا ہے جس کے قریب مجدی بیٹھا کرتے تھے۔ اُس نے مجھ پہ ایک گہری نظر ڈالی۔ میں متفکر ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اس شخص کا ارادہ کیا ہے۔ جب قریب پہونچا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سلام کیا جس کا میں نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ جامع مسجد تک میرے ساتھ چلو وہاں بیٹھ کر ذرا دیر باتیں کریں۔ میں نے کہا بہت اچھا چنانچہ قریب ہی جامع مسجد تھی وہاں جا بیٹھے اور وہ کہنے لگے کہ میں فلاں فلاں امر سے پریشاں ہوں اور میں نے ایسا ایسا واقعہ دیکھا ہے اور مجھے یہ یہ پیش آیا ہے۔ یعنی تمامی واقعات جو مجھے پیش آئے تھے وہ سب از خود ذکر فرمادے ان کی اس گفتگو سے واللہ میرا سارا بوجھ اُتر گیا اور میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اولیاء کاملین سے ہے۔ خود ہی انہوں نے بتایا کہ میرا نام عبداللہ برناوی ہے اور میں برلو کا شدہ ہوں۔ اور یہاں شہر فاس میں صرف تمہاری غرض سے آیا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اسوقت میں نے مولانا سید احمد جراوندیؒ کے کلام کی برکت کو سمجھا کہ مرحوم بڑے اہل خیر وصلاح تھے۔ غرض سید عبداللہ برناوی میرے ساتھ رہے کہ میری رہبری فرماتے مجھے کجی وبدراہی سے بچاتے قلب کو قوت پہونچاتے اور میرے دل سے وہ خوف مٹاتے رہتے تھے جو بقیہ رجب اور تمام شعبان ورمضان وشوال وذی قعدہ اور عشرہ ذی الحجہ تک پانچ مہینے کے مشاہدات میں مجھے پیش آتے رہے۔ حتیٰ کہ عید الاضحیٰ کا تیسرا دن آیا مجھے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت نصیب ہوئی۔ اُس وقت عبداللہ برناوی نے فرمایا کہ اے عبدالعزیز آج سے پہلے تو مجھے تمہارے متعلق اندیشہ تھا کہ آج چونکہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تم کو اپنی رحمت کاملہ یعنی وجود باجود سید الوجود صلے اللہ علیہ وسلم سے ملادیا اس لئے میرا دل مطمئن ہو گیا اور اب تم کو اللہ کی امان میں دے کر رخصت ہوتا ہوں۔ چنانچہ مجھے چھوڑ کر وہ اپنے وطن چلے گئے۔ درحقیقت ان کا میرے ساتھ رہنا اس غرض سے تھا کہ جو مشاہدات مجھے پیش آرہے تھے ان میں ظلمت کا دخل ہونے سے مجھے بچائے رکھیں حتیٰ کہ مشاہدۂ محمدیہ نصیب ہوجائے۔ کیونکہ صاحب فتح پر اس کے بعد کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ جو کچھ اندیشہ وخطرات ہوتے ہیں وہ اس مشاہدہ سے پہلے ہی پہلے ہوتے ہیں حضرت عبداللہ برناوی کے ساتھ مجھے بہت قصّے پیش آئے جن میں

عجیب ترین یہ ہے کہ ایک دن انہوں نے عورت کی صورت میں آ کر مجھے بہت کچھ پھسلایا اور بار بار اصرار سے اپنی طرف مائل کیا۔ صورت یہ ہوئی کہ میں محلہ جزائر بن عامر میں کھڑا تھا کہ ایک عورت چادر اوڑھے منہ پہ نقاب ڈالے خوشبو میں مہکی ہوئی صاف ستھری نہایت حسینہ و جمیلہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی اے میرے سردار ذرا تنہائی میں آپ سے باتیں کرنے کو میرا دل چاہتا ہے۔ یہ سُن کر میں بے تحاشا بھاگا اور جب آدمیوں کے مجمع میں پہونچ گیا تو ٹھہر گیا اور سمجھا کہ اب جان بچ گئی۔ مگر رصیف میں پہونچا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں وہ میرے پاس کھڑی ہے اور مجھے اپنی طرف پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا اور شراطین پہونچ کر دم لیا اور سمجھا کہ اب اس کی امید منقطع ہو چکی ہو گی۔ مگر دیکھتا کیا ہوں کہ وہ میرے پاس کھڑی پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا اور شماعین پہونچا مگر دیکھتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہے اور پاس کھڑی ہوئی ہے۔ میں پھر بھاگا اور مسجد قرویین کی شرقی جانب پہونچا اور سمجھا کہ بس اب نجات مل گئی۔ مگر دیکھا کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا حتی کہ صفارین تک پہونچا اور سمجھا کہ بس اب بچ گیا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی ہے۔ میں پھر بھاگا اور اب دوبارہ شماعین تک پہونچا اور سمجھا کہ بس اب چھٹکارا مل گیا مگر دیکھتا ہوں کہ وہ پاس کھڑی پھسلا رہی ہے۔ میں پھر بھاگا حتی کہ مسجد قرویین میں جا گھسا اور دل میں کہا کہ بس اب پیچھا چھٹ گیا مگر بڑے فانوس کے پاس پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پاس کھڑی ہے۔ اس وقت مجھ پہ غلبہ ہوا اور قریب تھا کہ میں غل مچاؤں اور لوگ آ جمع ہوں کہ وہ عورت دفعتہً عبداللہ برناوی بن گئی اور فرمایا کہ یہ کارنامہ تو میرا تھا اور تم کو آزمانے کے لئے کیا تھا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سادات کا میلانِ طبع عورتوں کی طرف زیادہ ہے۔ سو الحمدللہ تم کو ایسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا اور بہت خوش ہوئے۔

حضرت برناوی کے بعض معارف اثنائے کتاب میں ملاحظہ سے گزریں گے جس زمانہ میں وہ اپنے وطن واپس ہو گئے تو میں نے اپنے حضرت سید عبدالعزیزؒ سے بارہا سُنا کہ آج میں حضرت عبداللہ برناوی کے ساتھ تھا، اور انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا اور میں نے اُن سے یہ کہا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں قریب قریب ہر وقت آقا عبدالعزیزؒ کے پاس رہتا اور بہت ہی کم اُن سے الگ ہوتا تھا۔ مگر جب بار بار یہ سُنا تو میں نے کہا حضرت کیا مولانا برناوی اپنے ملک کو واپس نہیں گئے؟ فرمایا اللہ والوں کے وطن کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں مگر وہ ایک دوسرے سے دُور نہیں ہوتے حتیٰ کہ ایک اللہ والا جو مشرق میں ہو وہ دوسرے اللہ والے سے جو سوڈان یا بصرہ وغیرہ میں ہو باتیں کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح باتیں کرتا ہے۔ جیسے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے باتیں کیا کرتا ہے۔

اور جب کوئی تیسرا اللہ والا ان دونوں سے باتیں کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی کر لیتا ہے، اور اسی طرح چوتھا بھی، حتیٰ کہ تم دیکھو گے اللہ والوں کی ایک جماعت متفرق ہے کہ کوئی کسی ملک میں ہے اور کوئی کسی قطر میں مگر وہ آپس میں اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے ایک مجمع کے مجتمعین آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ حضرت برناوی کی ۱۱۲۱ھ میں وفات ہوئی اور حضرت نے فرمایا کہ ان کے تمامی اسرار کا میں ہی وارث ہوا فالحمد للہ۔

نیز فرمایا کہ منجملہ اُن بزرگوں کے جنکی مجھے ملاقات نصیب ہوئی حضرت منصور ہیں کہ قطب وقت تھے اور میرا اُن سے ملنا سورج گرہن سے ایک ماہ قبل ہوا تھا۔ ملنے کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت منصور سوت بٹنے اور بُننے کا کام کیا کرتے تھے میں اپنے بھائی علال کو لے کر اس نیت سے چلا کہ دیکھوں شاید کوئی بُننے کا کام اُن کو سکھا دے نقش و نگار کی جہاں بناوٹ ہوتی تھی میں وہاں پہونچا اور کام دیکھنے لگا۔ ایک شخص مجھ سے مِلا اور میں نے اس سے بات چیت کر لی۔ فارغ ہو کر جب واپس ہونے لگا۔ تو ایک شخص نے مجھے آواز دی جس سے میں بالکل واقف نہ تھا اور کہا کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس کے پاس آیا۔ تو اُس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا شریف (یعنی سیّد) کہا ماشاء اللہ اخیار، اطہار، ابرار۔ پھر پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا عبد العزیز۔ کہا کتنا پیارا اور بزرگ نام ہے پھر پوچھا کیا آپ کے ماں باپ حیات ہیں؟ میں نے کہا نہیں دونوں کا انتقال ہو چکا۔ کہنے لگے کچھ روپیہ پیسہ بھی پاس ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ کہا اچھا لیتے جاؤ۔ میں نے دیکھا تو تیس موزونہ تھے۔ پس یہ سبب ہوا اُن سے تعارف کا اور پھر ان کے ساتھ میرے عجیب عجیب واقعات پیش آئے جن میں سے چند کا تذکرہ اس کتاب میں انشاء اللہ آئے گا۔ غرض اللہ و رسول کی محبت میں میرا ان کا ساتھ رہا حتی کہ ۱۱۳۰ھ میں اُن کی وفات ہو گئی۔ سورج گرہن ۲۹ محرم ۱۱۱۸ھ میں ہوا تھا لہٰذا قریب بارہ سال کے معیت رہی۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کہ دونوں میں بڑا کون تھا؟ سید عبد اللہ برناوی یا حضرت منصور؟ فرمایا حضرت عبد اللہ برناوی بڑے تھے اگرچہ دونوں قطب وقت تھے۔ نیز فرمایا کہ جب حضرت منصور کا انتقال ہوا تو ان کے اسرار کا بھی میں ہی وارث ہوا۔ فالحمد للہ۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ منجملہ اُن مشائخ کے جن کی لقاء و معیت مجھے نصیب ہوئی حضرت محمد لہواج ہیں جن کا وطن تطاون کے قریب تھا۔ جیسا کہ حضرت منصورؒ کا وطن شہر فحص میں جبل حصب تھا۔ اور اُن سے ملنے کی یہ صورت ہوئی کہ جب میرے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا تو میرے

چچا مجکو اور میرے بھائی کو نقش ونگار کی بناوٹ سکھانے کے خیال سے کارخانہ میں لے گئے۔ کارخانہ کا ایک کاری گر حضرت محمد لہواج کا رشتہ دار تھا۔ اور حضرت ممدوح اس تعلق سے کارخانہ میں آیا کرتے تھے۔ مگر مقصود مجھ سے ملنا ہوتا تھا کہ جب آتے تو میرے پاس بیٹھتے اور باتیں کیا کرتے تھے۔ اس طرح باہم دونوں میں اچھا خاصہ تعارف ہوگیا۔ اور یہ میراان سے ملنا حضرت منصور سے پہلے ہوا تھا یعنی سنہ ۱۱۱۲ھ میں۔ مگر ان کی وفات حضرت منصور کے چند روز بعد ہوئی اور انکی وفات پر ان کی باطنی میراث بھی مجھ ہی کو ملی۔ ان کی معیت میں مجھے بہت کچھ واقعات پیش آئے جن میں سے بعض کا تذکرہ اسی کتاب میں انشاءاللہ آئے گا۔ الحاصل وہ مشائخ جن سے بطریق معروف استفاضۂ روحانی حاصل ہوا یہ پانچ حضرات ہیں۔ اول سیدنا خضر علیہ السلام دوم سید عمر بن محمد ہواری خادم روضہ علی بن حرزہم بوصیت خضر یہ۔ سوم عبداللہ برناوی۔ چہارم منصور بن احمد اور پنجم محمد لہواج رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ مگر آگے کتاب میں معلوم ہوگا کہ حضرت ممدوح کو ان کے علاوہ دیگر اولیاء کاملین کی بھی لقاء وصحبت نصیب ہوئی اور حضرت ممدوح ان کے اسرار باطنی کے وارث ہوئے۔ منجملہ اُن کے غوث وقت حضرت احمد بن عبداللہ مصری ہیں چنانچہ میں نے حضرت ممدوح کو یہ فرماتے سُنا کہ جس دن میں دیوان صالحین (مجلس اقطاب اغواث) میں داخل ہوا ہوں تو تمام دن احمد بن عبداللہ نے اور اسی طرح دیگر اہل دیوان نے بجز اس کے کوئی بات ہی نہ کی کہ مجھے کتمان سر کی تاکید فرماتے رہے۔ حتی کہ حضرت احمد بن عبداللہ نے تمامی اہل دیوان کو حکم فرمایا کہ اس بارہ میں ایک ایک واقعہ مجھے سنائیں۔

چنانچہ ان حضرات نے تقریباً دو سو واقعات مجھے سُنائے۔ ان میں سے آٹھ واقعات میں نے حضرت ممدوح سے سُنے تھے لہذا چند درج کتاب کرتا ہوں۔

(پہلا قصہ) خاص حضرت احمد بن عبداللہ غوث کا ہے کہ فرمایا۔ میرا ایک مرید تھا اور مجھے اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اس کو سُنانے لگا کہ بیٹے اگر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نہ ہوتا تو زمین کے اسرار میں سے ایک سر بھی ظاہر نہ ہوتا۔ وہ نور معظم نہ ہوتا تو نہ کوئی چشمہ ابلتا نہ کوئی نہر بہتی۔ عزیز من آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ماہ مابیح (شروع موسم بہار) میں تین مرتبہ تمامی بیجوں پر جھکتا ہے جس کی برکت سے ان میں پھل آتا ہے۔ بیٹا اگر نور محمدی نہ ہوتا تو کوئی تخم بھی پھل نہ لاتا۔ صاحبزادہ ضعیف ترین ایمان والے کو بھی اپنا ایمان پہاڑ جیسا بلکہ اس سے بھی بڑا لگ

وزنی معلوم ہوتا ہے۔ اور ذاتِ انسانی بسا اوقات ایمان کا یہ بوجھ اٹھانے سے عاجز ہو کر اس کے پھینکنے کا ارادہ کرتی (اور عیاذاً باللہ مرتد و آزاد بننا چاہتی) ہے کہ دفعتہً نور محمدی چمکتا ہے اور بار ایمان کے اُٹھانے میں معین و مددگار بنتا ہے۔ جس کی وجہ سے مومن کو ایمان شیریں اور پاکیزہ معلوم ہونے لگتا ہے (اور وہ ارتداد سے بچ جاتا ہے)۔ غرض عظمت شان محمدی اور اُن حسنات و خیرات کا ذکر کرتے کرتے جو بطفیل نور محمدی دُنیا و مافیہا کو نصیب ہوئی ہیں، میں ذاتِ محمدی میں محو ہو گیا۔ مرید نے جب میری یہ حالت دیکھی تو کہا اے میرے آقا اسی نبی محترم کے جاہ کا واسطہ مجھے سِر عطا فرما دیجئے۔ میں نے باز رہنا بھی چاہا مگر جب بڑی ذات کے جاہ کا واسطہ نظر کے سامنے آیا تو میں نے ہمت سے کام لیا اور اس کو نورِ بصیرت دے دیا۔ مگر چند ہی روز گزرے تھے کہ لوگوں نے اُس پر کفر کی گواہیاں دیں اور اس کو قتل کرا دیا۔ یہ شخص خوز کا بدو اور علاقہ مصر میں ناحیہ کا باشندہ تھا۔ مجھ سے سِر الٰہی لے کر وطن چلا گیا، اس کے پاس لوگوں کا اجتماع ہونے لگا اور وہ اُن کی عقول سے بالا اسرار الٰہیہ ان کو سُنانے لگا جس پر وہ بھڑکے اور شہادتیں جمع کر کے قتل کا حکم دلا دیا۔

(دوسرا قصہ) ایک صاحب نے فرمایا کہ میرا ایک مرید تھا جس نے بارہ برس میری خدمت کی اور مجھے بھی اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ حتیٰ کہ میرا ارادہ تھا کہ اپنی لڑکی اس کی زوجیت میں دے دوں۔ میں ہر ہفتہ میں تین دن کے لئے بستی چھوڑ کر کنارہ سمندر پر جا بیٹھا کرتا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانۂ غیبوبت میں عید آگئی۔ میرے چھ لڑکے تھے اور تین لڑکیاں اور ایک خدمت گار۔ جب میں گھر آیا تو دیکھا کہ اس نے عید کے موقع پر سب کے لئے کپڑے بنوائے اور حسب مراتب جس کو جس چیز کی ضرورت تھی سب مہیا کر دی۔ اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی جب وہ میرے سامنے آیا تو محبت و عقیدت سے ملا اور درخواست کی کہ سِر الٰہی اس کو عطا کر دوں جب اُس نے بار بار اصرار کیا تو با دلِ ناخواستہ میں نے اس کو سِر عطا کر دیا مگر چالیس دن سے زیادہ زندہ نہ رہا کیونکہ لوگوں نے اس کی زبان سے وہ اسرار الٰہیہ سن کر جن کو عقولِ عامہ برداشت نہیں کر سکتیں شہادتیں فراہم کیں اور پھانسی کا حکم دلا دیا۔

(تیسرا قصہ) ایک صاحب نے فرمایا میرا ایک مرید تھا جس کی خدمت گزاری و سلیقہ شعاری کی وجہ سے مجھے اس کے ساتھ بہت محبت ہو گئی تھی۔ نیز وہ میرا ہم محلّہ اور ہمسایہ بھی تھا۔ میری بیوی اکثر بیمار رہا کرتی تھی اور وہ مرید اپنی بیوی کو میرے گھر لے آیا کرتا تھا کہ جو کام میری بیوی نہ کر سکتی اس کو وہ انجام دیا کرتی تھی۔ غرض دونوں میاں بیوی ہماری خدمت میں لگے

رہتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے اس کی محبت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک دن میں ایک جگہ کھڑا ہوا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی سی بچی کو لے کر آیا جس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا دفعتہً کیا دیکھتا ہوں کہ بچی میرے پیروں میں پڑی ہے اور قرآنِ مجید اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنے پاؤں ہٹائے اور پیچھے کو قدم سرکا کر کہا کہ اے شخص آخر تو چاہتا کیا ہے؟ یہ واسطہ تو بہت ہی بڑا لایا۔ بولا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے سرِ الٰہی عطا فرما دیجئے۔ میں نے کہا عزیز من سرِ الٰہی بڑی بھاری چیز ہے۔ تو اُسے برداشت نہ کر سکے گا جسے حق تعالیٰ قوت بخشے اس کے سوا کوئی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور دو تہائی آدمی تو اس کے حامل کو تھو تھو ہی کرتے ہیں اور اسی میں اسی کی تباہی و موت ہے۔ اس نے کہا حضرت آپ عطا فرما دیجئے میں اس کو ضرور برداشت کروں گا۔ غرض اس کی اور اس کی بیوی کی خدمتوں پر اور ان تعلقات و حقوق پر جو اس کے میرے ساتھ قائم تھے نیز معصوم بچی اور کلام اللہ کا واسطہ لانے پر نظر کر کے میں نے ہاں کر لی اور اس کو سرِ الٰہی دے دیا۔ اب شیخ عبدالعزیز فرماتے ہیں) اُس نے سرِ الٰہی بغیر ذات کے لیا تھا اور جس کو بھی بغیر ذات کے سرِ الٰہی ملا کرتا ہے وہ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ذات سے کیا مُراد ہے؟ فرمایا کہ شیخ کی ذات اور ذات کے اسرار۔ مگر مرید کی طرف شیخ کی وفات کے بعد ہی منتقل ہوا کرتے ہیں، اور ولی سِر کے دینے کی تو طاقت رکھتا ہے مگر ذات کے دینے کی طاقت صرف حق تعالیٰ میں ہے (جیسے اپنے جلتے چراغ سے دوسرے کی بتی کو روشن کرنا تو کسبی اور اختیار عبد کے ماتحت ہے مگر اس میں تیل ڈالنا بندہ کا اختیاری فعل نہیں۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ چراغ کے جلنے کی مدت ختم ہو جائے۔ اور اس کا تیل دوسرے چراغ میں جا کر یہ گل ہو جائے۔ اسی کو اسرار کا وارث ہونا کہتے ہیں۔ جو شیخ کے انتقال پر کہ تربیت و افاضۂ جسمانی کے ختم کا وقت ہے بصورت ترکہ اہلیت والے مرید کو ملتا ہے)۔ الحاصل یہ شخص سرِ الٰہی لے کر چلا اور تین ہی دن شیخ کی نظر سے اوجھل رہا تھا کہ شیخ کی شان میں کلمات ناشائستہ بکنے لگا۔ شیخ کو بھی کسی نے اطلاع کی کہ آپ کا فلاں مرید آپ کے متعلق یہ یہ کہتا ہے۔ شیخ نے تغافل برتا اور ٹال دیا مگر اس پر بلا و آفت نازل ہوتی رہی۔ اسی تاریکی و ظلمت میں چند روز گزرے کہ ایک قافلہ آیا اور یہ اس کے ساتھ بحری سفر میں چلا گیا۔ وہاں جا کر قید ہوا اور پھر نصرانی بن گیا۔ والعیاذ باللہ۔

یہ بدنصیبی قبل از وقت سرِ الٰہی میں جلد بازی کے سبب لاحق ہوئی کہ اسلام سے بھی محروم ہو گیا۔

(چوتھا قصہ) ایک صاحبؒ نے فرمایا میں نے اور ایک شخص نے جو کہ میرا دینی بھائی تھا یہ طے کیا کہ وطن سے باہر نکلیں اور کسی ولی کی تلاش کریں جو ہمارا ہاتھ پکڑے اور سلوک کا راستہ طے کرائے۔ چنانچہ ہم سیاحت کرتے کرتے ایک شہر میں پہونچے اور وہاں ایک اللہ والا مل گیا۔ یہ بزرگ ثرید کی دوکان رکھتے تھے۔ پس ہم میں سے ایک نے تو آگ سلگانے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی اور دوسرے نے تول کر سودا دینے کی۔ اور خود شیخ ثرید پکایا کرتے تھے۔ مدت دراز تک ہم یہ خدمت انجام دیتے رہے حتیٰ کہ شیخ کا وقت اخیر آگیا اور ان پر غشی طاری ہوئی اس وقت میرے دینی بھائی نے پاس آکر شیخ سے درخواست کی کہ مجھے سرّ عطا فرما دیجئے۔ شیخ نے فرمایا تم میں تو ابھی اس کی طاقت آئی نہیں۔ اس نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت مجھے تو عطا ہی فرما دیجئے۔ شیخ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کیوں جی تم ایثار کرتے ہو (کہ اس عطا کے لائق تو تم ہو لیکن اگر اس کو دے دیا جائے تو تمہیں ملال یا حق تلفی کا خیال تو نہ ہوگا) میں نے کہا اگر حضرت کی رائے یہی ہے تو میری طرف سے بخوشی اجازت ہے۔ فرمایا ہاں حتیٰ پوشی کرو۔ اللہ تمہیں اس کا عوض اپنے پاس سے عطا فرمائے گا۔ چنانچہ میں راضی ہو گیا اور میرے بھائی نے سرّ لے لیا۔ دو روز کے بعد شیخ کی وفات ہوگئی اور میرا بھائی اپنے وطن چلا گیا۔ میں بدستور شیخ کی دکان پر کام انجام دیتا رہا کہ جو کچھ کماتا وہ شیخ کے گھر والوں میں خرچ کر دیتا۔ شیخ کے ایک بیوی تھی اور تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ غرض کامل بارہ برس تک میں دکان کو سنبھالے اور اولاد شیخ کی خدمت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ صاحبزادیوں کے بیاہ ہوگئے اور سب اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں۔ صاحبزادہ صاحب بجانب مغرب سفر کر گئے۔ اور پیرانی صاحبہ نے دیور کے ساتھ اپنا نکاح کر لیا۔ اب کوئی نہ رہا جس کی خاطر یہاں رہوں اس لئے میں نے بھی وطن کا عزم کر لیا۔ جو کچھ پونجی تھی اس کو میں نے بیچ دیا اور سامان سفر مہیا کیا۔ اب صرف اتنا کام رہ گیا کہ شیخ کے مزار پر حاضر ہو کر آخری زیارت کر لوں اور روانہ ہو جاؤں۔ مزار آبادی سے بہت دور اور خوفناک جگہ میں تھا۔ چنانچہ میں پہونچا اور جب زیارت کر کے واپس ہونے لگا تو میرے دل نے کہا کہ ہائے اب تو جا رہا ہے اور پھر شیخ کی زیارت کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس پر مجھے وحشت طاری ہوئی اور شیخ کی محبت نے میرا دل اور دامن پکڑ لیا۔ چنانچہ میں واپس ہوا اور گھنٹہ بھر وہاں بیٹھا، اس کے بعد پھر چلنے لگا تو دوبارہ پھر وہی وحشت طاری ہوئی اور میں واپس ہوا حتیٰ کہ زوال تک بیٹھا۔ آخر پھر چلنے کا ارادہ کیا اور پھر مجھے اسی قلق و وحشت نے پکڑا۔

غرض اسی حال میں کہ بار بار اُٹھ کر چلتا اور شیخ کی جدائی کے قلق سے روتا ہوا واپس آتا تھا رات ہوگئی اور میں بیٹھ گیا۔ جوں جوں رات گزرتی رہی میری بے چینی اور شیخ کی محبت میں ترقی ہو کر گریہ وزاری بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ پو پھٹی اور صبح نمودار ہوگئی اس وقت سیدنا خضر علیہ السلام تشریف لائے اور مجھے ذکر تلقین فرمایا اور حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی (کہ چشمِ بصیرت کھل گئی اور بابِ مشاہدہ وا ہوگیا) اس طرح بامراد ہو کر میں وطن روانہ ہوا۔ راستہ میں میرے دینی بھائی کا وطن پڑتا تھا۔ جب میں اس شہر میں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ انسان کو جلانے کے لئے لوگ لکڑیاں جمع کر رہے ہیں۔ میں آگے بڑھا کہ دیکھوں وہ کون شخص ہے۔ دیکھا تو میرا ہی دینی بھائی تھا۔ لکڑیاں جمع کرنے والوں سے میں نے پوچھا کہ آخر اس شخص کا جُرم کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ ایسا کہتا ہے یعنی اسرار الٰہیہ میں سے ایک راز کا اُس نے افشا کیا جس کی عقول عامہ متحمل نہ ہوسکیں۔ انہوں نے علماء سے استفتا کیا اور علماء نے اس کے جلائے جانے کا فتویٰ دیا۔ میں آگے بڑھا کہ اپنے بھائی کو میں نے تو پہچان لیا تھا مگر وہ اپنی مصیبت و پریشانی میں مجھے نہ پہچان سکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لوگ تم کو کیوں جلاتے ہیں۔ کہا مجھے یہ کہتے ہوئے انہوں نے سُنا۔ حالانکہ میں نے حق بات کہی ہے۔ میں نے کہا ممکن ہے تم نے اس کے سوا اور کچھ بھی کہا ہو۔ جواب دیا کہ نہیں اور کچھ بھی نہیں کہا۔ اب میں نے مجمع کی طرف مُنہ کر کے کہا کہ صاحبو! جب تک میں سلطان کے پاس سے واپس نہ آؤں اُس وقت تک ہاتھ روکے رہو۔ میں ابھی جاتا ہوں اور سلطان سے عرض کروں گا کہ اس شخص پر قتل کا حکم صحیح نہیں ہے لہٰذا تا حکم ثانی اپنی ساری کارروائی کو ملتوی رکھو۔ اور چونکہ مجھے غالب گمان ہے کہ میری تقریر پر سلطان اپنا حکم ضرور واپس لیں گے اس لئے میری واپسی سے قبل اگر کسی نے کوئی کارروائی کی تو وہ اپنی جان کی خیر نہ سمجھے۔ سب نے کہا بہتر ہے جب تک آپ واپس نہ آئیں گے ہم کچھ نہ کریں گے۔ چنانچہ میں بحضور سلطان پہونچا اور دیکھا کہ علماء پاس بیٹھے ہیں۔ اسی شخص کا تذکرہ ہو رہا ہے اور سلطان کو اس کے قتل پر اُبھار رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا اے ہمارے بادشاہ خداوند قدوس آپ کا ناصر و مددگار رہے اور ہر معاملہ میں آپ کو اپنے محبوب و پسندیدہ راستہ پر چلاتا رہے۔ دیکھئے۔ ہر ابن آدم کی ذات پر چھیاسٹھ فرشتے تعینات ہیں۔ جو شخص کسی ایک ذات کو بھی ناحق قتل کریگا تو مقتول کی ذات کے فرشتوں کی اتنی کثیر تعداد کا اس کے سوا کوئی مشغلہ نہ ہوگا کہ قاتل پر

پر لعنت برسنے کی بد دعا کرتے رہیں کہ اسی نے ذات کو قتل کر کے اِن کو بلا وجہ باہر نکالا اور معطل بنایا ہے، اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دُعا مقبول و مستجاب ہے۔ لہٰذا اے ہمارے بادشاہ اس بد دُعا سے ڈرنا چاہیے۔ نیز ہر ذات پر سات فرشتے بغرض محافظت وکتابت اعمال تعینات ہیں۔ پس جب کوئی ذات بلا وجہ قتل ہو جاتی ہے تو ان فرشتوں کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ مقتول کے اعمالنامہ سے اُس کی خطاؤں کو نقل کر کے قاتل کے اعمالنامہ میں لکھ دیں، اور قاتل نے جو بھی عمل نیک کیا ہے وہ اس کے اعمالنامہ سے منتقل کر کے اعمالنامہ میں درج کر دیں۔ قاتل کے مرتے دم تک اُن کا یہی شغل رہتا ہے، پھر اس کے مرنے کے بعد اس کی بد کاریوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ملائکہ کا تذکرہ چونکہ بارش کا حکم رکھتا ہے کہ جس کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اُس پر بھلائی برستی ہے اور جس کا تذکرہ بُرائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس پر بُرائی برستی ہے لہٰذا مقتول کا تذکرہ برائی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں لہٰذا (قبر و عالم برزخ میں بھی) اُس پر آفات برستی رہتی ہیں۔ پس اے بادشاہ کیا آپ کو اس سے ڈر نہیں لگتا؟ سلطان نے فرمایا کہ ان علماء ہی نے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ میں نے کہا مگر ان حضرات نے قتل کے فتویٰ میں جلدی کی۔ اِن کو چاہیے تھا کہ قائل کے لفظ اور نیت دونوں میں غور فرماتے۔ اگر لفظ اُس کے قتل کو چاہتے تھے تو اس سے اس کی نیت اور مراد معلوم کرتے کہ اس کے صحیح و موافقِ شریعت ہونے پر قتل کا حکم نہ ہوتا۔ لہٰذا اس کو بھیج کر اس شخص کو بلوالیا جائے اور اُس کا مقصود معلوم کر لیا جائے۔ علماء نے کہا ہاں بالکل ٹھیک ہے اور ہمیں اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ بلوایا گیا اور چونکہ اُس کے لفظوں کا جو مقصود تھا وہ شرعاً صحیح تھا اس لئے اس کو فوراً رہا کر دیا گیا۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کہ پھر رہائی کے بعد کیا ہوا۔ فرمایا جس بھائی نے رہا کرایا تھا اسی نے وہ سِرِ الٰہی جو شیخ سے ملا تھا اُس سے سلب کر لیا اور وہ منجملہ عوام کے بن گیا۔ میں نے سوال کیا کہ پہلے اور دوسرے قصہ والوں کا قتل ہونے کے بعد کیا انجام ہوا۔ فرمایا ان کی موت ولایت پر ہوئی۔ مگر تیسری حکایت والا (جس نے شیخ کیساتھ سوءِ ادب کیا تھا) البتہ کفر پر مرا۔ اللھم انا نسئلک حسن الادب باولیائک ونعوذ بک من سوء الادب باصفیائک۔

(پانچواں قصہ) ایک صاحب نے فرمایا کہ میرا ایک مُرید تھا۔ اور بارہ برس سے

میری خدمت میں رہتا تھا۔ بڑا سخی اور حوصلہ والا تھا کہ مجھ پر اور اپنے غریب برادرانِ طریقت پر قریب ایک قنطار کے خرچ کرچکا تھا۔ میرا ایک بھائی تھا جو شاہی ملازم تھا۔ ایک دن سلطان کو غصہ آیا اور بھائی پر اتنی رقم کا جرمانہ کیا جو اس کی وسعت سے باہر تھا۔ چونکہ عام لوگ مجھے بنظرِ عظمت و احترام دیکھتے تھے اس لئے کوتوالِ شہر مجھے کوئی نقصان نہ پہونچا سکا۔ مُرید نے وقت کو غنیمت سمجھ کر مجھ سے کہا کہ حضرت یا تو مجھے سّر عطا کر دیجئے یا جو رقم میں نے آپ پر اور آپ کے ساتھی فقیروں پر کھوئی ہے وہ سب ادا کر دیجئے۔ ورنہ میں کوتوال کو بُلاتا ہوں۔ ان تین باتوں میں جس کو آپ چاہیں پسند کرلیں۔ میں نے کہا اے شخص اللہ سے ڈر (اور مجھے دھمکا کر مجبور نہ بنا) جلدی ہی اللہ تجھے سّر عطا فرما دے گا۔ اور اگر تجھے میرے کلام میں شبہ ہو تو میں اللہ کا عہد و میثاق دیتا ہوں کہ صبر کر ایسا ہی ہوگا۔ مگر جوں جوں وہ میری سماجت کی گفتگو سنتا دوں دوں بھڑکتا اور میری ایذا رسانی میں اوپر چڑھتا تھا۔ بالآخر کہنے لگا کہ میں تو تمہارا پیچھا چھوڑنے کا نہیں جب تک کہ میری ساری رقم جو میں نے تم پر ضائع کی ہے ادا نہ کردو ورنہ کوتوال کو لا کر ابھی پکڑوا تا ہوں اور صورتِ حال ایسی نازک تھی کہ کوتوال کو ذرا بھی گنجائش ملے تو وہ مجھے نہ چھوڑے۔ جب اس شخص نے بار بار مجھ سے یہی کلمات کہے تو میں سر کے بل سجدہ میں گرا اور اس کے لئے سّر کی دعا مانگی چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کو سّر عطا فرما دیا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ اس کو ایک ایسی چیز نظر آئی جس کو حق تعالیٰ نے عقول عامہ سے مخفی رکھا ہے کیونکہ وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتیں اور یہ شخص لوگوں سے اس کا تذکرہ کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو سُن کر (اس کے کفر پر) شہادتیں مہیا کیں اور اسی وقت اس کو قتل کرادیا۔ اگر یہ شخص صبر کرتا اور سّر فات کو لیتا جس کے ذریعہ سّرِ ولایت قائم رہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو توفیق بخشتا اور اسرارِ ولایت میں سے کسی ایک راز کا بھی افشا نہ کرسکتا۔ مگر اس نے چونکہ عجلت کی اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو سزا دی۔ میں نے حضرت شیخ سے پوچھا کہ یہ شخص کس حال میں مرا۔ فرمایا مرا تو ولایت ہی پر۔ اور وہ اسرار جن کا افشا ان صاحب کی موت کا سبب ہوا میں نے حضرت شیخ سے سُنے مگر ان کو تحریر میں نہیں لاتا کہ وہ اسرار ہیں جو قابل بیان نہیں (اگر وہ بیان میں لائے جاسکتے تو ان کا نام اسرار ہی کیوں ہوتا اور بالآخر اس اظہار پر بھی وہی نتیجہ مرتب ہوگا کہ لوگ کفر کے فتوے دیں گے۔ کیونکہ عقول عامہ حقیقت کو سمجھ نہیں سکتیں)۔ ف سّر کا

ترجمہ ہے راز اور یہ ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی جس کی حقیقت چراغِ قلب کی روشنی ہے جس سے ذات و صفات کے حقائق و معارف اور عالم ملک و ملکوت کے مخفیات گوناگوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح قوت و ضعف کے اعتبار سے نورِ بصارت کے صدہا مراتب ہیں۔ اسی طرح اس نورِ بصیرت کے بھی بے شمار درجے ہیں کہ ایک مشاہدہ ہے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کے مافوق کوئی مشاہدہ نہیں۔ اور ایک مشاہدہ ہے معمولی درجہ کے ولی کا کہ دونوں کے درمیان صلحاء، اولیاء، ابدال اقطاب اغواث، صحابہ انبیاء اور ملائکہ کے کثیر در کثیر فرق و مراتب ہیں وفوق کل ذی علم علیم۔ پھر اس نور کے لیئے اس کے مناسب ظرف کی ضرورت ہے کہ معمولی قمقمہ زیادہ طاقت کی بجلی کے کرنٹ کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھٹکر چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ مولائے کریم کا انعام ہے کہ عوام الناس سے تمامی اسرار کو مخفی رکھا ہے کہ ان کی عقول جو بقدرِ ضرورت دنیا میں اُن کو عطا فرمائی ہیں۔ ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور ظاہر ہے کہ ان کا انکشاف اگرچہ کمال ہے مگر مدار نجات نہیں۔ مدارِ نجات وہ قانون الٰہی ہے جس کا نام شریعت ہے۔ کہ فوج میں بھرتی ہو کر غنیم پر تلوار چلانا اگرچہ ایک باعظمت عہدہ ہے مگر ساری رعایا کو اس سے نوازا جائے تو نظامِ سلطنت مختل ہو جائے۔ عام رعایا کی وفاداری کا امتحان صرف قانون سلطانی کی پابندی میں ہے کہ کوئی بچہ بھی کسی جرم کا مرتکب نہ ہو۔ طفلِ ضعیف اگر باپ کو جنگ میں تلوار چلاتا دیکھ کر ضد کرے اور وہ اس کی خوشامد یا گریہ و زاری پر تلوار اس کے ہاتھ میں دے دے تو عجب نہیں بچہ خود اس کا شکار ہو جائے کہ ہر کارے و ہر مردے الخ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک چرواہے کا قصہ لکھا ہے کہ فرطِ محبت میں سرشار چادر سے منہ ڈھانپے کھڑی زمین پر پڑا ہوا گنگنا رہا تھا کہ اے میرے پیارے اللہ اگر تجھے پاؤں تو اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں اور تیرے پاؤں دباؤں وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ کلمات کفریہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات پاک جسم سے منزہ اور کھانے پینے سے بے نیاز ہے، اور اسی لئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ڈانٹا اور دھمکایا۔ مگر حق تعالیٰ نے ان الفاظ کے منشاء پہ نظر فرما کر کہ شرابِ محبت کا سکر ہے، اس کو معذور قرار دیا۔ جیسے جج کسی قاتل کو پھانسی کا حکم دے مگر والسرائے اس کی خدمات شرافت پر نظر فرما کر مرحمت خسروانہ سے اس کو رہا کر دے اور اسی جج کو جس نے شاہی قانون کا احترام کرتے ہوئے سزائے موت کا حکم

فرمائے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔ قانونی جرم بہرحال جُرم ہے اور جج کا فیصلہ بہرحال قابل ستائش اور محافظ خانہ رکھ کر دیگر مقدمات میں نظیر بننے کا مستحق ہے مرحمتِ خسروانہ نے مجرم کو رہا ضرور کیا۔ مگر نہ جج پر عتاب فرمایا کہ فیصلہ کے وقت سمجھ سے کیوں نہ کام لیا' اور نہ مجرم کے جُرم کا انکار کیا' بلکہ غور کرو تو جرم کا اثبات ہے کہ معافی نام ہی ہے مستحق سزا سے سزا اُٹھا لینے کا۔ نہ کہ بَری ولے قصور کو چھوڑ دینے کا' جس کو عدل وانصاف کہتے ہیں۔ پھر کس کی ہستی ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کہ صاحبِ شریعت جلیل القدر پیغمبر تھے ایک عامی چرواہے سے عیاذاً باللہ نیچے اتار دے۔ آپؑ اس چرواہے سے ہزاراں ہزار گونہ زیادہ محبت الٰہیہ رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی اس سے لکھوکھا' گونہ بڑا ظرف بھی رکھتے تھے۔ جیسے کسی کی ایک گھونٹ شراب سے عقل جاتی رہے اور کوئی چند بوتلیں پی کر بھی مطلق از جارفتہ نہ ہو۔ بلکہ قانونی نظم کو سنبھالے ہوئے اہلِ ہذیان متوالوں کی پکڑ دھکڑ میں مشغول رہے مگر وہ زمانہ پیغمبر کا تھا کہ وحی الٰہی کا شاہی تار براہ راست آپ کو پہونچ گیا ورنہ آج جبکہ اس اطلاع کا دروازہ بند ہو گیا ہے' علماء اُمّتِ محمدیہ کو بجز گرفت اور سزائے دنیا جاری کرنے کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ ہاں اس مرحمتِ خسروانہ کا اثر بیوم حشر ضرور ظاہر ہو گا کہ بے شمار قانونی مجرم عفو شاہنشاہی سے بہرِ پا اور بیجن جہنم سے رہا ہوں گے۔ یہی حال اہلِ مکاشفہ کا ہے کہ جب قبل از وقت اور بالا از طاقت کیفیت کے ملنے پر اُبل پڑیں تو علماء مجبور ہیں کہ خلاف شرع کلمات پر قانونی سزا جاری کریں۔ کہ اس میں قصور علماء کا نہیں بلکہ اُبلنے والوں کا ہے کہ قبل از وقت اور ناقابل برداشت بوجھ اٹھایا کیوں۔ جیسا کہ خفیہ پولس جن کی معلومات کے لئے اخفا روکتمان ہی فرضِ اولین ہے۔ اگر تنگ ظرفی سے کسی راز کو افشا کر دے تو خطاوار وہ ہے۔ نہ کہ گورنر جس نے اُسے برخاست کیا یا قید کیا۔ رہا یہ کہ علماء صاحب کشف کیوں نہیں ہوتے تاکہ اس راز کی واقعیت معلوم کر لیتے سو اول تو تکوینی معاملات سے عموماً ان اسرار کا تعلق ہے اس سے اہلِ تشریع کا واقف ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ ہر خدمت جُدا ہے۔ اور ہر محکمہ کے فرائض وضروریات علیحدہ ہیں۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا خضر علیہما السلام کے قصّہ سے ظاہر ہے۔ جو کہ قرآن مجید میں مفصل مذکور ہے۔ اور باایں ہمہ افضلیت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ہے جن کی نبوت و رسالت قطعی اور جلالت شان قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ان کے چراغ قلب کا رُخ تکوینی مشاہدات کی طرف نہیں بلکہ معانی اور دقائق قانون

الٰہی وسیاست عامہ کی تدابیر کی جانب ہوتا ہے جیسا کہ رموزِ مملکت کی دانش سلاطینِ ملک کے لئے۔
دوم علماءِ شریعت کو اگر تکوینی کشف ہو بھی تو حق تعالیٰ نے چونکہ بقاءِ عالم اور امن عام کا مدار شریعت ہی پر رکھا ہے، اس لئے اس سیاست کا تقاضا ان کا پہلا فرض ہے۔ کہ آج واقعی ایک مغلوب الحال کوئی بات خلافِ شرع کہہ رہا ہے اور جرواہے کی طرح اس کو معذور قرار دیا جارہا ہے، تو کل کو واقعی ایک بددین ملحد شخص خلافِ شرع کلمات بک دیا اور نقال محض بن کر صاحبانِ اسرار کی نظیر پیش کر رہا ہے تو کیا منھ ہے کہ اس کو معافی نہ دیجائے اور یہ کہلوایا جائے کہ مولویوں کی من مانی تہمت ہے جس کو چاہا مغلوب الحال کہہ لیا اور جس کو چاہا نقال بنا کر قتل کر دیا۔ اس طرح تو نظم وامن عام ہی اُٹھ جائے گا۔ بہر حال خفیہ پولس بھی ایک سرکاری محکمہ ہے اور بڑا معتمد علیہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ واقعات کی حقیقت منکشف کرے اور انعام پاوے۔ مگر جج کی عدالت بھی اُسی سرکار کا محکمہ عالیہ ہے۔ جہاں صرف قانونی بحث ہے کہ جب کوئی ملزم لایا جائے گا تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ معائنہ کے دو گواہ پیش کرو۔ واقعہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اگر شہادت بروے قانون مکمل نہیں تو پھانسی تو کیا معنی ایک دن کا جیل خانہ بھی نہ ہوگا۔ نہ محکمہ پولیس کو ایک ناگواری ہے واقعہ اور حقیقت کی بھی رعایت نہ کی اور ہماری جدوجہد کو ضائع کر دیا۔ اور نہ جج پر گرفت ہے کہ سرکاری محکمہ کی صداقت پر اعتماد کیوں نہ کیا۔ چونکہ آئندہ یہ بحث بار بار آئے گا اس لئے اپنی فہم کے موافق بندہ نے اسکی تقریر ضروری سمجھی تاکہ نہ اہلِ باطن کی محبت دل سے نکلے نہ اہلِ ظاہر کی عظمت میں کوئی فرق آوے کہ دونوں حضرات سرکاری محکمہ کے عہدہ دار اور شاہی غلام ہیں۔ واللّٰہ اعلم۔ ان اسرارِ الٰہیہ کا زیادہ تعلق چونکہ کشوف کونیہ سے ہوتا ہے جس کے حامل صاحبانِ خدمت کہلاتے ہیں اسلئے ان کو نسبت خضریہ سے مستفید ہونا ضروری ہے۔ اور ان میں قطبیت وغوثیت کے عہدہ باطنیہ پر بھی فائز ہوتے ہیں جو مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ کے مصداق ہوں کہ بامتثال فرمان نبوی کلّموا النّاس علیٰ قدرِ عقولِہم اسرارِ مخفیہ کو عوام پر ظاہر نہ ہونے دیں مبادا فتنہ اور اختلالِ سیاست شرعیہ کا سبب ہو جائے اور خود شب و روز، بحرِ مشاہدہ میں غرق اور معارف عجیبہ ولطائف غریبہ میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم بھی بنے رہیں کہ تکوین وتشریع دونوں کا حق کما حقہ پورا کر کے مولائے کریم کے سامنے حاضر ہوں۔

(تیسری فصل) شیخ کی بعض کرامات کا بیان) یوں تو حضرت شیخ مجسم کرامت تھے کہ باوجودیکہ امی محض تھے اور باقاعدہ تحصیل علم تو درکنار، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کسی

مجلس درس میں آپ کو دیکھا ہی نہیں گیا۔ حتیٰ کہ حافظ قرآنِ مجید بھی نہ تھے۔ چند سورتیں اداء نماز کے قابل یاد تھیں، مگر اُن علوم میں بحث فرماتے تھے جن سے بڑے بڑے علماء عاجز تھے اور آپ ہی کی تحقیق بروئے عقل و نقل ہر طرح صحیح و صائب ہوتی تھی۔ تاہم سب سے پہلے ہم اُس کرامت کو بیان کرتے ہیں جس سے بالا کوئی کرامت نہیں، اور وہ صحت عقائد اور شانِ استقامت ہے۔ چنانچہ جب مجھے آپ کی صحبت نصیب ہوئی تو میں نے سب سے پہلے توحید کے متعلق آپکا عقیدہ دریافت کیا۔ آپ نے ترتیب وار تمامی عقائد اہلِ سنت والجماعت ظاہر فرما دیئے کہ ایک بھی نہ چھوڑا۔ ایک بار فرمایا بندہ کو فتح نصیب ہی نہیں ہوتی جب تک کہ اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ پر نہ ہو۔ اور اللہ کا ایک بھی ولی کسی دوسرے عقیدہ پر نہیں ہوا۔ اور اگر فتح سے قبل کسی دوسرے عقیدہ پر تھا بھی تو فتح کے بعد اُس پر واجب ہوا ہے کہ توبہ کرے اور فوراً عقیدۂ اہلِ سنت والجماعت کی طرف رجوع ہو۔ (چنانچہ علامہ بدر الدین زرکشی نے بھی کتاب جمع الجوامع میں یہی لکھا ہے) میں نے ہمیشہ حضرت ممدوح کو اہلِ سنت کی مدح و ثنا کرتے سُنا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اہلِ سنت سے بہت ہی زیادہ محبت ہے اور اللہ سے دُعا مانگا کرتے تھے کہ ان ہی کے عقیدہ پر مرنا نصیب ہو۔

پھر میں دیگر مذہب والوں کے شبہات (یعنی اُن کے عقائد جن کا منشاء علمی اشتباہ ہوتا ہے) پیش کیا کرتا تو آپ وجہِ اشتباہ کی تہ کو پہونچتے اور ایسی پیاری تقریر سے اس کا حل فرماتے جیسے دیکھا بھالا شخص جواب دیا کرتا ہے۔ غرض شانِ ربوبیت و سرِّ الوہیت کی وہ باتیں آپ کے دہن مبارک سے ہمارے کان میں پڑتی تھیں جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھیں۔ نہ کانوں نے سنیں۔ اور نہ ہم جیسوں کی عقل پر کبھی ان کا گذر ہوا۔ حالانکہ معقول و منقول میں جان کھپانا مدت ہائے دراز سے ہمارا مشغلہ رہا ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو حق تعالیٰ توفیق بخشتا اور وہ اس مبحث میں آپ سے مکالمہ کرتا اور تمامی اہل ہوا فرقوں کے اشتباہات میں آپ کے ساتھ دوڑتا تو عقیدۂ حقہ کی ایک بے نظیر قوت حاصل اور اس کو ایسا ملکہ نصیب ہو جاتا کہ بہتر فرقوں کے تمامی اشتباہات کے جواب پر پوری قدرت پا لیتا۔ ایک مرتبہ آپ نے کشف و مشاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تو مغیبات میں یقین اسی کا کیا ہے جس کو (نور بصیرت سے) دیکھ لیا ہے، کہ بے دیکھی چیز پر کون ایمان لایا کرتا ہے اور دیکھے بغیر تو خطرات و شبہات دور ہی نہیں ہوا کرتے۔ اس کے بعد میں نے احادیث

صفات کے متعلق آپ سے استفسار کیا کہ (وجہ اللہ اور ید اللہ وغیرہ میں) تفویض ضروری ہے
(کہ ان کی حقیقت کا علم اللہ کے حوالہ کریں) جیسا کہ متقدمین کا مسلک ہے یا تاویل ضروری ہے۔
کہ وجہ سے مراد ذات ہے اور ید سے مراد قوت) جیسا کہ متاخرین کا طریق ہے؟ فرمایا کہ تفویض
ضروری ہے۔ اور شان ربوبیت اتنی بلند و عظیم ہے کہ بندے نہ اس کی مقدار سمجھ سکتے ہیں اور
نہ اس کی کسی ایک چیز کی بھی حقیقت و کنہ تک رسائی پا سکتے ہیں۔ دیکھو اگر دنیا والے جنت
کی نعمتوں کے بارہ میں جتنا بھی انہوں نے سنا ہے اگر ان کی اصل حقیقت سے واقف
ہونا چاہیں تو بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ وہاں کا انگور نہ یہاں کے انگور جیسا ہے۔ نہ کھجور
یہاں کی کھجور کی طرح ہے۔ نہ وہاں کا سیم وزر یہاں کے سیم وزر کی مثل ہے۔ بلکہ حق
تعالیٰ اگر کسی بندہ کی آنکھیں کھول دے اور وہ جنت کے انگور، کھجور اور سیم وزر کو دیکھ
لے، تو انکی حقیقت اور ماہیت میں اتنا بے حد و بے پایاں فرق پائے گا کہ دونوں میں بجز
نام کی شرکت کے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ اسی طرح دوسری زمین کے باشندوں کا حال
ہے اس زمین کی نعمتوں کے متعلق کہ اگر ان کے سامنے مثلاً شہد۔ گھی۔ دودھ اور روٹی وغیرہ
چند کھانے ہی کی چیزوں کا نام لیا جائے تو ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گا کہ شہد روٹی
وغیرہ کیسی ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں دوسری زمین میں بالکل نہیں
ہوتیں۔ پس جب ایک حادث کا دوسرے حادث کے ساتھ یہ حال ہے (کہ ایک جگہ کی
مخلوق دوسری جگہ کے مخلوقات کی اصل حقیقت نہیں سمجھ سکتیں) تو قدیم سبحانہ و تعالیٰ کا
حادث کے ساتھ کیا پوچھنا (کہ اس کی صفات قدیمہ کی حقیقت اور اس کو بشر سمجھ لے)
لہٰذا بندہ پر واجب ہے کہ جب اس کی صفات کے متعلق کوئی بات سنے تو ظاہری مفہوم
سے جو کہ شرعاً محال ہے اس کو منزہ سمجھتا ہوا حقیقی مفہوم کو اللہ جل جلالہٗ کے حوالہ
کرے" میں کہتا ہوں کہ تفویض ہی مذہب ہے۔ امام مالک حضرت سفیان بن عینیہ
حضرت سفیان ثوری حضرت حماد بن زید حضرت حماد بن سلمہ، حضرت شعبہ حضرت شریک
حضرت ابو عوانہ حضرت ربیعہ امام اوزاعی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام ابن حنبل،
حضرت ولید بن مسلم امام بخاری امام ترمذی حضرت ابن المبارک حضرت ابن ابی حاتم اور
حضرت یونس بن عبد الاعلیٰ (مقتدایان اہل سنت علماء و محدثین) کا اور یہی قول ہے اہل
قرون ثلاثہ (حضرات صحابہ و تابعین و تبع تابعین) کا جو کہ تمامی قرون (ماضیہ و مستقبلہ)

شانِ خدا

میں افضل و بہترین ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین ، حتیٰ کہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں کہ شرق سے لے کر غرب تک تمامی فقہار کا اس پر اتفاق ہے کہ رب کی صفات کے بارہ میں قرآن پر اور اُن احادیث پر جو کہ بروایات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں بلا تشبیہ اور تفسیر کے ایمان لایا جائے (مثلاً نہ یہ کہا جائے کہ اس کا ہاتھ یا منہ عیاذ باللہ ہماری طرح ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ نے تشبیہ کو باطل کر دیا ہے، اور نہ یہ بتایا جائے کہ ہم جیسا نہیں تو پھر کیسا ہے، اس لئے کہ جس کی کنہ تک عقل کی رسائی نہیں اس کی تفسیر گویا اندھے کا تیر ہے جو خلافِ عقل ہے) اور امام الحرمین نے رسالہ نظامیہ میں اس طرح تحریر فرمایا ہے" ان ظواہر کے متعلق علمار کے مسلک مختلف ہیں کہ بعض کی رائے تفسیر کے متعلق ہے انہوں نے آیات کلام اللہ و احادیث رسول اللہ میں اسی کا التزام کیا ہے (جہاں بھی وجہ دید وغیرہ ایسی صفات آئیں جن کے ظاہری معنے شان ربوبیت کے منافی ہیں وہاں اقرب الی الفہم مجازی معنی لے کر تفسیر کر دی کہ منہ سے مراد ذات اور ہاتھ سے مراد قدرت ہے) مگر ائمہ سلف اس طرف گئے ہیں کہ تاویل سے باز رہے اور ان کے معانی جل جلالہ کے حوالہ کرے۔ اور ہمارے نزدیک پسندیدہ رائے اور حسن عقیدہ پر خدا کے سامنے حاضر ہونے کو ہمارا دل چاہتا ہے وہ آئمہ سلف ہی کا اتباع ہے کہ اجماعِ اُمت کا حجت ہونا دلیل قطعی سے محقق ہو چکا ہے۔ پس اگر ان ظواہر کی تاویل کرنا ضروری ہوتا تو حضرات سلف کو فروعی مسائل سے زیادہ اس کا اہتمام ہوتا۔ (کیونکہ عقائد کا قصہ ہے اور وہ بھی ذات و صفات الٰہیہ کے متعلق جو کہ اصل الاصول ہے)۔ اور جب صحابہ و تابعین کا بہترین زمانہ تاویل و تفسیر سے گریز ہی پر گزر لیا تو کون وجہ ہے کہ اس کی پیروی نہ کریں۔"

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں (کہ صحابہ و تابعین کا مشرب تو ظاہر ہو چکا۔ اب رہے) تیسرے قرون والے فقہاء بلاد مثلاً امام ثوری و اوزاعی و مالک و لیث اور اُن کے ہم عصر علمار) سو ان کا مذہب (اسی تفویض کا) ہم پہلے نقل کر چکے۔ اور یہی مشرب اُن آئمہ کا بھی ہے جو فقہاء مذکورین کے شاگرد اور اُن سے علوم حاصل کرنے والے تھے۔ پھر اس پر کیسے نہ اعتماد کیا جائے جو تینوں قرون کا متفق علیہ ہے۔ کہ وہی بشہادت صاحب الشریعۃ علیہ الصلوٰۃ و التحیۃ بہترین قرون ہیں۔ الحاصل حضرت شیخ کا عقیدہ وہی تھا جو اہل قرون ثلاثہ کا تھا اور یہی وہ بڑی کرامت ہے جس سے بالا کوئی کرامت نہیں ہے۔ علامہ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ ناصر الدین ابن منیر کا قول ہے استقامت (یعنی عقائد حقہ پر ثبات) ہی ایک ایسا کمال ہے جس کا کرامت ہونا

یقینی اور لاریب ہے، بخلاف دیگر خوارق عادات کے کہ وہ کبھی رحمت ہوتے ہیں (جب کہ اہل اصلاح کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ اور مخلوق کو اللہ کی طرف لانے کا وسیلہ بنیں)۔ اور کبھی فتنہ ہوتے ہیں (جب کہ بددین کے ہاتھوں بصورت استدراج ظاہر ہوں۔ اور مخلوق کو بد دین بنانے کا ذریعہ بنیں)، اس فیصلہ کے سننے کے بعد مطلق ضرورت نہ تھی (کہ ہم خوارق عادات کا تذکرہ کریں۔ مگر چونکہ عوام کے نزدیک ان ہی کا نام کرامات ہے اس لئے) ہم کہتے ہیں کہ حضرت ممدوح کے کشف و کرامات بھی ہم نے بے شمار دیکھے ہیں جن کا احاطہ ناممکن ہے، چنانچہ چند کا ذکر کرتے ہیں حضرت ممدوح سے تعارف کا شروع زمانہ تھا کہ میرے بچہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں کو بڑا صدمہ ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کا ایک بچہ اور مر چکا تھا۔ میں اس کو تسلی دینے لگا کہ میں نے حضرت احمد ابن عبداللہ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جب میں بچوں کو دیکھتا ہوں، اور پھر جو کچھ ان کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والا ہے۔ اس پر نظر کرتا ہوں تو مجھے بڑا ترس آتا ہے (کہ ان لاڈلوں کو ہماری طرح بہت کچھ پاپڑ بیلنے ہیں) اس لئے جو بچپن ہی میں دنیا سے اُٹھ گیا وہ سب آفتوں سے بچا رہا۔ اور تمہارا بچہ بھی انتقال کر گیا۔ (لہٰذا خوش ہو کہ ہر قسم کے افکار معاش و معاد سے محفوظ رہا) صبح کو جب حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا رات تم اپنی بیوی سے یہ باتیں کہہ رہے تھے، اور میری ساری تقریر نقل فرما دی۔ حضرت ممدوح سینہ کی کسی تکلیف کے سبب لونگ کھایا کرتے تھے اور جب آپ سانس لیا کرتے تو اس کی خوشبو مہکتی تھی، جسے میں دن بھر سونگھا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ رات کے وقت اپنے گھر میں بھی باوجودیکہ دروازے بند ہوتے تھے۔ بعینہٖ یہی خوشبو مجھے سنگھائی دیتی تھی، حالانکہ حضرت کا مکان محلہ راس الجنان میں تھا اور میرا گھر محلہ بکر نقر میں۔ اور آپ اپنے مکان میں ہوتے تھے اور میں اپنے گھر میں۔ مگر وہ خوشبو گھر کے اندر بار بار مہکتی تھی۔ میں نے اس پر غور کیا اور بیوی کو بھی آگاہ کیا کہ اُسے بھی حضرت کے ساتھ محبت تھی اور حضرت بھی اس کے ساتھ بہت محبت فرماتے تھے۔ ہم دونوں کو یہ خوشبو سونگھتے ہوئے جب ایک مدت گذر گئی تو میں نے ایک دن حضرت سے ذکر کیا کہ آپکے دہن مُبارک کی خوشبو رات کے وقت ہمیں اپنے گھر آیا کرتی ہے اور ہم اسے ہمیشہ سونگھا کرتے ہیں۔ کیا آپ ہمارے پاس ہوتے ہیں؟ فرمایا جی ہاں! میں نے ہنسی کے طور پر کہا کہ اے میرے آقا اب کی دفعہ اس خوشبو کی ٹوہ لگا کر حضرت کو ہاتھوں سے بھینچ لوں گا۔ آپ نے بطور خوش طبعی جواب دیا کہ ہم گھر کے دوسرے کونہ میں جا کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد اُس خوشبو کے قصہ کا دریا؟

ذکر آیا تو فرمایا یہ تو سونگھ ہے۔ اور شوق کہاں ہے (مطلب یہ ہے کہ محبت کا درجہ شوق تک پہونچے جب روحانی یک جہتی نصیب ہو[ف۱])۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تم سے نہ رات کو جُدا ہوتا ہوں نہ دن کو۔ ایک بار فرمایا اگر گھنٹہ بھر میں پانچ سو مرتبہ تمہارا خیال نہ کروں تو بحضور خداوندی مجھ سے مطالبہ کیجو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے اپنی ذات کو اور آپ کی ذات کو ایک کپڑے میں دیکھا ہے۔ فرمایا خواب سچی ہے کہ تم مجھ سے نہ دن کو جُدا ہوگے نہ رات کو۔ ایک مرتبہ فرمایا اچھا آج رات کو ہم تمہارے پاس آئیں گے۔ ذرا دھیان رکھیو۔ چنانچہ اخیر شب میں جب کہ میں کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا آپ (بطریق کرامت) تشریف لائے۔ جب میرے قریب آئے تو میں نے آپ کا ہاتھ خوب مضبوط پکڑ لیا اور آگے بڑھا کہ بوسہ دوں۔ جب آپ کے ہاتھ اور سر کو بوسہ دیا تو آپ غائب ہو گئے۔ ایک بار سلطان نے میرے نام فرمان جاری کیا اور اپنے دو خاص آدمیوں کے ہاتھ بھیجا کہ مکناسہ پہونچ کر جامع مسجد ریاض میں امامت انجام دو۔ بس خدا ہی جانتا ہے کہ (وطن اور حضرت کی صحبت چھوٹنے کے خیال سے) مجھے کتنی پریشانی ہوئی حضرت نے سُنا تو فرمایا گھبراؤ مت تم مکناسہ جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے باقی کوئی فکر کی بات نہیں سلطان جو تم سے چاہتے ہیں وہ ہوگا نہیں۔ چنانچہ میں نے ہر دو قاصد کے ساتھ مکناسہ پہونچا۔ مگر حق تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل فرمایا اور وہی ہوا جو حضرت نے فرمایا تھا کہ میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ میرے خسر مولانا محمد بن عمر نے جو سُنا

ف۱ جس طرح مادیات میں برق کو حق تعالیٰ نے یہ طاقت بخشی ہے کہ ہمارے پاؤں جس مسافت کو سال بھر میں طے کریں وہ اس کو بذریعہ تار ایک سکنڈ میں عبور کر جاتی ہے۔ اور بدن کی کھال و ہڈی وغیرہ جو کہ نور بصر کے لئے حاجب ہے وہ اس کے لئے حاجب اور مانع نفوذ نہیں (جیسے کہ ایکسرے کہ وہ اندرون شکم کے فوٹو لینے کا آلہ ہے) اسی طرح روحانیات میں نور بصیرت کو حق تعالیٰ نے اس سے بھی صد گونہ زیادہ طاقت بخشی ہے کہ زمان و مکان کا بُعد اور دیوار و پہاڑ وغیرہ اجسام کثیفہ کا جرم اس کے راستہ میں مزاحم و حائل نہیں بنتا اور وہ پلک جھپکنے میں مشرق و مغرب تمامی آفاق بلکہ فوق السمٰوٰت وتحت الارضین کا گشت کر لیتی اور تمام اجرام حسی کہ گوشت و پوست تک میں بسرعت کاملہ نفوذ کر جاتی ہے۔ اسی کا نام کشف ہے۔ اور صاحبان خدمت اقطاب و اغواث سے چونکہ انتظام عوام کا کام لیا جاتا ہے اس لئے ان کو یہ قوت خزانہ الٰہیہ سے بیش از بیش عطا کی جاتی ہے۔ لہٰذا نہ اپنے محروم و ناواقف ہونے کے سبب ان کرامتوں کا انکار کرو اور نہ ان عہدہ داران تکوین کو سلطان با اختیار اور ہم پلہ علیم و قدیر سمجھو۔ واللہ اعلم۔

تو مجھے خط لکھا کہ تم مکناسہ گئے مگر نہ سلطان سے ملے اور نہ باضابطہ استعفا دیا۔ دیکھئے تم پر کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ فوراً مکناسہ واپس جاؤ اور سلطان سے ملو اور مسجد یاصن کی امامت پر اپنی خوشنودی کا اظہار کرو۔ اس کے سوا کسی رائے پر عمل نہ کرنا۔ میں یہ خط لے کر حضرت کے پاس آیا۔ فرمایا میاں اپنے گھر بیٹھو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسا حضرت نے فرمایا تھا۔ اور یہ ایک عجیب حیرت خیز کرامت ہے جس کا عجوبہ ہونا واقعہ کے مفصل ذکر کرنے پر موقوف ہے حتیٰ کہ مکناسہ کے میرے بعض احباب کہا کرتے تھے کہ اس سے زیادہ عجیب بات ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی کہ خود سلطان تمہارے نام فرمان جاری کریں۔ اور اس میں تاکیدی حکم ہو۔ اور دو خاص مصاحب اس کو لے کر جاویں اور تم کو لے کر مکناسہ پہنچیں۔ اور تم سلطان سے ملاقات تک نہ کرو۔ اور اپنے وطن فاس واپس آجاؤ۔ اور کچھ پروا نہ کرو۔ (کہ اس کا انجام کیا ہوگا) واللہ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ مگر یہ سب حضرت شیخ کی برکت تھی۔ ایک عورت کو حمل قرار پایا۔ آپ نے فرمایا لڑکا ہوگا۔ جب نواں مہینہ شروع ہوا اور عورت کی عادت تھی کہ نویں مہینہ کے شروع ہی میں ولادت ہو جاتی تھی تو اس کے درد اٹھا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ دروازہ ہے۔ مگر حضرت نے فرمایا یہ تو مرض کا درد ہے ولادت تو ابھی دور ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک دفعہ مولانا محمد امیارہ سے ملاقات ہوئی اور مولانا نے حضرت شیخ کے لئے چار موزونہ دیئے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا محمد امیارہ بڑی چیز ہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو برے موزونات نکلے۔ لہٰذا ان کو لوٹا کر دوبارہ اچھے موزونات نکالے۔ اور وہ ہمیں دیئے۔ چنانچہ میں نے مولانا محمد امیارہ سے مل کر حضرت کا مقولہ نقل کیا تو فرمایا بالکل ہے۔ پہلے کھوٹے موزونات نکلے تھے میں نے ان کو جیب میں ڈال لیا اور پھر دوبارہ کھرے موزونے نکالے اور پیش کئے تھے۔

حضرت کے صاحبزادہ سید ادریس کو ایک بار خطرناک مرض لاحق ہوا۔ اور ان کی والدہ بہت پریشان ہوئیں۔ ایک دن بعد مغرب میں عیادت کو آیا اور دیکھا کہ غلبہ مرض کے سبب بولا بھی نہیں جاتا۔ اس حالت سے مجھے بھی پریشانی ہوئی۔ مگر جب ہم باہر آئے تو حضرت نے فرمایا یہ مرض الموت نہیں ہے اور انشاء اللہ صحت ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک بار صاحبزادی صاحبہ سیدہ فاطمہ کو مرض پیش آیا اور اس نے بڑا طول پکڑا۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ مرنے کی نہیں۔ انشاء اللہ تندرست ہو جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں حضرت کے ساتھ مولانا محمد امیارہ کے بچّے کی عیادت کو گیا کہ وہ ایک سخت مرض میں مبتلا تھا۔ مگر حضرت نے فرمایا اس مرض میں تو مرنے کا نہیں سا انشاء اللہ عنقریب تندرست ہو جائے گا۔ چنانچہ

ایسا ہی ہوا۔ اسی طرح ایک دفعہ میرے دوست حاج محمد علی سجلماسی کا بچہ اتنا بیمار ہوا کہ باپ نے آس توڑ دی میں نے اس کا ذکر جب کہ اندلس کی جامع مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر نکلے اور باب الفتوح کی طرف جا رہے تھے حضرت سے کیا۔ تو فرمایا کہ کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ بچہ کی ماں اس کا مرنا گوارا نہیں کرتی کہ اگر وہ مر جائے تو ماں کو اتنا صدمہ ہو کہ جھیل نہ سکے لہٰذا (ماں کی خاطر بچہ پر حق تعالیٰ نے کرم فرمایا) اور وہ ابھی مرے گا نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ چاروں بیمار آج تک کہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ ہے بحمد اللہ بقید حیات ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے قطب الوقت شیخ عبدالسلام بن مشش کے مزار کی زیارت کے لئے سفر کیا اور نماز ظہر کے قریب وہاں پہنچے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ یہاں ضرور قیام کریں گے۔ مگر حضرت شیخ نے رفقاء سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو اور سواریوں سے نہ اترنا' ہم زیارت کر کے ابھی واپس آتے ہیں چنانچہ صرف میں آپ کے ساتھ پہاڑ پر (جہاں مزار تھا) چڑھا۔ اور جب زیارت سے فارغ ہو لئے تو حضرت نے مجھ سے پوچھا۔ کہو کیا دعائیں مانگیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس زیارت میں تو میری ساری دعائیں آپ کے لئے مخصوص رہیں کہ جب سے بیٹھا تھا حضرت ہی کے لئے مخصوص رہیں کہ جب سے بیٹھا تھا حضرت ہی کے لئے خیر و خوبی کی دعائیں مانگتا رہا۔ اور دوسروں کے لئے تو کیا خود اپنے لئے بھی کوئی دعا نہیں مانگی۔ حضرت نے فرمایا اور یہی حال میرا رہا ہے کہ ساری زیارت تمہارے لئے تھی۔ اور کسی دوسرے کے لئے میں نے دعا ہی نہیں مانگی۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی اس کے بعد ہم پہاڑ سے اترے اور آپ نے ہم کو شہر تطاون کے سفر کا حکم سنایا۔ میں نے عرض بھی کیا کہ شہر بہت دور ہے اور آج وہاں تک پہونچ بھی نہیں سکتے (کہ دن بہت تھوڑا باقی ہے) باقی جس طرح حکم ہو تعمیل کے لئے حاضر ہیں۔ مگر اس پر بھی حضرت نے تاکید سے پھر وہی فرمایا۔ چونکہ ہمیں یقین تھا کہ بات وہی ٹھیک ہے جو حضرت کی زبان سے نکلے۔ لہٰذا ہم سواریوں پر سوار ہو کر روانہ ہو لئے۔ اور رات بھر چلتے رہے حتیٰ کہ صبح صادق ہونے پر شہر تطاون میں داخل ہو لئے۔ بس شہر میں گھسنا تھا کہ آسمان نے اپنی بکھالیں کھول دیں۔ اور اس زور کی بارش ہوئی کہ الٰہی پناہ۔ پورے دو دن یہی زور رہا۔ اسی اثنا میں حضرت مجھے لے کر اس گھر کی چھت پر چڑھے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور فرمایا احمد دیکھ رہے ہو کیسی موسلا دھار بارش برس رہی ہے۔ میں نے کہا جی حضرت۔ فرمایا اسی کی وجہ سے میں نے تم کو رات بھر چلایا کہ جس وقت میں حضرت شیخ کے

مزار پر پہنچا ہوں اسی وقت یہ بارش مجھے نظر آگئی تھی۔ بھلا بتلاؤ اگر یہ شدید بارش ہمیں
اُن پہاڑی دَرّوں میں آتی جہاں ہمارے پاس نہ اپنے کھانے کی کوئی چیز تھی نہ سواریوں
کو کھلانے کی۔ اور پھر متواتر دو دن یہ برستی رہتی تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ میں نے عرض کیا
کہ حضرت اگر مرتے نہیں تو مصیبت تو اتنی اٹھاتے جس کی حد نہیں۔ اس کے بعد میں نے آپ
کا ہاتھ چوما اور عرض کیا اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ پھر دو دن کے بعد جب ہم تطاون سے
چلے تو اس وقت بھی خوب بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے عرض بھی کیا کہ حضرت بارش ہی سے
تو ہم بھاگے تھے اور پھر اسی میں گھسنے لگے۔ مگر آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ غرض ہم شہر سے باہر
آئے اور چاہا کہ جانوروں کے چارہ کے لئے جو خرید لیں۔ مگر حضرت نے منع فرما دیا۔ آخر
اسی شدید بارش میں ہم چل پڑے۔ میل دو میل سے زیادہ نہ چلے تھے کہ گھٹا پھٹ گئی ہوا ٹھیر
گئی۔ سورج نکل آیا۔ اور منظر بڑا سوہنا ہو گیا۔ اس پر ہم کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر جب عصر کا وقت
نصف رہ گیا تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت سواریوں کا چارہ کہاں ملے گا۔ آپ نے رفقاء سے پوچھا
کہ آبادی کتنی دور ہے؟ معلوم ہوا اتنی دور ہے کہ آدھی رات سے پہلے نہیں پہونچ سکتے۔ آپ
خاموش ہو گئے اور چلتے رہے حتیٰ کہ مغرب کا وقت قریب آگیا تو فرمایا داہنی طرف کو مڑ جاؤ۔
چنانچہ ہم نے راستہ چھوڑ کر داہنی جانب سواریوں کا مُنہ پھیر دیا۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ غلّہ
کے کھلیان ہمیں نظر آئے جن میں ابھی دائیں نہ چلی تھی، اور اس کے قریب ہی پانی کا چشمہ
جاری تھا۔ فرمایا یہاں اُتر جاؤ کہ حق تعالیٰ نے جانوروں کی خوراک بھی عطا فرما دی ہے کہ
کھلیان میں سے جتنی ضرورت ہو لے لو۔ چنانچہ ہم نے کھلیان میں سے لے کر جانوروں کے
سامنے رکھ دیا کہ انہوں نے خوب کھایا۔ اور الحمد للہ ہم نے بڑے آرام سے رات گزاری۔ عشاء
کے قریب کھلیان کا مالک آیا اور ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جانوروں نے جتنی قیمت کا غلّہ
کھایا تھا اس سے زائد حضرت نے اس کو عطا فرمایا۔ اس پر وہ بہت ہی زیادہ مسرور ہوا۔
اور رات بھر ہمارے پاس رہا۔ ہمارے ہی ساتھ کھانا کھایا اور ایسا بن گیا گویا ہمارا رفیق
سفر ہے۔ ایسا ہی قصّہ دوسری دفعہ پیش آیا کہ ہم شیخ عبدالسلام کے مزار پر جا رہے تھے۔
مگر جب نبی زکاتی پر پہونچے تو عصر کا وقت نکل چکا تھا۔ جو لوگ اس گھاٹی کو ہم سے پہلے
عبور کر چکے تھے وہ پڑاؤ بھی ڈال چکے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو قافلہ ہم سے پہلے
چلا تھا وہ سواریوں سے اُتر چکا ہے (کہ اب آگے جانے کا وقت نہیں)۔ فرمایا چلے چلو ہم نے

عرض کیا حضرت چلیں کیسے؟ نہ ہمیں راستہ معلوم اور نہ کوئی راستہ بتانے والا ہمارے ساتھ، فرمایا چلے چلو۔ چنانچہ ہم یہاں سے بڑھے اور رہبر کے بغیر ہی آگے چل دیئے ہم قدم اٹھاتے رہے اور حق تعالیٰ ہمیں راستہ کا الہام فرماتا رہا حتیٰ کہ پانی کے ایک چشمہ پر پہونچے جس کے قریب ہی کھلیان تھا جس میں دائیں چل چکی تھی (یعنی بیل چلا کر بھوسہ الگ اور غلّہ الگ ہو چکا تھا)۔ کھلیان کا مالک ہمیں ملا اور اس نے یہاں اترنے کی ہم سے خواہش کی۔ چنانچہ ہم نے بڑے آرام سے رات گذاری کہ ہمارے جانور بھی رات بھر بھوسہ کھاتے رہے اور جو قافلہ ہم سے پہلے (گھاٹی پر) اتر چکا تھا ان کے جانوروں کو رات بھر بھوسہ نہ ملا۔ اس سفر زیارت میں بڑے بڑے دقائق وحقائق حضرت کی زبان مبارک سے سننے میں آئے جن میں اکثر کو میں نے اس کتاب میں درج بھی کر دیا ہے۔ حضرت ممدوح جب اماکن ومواضع کا تذکرہ فرمایا کرتے تو انجان آدمی یوں سمجھتا تھا کہ حضرت ممدوح نے ان مقامات کا ضرور سفر کیا اور چپہ چپہ کو دیکھا ہے۔ حالانکہ وہ محض کشف ہوتا تھا۔ اکثر آپ دور دور مقامات کا سفر رہبر کو ساتھ لئے بغیر کیا کرتے اور ایسے راستوں سے نکل جاتے تھے جن کو اکثر آدمی جانتے بھی نہ تھے۔ ایک دن آپ نے مولانا علی بن عبداللہ صباغی سے جن کا مکان شہر فاس سے چار منزل پر موضوع صباغات میں تھا فرمایا کہ میں ایک دن مجمع کے ساتھ چلا کہ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے حتیٰ کہ فلاں مقام پر پہونچے۔ حضرت نے اس جگہ کا نام بھی بتایا اور اس کی صورت وکیفیت سب بتائی۔ پھر میں رفقاء کو وہیں چھوڑ کر تمہارے وطن میں داخل ہوا اور سارا حلیہ اس کا اور مولانا کے گھر کا ایسا بیان کیا گویا نظر کے سامنے ہے (اور دیکھ دیکھ کر بیان کر رہے ہیں) حالانکہ محض کشف تھا۔ اور گھوڑوں پر سوار آنا صرف کشف کو چھپانے کی غرض سے ذکر کیا تھا۔ مولانا علی نے ہم سے خود کہا کہ حضرت نے آنکھوں دیکھا ایسا ٹھیک حال بیان فرمایا ہے کہ نہ ذرہ برابر کمی تھی نہ بیشی۔ اس کے بعد حضرت نے ان سے فرمایا کہ فلاں جگہ جہاں تم اپنے گھوڑے باندھا کرتے ہو ایک بڑے ولی کی قبر ہے، آئندہ وہاں گھوڑے نہ باندھنا۔ چنانچہ انہوں نے واپس جا کر چھان بین کی تو حضرت کا فرمودہ صحیح پایا اور اس جگہ مزار بنا دیا گیا۔ میں نے حضرت کو یہ بھی فرماتے سنا کہ وہ ولی ہمارے آباء میں سے ہیں یعنی غوث تھے پھر ایک مرتبہ اس کی تصریح بھی فرما دی۔ ایک روز میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص تازا سے آیا جو کہ مشہور بستی ہے۔ آپ نے پوچھا کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا تازا کا رہنے والا ہوں۔ حضرت اس بستی کا حلیہ اور اس کے مقامات وعلامات بیان فرمانے لگے۔ اور وہ

شخص آپ کی تصدیق کرتا اور یوں سمجھتا رہا کہ حضرت اس جگہ جا چکے ہیں پھر جب وہ چلا گیا تو میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کشف کو لوگ پسند کرتے حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے خود ولی کے لئے بھی اور اس کے لئے بھی جو ولی کا طالب ہوتا ہے۔ ولی کے لئے تو یہ ضرر ہے کہ اس میں مشاہدۂ حق سے مشاہدۂ خلق کی طرف اُترنا ہے۔ اور یہ بالا مقام سے پستی کی طرف انحطاط ہے۔ اور طالب کا ضرر یہ ہے کہ کشف و کرامت کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت اوپری ہوتی ہے اور جب ولی نے اس کی موافقت کی (کہ کشف یا کرامت کا ظہور ہو گیا) تو اس کو گویا اس کی حالت ناقصہ اور رامذسے پن پر برقرار رکھا۔ (ان دونوں باتوں کی تشریح انشاء اللہ آئندہ کتاب میں آئے گی)۔ ایک بار یہ قصہ پیش آیا کہ سادات میں سے ایک شخص مجھ سے ایک دقیق کتاب پڑھا کرتے تھے اور میں جو اس کی شرح کیا کرتا تو اُن کو بہت پسند آتی اور وہ کہا کرتے کہ جس وضاحت سے آپ بیان کرتے ہیں علماء میں کسی کو بھی ہم نے ایسا کھول کر سمجھاتے نہیں پایا۔ غرض اثناء درس میں ایک دقیق مسئلہ آگیا جس میں مصنف کتاب نے اسرار الٰہیہ میں سے ایک سر بیان کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہہ دیا مجھے معلوم نہیں کیونکہ سر الٰہی کا افشا کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ مگر ان کا شوق بڑھتا رہا۔ تب میں نے کہا واللہ میں اس کی شرح ہرگز نہ کروں گا جب تک عہد و پیمان نہ دو کہ نہ کسی اپنے سے ظاہر کرو گے نہ کسی غیر سے۔ چنانچہ انہوں نے عہد و میثاق دیا اور میں نے اس کا مطلب بیان کیا اور جتنے اشکالات اس پر وارد ہوتے تھے سب کا ایسا جواب دیا کہ مسئلہ آفتاب کی طرح کھل گیا۔ اس پر وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ دیکھو اگر ہمارے حضرت سے کبھی ملنے کا اتفاق ہو اور گفتگو کا سلسلہ چلتے چلتے اس مسئلہ تک پہونچ جائے اور حضرت تم سے اس کی شرح بیان کرنا چاہیں تو اپنی ناواقفیت ظاہر کرنا اور ایسے بن جانا جیسے کبھی سُنا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس کا بھی عہد کر لیا۔ اس کے بعد میں اسی روز حضرت ممدوح سے ملا تو سب سے پہلی بات آپ نے یہی فرمائی کہ فلاں سید سے تم نے یہ گفتگو کی اور یہ مسئلہ بھی ذکر فرمادیا۔ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ٹھیک ہے مگر میری نیت خیر کی تھی۔ (کہ حضرت کی زبان سے اور کچھ زائد معلوم ہو جائے گا نہ یہ کہ حضرت کا امتحان لینا تھا) اس کے بعد میں حضرت کی خاطرِ مبارک کو ٹٹولتا رہا کہ (خدانخواستہ گرانی تو نہیں آئی) مگر الحمدللہ ایسا صاف پایا جیسے تھن کا نکلا ہوا دودھ۔ غرض آپ کے کشوفات اتنے بے شمار ہیں کہ ان کے جمع کرنے کو ایک مستقل تالیف

کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ مذکور ہے وہ سب حضرت ممدوح کی کرامات ہی ہیں۔ آپ کی ایک بڑی کرامت یہ بھی کہ آپ کا کلام دلوں میں اثر کرتا تھا۔ ایک دن ایک عالم آپکے پاس آئے اور کہنے لگے کہ حضرت دُعا فرمایئے حق تعالیٰ میرے دل میں وسوسوں کا آنا بند فرمادے۔ فرمایا میاں وسوسے ہمیشہ راستہ کی ناواقفیت کے سبب آیا کرتے ہیں کہ ایک شخص کسی شہر کے جانے کا قصد کرے اور اس کے راستہ سے ناواقف ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے خیالات میں انتشار ہوگا۔ طبیعت کبھی یہ کہے گی کہ راستہ اِدھر کو ہے لہٰذا وہ اس طرف چل پڑے گا، اور کبھی کہے گی کہ نہیں بلکہ راستہ اُدھر کو ہے لہٰذا وہ اُدھر کو چلنے لگے گا۔ غرض متحیّر رہے گا کہ کدھر کو جائے۔ اور جو شخص راستہ سے واقف ہوگا، اُس کا قلب اس سے محفوظ ہوگا اور وہ اطمینان کے ساتھ چلتا رہے گا۔ پس دُنیا و آخرت کا راستہ چونکہ ذاتِ حق ہے اس لئے جس نے اللہ کو پہچان لیا (کہ واقعی اس کی کیا شان ہے اور کیا استحقاق) اس نے دونوں جہان کی دولت پائی اور اس کو پُرلطف زندگی عطا ہوئی۔ اور جو اُس سے ناواقف رہا اس کی حالت برعکس ہوئی۔ آپ کی اس تقریر سے حق تعالیٰ نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ جب طبیعت کسی ضرورت کے پورا کرانے میں غیر اللہ کی طرف جاتی تو ایک اندرونی کشش اس کو پھیر کر اللہ کی طرف لے آتی تھی (کہ قاضی الحاجات کا آستانہ چھوڑ کر محتاجوں کا دامن کیوں پکڑتا ہے)۔ اللہ سے دُعا ہے کہ اس معرفت کو اتمام پر پہونچا دے۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے سُنا کہ مومن جب سوتا ہے تو اللہ ہی کے دھیان میں سوتا ہے اور جب جاگتا ہے تو اللہ ہی کے دھیان میں جاگتا ہے۔ یہ کلام سُن کر اس کا مفہوم میرے قلب میں اُتر گیا اور الحمدللہ کہ سونے کی حالت میں بھی اللہ میرے دل میں ہوتا ہے (ہم اسکا مطلب بھی سمجھنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ اللہ کی محبت و عظمت سے ہمارا دل خالی ہے۔ ہاں دنیوی ترقیات سے اگر سبق لیں کہ بعینہٖ یہی حال ہمارا جاہ و مال کے ساتھ ہے کہ اُسی کے خیال میں سوتے ہیں اور اُسی کے خیال میں آنکھ کھلتی ہے جس کی وجہ سے بحالت خواب بھی دنیا ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے تو شاید کچھ سمجھیں اور آنکھیں کھلیں)۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بندہ کا خیال جب غیر اللہ کی طرف جاتا ہے تو اللہ جل جلالہ سے بے تعلق بن جاتا ہے۔ پھر کوئی تو ایک پہر میں (متنبہ ہو جاتا اور) اللہ کی طرف لوٹ آتا ہے، اور کوئی دو پہر بعد اور کوئی اس سے کم مدت میں اور کوئی اس سے زیادہ مدت میں، لہٰذا ہر بندہ کو غور کر لینا چاہیئے کہ اُس کے قلب کا اللہ جل جلالہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ آپ کا یہ کلام الحمدللہ میرے قلب کی لگام بن گیا کہ جب بھی اس نے

غفلت کے سمندروں کی طرف قدم بڑھایا تو اس کلام نے (آزادی پسند گھوڑے کی لگام بن کر) اس کو کھینچ لیا (کہ مولائے کریم سے قطع تعلق کر کے کہاں ڈوبنے جاتا ہے) ایک بار آپ نے فرمایا کہ بندہ کو اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت نہ ہو جائے" اور سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ اپنے شیخ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ تمامی بشر اس کی نگاہ میں فنا نہ ہو جاویں کہ نہ کسی پر نظر جائے نہ خیال۔ لہٰذا سب پر نماز جنازہ پڑھ کر ان کی طرف سے توقع وانتظار کو اپنے دل سے نکال دے۔ آپ کے اس کلام سے حق تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل فرمایا کہ ہر قسم کی خیر و خوبی نصیب ہونے کا یہی وسیلہ بنا۔ اور اس کلام کی شرح اتنی طویل ہے کہ اس کے پیچھے پڑیں تو بڑی دور نکل جائیں اس لئے جتنا ذکر کر دیا اسی پر اکتفا کرتے ہیں ف چونکہ تمامی حسنات دین و دنیا بلکہ سچ پوچھو تو ایمان کی اصل بھی یہی معرفت ہے اس لئے اپنی فہم نارسا کے موافق بقدر ضرورت تشریح کرتا ہوں۔ حج کا مسافر جب شوق لقاء رب میں وطن کو الوداع کہتا اور بندرگاہ پر پہونچتا ہے تو سب سے پہلے جدہ جانے والے جہاز کی تلاش کرتا ہے کہ گودی میں جاپان و جرمن ہر ملک کو جانے والے جہاز کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جب پوری چھان بین سے پتہ چلا لیتا ہے کہ جدہ جانے والے جہازوں کا ٹکٹ گھر یہ ہے تو پھر اپنی مناسبت طبع موسم و وقت اور جہاز کی رفتار و وزن وغیرہ کی کرید و تحقیق کے بعد اس پر آ بیٹھتا ہے۔ گویا نئی دنیا میں آتا ہے اور بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا پڑھتا ہوا اپنی جان و مال کو کپتان کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہاں اس کا مزاج بھی بدل جاتا ہے کہ بری سطح پر جن چیزوں کی رغبت تھی ان سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ اور احکام بدل جاتے ہیں کہ پہلے ہر طرح کی کرید اور ہر دلال سے بحث مباحثہ تھا کہ دھوکا نہ کھا جائے۔ مگر اب اس کو یہ سوال کرنے کا بھی حق نہیں کہ جدہ کب پہونچاؤ گے' اس لئے کہ یہ کام خدا کا ہے نہ کہ ناخدا کا۔ یہ تمثیل ہے شیخ طریقت کی۔ آخر حق تعالیٰ کے محض فضل سے طوفان تلاطم اور قدم قدم پر ڈوبنے کے خطرات سے بچا ہوا جب حرم الٰہی میں قدم رکھتا ہے تو اس کو ہر امن و امان کا شاہی پروانہ ملتا اور وہ انشراح نصیب ہوتا ہے جو تمام سفر کی کلفتوں کو محو کر دیتا ہے۔ بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے تو اس کے سیاہ پردے اس کی آنکھوں کی پتلی بن کر اس کو متوالا بنا لیتے ہیں کہ کبھی چومتا اور کبھی سجدہ میں گرتا اور کبھی دامن پکڑ کر چمٹتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اس کی ایک ایک

نماز ایک ایک لاکھ بنا دی جاتی اور ایک ایک نگاہ محبت پر دس دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ وہ
خوب سمجھتا ہے کہ یہی بقعہ ناف ارض اور وہ پہلی ہستی ہے کہ ساری زمین بایں طول وعرض
اپنے وجود میں اسی کی مرہون احسان ہے۔ ہر چند کہ پتھروں کی چنائی کا ایک سادہ کوٹھا ہے،
مگر دُنیا بھر کے مرصّع محلوں سے زیادہ پیارا اور بزرگ ترین ہے کہ دوسری طرف رُخ کرکے
کوئی نمازوں میں فنا بھی ہو جائے تو مردود ہے' ایک سجدہ بھی مقبول نہیں۔ یہ تمثیل ہے۔
وجود سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اب اس کو پُل صراط جیسے باریک راستہ پر چلنا ہے
کہ جہاں یہ سمجھنا ہے یہی مقام جلالت گاہ حق ہے کہ جو کچھ ملے گا اسی آستانہ سے ملے گا'
وہیں یہ بھی یقین کئے ہوئے ہے کہ خانۂ خدا ہے خود خدا نہیں' اور بیت اللہ ہے۔ ذات اللہ
نہیں۔ حتیٰ کہ اس کو اللہ سمجھ کر ایک بھی سجدہ کروں تو وصال بدل جائے گا ہجر و فراق سے۔ اس
لئے یوم ولادت جیسی معصومیت و مغفرت لینے کے لئے ابھی ذرا سا سفر اور کرنا ہے اور لباس
ہوائے نفس اُتار کر مُردہ کی کفنی پہنے ہوئے دیوانہ وار چیختے چلاتے اُس ہو کے میدان میں
جانا ہے جس کا نام عرفات ہے' جہاں نہ کوئی بستی ہے نہ کسی درخت کا سایہ' اور نہ کوئی مکان۔
وحدانیت محضہ و بے نیازی خالصہ ہے ہاں اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی مقصود سفر پورا
اور شاہی دربار سے حاجی کا خطاب عطا ہو گا۔ مگر اس سفر کا مزّور و مطّوف اور محافظ اہر دو ہی
بیت اللہ ہو گا۔ کہ حج مبرور کی ابتدا و انتہا اسی کا طواف قدوم و طواف افاضہ اور طواف
الوداع ہے۔ یہ ہے تمثیل معرفت آلہیہ کی کہ وصول الی اللہ چاہتا ہے تو اس ترتیب سے سفر کرے
۱۲ مترجم) میں نے اپنے بعض برادران طریقت سے درخواست کی تھی کہ حضرت ممدوح
کی کچھ کرامات جو انہوں نے دیکھی ہوں مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ چنانچہ چند تحریرات آئیں
اور ان کو میں نے حضرت شیخ پر پیش کیا۔ جب حضرت نے ان کی تصدیق فرما دی تب
درج کتاب کرتا ہوں۔ مولانا محمد احمد زیراری کا بیان ہے کہ میرا قلب تجارت و زراعت
کے دنیوی دھندوں میں بہت پھنسا ہوا تھا۔ اسی جدوجہد میں لگا رہتا کہ نہ دن کو چین
تھا نہ رات کو آرام۔ دنیا ہی دنیا مقصود تھی اور آخرت کا منظر ایک خواب و خیال بن گیا تھا
حالانکہ مجھے حق تعالیٰ نے زمرۂ علماء میں بنایا اور علم نصیب فرمایا تھا۔ میری پختہ نیت تھی کہ
مجھے محکمہ شہادت کی افسری ملے یا کسی شہر کا عہدۂ قضا۔ مگر حق تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا
اور حضرت ممدوح کی خدمت میں پہونچا دیا جنہوں نے میرے قلب کی گندگیاں دھو دیں۔

جب میں بیعت ہوا اور حضرت نے میرے مرض لاعلاج کو دیکھا تو سب سے پہلے حکم دیا کہ کھیتی کے جتنے بیل میرے پاس ہیں سب کو بیچ دوں اور فلاں کام کروں۔ اور وہ سبب معاش کا ایک مشغلہ تھا کہ اسباب دنیویہ کے منافی بھی نہ ہو اور درحقیقت مقصود یہ تھا کہ کھیتی کی محبت میرے قلب سے مٹائیں (کیونکہ کسب دنیا جائز ہے نہ کہ حب دُنیا۔ چہ جائیکہ عشق دنیا)۔ حضرت کی حسنِ تدبیر پہ صد آفرین کہ جس گندی حالت سے مجھے نکالنا چاہتے اس طرح نکال لیا کرتے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہوتی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب پہلے سے زیادہ راحت و لذت میں ہوں اور حالتِ سابقہ کی گندگی و ظلمت آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اور یہی میرے اور تمامی برادران طریقت کے ساتھ حضرت کا طریق تربیت رہا کہ جب کسی کو بُری حالت پر دیکھتے تو صراحتہً کبھی نہ فرماتے کہ اس کو چھوڑ یا یہ کہ نہ چھوڑنے پر لعن طعن فرمادیں' یا تعلق قطع کر دیں' کہ ایسی صورتوں کا نتیجہ عموماً اچھا نہیں نکلتا۔ کیونکہ نفس اس کا انکار کرتا اور لبسا اوقات ضد اور مخالفت کا داعی بن جاتا ہے۔ لہذا شفقت و نرمی برتتے بلکہ اس کی حالت کی کسی درجہ میں تعریف فرمادیا کرتے تھے پھر اُس کو آہستہ آہستہ اوپر چڑھاتے کہ وہ خود ہی اپنی پہلی حالت قبیح سمجھنے لگتا اور اپنے سینہ میں ایک انشراح و تازگی محسوس کیا کرتا تھا۔ غرض بیلوں کی فروختگی کے بعد جلد ہی روز گذرے تھے کہ کھیتی کی محبت میرے دل سے نکل گئی بلکہ اس سے کراہت معلوم ہو لگی۔ اس کے بعد مجھے کتابیں بیچ دینے کا حکم فرمایا اور دوسرا کام بتایا کہ فلاں کام کروں جسے میرا دل پسند بھی کرتا تھا۔ اور نفس بھی اس سے خوش تھا۔ اس کے بعد لوگوں سے مال کی طمع اور حرص نے میرا دامن پکڑا کہ اہلِ ثروت کی طرف نظر جاتی اور انتظار رہتا تھا (کہ آ کر نذرانے اور ہدایا پیش کریں گے) پس حضرت ممدوح نے اس سے بھی اوپر چڑھایا۔ اور اب الحمدللہ لوگوں کے مال کی طمع تو درکنار کسی نفع یا ضرر کے متعلق مخلوق پر نظر ہی نہیں جاتی۔ (اصل کرامت تو یہ ہے کہ نیابت ہے مرشد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی) رہے کشف کے قصے سو چند وہ بھی سن لو۔ شروع تعلق میں ایک دن حضرت نے مجھ سے پوچھا تمہارے پاس گھی بھی ہے؟ میں نے کہا جی حضرت ہے۔ فرمایا کچھ ہمارے لئے لے آنا۔ میرے ایک پیر بھائی نے کہا ممکن ہے باقیماندہ گھی ارزانی کے موسم تک نہ چل سکے۔ میں نے کہا ہاں صحیح ہے۔ حضرت نے فرمایا اچھا فلاں وقت تک بھی چل سکے گا؟ میں نے کہا جی ہاں فرمایا جتنا اس سے زائد ہو وہ لے آنا۔ چنانچہ میں لے آیا اور جب وہ وقت آیا (جس پر گھی کو ختم ہونا تھا) تو ایک شخص لوجہ اللہ مجھے گھی دے گیا جہاں میرا

گمان بھی نہ گیا تھا۔ اور یہ گھی مجھے ارزانی کے موسم تک کو کافی ہوگیا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے غلّہ کی فروختگی کے متعلق آپ سے مشورہ کیا تو فرمایا فلاں مہینہ کی پانچ تاریخ تک سب بیچ دینا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پانچ اور چھ تاریخ کو خوب بارش ہوئی اور غلّہ بے حد ارزاں ہوگیا۔ (مگر میں پہلے ہی بیچ کر خوب نفع اٹھا چکا تھا)۔ میری دو بیویاں تھیں جن میں ایک کو حمل تھا۔ حضرت کی زیارت کو گیا تو اس کا تذکرہ آگیا۔ فرمایا لڑکا پیدا ہوگا جس کا نام احمد ہوگا۔ میں نے آکر بیوی سے ذکر کیا اور ایسا ہی ہوا جیسا حضرت نے فرمایا تھا۔ اس کے بعد دوسری بیوی کو غیرت آئی کہ سوکن کے تو لڑکا ہوا اور میرے لڑکی ہے، جو کہ شیر خوار تھی۔ لہٰذا اس نے قبل از وقت بچی کا دودھ چھڑا دیا تاکہ حمل قرار پا سکے۔ میں نے اس کو اس پر ملامت بھی کی کیوں کہ بچی کے متعلق خطرہ تھا مگر اس نے کہا کہ میں حاملہ ہوں (اور حمل کا دودھ بچی کو نقصان دیتا اس لئے قبل از وقت چھڑایا ہے) اس پر اس نے قسم بھی کھائی۔ جب میں حضرت کی زیارت کو گیا تو اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا۔ فرمایا جھوٹی ہے حمل ومل کچھ نہیں۔ میں نے واپس آکر دیکھا تو واقعہ یہی تھا جو حضرت نے فرمایا۔ تین مہینہ گذرنے کے بعد جب میری حاضری دوبارہ ہوئی تو حضرت نے پوچھا کہو بیوی کو حمل ہے؟ میں نے کہا حضرت مجھے پتہ نہیں۔ فرمایا ہاں پندرہ دن کا ہے اور انشاء اللہ لڑکا ہوگا۔ اس کا نام میرے نام پر (عبدالعزیز) رکھنا کہ وہ انشاء اللہ میرے ہی مشابہ ہوگا۔ میں نے واپس ہوکر بیوی کو بشارت سنائی اور وہ بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ لڑکا پیدا ہوا اور درحقیقت وہ بدن اور صورت میں حضرت کے بہت مشابہ تھا۔ پھر پہلی بیوی دوبارہ حاملہ ہوئی تو فرمایا انشاء اللہ لڑکی ہوگی اور اس کا نام میری ماں کے نام پر (فاطمہ) رکھنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور آپ مجھ سے خوش طبعی فرما رہے تھے کہ ارشاد فرمایا کیوں جی کیا تم نے فلاں کام کیا تھا اور وہ ایک معصیت اور گناہ کا کام تھا۔ میں نے کہا نہیں۔ کیونکہ میرا گمان یہی تھا کہ میں نے نہیں کیا۔ اس پر ہنسے اور فرمایا ذرا سوچو۔ میں نے قسم کھائی کہ حضرت واللہ میں نے نہیں کیا۔ حضرت نے پھر وہی فرمایا اور میں نے پھر قسم کھائی۔ مگر چھٹی دفعہ جو میں نے غور کیا تو واقعی پندرہ برس ہوئے، بہت دور شہر میں جو کہ فاس سے سات منزل ہے مجھ سے وہ گناہ صادر ہوا تھا۔ تب شرم کے مارے مجھے پسینہ آگیا۔ حضرت نے میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا اب بھی قسم کھاؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت نہیں اور آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو اس کی اطلاع کیسے ہو گئی۔ فرمایا میاں اللہ سے کیا کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ اور اسی طرح جس کو بھی اللہ اپنے اسرار و مغیبات پر مطلع فرما دے۔ اس کے بعد آپ نے اور چند خطاؤں پر مجھے مطلع کیا جو مجھ سے آگے پیچھے سرزد ہوئی تھیں اور میں نے آپ کے ہاتھ پر سب سے توبہ کی۔ ایک دن میں آپ کے سامنے کے رُخ پر بیٹھا ہوا تھا اور آپ اپنے داہنے ہاتھ پر ٹیک لگائے خواب و بیداری کے درمیان لیٹے ہوئے تھے کہ میرے قلب پر ایک بُرا خطرہ گذرا۔ فوراً آپ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا کیا کہا تم نے؟ میں نے کہا حضرت میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ فرمایا اپنے دل میں تم نے کیا کہا؟ مجھے بڑی شرم آئی اور میں نے توبہ کی۔ ایک مرتبہ خلوت میں بیوی کی شرم گاہ پر میں نے قصداً نظر ڈالی۔ جب زیارت کے لئے آیا حالانکہ میرا مکان آپ سے دو منزل دور تھا۔ مگر بطریق مزاح فرمانے لگے کیا فرماتے ہو اے علماء دین بیوی کی شرم گاہ پر نظر ڈالنے کے متعلق۔ میں نے علماء کا قول ظاہر کیا (کہ مکروہ ہے) فرمایا تم ایسا کرتے ہو؟ میں نے کہا "نہیں"۔ اس لئے کہ واقعہ بالکل بھول گیا تھا۔ فرمایا حتی کہ فلاں شب میں بھی نہیں؟ تب مجھے یاد آیا اور شرما گیا۔ فرمایا پھر ایسا نہ کرنا کہ انشاء اللہ یہ نظر کعبہ پر ڈالو۔ (اللہ اللہ کیا پاکیزہ طریق نصیحت ہے کہ جو نگاہ پاک خانۂ خدا پر ڈالنے کے لئے اللہ نے بخشی ہو وہ محل بول پر ڈال کر گندی بنائی جائے)۔ ایک مرتبہ میری بیویاں ایک ہی گھر میں تھیں کہ ایک کو اپنے گھر میں رہنے سے کوئی عذر مانع ہوا تھا۔ مکان میں چار پلنگ تھے۔ دو پر وہ دونوں الگ الگ لیٹ گئیں اور تیسرے پر میں تنہا لیٹ گیا اور چوتھا خالی رہا۔ شب میں ایک بیوی سے ہم بستر ہوا کہ دوسری کو سوتا ہوا سمجھا۔ پھر تھوڑی دیر سونے کے بعد اٹھا اور پہلی کو سوتا ہوا سمجھ کر دوسری سے ہم بستر ہوا۔ حسب معمول جب زیارت کے لئے حاضر ہوا تو مزاح کے طور پر حضرت نے فرمایا کہ کیا فرماتے ہیں علماء تحقیق دو بیویوں کو ایک گھر میں جمع کرنے اور دونوں سے صحبت کرنے کے متعلق؟ میں سمجھ گیا کہ میرے واقعہ کی طرف اشارہ ہے لہٰذا عرض کیا کہ حضرت آپ کو کیسے خبر ہوئی۔ فرمایا اور چوتھے پلنگ پر کون سو رہا تھا؟ میں نے کہا حضرت میں نے ہمبستری کی ہر ایک سے اُس وقت جبکہ دوسری سو رہی تھی۔ فرمایا نہ پہلی سوئی تھی نہ دوسری۔ علاوہ ازیں اگر سو بھی رہی ہوں تو ایسا مناسب نہیں تھا۔ میں نے کہا حضرت بے شک مفتی بہ قول یہی ہے اور میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔

چونکہ ان واقعات میں کشف ہی نہیں بلکہ ارشاد و اصلاح ہے اُن مخفیات کی جن پر نہ کوئی

مطلع ہوتا ہے نہ اس کے متعلق شرعی حکم یا نور و ظلمت کا سوال کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ چند قصے بضرورت بیان کر دیئے۔ ان کو گندا کہہ کر اعتراض نہ کرنا) ایک مرتبہ چند برادرانِ طریقت کیساتھ بغرض زیارت حاضر ہوا۔ جب ہم رخصت ہو کر چلے تو نہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ چوروں کی مدافعت کا کوئی سامان۔ اتفاق سے بستی کا راستہ بھول گئے اور رات کو ایک خطرناک بیابان میں ٹھیرنا ہوا جو کہ راہ زنوں کا پڑاؤ تھا۔ سب رفقاء تو سو گئے مگر میں اور میرا ایک ساتھی دو شخص جاگ رہے تھے کہ قریب ہی ہمیں شیر کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے رفیق سے کہا کہ دوسروں کو جگانا مت کہ وحشت کھا جائیں گے۔ کیونکہ انمیں بعض ایسے ہیں جنکو ایسی صورت کبھی پیش نہیں آئی۔ بس دعا کرو کیا عجب ہے حق تعالیٰ کا منہ دوسری طرف پھیر دے۔ جب صبح قریب ہوئی تو ہم اُٹھے اور وہاں سے چل دیئے۔ پاس ہی ہم کو ایک خرگوش پڑا نظر آیا۔ جیسے اس کی رُوح ابھی نکلی ہے۔ کچھ دنوں بعد جب پیر بھائیوں کے ساتھ حضرت کی زیارت کے لئے آیا تو رات بھر جاگا ہوا تھا کیونکہ درندوں سے حفاظت کے لئے پہرہ دیتا رہا تھا، اس لئے حاضر خدمت ہو کر میں نے عرض کیا کہ حضرت میں سو رہوں کہ تمام رات کا جاگا ہوا ہوں۔ فرمایا یہ کیوں؟ میں نے عرض کیا جنگلی جانوروں کی خاطر پہرہ دیتا رہا۔ فرمایا اور تمہارے پہرہ دینے سے ہوتا کیا؟ اور فلاں شب (یعنی شیر کی آہٹ والی رات) میں اگر لٹیرے تم پر آپڑتے تو تم کیا کر لیتے؟ میں نے عرض کیا حضرت اس کا کیا مطلب؟ فرمایا جب تم فلاں پہاڑی کے درہ میں پہونچے تو تم کو تین آدمی ملے تھے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا جب وہ پہاڑ پر چڑھے تو وہاں چار آدمیوں کو بیٹھا پایا جو کہ لوٹنے کے لئے مسافروں کا انتظار دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں نے ان کو بھی تمہاری اطلاع کر دی اور اب ساتوں ڈاکو تمہارے پیچھے لگ گئے کہ دیکھیں رات کہاں گزارتے ہو۔ جب تم رات کو اُتر پڑے تو وہ تمہارے سو جانے کا انتظار دیکھتے رہے۔ آخر جب انہوں نے سمجھا کہ تم سب سو گئے تو انہوں نے تمہاری طلب میں قدم بڑھائے۔ مگر دیکھا کہ تمہارے قریب شیر کھڑا ہے۔ کہنے لگے کہ کیا کرنا چاہیئے اگر شیر سے لڑتے ہیں تو یہ سب جاگ جائیں گے۔ اور اگر ان کی طرف چلیں تو راستہ میں شیر حائل ہے۔" آخر تم کو چھوڑ گئے اور دوسرے قافلہ کی طرف رُخ کیا۔ مگر جب وہاں بھی کچھ نہ ملا تو پھر دوسری جانب سے تمہاری طرف آئے لیکن اس جانب بھی ان کو شیر نظر پڑا اور وہ

یوں سمجھے کہ یہ شیر دوسرا ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا یہ کون لوگ ہیں کہ ہم ایک سمت سے آئے تو دیکھا شیر ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ اور پھر دوسری سمت سے آئے تو ادھر بھی دیکھا کہ شیر ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس راز کی حقیقت کو سمجھنا بھی چاہا مگر حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مُہر لگادی (اور وہ نہ ادراک کر سکے کہ کرامت ہے اولیاء اللہ کی اور خدام و زائرین غوث کی حفاظت ہے من اللہ۔ ورنہ ڈکیتی سے تائب ہو جاتے)۔ میں نے عرض کیا اور وہ خرگوش کیسا تھا؟ فرمایا شیر میں بنی آدم کی طرح ایک نخوت کا مادّہ ہے اور جس طرح انسان کے مُنہ پر جب مکھی بیٹھتی ہے تو وہ اس کو دفع کرتا ہے اسی طرح وہ شیر بیٹھا ہوا تھا کہ خرگوش سامنے آگیا۔ جس نے شیر کو دیکھا نہیں تھا۔ لہذا شیر نے اس کو مار دیا۔ ایک دن میں آپ کے مکان پر تھا۔ آپ تو نیچے کچھ کام کر رہے تھے اور میں اوپر کھڑا ہوا اپنے سامنے کی چھت پر نظر ڈال رہا تھا۔ دفعتہً ایک عورت اس چھت پر چڑھی جس کے چہرہ پر مجھے سُرخی دمکتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کو غور سے تکنے لگا کہ معلوم کروں یہ سُرخی خون کی ہے یا رنگ کی۔ میری اس پر نظر پڑی ہی تھی کہ شیخ نے مجھ پر نظر ڈالی اور فرمایا اللہ سے ڈرو۔ یہ بد نظری اور میرے سامنے؟ اور ہنسنے لگے۔ ایک مرتبہ خوردنوش کا غلّہ وغیرہ خرید کر رکھ لینے کا آپ سے میں مشورہ لینے لگا۔ فرمایا کوئی چیز نہ خریدو کہ جتنا موجود ہے فصل تک کے لئے کافی ہے البتہ گھی خرید لو کہ تمہارے پاس اتنا ہے جو موسم تک نہ چل سکے گا میں نے کہا حضرت نے صحیح فرمایا مگر فلاں عورت کا میرے پاس امانۃً گھی رکھا ہے اور ایک دن وہ آئی تھی تو میں نے اس سے اپنے پاس گھی کم ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ گھی میرے پاس بہتیرا ہے جتنا تمہیں درکار ہو لے لینا۔ اگرچہ میں یہ نہیں سمجھا کہ اس کا مقصود لوجہ اللہ دینا تھا یا قرض۔ مگر بہر حال میرا خیال ہے کہ وہ سچی ہے اور بوقت ضرورت اس سے گھی مل جائے گا۔ آپ نے ذرا دیر سکوت فرمایا اور کہا کہ گھی تو ضرور خرید لو۔ اور دوبارہ سہ بارہ پھر یہی فرمایا۔ میں سمجھ گیا کہ عورت اپنی بات کو پورا نہ کرے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب گھی کے بیچنے کا وقت آیا تو اس نے میرے ہی گھر بیٹھ کر اپنا سارا گھی فروخت کر دیا۔ حلانکہ اسے میری حالت (فقر و تنگدستی) معلوم تھی۔ اس کے بعد تو حق تعالیٰ نے شیخ کی برکت سے مجھے توقع سے بھی زیادہ فراخی عطا فرمادی۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کچھ رقم مجھے قرض دی اور میرے پاس امانت رکھ گیا۔ چند روز بعد اپنی امانت اور قرض دونوں رقمیں وصول کرنے کے لئے میرے پاس آیا۔ مگر میرے پاس اس وقت پیسہ بھی نہ تھا کہ دے دوں اور نہ کوئی ایسی چیز

میسر تھی کہ جسے بیچ کر قرض ادا کر دوں۔ اور میرا خیال تو یہ تھا کہ اس کو مدت تک ضرورت نہ ہو گی (اس لیئے پہلے سے کچھ فکر و اہتمام بھی نہ کیا) غرض میں نے اس کی امانت نکالی اور دل میں حضرت شیخ کو یاد کرنے لگا کہ کاش قرض کا تذکرہ نہ کرے۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور اب تک بھی کہ چھ مہینے گزر چکے ہیں اُس نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ آیا ہی اس لیئے تھا کہ دونوں رقم لے کر جائے۔ ایک مرتبہ ایک اجنبی عورت کے ساتھ مجھے ایسا واقعہ پیش آیا۔ جو شرعاً ناپسندیدہ تھا اگرچہ خفیف تھا۔ ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا عورتوں ہی کے متعلق آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ نہ معلوم کس تقریب میں اس عورت کا بھی ذکر آگیا۔ فوراً ہی فرمایا میں تمہارے اور اس عورت کے درمیان ایک نیلگوں ڈورا دیکھ رہا ہوں (جو علامت ہے ظلمت و معصیت کی) ایسا کیوں ہے؟ مجھے اپنی حرکت یاد آگئی اور میں شرما گیا۔ حالانکہ اس قصّہ کو تقریباً پانچ برس گزر چکے تھے۔ فقط

اسی طرح میرے دوست مولانا علی بن عبداللہ صباغی نے چند کرامتیں لکھ کر بھیجیں۔ جن کو میں نے حرفاً حرفاً حضرت شیخ پر پیش کیا اور حضرت نے ان کی تصدیق فرمائی کیونکہ میری غرض یہ ہے کہ اس کتاب میں صرف وہی لکھوں جو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا حضرت شیخ سے اپنے کانوں سُنا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اخیر رمضان میں آپ کی زیارت کر کے جب میں واپس جانے لگا تو حضرت نے فرمایا بقر عید کے لیئے ہمارے واسطے ایک مینڈھا لانا۔ میں نے عرض کیا بہتر ہے۔ چنانچہ جب عید قریب آئی تو میں نے دو مینڈھے خریدے اور ان کو لے کر وطن سے روانہ ہوا۔ میرے ایک پیر بھائی سے جن کا مکان راستہ میں نصف مسافت پر پڑتا تھا اور وہ اتفاق سے اس وقت حضرت پاس بیٹھے تھے۔ حضرت نے یہ فرمایا تھا۔ کہ علی صباغی دو مینڈھے لے کر آئے گا۔ ان میں سے ایک تم رکھ لینا اور عید میں قربانی کر دینا اور دوسرا ہمیں پہونچا دینا۔ چنانچہ جب میں اُن کے مکان پر پہونچا تو انہوں نے حضرت کا ارشاد مجھے پہونچایا۔ چونکہ میں ان کو بارہا حضرت کی خدمت میں دیکھ چکا تھا اس لیئے ان کی بات کا مجھے یقین آگیا اور میں نے کہا بہتر ہے دونوں میں جو پسند ہو وہ لے لو۔ کہنے لگے کہ جو ادنیٰ ہو وہ ہم لیں گے اور جو اعلیٰ ہو وہ حضرت کے پاس جائے گا۔ چنانچہ دونوں میں جن کو اعلیٰ و بہتر سمجھا وہ ہم نے رکھ لیا اور ادنیٰ ان کے حوالہ کر کے وہاں روانہ ہو گئے۔ حضرت کے پاس پہنچے تو اس سے قبل کہ آپ اس کو دیکھیں فرمانے لگے فلاں

صاحب نے اپنا کام بنالیا کہ اعلیٰ تو رکھ لیا اور ادنیٰ تم ہمارے لیئے لائے۔ میں نے عرض کیا حضرت ہمیں تو یہی فربہ اور اعلیٰ معلوم ہوا۔ ارشاد فرمایا ہاں اس کی اوجھ میں چربی ہے (جس سے موٹا معلوم ہوتا ہے مگر گوشت چکنا دوسرے ہی کا تھا) چنانچہ عید میں قربانی ہونے پر دونوں مینڈھے ایسے ہی نکلے جیسے حضرت نے فرمائے تھے۔ اسی سفر میں یہ قصہ بھی پیش آیا کہ ایک مینڈھا پیر بھائی کو دے کر جب ہم چلنے لگے تو فکر ہوا کہ دوسرے کو لے کر کیسے چلیں اونٹوں پر بھی اس کو لادنا مشکل، اور پیدل بھی اس کے ساتھ چلنا دشوار (کہ بھیڑ اور مینڈھے کو تنہا چلنا بہت اکھلتا ہے)۔ مگر اللہ پاک نے سامان مہیا فرمایا کہ بکریوں کا ایک گلہ فاس ہی کو جانے والا مل گیا۔ چونکہ ہم سب سواریوں پر تھے۔ اور صرف میرا علاقائی بھائی پیدل تھا اس لیئے ہم نے اس کو مینڈھے کے ساتھ چھوڑا کہ گلہ کے ساتھ مینڈھے کو لے کر آجائے۔ چنانچہ وہ ہم سے ایک دن بعد پہونچا۔ جب وہ حضرت کے سامنے آیا تو حضرت نے فرمایا اچھا تم ہمارے لیئے گوسفند لائے اور ہم نے تمہیں فرزند دیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہی اس کی مراد بھی تھی۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اس کے نکاح کو پندرہ برس ہو چکے تھے مگر اولاد نہیں ہوئی تھی حتیٰ کہ اس پر بیوی بانجھ ہونے کا الزام لگاتی تھی اس لیئے اس کو اولاد کا بے حد اشتیاق تھا۔ مینڈھے کو باندھ کر جب ہم اپنی قیام گاہ کو اور حضرت ہم سے رخصت ہو کر اپنے گھر تشریف لے جانے لگے تو رات کا وقت تھا۔ چراغ کی روشنی میں آپ کی نظر میرے بھائی پر پڑی تو فرمایا میرے قریب آؤ۔ اس کے بعد اس کی پیشانی کھول کر تین مرتبہ کچھ کلمات پڑھے اور فرمایا کہو بچّہ کا نام کیا رکھو گے؟ بھائی نے کہا حضرت ہی نام بھی تجویز فرمادیں۔ فرمایا اس کا نام رحّال رکھ دینا۔ یہ نام ہماری برادری بھر میں بھی کسی کا نہ تھا اور نہ آباؤ اجداد میں اس نام کا کوئی گزرا تھا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا بھی کہ یہ نرالا نام حضرت کو کہاں سے مل گیا۔ فرمایا اس وقت ذہن میں یہی آیا۔ غرض جب ہم واپس وطن پہونچے تو بھاوج کو حاملہ پایا۔ حالانکہ اس وقت تک گھر والوں کو بھی حمل کا علم نہ تھا۔ غرض ولادت ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا۔ حضرت کے فرمانے کے موافق اس کا نام رحّال رکھ دیا مگر لوگ اس نرالے نام پر بہت متعجب ہوئے۔ کچھ دنوں بعد میرے ذہن میں آیا کہ شاید بچّہ زندہ نہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تین سال کا ہو کر رحلت کر گیا۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ حضرت نے اس کا نام اس لیئے رحّال تجویز فرمایا تھا۔

اس کے بعد جو حاضری ہوئی تو حضرت نے بھائی سے فرمایا اس دفعہ ہم نے تم کو رحال دیا تھا۔ اور اس دفعہ وہ بچہ دیں گے جو تمہارے پاس رہے گا اور رحلت نہ کرے گا۔ ف حق تعالیٰ نے جس طرح ظاہری نظامِ عالم حکام وسلاطین کے ہاتھ میں دیا ہے اور گو وہ محض تنفیذ مقدرات کے وسائط و آلات ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے بحکم خدا ہوتا ہے مگر اس کا ظہور ان کے ہاتھوں ہوتا ہے اور محض اسی ظاہری توسط پر یہ کہنا صحیح ہے کہ بادشاہ نے فلاں کو جاگیر دی اور میں نے فلاں کو مکان دیا۔ اسی طرح ان سے پہلے یہ نظامِ عالم باطنی طور پر اقطاب و اغواث کے ہاتھوں میں دیا ہوا ہے کہ ملائکہ کی طرح امور تکوینی کی تنفیذ کے یہ حضرات آلہ کار ہیں کہ مشیت الہٰیہ کے ماتحت جب ہونے والی باتیں ان کے قلوب پر وارد ہوتی ہیں تو یہ اُن کو واقع کرنے کا واسطہ بنائے جاتے ہیں اور جس امر کا نہ ہونا تقدیر الہٰی میں طے ہوتا ہے اس کے واقع نہ ہونے کی سعی و تدبیر ان کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے۔ بلا تشبیہ ایسا سمجھو جیسے شاہی شاہی منشاء وخواہش خواہ کسی کے عزل کے متعلق ہو یا نصیب کے اور عزت کے متعلق ہو یا ذلت کے اول وزراء کے واسطہ سے انجام پاتی ہے اور وزراء اس کی تنفیذ حکام متعلقہ کے ذریعہ کراتے ہیں۔ لہٰذا اسی توسط باطنی کی بنا پر ان حضرات اہلکاران قضا و قدر کا یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ہم نے تمہیں لڑکا دیا یا یہ کہ لڑکی عطا کی۔ گویا عطا کردہ خداوندی کو کشف سے معلوم کر کے اظہار کیا اور امر مقدر کی تنفیذ کا واسطہ بن کر اس کو اپنی طرف منسوب کیا۔ جیسے شاہی خزانچی کسی کو ہزار روپیہ دے کر کہے کہ میں نے تم کو ایک تھیلی دی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ فرزند کا حقیقۃً دینا اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو رحلت کرنے والے بچہ کو صاحب عمر بنانا بھی بدرجہ اولیٰ اس کے اختیار میں ہوتا۔ اور غوث وقت کو اس کا نام رحلت کنندہ رکھ کر نام تمام تبشیر کی ضرورت نہ ہوتی۔ خوب سمجھ لو تاکہ نہ تو توحید ہاتھ سے جائے نہ اولیاء کی محبت و عظمت قلب سے نکلنے پائے۔ واللہ اعلم۔

میں ایک دن اپنے ایک رفیق کے ساتھ شکار کو گیا۔ کھانا ہم نے صبح سویرے گھر ہی پر کھا لیا اور ساتھ کچھ نہ رکھا کیونکہ خیال تھا کہ رفیق بڑا شکاری ہے اور جلدی ہی واپسی ہو جائیگی۔ مگر شکار نہ ملا اور ہمیں گھومتے ہوئے بڑی دیر لگ گئی۔ بھوک نے بیتاب کر دیا۔ اور نادم و پشیمان ہوئے کہ کھانا ساتھ کیوں نہ لیا تھا۔ آکر پہاڑ کے نیچے سے ایک تُرہی کو لے کر آئے۔ جب حضرت کی زیارت کو حاضر ہوا تو فرمایا تم چارشنبہ کو شکار کے لیے کیوں گئے تھے اور پھر کھانا بھی ساتھ نہ لیا حتیٰ کہ تم کو ایک شخص ملا اور اس نے تمہاری خرجی بھی ٹٹولی مگر اس میں کچھ نہ پایا۔ دیہ

ٹٹولنے والے خود حضرت شیخ تھے) پھر ہم بزکو ہی لے کر گھر پہنچے۔ غرض سارا قصہ بیان فرمایا کہ اُس پہاڑ پر پیالہ کی برابر ایک چشمہ ہے جس کا پانی باہر نہیں بہتا اور نہ اُس میں کمی ہوتی نہ بیشی۔ چونکہ میں نے وہ چشمہ کبھی نہ دیکھا تھا کیونکہ پہاڑ کے اوپر شکاری بہت ہی کم چڑھتے تھے' اس لئے واپس آکر تحقیق کی اور ایک شکاری سے اس کا پتہ لگا کہ بعینہ حضرت کے فرمانے کے مطابق ہے حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ لا الہ الا اللہ میں نے اور مولانا منصور نے بارہا اس چشمہ کے پاس نماز پڑھی ہے کہ بلندی کی وجہ سے چوٹی پہاڑ پر وہ جگہ ہمیں بہت بھلی معلوم ہوئی۔

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو اسی طرح ایک دوسرے مقام کا صحیح حال بیان فرمایا اور کہا کہ تم اس جگہ اپنے گھوڑے کیوں باندھا کرتے ہو؟ وہاں تو ایک ولی مدفون ہیں خاص تمہارے گھوڑے کے پاؤں کے پاس۔ حالانکہ میں نے سارے حصہ میں کہیں ایک قبر کا بھی نشان نہیں پایا نہ کسی سے کبھی سُنا بلکہ گورستان وہاں سے نصف میل پر تھا۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ تمہاری اس چراگاہ میں قبریں تو سات ہیں مگر جو قبر تمہارے گھوڑوں کے پاؤں کے قریب ہے اس کا احترام تم کو ضرور کرنا چاہئے کہ کوئی آڑ قائم کر کے قبر کی شکل بنا دو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت وہ کون بزرگ ہیں؟ فرمایا وجدہ اور تلمستان کے درمیان ایک بدوی قبیلہ کے باشندے تھے جو صحابہؓ میں رہا کرتے تھے اور ان کو لوگ طالب علم سمجھتے تھے' ولی نہیں سمجھتے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور دفن کر دیئے گئے۔ ہم نے وجدہ اور تلمسان کے درمیان کے قبائل کا نام لینا شروع کیا اور حضرت انکار فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے بنو ریاح کا نام لیا تو حضرت نے فرمایا ہاں اسی قبیلہ کے تھے حالانکہ نہ حضرت (بظاہر اسباب) ہمارے وطن سے واقف تھے' نہ وجدہ و تلمستان سے' اور نہ اُن کے مابین کی بدوی آبادیوں سے اور نہ کبھی ادھر کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا اگر دیکھنا چاہو تو کھدال لے کر اس جگہ کو کھود لینا تحقیق ہو جائے گی۔ وہ جگہ تمہارے صاحبزادہ کے گھر کی بائیں جانب باہر کے رُخ اُس چبوترہ کے عین سامنے ہے جو چراگاہ کے دروازہ کی طرف پڑتا ہے۔ چنانچہ وطن آیا تو میں نے گھر والوں سے اس کا تذکرہ کیا اور پھاوڑا لے کر جگہ کو کھودا تو بالکل حضرت کے موافق پایا۔ پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا سات قبروں میں صرف اسی ایک قبر کی کیا خصوصیت کہ دوسروں کا احترام ضروری نہ ہوا۔ فرمایا ان کی روح (شہدا کی طرح) آزاد ہے (کہ مدفن سے تعلق رکھتی اور لید وغیرہ سے تکلیف پاتی ہے) اور دوسروں کی روحیں (عام مومنین کی طرح)

برزخ میں مقید ہیں۔ اور زمانہ بھی قریب تین سو برس کے گذر لیا کہ عام قبور کا جو احترام نثر عاً ضروری تھا وہ بھی کھٹکی (اندر اس کے سبب اُٹھ گیا) مجھے تسلی ہو گئی اور اشکال رفع ہو گیا۔ ایک مرتبہ حضرت کی زیارت کے لئے میرا چچازاد بھائی علال میرے ساتھ آیا جو کہ میرا سالہ بھی ہوتا تھا پہلی ہی مرتبہ آیا تھا اور اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اس کی نیت یہ تھی کہ تنگ دستی دور ہونے کے لئے دعا کرائے جس میں وہ مبتلا و پریشان تھا جب سامنے پہونچا تو حضرت نے فرمایا کہ تمہاری بیوی حاملہ ہے؟ عرض کیا جی! حضرت نے فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم کو لڑکی عطا ہو اور وہ رزق لے کر آوے۔ اُس نے عرض کیا حضرت بڑی خوشی سے۔ فرمایا ہمیں بھی یہی پسند ہے۔ اچھا اُس کا نام کیا رکھوگے؟ اُس نے کہا جو بھی حضرت تجویز فرمایا اس کا نام خدیجہ رکھنا۔ میرا بھائی بہت خوش ہوا کہ ولادتِ دختر اور وسعت معاش دونوں کو حضرت نے جمع فرمادیا کہ اُس کی یہی مراد بھی تھی چنانچہ وطن آئے تو معلوم ہوا اُس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ پھر ساتویں دن اُس کا نام حضرت کی تجویز کے موافق خدیجہ رکھا گیا تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ برادری بھر میں یہ نام کسی کا نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے خدیجہ نام کیوں تجویز فرمایا؟ ارشاد فرمایا کہ جس خوش نصیب کو بھی حق تعالیٰ نے فتح کبیر عطا فرمائی اور اس نے نکاح کرنے کا قصد کیا ہے تو ایسی عورت کی جستجو کی ہے جس کا نام خدیجہ ہو۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بڑی راحت ملی اور ان ہی کے پاس ہر قسم کی دینوی و دینی خوبیاں آپ کو عطا ہوئیں۔ میری بھی تمنا ہے کہ حق تعالےٰ مجھے لڑکی عطا فرمائے تو اس کا نام خدیجہ رکھوں۔

مجھے نیند بہت آیا کرتی تھی اگر صبح صادق کے قریب آنکھ کھل جاتی تو بیوی سے ہم بستر ہوا کرتا ورنہ سوتا ہی رہتا اور طلوع فجر کے بعد آنکھ کھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے حاضرین سے فرمایا" فلاں شخص کے پاس جب کبھی بھی ہم گئے تو یا اس کو سوتا ہوا پایا۔ یا بیوی سے ہمبستری کرتے ہوئے" ایک شخص نے پوچھا کہ پھر حضرت اُس وقت میں سونا بہتر ہے یا ہم بستری؟ فرمایا سونے سے تو ہم بستری ہی بہتر ہے (کہ مبارک وقت میں بیداری تو ہے) مگر نماز کے اوقات میں ہم بستر ہونے سے اگر بحکم خدا بچہ پیدا ہوا تو وہ اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوگا۔ چنانچہ پھر کبھی میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس ارشاد میں کہ باوقات نماز مجامعت سے علوق ہوگا۔ تو بچہ عاق اور والدین کا کہنا نہ ماننے والا پیدا ہوگا حضرت کی دوسری کرامت تھی کہ یہی علی بن عبداللہ اپنی اولاد کے غیر مطیع ہونے کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے۔ اور ہم نے خود

دیکھا ہے کہ بعض اوقات اُن کے بچے بڑی بُری حرکتیں کر گزرتے تھے۔مولانا علی کی دُعا تھی کہ بار الٰہا مجھے حضرت شیخ کی محبت پر مرنا نصیب کیجو۔اور قیامت کے دن حضرت ہی کی جماعت میں اُٹھائیو۔ چنانچہ وہ قبول ہوئی کہ موت کا وقت قریب آیا تو اُن کے قلب میں خیال پیدا ہوا کہ اب مرنے کا وقت قریب آلگا ہے، وہ بیوی سے یہ کہہ کر کہ میں حضرت کی خدمت میں فاس جاتا ہوں تاکہ وہیں وفات پاؤں۔ صبا فات چھوڑ کر اہل وطن سے رخصت ہو کر آستانۂ شیخ پر آپڑے۔ اور چند ہی روز بعد بیمار ہو گئے حضرت نے ان کو وصیت کرنے اور لقاءِ رب کی تیاری کا حکم فرمایا اور اپنے گھر رکھ کر ان کی تیمارداری فرمائی کہ باہر خود حضرت اور گھر میں حضرت مخدومہ اور دیگر متعلقین تمامی وہ ضروریات انجام دیتے تھے جن کی بیمار کو ضرورت ہوتی ہے۔ آخر جب وقت اخیر آگیا تو حضرت دولت خانہ میں تھے اور یہ اوپر مہمان خانہ میں کہ حضرت نے حاضرین سے فرمایا علی صباغی کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی زیارت ہوئی۔ چنانچہ لوگ دریافت کرنے کے لئے اوپر چڑھ کر گئے تو دیکھا کہ زبان بند ہو چکی ہے۔ مگر اس پر بھی حضرت شیخ کا مقولہ اُن سے نقل کیا جس کو انہوں نے سمجھا اور گردن کو حرکت دے کر اشارہ کیا کہ ہاں صحیح ہے اور منہ کھول دیا جیسے کوئی ہنستا ہے۔ اسکے بعد تھوڑی دیر مسکراتے رہے اور اسی حال میں روح پرواز کر گئی۔ میں نے حضرت سے سُنا کہ فرماتے تھے سید علی کو صباغات میں نوّے برس رہ کر بھی وہ حالت نصیب نہ ہوتی جس پر ان کا دم نکلا ہے۔

اسی طرح ایک تحریر مولانا عبداللہ بن علی تازی کی آئی جس کو میں نے حضرت پر پیش کیا اور تصدیق ہو جانے کے بعد درج کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں مولانا عبدالرحمٰن مخوخی نے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ حضرت ممدوح کے ساتھ مولانا الشیخ ادریس کے مزار تک گیا۔ وہاں حضرت نے کسی ضرورت سے مجھے اپنے مکان پر بھیجا۔ میں حضرت کو وہیں چھوڑ کر لپکا ہوا دولت خانہ پر پہونچا یہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک شخص دھونے کی غرض سے کپڑے لینے کے لئے حضرت کی تلاش میں دروازہ پر کھڑا ہے۔ ہم شیخ کی تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھ گئے کہ دفعتہً حضرت کپڑے لئے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور وہ دھوبی کو دیدیئے۔ حالانکہ حضرت شیخ مولانا ادریس کے راستہ میں کیچڑ ہونے کی وجہ سے کھڑاؤں پہن کر گئے تھے اور میں اتنا تیز آیا تھا کہ حضرت اگر پاپوش بھی پہنے ہوئے ہوتے تو مجھ سے پہلے گھر نہیں پہونچ سکتے تھے۔ یہی مولانا عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت کی عینک گم ہو گئی۔ میں دوسری عینک محمد کواش کی دوکان سے لے کر آیا مگر وہ بینائی پر ٹھیک نہ لگی۔ حضرت نے فرمایا ہماری پہلی عینک تلاش کرو کہ وہ بہت صاف تھی۔

غرض ہم نے اس کتاب کا ورق ورق چھان مارا جس میں حضرت عینک رکھا کرتے تھے مگر وہ نہ ملی۔ دفعتہً حضرت کا رنگ بدل گیا اور جب میں نے دریافت کیا کہ حضرت کیا بات ہے تو فرمایا مجھے اس عینک سے ناگواری ہے۔ اس کے بعد وہ کتاب اٹھائی جس میں ہم بار بار ڈھونڈھ چکے تھے اور یہ ناقص عینک بینی مبارک پر چڑھی ہوئی تھی کہ دفعتہً وہ نیچے گری اور حضرت نے کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیا، دیکھتے کیا ہیں کہ پرانی مانوس عینک کتاب کے اوپر پڑی ہے۔ تب آپ نے صاحبزادہ سید عمر سے فرمایا اپنی ماں سے کہہ آؤ کہ حق تعالیٰ نے میری عینک مجھے واپس فرمادی یہی عبدالرحمٰن فرماتے تھے کہ سخت جاڑہ کے زمانے میں ہم حضرت کے پاس بیٹھتے پیشانی مبارک سے بکثرت پسینہ ٹپکتا ہوا دیکھتے تھے۔ مگر پھر یہ حالت نہ رہی۔ ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا یہ پسینہ مجھے ابتدا میں آتا تھا جب کہ مشاہدہ کبھی سامنے آتا اور کبھی غائب ہونے پر میری حالت عام لوگوں کی سی ہوتی تھی اور جب مشاہدہ ہوتا تو انسانی حالت سے مجھے باہر نکال دیتا تھا، اور پھر جب غائب ہوتا تو میری حالت عام انسانوں کی سی بن جاتی تھی اور اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ مگر جب وہ دائمی بن گیا کہ کسی وقت بھی غائب نہیں ہوتا تو طبیعت اس کی عادی اور ذات اس سے مانوس ہوگئی۔ اس لئے اب بدن پر کچھ اثر نہیں ہوتا ایک مرتبہ میں اور میرے بھائی یہی مولانا عبدالرحمٰن مدرسہ عطارین کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں گھروں کی چھتوں پر عورتیں نظر آئیں تو ہم ان کو تکتے اور ان کا تذکرہ کرکے باہم ہنسنے لگے حتیٰ کہ غلبۂ خوش طبعی میں ایک شخص ہوا میں بڑے زور سے اچھلا بھی۔ جب ہم حضرت کے مکان پر آتے اور صقلابیہ میں (کہ مہمان خانہ یا خانقاہ تھی) بیٹھے تو حضرت خوب ہنسے اور فرمایا وہ شیخ بہت اچھا جسے کشف نہ ہوتا ہو۔ اس کے بعد فرمایا سچ بتاؤ جھوٹ نہ بولنا تم دونوں کہاں گئے تھے۔ ہم نے واقعہ عرض کردیا تو حضرت نے مفصل قصہ ایسا سنایا کہ گویا ہمارے ساتھ تھے۔ حتیٰ کہ اچھلنے کا واقعہ بھی بیان فرمادیا حالانکہ اس کا تذکرہ ہم نے آپ سے بالکل نہ کیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت ممدوح زائرین کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اس اچھلنے کا مشاہدہ فرماکر دفعتہً کھل کھلائے۔ حاضرین نے سمجھا کہ ہم میں سے کسی کی بات پر ہنسے ہیں۔ ایک مرتبہ میں حاضر خدمت ہوا اور میری بیوی حاملہ تھی تو میں نے اس کا تذکرہ کیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ہنسی کے طور پر کہا لڑکی ہوگی حضرت نے مجھ سے فرمایا میرے پاس آؤ اور پھر کان میں کہا کہ واللہ لڑکا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک بار بغرض زیارت حاضر ہوا۔ اور لڑکے کو مریض چھوڑ آیا تھا۔ اس کے لئے دعا صحت کی میں نے درخواست کی تو فرمایا اب کے آؤ گے تو درخواست کرنا۔ میں سمجھ گیا کہ بچہ جلدی وفات پا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ میں تیس اوقیہ حضرت کے لئے لے کر بغرض زیارت فاس آیا مگر جب شہر کے قریب پہونچا تو اس میں سے ایک اوقیہ نکال لیا۔ جب باقی رقم حضرت کو پیش کی تو فرمایا اپنی کارروائی تم چھوڑتے نہیں۔ جاؤ ایک موزونہ کی کھجور اور تین موزونہ کا پنیر لے کر آؤ اُس اوقیہ کے عوض جو تم نے نکال لیا ہے۔ میں نے کہا حضرت کی عقل و دانش پر بھی آفرین" اسی طرح سید عربی زیادی نے تحریر بھیجی جس میں سے چند قصے تو میرے سامنے پیش آئے اور ان کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جو میرے سامنے کے نہیں ان کو میں نے حضرت پر پیش کر کے جب تصدیق کر لی تو درج کتاب کرتا ہوں۔

لکھتے ہیں کہ میں سرکاری کتب خانہ کے لئے کتابیں خرید کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ چند کتابیں خریدیں اور اُن کی قیمت مالک کو دے دی کہ دفتر سے مجھے قیمت پیشگی مل چکی تھی۔ جب وہ کتابیں میر منشی کے پاس پہونچیں تو ان کو پسند نہ آئیں اور وہ بہت کچھ گرجے اور چمکے۔ اس کے بعد وہ کتابیں مجھے واپس کر دیں اور کہا کہ ان کو مالک پر واپس کر کے قیمت داخل کرو ورنہ پھر جو ہم سے ہوسکے گا ہم کریں گے۔ یہ سن کر میں نہایت بے چین و پریشان اور مغموم و خائف ہوا کہ میر منشی کا قہر و سطوت مجھے معلوم تھا۔ پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا اور یہ بھی کہ مالک نے کتابیں واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اور میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ خود ادا کر دوں، اور میر منشی مزاج کا بڑا کڑوا ہے، اور با اختیار و صاحب اقتدار ہے۔ فرمایا بچہ کچھ اندیشہ نہ کر انشاء اللہ عنقریب کوئی سبیل نکل آئے گی۔ چنانچہ چند روز ہی گزرے تھے کہ سلطان نے میر منشی کو قتل کرا دیا اور میری پریشانی دور ہوگئی۔

ایک مرتبہ ہمارے وطن تامسنا میں فساد عظیم ہوا اور قاضی شہر میرے خاص دوست تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ ان پر بھی سلطانی عتاب ہوگا) اس لئے میں دعائے خیر کرانے کے لئے حضرت کے پاس آیا تو فرمایا کہ قاضی صاحب کے متعلق تو کوئی خطرہ نہ کرو۔ باقی میر منشی کا میں ذمہ دار نہیں۔ یہ میر منشی بھی میرے دینی بھائی اور وہی صاحب تھے جن سے کتابوں کا قصہ پیش آیا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قاضی صاحب پر تو ذرہ بھر بھی آنچ نہ آئی اور میر منشی کے قتل کا حکم صادر ہوگیا۔ نیز میر منشی کے قتل کا قصہ ابھی عوام میں پھیلا نہ تھا صرف چند ہی لوگوں کو معلوم ہوا تھا

کہ میں حضرت کے مکان پر حاضر ہوا اور دستک دی۔ آپ باہر تشریف لائے اور بغیر اس کے کہ فرمایا میر منشی تو مر گیا میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا! میں نے تو تم سے کہہ ہی دیا تھا اس کے بعد فرمایا کیا منشی کی تمہارے پاس کچھ کتابیں ہیں؟ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ہیں فرمایا اللہ انجام بخیر فرمائے۔ یہ سن کر میں ڈر گیا (کہ کچھ کشاکش ضرور پیش آنی ہے) اور کانپتے ہوئے حضرت کے ہاتھ پر جھکا اور بوسہ دے کر عرض کیا حضرت مجھے تو بڑا اندیشہ ہو گیا۔ مگر حاضرین نے بھی میری سفارش کی۔ حضرت نے فرمایا طلبی و تلاش ضرور ہونی ہے۔ مگر انشاء اللہ انجام سلامتی ہے۔ چنانچہ مجھے اس کا انتظار لگ گیا اور آخر اس کا ظہور ہوا کہ میر منشی کا جن جن سے بھی میل جول تھا سب کی تلاشی و طلبی و تفتیش ہونے لگی اور جو گرفتار ہوئے ان کو گردن زدنی و ضبطی املاک اور ذلت و خواری کے بڑے بڑے مصائب پیش آئے۔ یہ دیکھ کر میرا خوف بڑھتا اور حضرت کی خدمت میں بار بار جاتا رہا۔ آپ فرماتے کہ موت تو ہے نہیں۔ باقی پریشانی ضرور ہے۔ حتیٰ کہ مجھے مکناسہ (دارالسلطنت) لے جانے کے لئے قاصد میرے پاس بھی آ گیا اور میں اس کو لے کر حضرت کے پاس آیا۔ حضرت اس سے بڑی مسرت و انبساط سے ملے اور اس کے لئے دعائے خیر فرما کر میرے متعلق اس کو بہت کچھ نصیحت فرمائی، اور مجھ سے فرمایا کہ انشاء اللہ بخیریت واپس آؤ گے۔ نیز قاصد کی معرفت اس حاکم کو جس کے سپرد میر منشی کے معاملہ کی تفتیش و تحقیقات تھی سلام بھی کہلا کر بھیجا۔ غرض میں مکناسہ پہنچا اور میر منشی کی جو کتابیں میرے پاس تھیں وہ پیش کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے وصول کر کے مجھے رخصت کر دیا اور میں بحمد اللہ فاس واپس آ گیا۔ اس کے بعد چند لوگوں نے جو ظلم پسند حکام میں مقرب بننا چاہتے ہیں افسر تفتیش کو مجھ پر بھڑکایا اور افترا باندھ کر اس کو سنایا کہ فلاں شخص کا بہت کچھ مال ابھی اس کے پاس باقی ہے۔ چنانچہ مجھے گھر آئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ سپاہی آموجود ہوا اور کہنے لگا کہ تاسنا کے قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ تمہارا معاملہ خیر و خوبی سے طے ہو گیا ہے تو انہوں نے افسر تفتیش کو لکھا کہ سید عربی کو ہمارے پاس بھیج دو کہ موضع سلا میں ہم سے آ کر ملاقات کر جائیں۔ لہٰذا اگر آپ چلنا چاہیں تب آپ کی مرضی اور نہ چلنا چاہیں تب آپ کی خوشی۔ میں اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے حضرت کے سامنے بھی یہی گفتگو کی، اور حضرت خاموش بیٹھے سنتے رہے اسکے بعد

مجھ سے فرمایا کہ میری رائے تمہارے متعلق یہ ہے کہ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ مگر تیس اوقیہ اپنے ساتھ ضرور لے لو تاکہ افسر تفتیش کو دے سکو۔ سپاہی بولا کہ ہاں حضرت میری رائے بھی یہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو تامسنا کے قاضی صاحب کی طلبی بتاتے ہیں (جو میرے پرانے دوست ہیں) لہٰذا ان ہی کے ساتھ جانے کی مجھے کیا حاجت ہے، اور پھر تیس اقیہ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت۔ فرمایا جو میں کہہ رہا ہوں وہ مانو۔ میں فضول بات نہیں کہہ رہا۔ چونکہ مجھے اس بلا کی خبر نہ تھی جو اس شخص کے دل میں تھی کہ اس کی یہ ساری گفتگو محض دھوکا اور چال تھی لہٰذا جب میں اس کو نہ سمجھا اور اپنی نادانی پر جارہا تو حضرت نے ان لفظوں میں گویا اس کی تصریح ہی فرمادی اور وہ شخص بھی اس کو سنتا رہا ہنسی میں اس کو رلایا گیا۔ اس کے بعد جب ہم نے حضرت کے پاس سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ موت کا تو اندیشہ کرومت۔ البتہ قید بھگتنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں قاصد کے ساتھ مکناسہ روانہ ہوگیا۔ مگر تیس اوقیہ جس کا شیخ نے حکم فرمایا تھا اپنے ساتھ نہ لئے۔ جب ہم مکناسہ پہنچے تو افسر نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور حکم دیا کہ ہمارے گھر میں اس کو محبوس رکھو کہ جب تک سلطان سے مشورہ نہ کرلوں یہ باہر نہ نکلنے پائے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ مجھ سے پہلے میرے ہموطن چند لوگوں کے متعلق اس نے سلطان سے مشورہ کیا اور ان کو قتل کرا چکا تھا اس لئے خدا ہی جانتا ہے کہ خوف کے مارے میرا کیا حال ہوا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ بس اب قتل ہی ہونا باقی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ جس وقت وہ افسر مشورہ کے لئے روانہ ہوگیا اسی وقت بہ برکت حضرت شیخ اس مقتول و معتوب میر منشی کا ایک عزیز حضرت ابوالعباس سبتی قدس سرہ کا غلاف سلطان کی نذر کرنے کے لئے لے آیا۔

اس پر سلطان نے خود اس شخص کو اور جس کا بھی تعلق اس میر منشی سے تھا سب کو معافی دے دی۔ چنانچہ مجھے نجات ملی مگر سخرہ کے بارہ میں مجھے گرفتار کرلیا گیا اور سخرہ کی قیمت تیس ہی اوقیہ تھی۔ اس وقت میں حضرت کے اس ارشاد کا مطلب سمجھا کہ تیس اوقیہ اپنے ساتھ لے جانا۔ غرض فراہمی رقم میں بہت سرگرداں رہا اور مارا پھرا۔ آخر حق تعالیٰ نے اس کا انصرام فرمادیا اور مجھے رہائی نصیب ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہٖ ایک مرتبہ میں بعد مغرب حضرت کے گھر آیا اور دیر تک دروازہ پر بیٹھا رہا کہ نہ دستک دی نہ کسی کو آواز۔ اس کے بعد حضرت کی آہٹ مجھے محسوس ہوئی کہ سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ اور میرا نام لے کے

فرمایا کیا تم گھنٹہ بھر سے یہیں بیٹھے ہوئے ہو۔ میں نے یہ کہہ کر کہ ہاں حضرت! آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔
ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک جاہل سے کہ حضرت کی شان نہ پہچانتا تھا میری بحث ہونے لگی جب حاضر خدمت ہوا تو ساری گفت گو حضرت نے نقل فرما دی کہ رات تم نے فلاں شخص سے یہ کہا اور اس نے یہ کہا
اسی طرح ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ فلاں شخص کو آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے (کہ بہت تعریفیں کیا کرتا ہے) فرمایا کہ اس کو میری محبت خاک نہیں۔ اور تجربہ کرنا چاہو تو اس سے ایسی گفت گو کرو جس سے معلوم ہو کہ تم مجھ سے بدظن ہو گئے ہو، پھر دیکھنا وہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ وہ شخص جب میرے پاس آیا تو میں نے کہا میاں اب تو کچھ اور ہی تحقیق ہوا اور ایسی تقریر کی جس سے وہ سمجھا کہ شیخ کے متعلق میرا خیال بدل گیا ہے۔ یہ سن کر وہ فوراً ہی کھل گیا اور کہنے لگا میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ چکا تھا اور اپنی چھپی خباثت ساری ظاہر کردی۔ تب میں نے کہا کہ جناب والا میں تو آپ کو آزما رہا تھا سو آپ کی حقیقت واضح ہو گئی۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا۔ ایک مرتبہ میں صفلابیہ میں بیٹھا ہوا حضرت سے باتیں کر رہا تھا کہ دفعتاً پیرانی صاحبہ کے گریہ کی آواز آئی اور وہ بدحواس ہو کر گھر میں گھومنے لگیں، کیونکہ ان کو بھائی کے انتقال کی خبر ملی جو پردیس میں تھے اور اس اندوہناک خبر سے اُن کے کلیجہ میں آگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ حضرت نے اوپر سے جھانکا فرمایا اس کا انتقال نہیں ہوا اور جس نے تم کو یہ خبر پہونچائی ہے خدا کی قسم غلط پہونچائی ہے" مگر سانحہ ایسا تھا کہ ان کو قرار نہ آیا۔ مگر اس کے بعد خبر آئی کہ غلط افواہ تھی اور بحمداللہ وہ اب تک بقیدِ حیات ہیں۔ ایک مرتبہ آپ بالاخانہ پر چڑھ رہے تھے کہ ایک شخص جس کا ایک عزیز سلطان کے ولیعہد کی معیت میں کہیں باہر گیا ہوا تھا آیا اور کہنے لگا کہ حضرت فلاں شخص سے جو بظاہر سچا اور صالح ہے مجھے خبر ملی ہے کہ میرا عزیز بخیریت ہے مگر میرا دل بے چین ہے آپ فرمائیے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ حضرت نے معاملہ کو گول کیا مگر جب ان کا اصرار ہوا تو فرمایا جب تم مانتے ہی نہیں آتے تو صحیح خبر یہ ہے کہ غریب الوطن حاج عبدالکریم (سبکی پر) کہ اس کے عزیز کا یہی نام تھا) اللہ کی رحمت نازل ہو۔ اس کو تو ولیعہد نے قتل کردیا۔ اور مجھے وہاں کے اُس صاحب خدمت نے اطلاع دی ہے جو اس کے جنازہ کی نماز میں شریک تھا چنانچہ بعد میں یہی خبر آئی۔ حضرت ممدوح کے پاس ایک خادم ملازم تھا جس کو معاوضۂ خدمت میں حضرت کچھ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مگر وہ حاکم سے روپوش تھا۔ اس کا ایک بھائی اس کی تخریب و ایذاء رسانی کے درپے تھا۔ حضرت نے اس کو سمجھایا بھی کہ اس کا پیچھا

چھوڑدے مگر وہ نہ مانا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ حاکم ضلع کے پاس پہونچا اور مخبری کی کہ میرا بھائی شیخ عبدالعزیز کے پاس موجود ہے اور وہ مجھے اس پر قابو پانے نہیں دیتے۔ چنانچہ سپاہی کو تعینات کردیا گیا اور وہ مخبر کو لئے ہوئے حضرت کے پاس آیا اور کہا اٹھو افسر پولیس نے بلایا ہے۔ حضرت نے فرمایا کیا مجھے؟ اس نے کہا ہاں تمہیں اور تمہارے نوکر کو فرمایا حکم حاکم بسر وچشم۔ حاضر ہوں کہ رعیت ہوں اور ناچیز مسکین۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ چلو۔ چنانچہ ہم سب محکمہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ میں سپاہی کو ندامت ہوئی اور اس نے کہا حضرت ہمیں ضرورت صرف اس شکایت کنندہ کے بھائی کی تھی جس کو ہم نے گرفتار کرلیا لہذا آپ واپس تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا اور میں نے اس کی گرفتاری سے تم کو کب روکا تھا۔ چنانچہ ہم لوٹ آئے اور وہ ملازم کو لے کر چلے گئے۔ مہینہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اس کا بھائی دنیا سے رخصت ہوگیا اور شیخ کا ملازم واپس آگیا کہ اب کوئی خدشہ ہی باقی نہ رہا۔ جن ایام میں مشہور قبیلہ بنی بزناسن کا واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے بغاوت کی اور سلطان کی طرف سے ان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو قصبہ تازہ کے ایک اہل کار نے اس آگ کو باشندگان تازہ پر لا برسانے کی غرض سے ایک جعلی تحریر مرتب کی جس میں بنی بزناسن کے نام ان کی طرف سے لکھا تھا کہ ہم ہر طرح تمہارے ہم خیال اور حامی و مددگار ہیں۔ اور اس کاغذ کو سلطان کے حضور میں جا پیش کیا۔ سلطان یہ دیکھتے ہی بھڑک اٹھے اور ارادہ فرمایا کہ انتقام لینے کے لئے گورنر کو روانہ کریں کہ دفعتہً خیال آیا اور محض بمزید احتیاط اس اہل کار کو نظر بند کرلیا۔ باشندگان تازہ کو اطلاع ملی تو کانپ گئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بھاگ جانے اور وطن چھوڑ کر روپوش ہو جانے کا مشورہ لینے لگے۔ حضرت خاموش سنتے رہے اور پھر فرمایا کہ اگر تم مانو تو اپنی رائے ظاہر کروں۔ سب نے کہا حضرت ضرور ارشاد فرمائیں کہ اسی کو معلوم کرنے کے لئے تو ہم آئے ہیں اور یقیناً اسی پر عمل کریں گے۔ فرمایا تم کو سیدھا سلطان کی طرف رخ کرنا چاہیے البتہ ان سے پہلے وزیر سے مل لینا چاہیے۔ چنانچہ حسب ارشاد حضرت والا سب روانہ ہوگئے اور وزیر کے پاس پہونچے۔ وزیر صاحب ان کو بارگاہ سلطانی میں لے گئے اور بہت کچھ کلمات خیر کہہ کر اہلکار نے ان پر جو افترا باندھا تھا اس سے بالکل بری و بے لوث ہونے کا اظہار کیا۔ اس پر سلطان نے فوراً ہی اہلکار کو بلایا اور قتل کردیا۔ ایسا ہی ایک قصہ دوسرے شخص کا پیش آیا کہ فاس ہی میں اس سرکاری عملہ کا ایک ممبر تھا جس میں سلطانی

عتاب پر) کچھ اوپر بیس آدمی شوال ۱۳۱۰ھ میں قتل کیے جا چکے تھے اور تفتیش جاری تھی۔ یہ شخص گرفتاری سے قبل گھبرایا ہوا حضرت کے پاس آیا اور مفرور ہو جانے کا خیال ظاہر کیا۔ حضرت نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ حاکم ضلع کے سامنے جا کھڑے ہو اور کہہ دو کہ میں حاضر ہوں جو بھی آپ کا منشا ہو مجھے تحمیلِ حکم میں کوئی عذر نہیں چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ حاکم ضلع نے کہا اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو فوراً محیج چلے جاؤ اور وہاں تیراندازوں کے ساتھ ہو کر فوجی خدمات انجام دو۔ یہ شخص حضرت کے پاس پھر آیا۔ آپ نے فرمایا بس جلدی۔ چنانچہ یہ شخص روانہ ہو گیا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ حاکم ضلع معہ اپنے آدردوں کے گرفتار ہو گیا اور ان میں اسی تعداد کے آدمی قتل کیے گئے (جتنوں کو اس نے قتل کرایا تھا) حضرت کی برکت سے یہ شخص بچ گیا اور ظالموں کو اپنے کیے کا بدلہ مل گیا۔ یہ عادات حضرت کی میں نے بارہا دیکھی کہ جب کوئی مفرور ہونے کا مشورہ لیتا۔ تو آپ اس کو منع فرماتے اور بتاکید کہا کرتے تھے کہ حاکم کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔ اور میں نے اس کا انجام ہمیشہ بہتر ہی پایا ہے۔ ایسے واقعات اگر درج کروں تو بہت طول ہو جائے۔ ایک افسر کو سلطان نے معطل کر دیا۔ وہ حضرت کی خدمت میں دُعا کے لئے حاضر ہوا کہ اپنے عہدہ پر بحال ہو جاؤں۔ حضرت نے اس سے وعدہ فرمالیا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ سلطانی فرمان اس کی بحالی کا آگیا۔ اتفاق سے حضرت نے چند حفاظ کلام اللہ کے متعلق اس سے سفارش کی کہ فلاں ٹیکس ان سے معاف کر دیا جائے۔ مگر حاکم نے سفارش کو نہ مانا اور صاف انکار کر دیا۔ اب اس حاکم کا بھائی حضرت کی خدمت میں آیا اور حضرت نے اس سے وعدہ فرمایا کہ بھائی کا عہدہ تم کو مل جائے گا۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور اس کا بھائی اس جگہ پر مامور ہوا۔ اس نے حضرت کی سفارش جس کے متعلق بھی تھی پوری کر دی۔ میرا پہلا نکاح مولانا محمد بن عمر سلجاسی امام وخطیب مسجد مولانا ادریسؒ کی لڑکی سے ہوا تھا۔ اُدھر تو مولانا کی شان علمی و مرتبہ علیا سے واقفیت اور اِدھر خود لڑکی کی عقل وسلیقہ شعاری اور حسن معاشرت اس لئے مجھے اس کے ساتھ بہت ہی محبت تھی۔ چونکہ حضرت کو بھی اس کا علم تھا کہ مجھے جتنی محبت اپنی بیوی کے ساتھ ہے دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں اس لئے کبھی کبھی پوچھا کرتے تھے۔ کیوں جی ہمارے ساتھ بھی تمہیں اتنی ہی محبت ہے۔ جتنی بیوی کے ساتھ ہے یا وہ زیادہ پیاری ہے؟ میں سچ بولتا اور عرض کر دیتا تھا کہ حضرت اس کی محبت زیادہ ہے۔ اور درحقیقت میں معذور تھا کہ حضرت کے مرتبہ

سے جاہل اور امامِ وقت ہونے سے ناواقف تھا۔ حضرت پر اس جواب کا اثر ہوا کرتا تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ مرید کے قلب میں جب تک اپنے شیخ اور اللہ و رسول کے سوا غیر کا تسلّط ذرا بھی رہے گا اس کا کچھ بھی کام نہ بنے گا۔ غرض اس بارہ میں آپ میرا قدم آگے بڑھانے اور اس حالت سے مجھے منتقل کرنے کی تدبیر میں لگے رہے۔ مگر میں باز نہ آیا۔ آخر ستائیسویں شب رمضان ۱۱۲۵ھ کی صبح کو جب میں حاضر ہوا تو آپ نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ اولیاء اللہ کے ساتھ ربط و ضبط بمنزلہ زہر خوردانی کے ہے اور ہمارے فلاں بزرگ نے تو اپنے مرید کے لئے نہ بیوی چھوڑی نہ بچہ۔ ان کو محض اپنا بنا لیا تھا۔ میں اس اشارہ کو بالکل نہ سمجھا حتیٰ کہ چند ہی دن بعد میری بیوی مبتلائے مرض ہوئی اور بہت کچھ علاج کیا مگر دُنیا سے رخصت ہو گئی۔ چونکہ اس کو بھی حضرت سے محبت تھی اور حضرت بھی اس سے محبت فرماتے تھے اس لئے حضرت اس کے لئے دوائیں اور وہ اشیاء جن کی مریض کو رغبت و ضرورت ہوتی ہے اس کو بھیجا کرتے اور یہ بھی امید دلایا کرتے تھے کہ شفا نصیب ہو گی۔ مگر اس سے مراد شفائے آخرت ہوتی تھی جیسا کہ بعد میں خود ظاہر فرمایا۔ اس کی وفات کے بعد میری گرویدگی بچّہ کے ساتھ بڑھی جسے وہ (اپنی نشانی) کے طور پر چھوڑ گئی تھی کہ جب اس کو دیکھتا تو قلب اسی کا ہو رہتا تھا۔ ماں کے بعد وہ بھی چند ہی روز زندہ رہا اور آخر انتقال کر گیا۔ اس کے بعد میں نے مولانا کی دوسری لڑکی (یعنی اپنی سالی) سے نکاح کیا اور وہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے میرے دل کی مالک بن گئی۔ مگر وہ بھی زندہ نہ رہی اور تھوڑی مدّت بعد سفرِ آخرت کر گئی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے مجھے شیخ کی محبت کاملہ نصیب فرمائی جس سے بالا کوئی محبت نہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور آپ محبت الٰہیہ کے متعلق تقریر فرما رہے تھے کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ میں اس کے متعلق سوال پر سوال کر رہا تھا اور حضرت ان کا جواب دے رہے تھے (یہ سوال و جواب میں نے درج کتاب بھی کر دیئے ہیں جو ناظرین کی نگاہ سے انشاء اللہ گزریں گے) اس کے بعد حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ ہم تمہارے متعلق آخر کیا تدبیر کریں۔ دنیا میں تم بیویوں ہی سے محبت رکھتے رہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا اور ان کی روحوں کو دیگر ارواح کے ساتھ عالم برزخ میں جگہ دے دی مگر تم اب بھی انہیں کی محبت کاملہ پر جمے ہوئے ہو۔ بھلا اب عالم برزخ سے نکال کر حق تعالیٰ ان کو کہاں پہونچا دے کہ تمہارا قلب ان کی محبت سے خالی ہو جائے بس حضرت کے ان کلمات نے ان کی محبت کو میرے قلب سے دھو دیا اور

اور اب ساری محبت خالص شیخ کے ساتھ ہوگئی۔ کہ تیسرا نکاح بھی میں نے اپنی دوسری سالی سے کیا مگر اس کے ساتھ وہ رنگ نہ ہوا کہ دل اسی کا ہو رہے۔ فالحمد للہ علی السلامۃ والعافیۃ۔ ایک مرتبہ حضرت مخدومہ پیرانی صاحبہ کو حمل قرار پایا۔ آپ حضرت سے کہنے لگیں اے میرے سردار اللہ نے مجھے کافی بچے دے دیئے ہیں اس حمل کی مجھے ضرورت نہیں ہے خصوصاً جب کہ خانگی امور اور مہمانوں کی خدمت کا بوجھ میرے سر پر ہے اور کوئی باندی بھی ہمارے پاس نہیں ہے جس سے کام میں مدد لیں۔ لہذا اگر تم واقعی ولی ہو جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں تو دعا کرو یہ حمل گر جائے کہ واقعی مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ حضرت شیخ ان کو ہمیشہ اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے کہ سر ڈھانپ لینے اور سو جانے کے بعد کبھی اپنا منہ نہ کھولیں۔ مبادا ایسی چیز نظر آجائے جس کی برداشت نہ کر سکیں۔ مگر اتفاق سے ایک بار وسط شب میں ان کا منہ کھل گیا اور ان کو شیخ کے پاس تین مردان غیب دکھائی دیتے اس سے ان کے دل میں اتنا خوف بیٹھا کہ فوراً اسقاط حمل ہو گیا۔ حضرت شیخ کی اس حالت کا اہل خانہ اور بعض زائرین نے بھی مشاہدہ کیا تھا کہ آپ کو کبھی کبھی اپنے جسم سے ایک خفیف غیبوبت حاصل ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ روح بدن سے نکل گئی اور نہ سانس میں حرکت باقی ہے نہ نبضوں میں اور نہ رگوں میں۔ چنانچہ ایک دن آپ پر یہ حالت طاری تھی کہ جانیوالوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس پہونچ گیا اور اس نے دیکھا کہ بجلی کی طرح ایک روشنی پھیلی ہوئی ہے مگر بجلی کی سی اس میں سرعت نہیں ہے اور بہ اس سے زیادہ صاف۔ اس نے باہر آکر دوسروں کو خبر دی اور اب جتنے بھی موجود تھے۔ سب نے وہاں جا کر آپ کی اس حالت کو دیکھا۔ اگلے دن جب میں حضرت سے ملا اور آپ کے ساتھ نشستگاہ میں آیا تو آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھی اور فرمایا کل میری ایک ایسی بات کا ظہور ہو گیا جس کو ہمیشہ مخفی رکھنے کی عادت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت واقعہ تو میں بھی سن چکا ہوں مگر اس میں راز کیا تھا۔ فرمایا وہ نور تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور پھر بڑی بڑی مفید باتیں بیان فرمائیں۔ نیز حضرت ممدوح کی ایک کرامت میں نے حاج عبدالقادر تازی کی بیاض میں خود حضرت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی۔ وہ یہ تھی کہ حضرت ممدوح بچپن میں محمد بن عمر ولائی کے پاس حمام کی خدمت (بصورت ملازمت) انجام دیا کرتے تھے۔ جب وہ سفر حج میں روانہ ہوئے تو حضرت اسی کام پر ان عبدالقادر کے پاس ملازم ہو گئے۔ عبدالقادر نے خود مجھ سے کہا کہ ایک دن سید عبدالعزیز نے میری بنائی

اٹھاکر اس پر لکھ دیا الحمد للہ وحدہٗ ۔ آج میرے آقا محمد بن عمر کی وفات ہوگئی اور وہ جوارِ رحمت الٰہیہ میں پہونچ گئے ۔ کتبہ عبد العزیز ابن مسعود دباغ ۔ ماہ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ۔ میں نے آواز دی اور کہا یہ کیا لکھ رہے ہو۔ انہوں نے فوراً قلم اٹھاکر تحریر کو قلم زد کردیا اور فرمایا کچھ نہیں لکھا۔ میں اس سے پہلے بھی ان کی کرامتیں دیکھ چکا تھا اس لئے انتظار رہا اور جب حجاج واپس آئے تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمر کا ماہِ ذیقعد میں انتقال ہوگیا میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ فتح تو حضرت کو ۱۱۲۵ھ میں عطا ہوئی پھر یہ واقعہ کیسے ہوا۔ فرمایا فتح (اور کشف) تو مجھے اسی وقت سے حاصل ہوگیا تھا جب میں نے حضرت عمر بن فشتالی کی امانت کو بہایا تھا ۔ مگر وہ تنگ تھی کہ جب کسی شے کی طرف توجہ کرتا تو وہ شے ظاہر ہوجاتی تھی مگر بجز اس کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا جس زمانے میں آپ محمد بن عمر کے پاس ملازم تھے صبح ہی صبح پانی گرم کرنا آپ کا کام تھا۔ ایک دن ذرا دیر ہوگئی تو منیجر آپ پر بڑبڑایا۔ اس پر آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا تو جتنی لکڑیاں چاہے پھونک اور جلا لو واللہ یہ دیگ کبھی گرم نہ ہوگی۔ چنانچہ صبح سے لے کر عصر تک لکڑیاں جلائیں مگر پانی ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہی رہا۔ محمد بن عمر کہیں گئے ہوئے تھے جب آئے تو سارا قصہ معلوم ہوا۔ کہنے لگے پیارے عبد العزیز مجھے تو تمہارے ساتھ محبت ہے اور تمہاری خدمت کرتا رہتا ہوں مگر تم مجھے خسارہ دینا چاہتے ہو جس نے تم کو ڈانٹا تھا بھلا اس کو کیا نقصان پہونچا۔ اس میں نقصان تو میرا ہے اور میری کوئی خطا نہیں۔ غرض شیخ کو ترس دلانے اور راضی کرنے کی باتیں کرتے رہے ۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے شرم آگئی ۔ کیونکہ درحقیقت اگر میں کام بھی نہ کرتا تو وہ مجھے اجرت دیا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ میں تو برکت کی غرض سے رکھے ہوئے ہوں نہ کہ کام کی خاطر۔ لہذا میں نے لکڑیاں دیگ کے نیچے رکھیں اور کہا کہ تم لوگوں کو آگ جلانا تو آتا نہیں لو دیکھو پانی کھولنے لگا۔ ہاتھ لگایا تو واقعی پانی تیز گرم تھا۔ یہ قصہ میں نے بہت لوگوں سے سنا اور خود حضرت ممدوح سے بھی سنا۔

آپ کی ایک بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ سے کسی علمی مسئلہ میں علماء کے اقوال دریافت کیا کرتا تو باوجود امی ہونے کے آپ کو ہر مسئلہ سے پورا واقف پاتا ۔ حتی کہ جس مسئلہ پر سب کا اتفاق ہوتا اور جس میں اختلاف ہوتا دونوں کو واضح فرماتے اور علماء ظاہر و باطن کے ہر مسئلہ میں جتنے بھی اقوال ہوتے سب کا ذکر کردیا کرتے تھے ۔ پورے چھ سال تک اس کا

تجربہ کرتا رہا۔ نیز قرون ماضیہ میں جو حوادث ہو چکے تھے۔ ان کی بھی واقفیت تامہ رکھتے تھے۔ ایک دن میں آپ کے ساتھ سوق الخمیس میں تھا کہ گرج اور بجلی اور کڑک کا سبب دریافت کر بیٹھا تو اس بارہ میں آپ نے ایسی نفیس تقریر فرمائی جس کو آپ ہی جیسا شخص نقل کر سکتا ہے سلسلہ گفتگو میں اس آگ کا تذکرہ آگیا جو قرنیطہ میں بماہ جمادی الآخر ۶۵۴ھ ظاہر ہوئی تھی۔ اور اس کو حافظ ابن حجر نے کتاب الفتن میں اور قرطبی نے تذکرہ میں اور ابو شامہ و امام نووی نے اپنی تصانیف میں مفصل بیان کیا ہے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ ان کی روایات آپ کو سناؤں مگر آپ خود اس کا قصہ اور یہ کہ وہ کس طرح پھیلی بیان فرمانے لگے حتیٰ کہ تمامی علماء تاریخ کے اقوال نقل فرما دیئے۔ بلکہ اتنا زائد کہ اس کا سبب کیا ہوا تھا اور نیز اس شخص کا نام جس کو آخرت میں اس آگ کا عذاب دیا جائے گا مع دیگر اسرار کے جن کا اظہار مناسب نہیں ہے۔ غرض آپ کی کرامتیں اتنی بے شمار اور ان گنت ہیں کہ اپنی اور اپنے دوستوں کی معلومات ہی کو ڈھونڈ کر جمع کروں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ مگر طالب کے لئے اتنی ہی مقدار کافی ہے اس لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں' البتہ جس طرح ایک بڑی کرامت (یعنی سلامتی عقائد و استقامت علی الدین) سے اس مبحث کو میں نے شروع کیا تھا اسی طرح ایک بڑی کرامت پر اس کو ختم کرتا ہوں' اور وہ یہ ہے کہ شروع میں مجھے آپ سے تعارف ہوا اور آپ کی وسعت عرفان و فیضان ایمان کو میں نے دیکھا تو آپ کی آزمائش کی غرض سے صحیح اور موضوع حدیثوں کا آپ سے استفسار کرنے لگا کہ میرے پاس علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تالیف کردہ کتاب الدرالمنتثرہ فی الاحادیث المشتہرہ موجود تھی جو ایک عجیب کتاب ہے جتنی احادیث عام لوگوں میں مشہور ہیں سب کو حروف تہجی پر ترتیب دے کر ہر حدیث کے متعلق یہ ظاہر کیا ہے کہ صحیح ہے یا (من گھڑت) موضوع کسی طالب علم کو اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے کہ نہایت نفیس کتاب ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت شیخ سے پوچھا کہ اُمِرْتُ اَنْ اَحْکُمَ بِالظَّوَاهِرِ وَاللّٰهُ یَتَوَلَّی السَّرَائِرَ کیسی حدیث ہے۔ فرمایا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نہیں ہے چنانچہ علامہ سیوطی نے بھی یہی کہا ہے۔ میں نے پوچھا اور کُنْتُ کَنْزًا لَا اُعْرَفُ الخ فرمایا یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نہیں ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی یہی لکھا ہے کہ لا اصل لہ۔ پھر حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلُ کو سنایا۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ احمد بن حنبل کا قول بھی یہی ہے اور علامہ ابن الجوزی نے

اس کو الموضوعات میں لکھا ہے اور ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث جھوٹی ہے۔ علامہ زرکشی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بالاتفاق موضوع ہے ایسے ہی علامہ سیوطی نے (اپنی دوسری تالیف) اللئالی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ۔ میں اس کو موضوع لکھا ہے' الکرر منتثرہ میں ایک دوسری صحیح حدیث کو اس کا شاہد بنایا ہے (مگر اس سے صرف مضمون کا صحیح ہونا ثابت ہوگا۔ اس کے الفاظ بدستور موضوع رہیں گے) بایں ہمہ وہ شاہد حسنؒ کی مرسل حدیث ہے اور ابن حجرؒ نے شرح میں لکھا ہے کہ حسنؒ کی احادیث مرسلہ قابل استدلال نہیں ہیں۔

پھر اس حدیث کے متعلق دریافت کیا اِتَّخِذُوا عِنْدَ الْفُقَرَاءِ يَدًا فَاِنَّ لَهُمْ دَوْلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الحاوی فی الفتاوی میں یہی لکھا ہے۔ پھر اس حدیث کے متعلق دریافت کیا۔

اُحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّي عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ۔ فرمایا یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ پھر عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ کی بابت دریافت کیا۔ فرمایا یہ بھی حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی کا درر میں یہی قول ہے۔ پھر اَكْرِمُوْا عَمَّاتِكُمُ النَّخْلَ کی بابت دریافت کیا۔ فرمایا یہ بھی حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ ابن حجرؒ نے شرح میں اور سیوطی نے لئالی مصنوعہ میں اور ابن الجوزی نے الموضوعات میں یہی لکھا ہے۔

پھر حدیث اَنَا اَفْصَحُ مَنْ نَطَقَ بِالضَّادِ کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر نے اور النشر میں علامہ ابن الجزری نے اور علامہ سیوطی نے درر میں ایسا ہی لکھا ہے۔ الغرض مجھے محفوظ نہیں رہا بہتری حدیثوں کے متعلق میں نے دریافت کیا اور آپ کا جواب بالکل علماء محدثین کے موافق پایا۔ اس سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ پائی کہ میں جب اس مبحث میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں ایک حدیث جو بخاری میں آئی ہے مگر مسلم میں نہیں آئی' اور دوسری حدیث جو مسلم میں آئی ہے مگر بخاری میں نہیں آئی آپ دونوں کو متمیز فرما دیتے تھے۔ آخر جب پورا امتحان کر چکا اور مجھے محقق ہو گیا کہ حدیث کی شناخت آپ کو پوری ہے تو میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ یہ کس طرح معلوم کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام چھپ نہیں سکتا۔ پھر دوسری مرتبہ میں نے یہی سوال کیا تو فرمایا انسان جب جاڑے کے موسم میں بات کرتا ہے تو

تو اُس کے مُنہ سے بھاپ نکلتی ہے اور جب گرمی کے موسم میں کلام کرتا ہے تو بھاپ نہیں نکلتی۔
اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جب کسی کے مُنہ سے نکلے گا تو اس سے ایک نور خارج ہوگا۔
اور جب دوسرے کا کلام مُنہ سے نکلے گا تو وہ نور سے خالی ہوگا۔ پھر ایک مرتبہ میں نے آپ سے یہی
سوال کیا تو فرمایا چراغ کو جب اُس کی غذا ملتی (اور اس میں تیل ڈالا جاتا ہے) تو اس کی روشنی
قوت پکڑتی ہے۔ اور جب اس کو غذا نہیں ملتی تو بدستور اپنی حالت پر رہتا ہے۔ اسی طرح اہل
عرفان جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنتے ہیں تو ان کے انوار میں قوت اور معارف میں
بیشی ہوتی ہے۔ اور جب دوسرے کا کلام سنتے ہیں تو ان کی حالت بدستور رہتی ہے۔ جب
مجھے معلوم ہوگیا کہ اس میں بھی آپ کا قدم اتنا راسخ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن
مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کی شناخت میں کبھی نہیں ڈگمگاتا تو میں نے قرآن اور حدیث میں
فرق کے متعلق آپ کو آزمانا چاہا کہ آپ حافظ قرآن تو کیا بجز سبّح کے حزب کے دوسری سورتیں
بھی آپ کو یاد نہ تھیں۔ چنانچہ میں ایک مرتبہ قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھتا اور پوچھتا کہ حضرت یہ
قرآن ہے یا حدیث؟ آپ فرماتے کہ یہ قرآن ہے۔ پھر دوسری مرتبہ ایک حدیث سناتا اور پوچھتا
کہ یہ حدیث ہے یا قرآن فرماتے کہ یہ تو حدیث ہے۔ غرض اس کا بھی بہت کچھ امتحان کیا۔
حتی کہ ایک مرتبہ میں نے کہا حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَهِيَ صلوة العصر وَ
قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ کلام اللہ ہے یا کلام الرسول۔ فرمایا اس میں کچھ تو قرآن ہے اور
کچھ حدیث اور وهی صلوة العصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے نکلا ہے۔
صرف یہ کلام اللہ نہیں ہے۔ باقی سب کلام اللہ ہے۔ میرے استفسار کے وقت علماء کی
ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سن کر والله ہم سب حیران ہوگئے۔ جب مجھے علم ہوگیا کہ
حدیث و قرآن میں امتیاز بھی آپ کو پورا حاصل ہے تو مجھے خیال آیا کہ قرآن اور احادیث
قدسیہ میں فرق کے متعلق آپ کو آزماؤں۔ چنانچہ میں ایک حدیث قدسی پڑھتا اور آپ
سے دریافت کرتا کیا یہ قرآن ہے؟ فرماتے یہ تو نہ قرآن ہے نہ ایسی حدیث ہے جیسی تم پہلے
پوچھتے رہے ہو بلکہ حدیث ہی کی دوسری قسم ہے جس کو حدیث ربانی کہنا چاہئے۔ میں نے آپ کا
ہاتھ چوم لیا۔ اور عرض کیا کہ حضرت ہماری آرزو یہ ہے کہ تینوں کا فرق سمجھا دیں۔ کیونکہ حدیث
قدسی کو کچھ تو مشابہت قرآن سے اور کچھ مشابہت ہے غیر قدسی حدیث سے۔ قرآن کے
ساتھ مشابہت ہے بلحاظ منزل من اللہ ہونے کے اور غیر قدسی حدیث کے ساتھ بہت

ہے اس بارہ میں کہ اس کی تلاوت کو عبادت نہیں قرار دیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ تینوں کلام اگرچہ نکلے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دہن مبارک سے ہیں اور آپ کے انوار تینوں میں موجود ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں یہ فرق ہے کہ قرآن میں جو نور ہے وہ قدیم ہے' ذات حق سبحانہ کا نور کہ اس کا کلام قدیم ہے۔ اور حدیث قدسی میں جو نور ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کا نور ہے' اور نورِ قرآن کی طرح نہیں ہے' کہ قرآن کا نور قدیم ہے اور اس کا نور قدیم نہیں۔ اور غیر قدسی حدیث میں جو نور ہے وہ ذات محمدی کا نور ہے۔ لہٰذا نسبت کے لحاظ سے تین قسم کے نور ہو گئے۔ کہ نورِ قرآن منسوب ہے ذات باری عزاسمہ کی طرف اور حدیث قدسی کا نور منسوب ہے روح محمدی کی طرف۔ اور عام احادیث کا نور منسوب ہے ذات محمدی کی طرف صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں نے سوال کیا کہ نور روح اور ذات میں کیا فرق ہے؟ فرمایا کہ ذات پیدا ہوئی مٹی سے اور مٹی ہی سے سب بندوں کی پیدائش ہے۔ اور روح کا تعلق ملاء الاعلیٰ سے ہے اور ملا ء اعلیٰ تمامی مخلوق میں سب سے زیادہ حق تعالیٰ کی معرفت رکھنے والی جماعت ہے۔ اور چونکہ ہر شئے اپنی اصل کی طرف رجوع کیا کرتی ہے۔ لہٰذا نورِ روح کو تعلق ہوگا خالق کے ساتھ' اور ذات کو تعلق ہوگا مخلوق کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث قدسیہ کا تعلق جہاں بھی دیکھو گے حق تعالیٰ کے ساتھ دیکھو گے یا اس کی عظمت ظاہر کرے گی یا اس کی رحمت اور یا اس کی وسعت ملک و کثرتِ عطا (چنانچہ مسلم میں ابوذر کی حدیث یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ الخ میں عظمت الٰہیہ کا اظہار ہے اور حدیث قدسی اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ الخ رحمت الٰہیہ کی مظہر ہے اور حدیث یدُ اللّٰہِ مَلْاٰی لَا یَغِیْضُھَا نَفَقَۃٌ سَحَّاءُ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ الخ اللہ کے وسعت ملک و کثرت عطا کو ظاہر کر رہی ہے) اور ذات باری ہیں ان کمالات کا علم روح کے ہی علوم میں سے ہے۔ اور غیر قدسی احادیث کو دیکھو گے کہ ان کا روئے سخن صرف ان امور کی جانب ہے جن کا تعلق عباد و بلاد کی اصلاح (اور دنیا و مافیہا کے مصالح) کے ساتھ ہے۔ مثلاً حلال و حرام چیزوں کی تفصیل یا عذاب و ثواب کا تذکرہ کہ حکم خدا کی تعمیل پر آمادہ کریں وغیرہ۔ یہ نا تمام خلاصہ ہے حضرت کی تقریر کا جو میں سمجھا ہوں' ورنہ حق یہ ہے کہ میں نہ آپ کی جامع تقریر کو ضبط کر سکا اور نہ پورے مفہوم کو ادا کر سکا۔ پھر میں نے سوال کیا کہ حدیث قدسی اللہ کا کلام بھی ہے یا نہیں۔ فرمایا

نہیں، وہ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، اللہ کا نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا پھر وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیوں ہے؟ کہ اس کا نام حدیث قدسی رکھا اور اس کی روایت کرنے میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے روایت فرماتے ہیں۔ جب یہ کلام الرسول ہے تو پھر رب سے روایت کہاں ہوئی اور احادیث مذکورہ میں ضمیر متکلم کیسے صحیح ہوئی کہ اے میرے بندو، اور میں نے اپنے بندوں کے لئے فراہم کیا ہے، اور میرے کچھ بندے صبح کو مومن اٹھے اور کچھ منکر۔ کیونکہ اس طرح تو فرمانا حق تعالیٰ ہی کا حق ہے (نہ کہ رسول کا کام) لہٰذا احادیث قدسیہ کو اللہ کا کلام ہونا چاہیئے اگرچہ (قرآن مجید کی طرح) نہ اُن کے الفاظ معجز ہوں اور نہ ان کی تلاوت داخل عبادت ہو۔ یہ سن کر ایک مرتبہ تو یہ تقریر فرمائی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر انوار برسا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کو مشاہدۂ خاصہ حاصل ہوتا تھا۔ اگرچہ مشاہدہ میں آپ ہر وقت رہتے تھے (مگر پھر بھی بعض انوار کی خصوصی شان آپ پر خصوصی مشاہدہ کا سبب بنتی تھی۔) پس اس مشاہدۂ خاصہ میں اگر آپ کو انوار کے ساتھ (بلا واسطہ) حق تعالیٰ کا کلام سُنائی دیتا یا فرشتہ نازل ہوتا (اور کلام الٰہی سناتا) تو وہ قرآن کہلاتا تھا۔ اور اگر نہ کلام سُنتے اور نہ فرشتہ آتا تو وہ وقت حدیث قدسی کا ہے اور اس حالت میں آپ جو کچھ بھی کلام فرماتے تھے وہ صرف شانِ ربوبیت کے متعلق ہوتا تھا کہ اسی کی عظمت و سطوت کا اظہار ہوتا تھا یا اس کے حقوق شاہانہ کا بیان۔ رہا اس کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مشاہدۂ خاصہ میں تمام امور خلط ملط ہو جاتے تھے حتیٰ کہ باطن بحکم ظاہر اور غیب بمنزلۂ شہادت بن جاتا تھا۔ لہٰذا اس کا انتساب رب کی طرف ہوا کہ اس کا نام حدیث ربانی رکھا گیا اور اس کے متعلق یہ کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنے رب سے روایت فرماتے ہیں۔ اور ضمیروں کی وجہ یہ ہے کہ اپنے رب کی شان کو مشاہدہ فرما کر بزبانِ حال (حق تعالیٰ کی طرف سے) نقل فرمایا۔ باقی احادیث غیر قدسیہ آپ کا وہ کلام ہے جو ذات مطہرہ میں ہمہ وقت رہنے والے نور کے ساتھ دہن مبارک سے نکلا کہ وہ نور کسی حال بھی آپ سے جُدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح جرم آفتاب کو انوار محسوسہ سے نوازا ہے اسی طرح ذات محمدی کو انوارِ حق سے نوازا ہے۔ کہ جیسے سورج کی روشنی سورج کے ساتھ لگی ہوئی ہے کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ذات محمدی کے لئے نورِ حق لازم و دائم ہے کہ کسی وقت علیحدہ

نہیں ہوتا (لہذا کوئی حدیث بھی حقانیت سے خالی نہیں) دوسری مرتبہ (اس کی شرح
بصورت تمثیل اسی طرح) بیان فرمائی کہ فرض کرو ایک شخص کو ایک خاص مقدار پر ہر وقت
بخار رہتا ہے۔ اور کسی وقت زور پکڑ کر اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ ہوش و حواس کھو دیتا ہے
اور ایسی حالت کر دیتا ہے کہ وہ خود بھی نہیں سمجھتا کہ کیا کہہ رہا ہوں اور کبھی اتنا تیز ہوتا ہے
کہ حواس بھی معطل نہیں ہوتے اور عقل و شعور بھی قائم رہتا ہے کہ زبان سے جو کہتا ہے
اس کو سمجھتا بھی ہے۔ پس بخار کی تین حالتیں ہوئیں۔ ایک دائمی جو معین مقدار پر ہے۔
دوم اتنا قوی جس نے حواس کو معطل بنا دیا۔ سوم بین بین کہ معتاد سے زائد ہے۔ مگر
حس و عقل قائم ہیں۔ یہی حال ذات محمدی میں انوار حقہ کا ہے کہ جب وہ مقدار معین
و معتاد پر ہوتے تھے تو ایسی حالت میں جو کلام فرماتے اس کا نام حدیث ہے غیر قدسی۔ اور
جب وہ انوار ذات محمدی میں مشتعل ہوتے اور اتنا زور پکڑتے کہ آپ کو حالت معتادہ سے
باہر (حواس ظاہریہ لبشریہ سے بالا) بنا دیتے تو ایسی حالت میں دہن مبارک سے نکلا ہوا
کلام قرآن کہلاتا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی
حالت ہوتی بھی تھی۔ اور جب ان انوار میں اشتعال تو ہوتا تھا مگر اتنا کہ آپ کو حالت
معلومہ سے باہر نہ نکالتا تھا تو ایسی حالت کا کلام حدیث قدسی کہلاتا ہے اور ایک مرتبہ اس کی
تقریر اس طرح فرمائی کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلا ہوا
ہوا کلام اگر آپ کے اختیار و ارادہ کے بغیر نکلا ہے تب تو قرآن ہے اور اگر باختیار و ارادہ
نکلا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر عارضی انوار بھی اس وقت مشتعل ہیں تو وہ
حدیث قدسی ہے اور اگر صرف دائمی انوار ہیں تو اس کا نام حدیث ہے غیر قدسی۔ اور چونکہ
آپ کے کلام کے ساتھ انوار حق سبحانہ کا ہونا لازم و ضروری ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی آپ
کی زبان مبارک سے نکلا ہے وہ سب وحی الہٰی ہے۔ البتہ انوار کی حالتوں کے اختلاف سے اسکی
خصوصیتیں بن گئی ہیں۔ واللہ علم۔ میں نے عرض کیا بات تو بڑی پیاری ہے مگر سوال یہ ہے کہ حدیث اللہ کا
کلام نہیں ہے۔ اسکی کیا دلیل ہے۔ فرمایا اللہ کا کلام تو چھپ نہیں سکتا۔ (گویا وہ خود کہہ دیتا ہے
کہ میں کلام خدا ہوں) میں نے کہا کہ بذریعہ کشف؟ فرمایا کہ بذریعہ کشف بھی اور بلا واسطہ
کشف بھی۔ کہ حق تعالیٰ نے جس کو بھی عقل عطا فرمائی ہے جب وہ اللہ کے کلام پر کان
لگائے گا اور اس کے بعد کسی دوسرے کا کلام سنے گا تو لامحالہ دونوں میں فرق محسوس کریگا
دیکھو حضرات صحابہ کو کہ بیش از بیش عقل رکھتے تھے آبائی مذہب چھوڑ کر ان کو ادھر لانیوالا

صرف کلام اللہ ہی ہے (کہ عقل کے سبب قرآن کا کلام الٰہی ہونا سورج کی طرح ان پر واضح ہوگیا) اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف احادیث قدسیہ جیسا کلام ہوتا اور قرآن نازل نہ ہوتا) تو آپ پر (متکبرین عرب اور ضدی مشرکین میں) کوئی ایمان نہ لاتا۔ وہ چیز جس کے سامنے سب کی گردنیں جھک گئیں وہ قرآن مجید ہی ہے کہ اللہ سبحانہ کا کلام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا کلام ہے حالانکہ وہ بُت پرستی میں غرق تھے، اور اللہ کی پہچان و واقفیت ان کو پہلے سے نصیب نہ تھی، پھر کیسے شناخت کیا کہ بے شک یہ اللہ کا کلام ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے کہ بشری طاقت سے بالا کلام ہے اور اس جیسا کلام کوئی انسان نہیں کر سکتا، سو ممکن ہے مثلاً فرشتوں کا کلام ہو۔ فرمایا (جیسے دھوپ پر جس کی بھی نظر پڑی اور آنکھ کی پتلی میں سرایت کر گئی ہے تو بدیہی و ضروری علم اس کے دل میں پڑا ہے کہ یہ سورج کی روشنی ہے) اسی طرح جس نے بھی کلام الٰہی کو سنا اور اس کے معانی کو اپنے قلب میں اتارا ہے اُس کو علم الیقین ہوا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ کیونکہ جو شانِ عظمت و شانِ کبریائی اُس میں موجود ہے اور جس سطوت پر یہ مشتمل ہے، وہ خالص عظمت ربوبیت اور محض سطوت الوہیت ہے۔ دیکھو ایک صاحبِ عقل انسان جب دنیا کے کسی بادشاہ کی تقریر سُننے اور پھر اُس کی رعیت کی تقریر سنے تو شاہی تقریر میں ایک خاص دم خم پائے گا۔ حتیٰ کہ فرض کرو کہ ایک اندھا کسی مجمع میں آ بیٹھے جہاں بادشاہ بھی بیٹھا ہو اور یکے بعد دیگرے سب کی تقریر ہونے لگے تو جس وقت بھی بادشاہ کی تقریر اُس کے کان میں پڑے گی وہ فوراً امتیاز کرے گا کہ پہلی تقریروں سے جُدا ہے۔ اور یہ فرق الیسا بیّن ہوگا کہ برائے نام بھی اس کو شبہ نہ رہے گا (کیونکہ جو حاکمانہ جلال دبدبہ رعبی فطری طور پر اس کے لفظ لفظ میں برسے گی وہ محکوم و مرعوب کی گفتگو میں کتنا ہی وہ اپنے کو بناتے اور میز پر ہاتھ مار مار کر گرجے مگر نہیں ہوسکتی) جب فانی کے ساتھ یہ رنگ ہے تو کیا پوچھنا کلام قدیم کا۔ حضرات صحابہ نے تو قرآن ہی سے اپنے رَب کو پہچانا، اُس کی صفات کو پہچانا اور جس ربوبیت کا وہ مستحق ہے اس کو پہچانا۔ کہ صرف قرآن کا سننا ہی ان کے لئے اللہ کا علم الیقین حاصل ہونے میں اللہ کو آنکھوں سے دیکھنے کے قائم مقام ہوگیا اور حق سبحانہٗ وتعالیٰ ان کا ایسا (جانا پہچانا) بن گیا جیسے ہمنشین کہ وہ اپنے ہمنشین پر کبھی نہیں چھپتا پھر آپ نے فرمایا کہ کلام الٰہی کی پہچان کئی باتوں سے ہوتی ہے۔ اوّل اس کا بشر بلکہ تمامی مخلوقات کی طاقت سے باہر ہونا کہ

ہر کلام متکلم کے حسب علم ہوا کرتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کا علم چونکہ محیط اور اس کا حکم نافذ ہے (کہ اُس کے اجراء کو کوئی ہستی روک نہیں سکتی) لہذا اس کا کلام اُس کے موافق ہوگا۔ اور مخلوق کا علم (ہر شئی کو) محیط بھی نہیں اور اس کا حکم بھی عاجز ہے کیونکہ دونوں دوسرے کے ہاتھ میں ہیں، لہذا اس کا کلام اس کے علم کے موافق ہوگا کہ وہ جانتا ہے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دوم کلام الٰہی میں ایک خاص زور ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں۔ کیونکہ ہر کلام اپنے متکلم کے احوال کا تابع ہوا کرتا ہے۔ لہذا کلام اپنے متکلم کے احوال کا تابع ہوا کرتا ہے۔ لہذا کلام قدیم اپنے ساتھ الوہیت کی سطوت اور ربوبیت کی شان کبریائی لئے ہوئے نکلے گا، اور یہی وجہ ہے کہ جہاں اس میں (دشمنوں کے لئے سزا کی) دھمکی ہے وہیں اس میں (دوستوں کے لئے انعام کا) وعدہ بھی ہے۔ اور جہاں ڈرانا دھمکانا ہے وہیں خوشخبری سُنانا ہے کہ (دونوں متضاد کیفیتیں) مخلوط اور ساتھ ساتھ ہیں۔ اگر اس کے کلام میں اس شوکت و زور کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا کہ وہ "تکلم فرما رہا ہے درانحالیکہ سارا ملک اس کی مِلک ہے، تمامی شہر اُس کے زیر نگیں ہیں، سارے بندے اُس کے غلام ہیں، زمین اُس کی مقبوضہ ہے، آسمان اُس کا مملوک ہے، اور تمامی مخلوقات اس کی پیدا کردہ ہے، کوئی ہستی بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ تب بھی (پہچان کے لئے) کافی تھا۔ اور دوسرے کے کلام میں لامحالہ ایک خوف کا اثر ہوگا کہ کیسا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقرب کیوں نہ فرض کر لیا جائے مگر اس کے باطن میں ضرور خوف الٰہی بھرا ہوگا۔ اور حق تعالیٰ کو کسی کا ڈر نہیں کیونکہ وہ غلبہ والا ہے۔ لہٰذا اس کا کلام بھی غلبہ والا ہے۔ سوم یہ کہ کلام قدیم سے اگر حروف حادثہ کو علیحدہ کر دیا جائے اور خالص معانی قدیمہ باقی رہ جائیں تو اُن کا تکلم (ایک وقت) ساری مخلوق کے ساتھ ایسا پاؤ گے کہ ماضی و حال و استقبال میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ معنی قدیم میں نہ ترتیب نہ تجزیہ (کہ یہ پابندی صرف الفاظ میں ہے جب تک پہلا حرف زبان سے نکل کر ختم اور فنا نہ ہو جائے گا دوسرا حرف کبھی نہ نکل سکے گا) اور صاحب بصیرت کی نظر اول معنی قدیم پر جاتی ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اس کے بعد حروف پر نظر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک صورت ہے کہ اس میں معنی قدیم کو چھپا دیا گیا ہے۔ لہذا جب اس صورت کو علیحدہ کرتا ہے تو ایک غیر متناہی شے دکھائی دیتی ہے، یہ تو باطن قرآن ہے۔ اور جب صورت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو دو پٹھوں میں محدود (اور اوراق میں محصور و مجلد) دیکھتا ہے، اور یہ ظاہر قرآن

ہے۔ اور جب کان لگا کر قرآن کو سنتا ہے تو معانی قدیمہ کو ظلِ الفاظ میں رکا ہوا ایسا صاف دیکھتا ہے کہ محسوسات جس طرح حاسۂ بصر سے چھپ نہیں سکتیں اسی طرح وہ معانی قدیمہ کی نگاہِ بصیرت سے چھپ نہیں سکتے۔ چہارم مابہ الفرق وہ امتیاز ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کے کلام اور کلامِ الٰہی کے درمیان واقع ہوا ہے کہ آپ نے کلام اللہ کے لکھنے اور سینہ کے علاوہ کاغذ میں بھی محفوظ رکھنے کا حکم فرمایا، اور دوسرے کلام کو لکھنے کی ممانعت فرمائی۔ بلکہ دوسرا کلام اگر کسی نے لکھ لیا تھا تو اس کو محو کرنے کا حکم فرمایا (مبادا کسی زمانہ میں تحریر کو دلیل قرار دے کر کوئی غیر اللہ کے کلام کو اللہ نہ سمجھ بیٹھے) اور یہ جو کہیں ثبوت ملتا ہے کہ صحابہ نے احادیث قدسیہ کو بھی لکھ لیا تھا۔ سو اوّل تو اُن کی کتابت انہوں نے کلام الرسول قرار دے کر کی تھی نہ کہ منجملہ کلام اللہ کے سمجھ کر (اور اسی لئے یہ سُرخی دے کر کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے روایت فرمایا ہے اس کو قرآن کے ساتھ خلط ہونے سے جدا کر دیا تھا۔) علاوہ ازیں سہ امور یعنی بشری طاقت سے خارج ہونا اور دو باتیں جو اس کے بعد بیان کی ہیں ان میں سے ایک بات بھی اُن میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ہے خلاصہ جو عام احادیث اور حدیث قدسی اور قرآن میں فرق کے متعلق حضرت کے اشارات سے ہم نے سمجھا ہے۔

اور آپ کا یہ جواب کہ جو شخص بھی اللہ کا کلام سُننے گا اور پھر دوسرے کا کلام اس کے کان میں پڑے گا تو لامحالہ وہ دونوں میں ایک بیّن فرق پائے گا۔ اس کے قریب قریب امام ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کتاب الانتصار میں اشارہ کیا ہے اور اس پر بہت زور دیا اور خوب لکھا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ حتیٰ کہ اسی سے روافض کے بہتیرے دعوے جن میں غیر قرآن کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کیا ہے، رد فرماتے ہیں۔ اگر اندیشۂ طوالت نہ ہوتا تو ہم ان کی تقریر بھی نقل کر دیتے۔ الحاصل حضرت کا پہلا ہی جواب سن کر میں حیران ہو گیا کہ حضرت نے فی البدیہہ وہ وہ سارا مضمون ادا فرما دیا جو امام مذکور نے بیان کیا تھا (چہ جائیکہ چار جواب زائد)۔

اور پانچواں فرق جس پر حضرت نے تقریر کو ختم کیا تھا اور بھی بیان فرمایا مگر اس کا تعلق خالص کشف سے ہے لہٰذا ہم نے اس کو نہیں لکھا کہ عقول عامہ سے بالا ہے۔ بس مقدمہ کتاب میں اتنا ہی لکھنا کافی ہے اس لئے اس کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اور چونکہ مقصود یہ ہے کہ حضرت کی معلومات و ملفوظات جو ہمارے سننے میں آئے ان کو یکجا جمع کر دیں لہٰذا اب اس کو شروع کرتے ہیں۔ اور بلحاظ چند ابواب میں اس کو ترتیب دیتے ہیں۔

پہلا باب

وہ احادیث جن کا مطلب ہم نے حضرت شیخ سے دریافت کیا

(۱) ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے یہ حدیث مروی ہے کہ ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ اور آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں جو کتاب آپ کے ہاتھ میں تھی اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یہ کتاب میرے رب العالمین کی طرف سے ہے جس میں تمامی اہلِ جنت کے نام درج ہیں معہ ان کی ولدیت اور قومیت کے۔ اور اب ان میں نہ کسی کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ کسی کی کمی ہو سکتی ہے۔ پھر جو کتاب آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی اس کے بارہ میں فرمایا کہ یہ کتاب ہے رب العالمین کی طرف سے جس میں تمامی اہلِ جہنم کے نام درج ہیں مع ان کی ولدیت اور قومیت کے' اور اب ان میں نہ کوئی بڑھایا جا سکتا ہے نہ گھٹایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرما کر اس کو پھینک دیا۔ اور فرمایا۔ تمہارا پروردگار بندوں سے فراغ پا چکا (اور فیصلہ اخیر لکھا جا چکا کہ) یہ فریق جنت میں جانے والا ہے اور یہ گروہ دوزخ میں۔" اس حدیث پر ایک عالم نے اشکال وارد کیا کہ ایک چھوٹے سے کاغذ میں جس کو ہاتھ اٹھا سکے اتنے بے شمار نام جن کے لئے بڑے سے بڑا رجسٹر بھی ناکافی ہے' کیسے سما گئے۔ خصوصاً جب کہ نہ چھوٹے جسم کو بڑا بنایا گیا اور نہ بڑی چیز کو چھوٹا کیا گیا۔ یہ عقلاً محال ہے۔ حالانکہ علماء کلام کا قول ہے کہ قدرت الٰہیہ کا تعلق ممکنات سے ہے نہ کہ محال سے اور یہ حدیث ہے قول نبی معصوم کا جس کا ہر کلام وحی الٰہی ہے (پھر دونوں میں تطبیق کی صورت ہے) حضرت نے اس کا جواب تحریر فرمایا کہ علماء کلام کا قول بالکل صحیح اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے۔ حتیٰ کہ ولی کی کرامات اور نبی کے معجزات میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو عقلاً محال ہو البتہ بعض صورتوں کے سمجھنے سے عقل قاصر ضرور ہوتی ہے۔ مگر جب اس کی حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے تو فوراً

عقل اس کو تسلیم کر لیتی ہے (جیسے ہوائی جہاز کی پرواز کہ اس کی ایجاد سے پہلے جب کہا جاتا تھا کہ لوہے اور لکڑی کا ایک بڑا مکان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑے گا اور اس کی باگ انسان کے ہاتھ میں ہوگی کہ جرمن و جاپان جس ملک میں چاہے گا اتارے گا اور جہاں چاہے گا معلق اٹھا کر ریل کی طرح چلائے گا تو اس کو ناممکن بتایا اور کہنے والے کو دیوانہ قرار دے کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ مگر جب مشاہدہ میں آگیا اور حقیقت کھل گئی تو عقل نے فوراً مان لیا کہ اب بیسیوں جہاز اڑتے ہوئے دیکھتا ہے اور حیرت بھی نہیں ہوتی۔ لہذا ارشاد محمدی کی حقیقت سمجھو کہ) مراد قلم کی لکھت نہیں ہے بلکہ نظر کی لکھت ہے (جیسے پچاس آئندہ کی تجاویز کا ایک طور سا کسی مدبر کی قوت فکریہ میں آوے اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کو مسلسل پڑھنا شروع کرے اور کہے کہ یہ سب میری نظر کے سامنے ہے تو مراد نظر چشم نہیں بلکہ نظر خیال ہے)

اس کی شرح یہ ہے کہ صاحب بصیرت شخص خصوصاً سید الاولین والآخرین سیدنا و مولانا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا قصد جب کسی چیز کے دیکھنے کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ کے اور اس شئے کے درمیان جتنے پردے حائل ہوتے تھے آپ کی بصیرت اُن کو پھاڑتی چلی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی روشنی اس شئے تک پہونچتی اور اس کو محیط ہو جاتی تھی کہ اس کا ریشہ ریشہ نظر آجاتا تھا (جیسے آلۂ ایکسرے کی برق ہڈی اور چمڑے کے اندر گھستی چلی جاتی ہے کہ یہ پردے جو نگاہ چشم کے لئے آڑ بنے ہوئے ہیں۔ برق ان کو بے تکلف پار کر جاتی اور اندر کی ذرہ ذرہ چیز کا نقشہ کھینچ لاتی ہے) پھر یہ بصیرت بھی بمنزلۂ آلہ کے ہے لہذا اُس کا حکم متعدی ہوتا ہے نور بصر کی جانب کہ جو طاقت بصیرت کو حاصل تھی وہ بصر کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جو چیز بھی اُس وقت سامنے ہوتی ہے اُسی میں وہ شئی منقوش دکھائی دیتی ہے اور دیوار سامنے ہوئی تو دیوار میں اور ہاتھ مقابل ہوا تو ہاتھ میں اور کاغذ مقابلہ پر ہوا تو کاغذ میں (جیسے ایکسرے کی برق محض آلہ ہے اندرون شکم پہونچ کر جس جس چیز کو بھی دیکھا ہے اُسے فوٹو کے کاغذ تک الساصاف پہونچا دیتی ہے گویا یہ کاغذ ہی دیکھ رہا ہے اور پھر اس کا پورا نقشہ کھینچ کر نگاہِ چشم کے سامنے لے آتا ہے۔) اسی حقیقت پر اُس حدیث کو متفرع کیا جائے گا جو مروی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "مجھے اس دیوار میں جنت اور دوزخ کھڑی نظر آئیں" الخ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بصیرت کاملہ جب کہ آپ نماز کسوف میں مشغول تھے جنت و دوزخ کی طرف متوجہ ہوئی لہذا تمامی پردے پھاڑ کر وہاں

پہونچی اور پھر اس کو نور بصر تک لاکر اُس دیوار میں منقوش کر گئی جو اُس وقت آپ کے سامنے تھی۔ لہذا آپ نے فرمایا کہ مجھے اس دیوار میں جنّت و دوزخ مجسم کھڑی دکھائی گئیں۔اسی حقیقت پر یہ حدیث متفرع ہے۔ پس اگر دیوار میں جنت و دوزخ نظر آنے کی حدیث پر اشکال ہے تو اس اسماء بہشتیاں و دوزخیاں کی کتاب والی پر بھی اشکال ہے' اور اگر اس پر کوئی اشکال نہیں تو اس پر بھی کوئی اشکال نہیں۔غرض اشکال کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ کتاب کو قلمی کتابت سمجھ لیا حالانکہ وہ نظری کتابت تھی۔ علاوہ ازیں اگر قلمی کتابت ہوتی تو یہی حدیث اپنے آخری حصہ سے متناقض ہو گی کہ اس میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کتابوں کو پھینک دیا۔ بھلا جو تحریر اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے آئی ہو' بالخصوص جب کہ اس میں اللہ کے مقبول و برگزیدہ اور بہترین مخلوقات حضرات انبیاء اولیاء و صلحاء کے اسماء مقدسہ لکھے ہوئے ہوں' اس کو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم "کس" طرح پھینک دیتے جب کہ آپ سے زیادہ اللہ جل جلالہٗ اور اس کے پیغمبروں اور فرشتوں کی تعظیم کرنے والا ساری مخلوق میں کوئی بھی نہیں۔الحاصل تحریر سے مراد صرف وہ صورت ہے جو (بواسطہ بصیرت) نظر کو حاصل ہوئی۔ اور نظر میں اُس کا آجانا نہ محال ہے نہ مشکل کہ آخری تمامی مرئیات رات دن نظر ہی میں سماتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے بہت چھوٹا ہونے کے بڑی سے بڑی چیز اس میں منقوش ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ آسمان بایں وسعت نامحدود آنکھ کی اسی مسور کی دال سے چھوٹی پتلی میں سما جاتا ہے لہذا حدیث مذکور از قسم ممکنات ہوئی اور یہی حال ہے تمامی معجزات اور اور خوارق کا (کہ از قسم محالات نہیں بلکہ عوام کی عقل ان کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہ گئی) واللہ اعلم۔

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق میں نے حضرت ممدوح سے چند مرتبہ استفسار کیا اور حضرت نے مجھے متعدد جواب بھی دئے۔ مگر تسکین نصیب نہ ہوئی اور مجھے شافی جواب کا شوق و انتظار لگا رہا۔ کیونکہ اشکال کا اصل سبب یہ ہے کہ لفظ حرف کا مفہوم بروئے لغت بالکل واضح ہے' اور جیسا اشکال سورتوں کے شروع حروف مثلاً الم ص ق ن وغیرہا کی مراد سمجھنے میں ہے۔ لفظ حرف کا مفہوم سمجھنے میں کوئی اشکال بھی نہیں۔مگر ترجمہ اتنا واضح ہونے کے باوجود حضرات علماء کا اس میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ دیکھنے والے کی حیرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ظاہر ہے کہ ایک ہی ہوگی مگر علمار کے اختلاف کی تعداد اس کے معنے بیان کرنے میں چالیس اقوال تک پہونچ چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے بہت ہی دقیق اور چھپے ہوئے ہیں، اور پھر بھی ممکن ہے کہ اصل مراد ان تمامی اقوال سے باہر اور ہی کچھ ہو۔ حالانکہ یہ حدیث حضرت عمر بن الخطاب ہشام بن حکیم۔ ابی بن کعب۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ عثمان بن عفان عمر بن ابی سلمہ۔ ابوسلمہ۔ ابوجہیم۔ سمرۃ بن جندب۔ عمرو بن العاص۔ ام ایوب انصاریہ وغیرہ بکثرت صحابہ سے منقول ہے رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ابویعلی موصلی تو اپنی مسند کبیر میں یہ روایت لائے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھنے کے لئے ممبر پر کھڑے ہوئے اور حاضرین سے فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ جس نے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہو کہ بے شک قرآن نازل کیا گیا ہے سات حرفوں پر، وہ اٹھ کھڑا ہو۔ یہ سُن کر چہار جانب سے بلشمار صحابہ کھڑے ہوگئے کہ ہر شخص کہتا تھا ہاں حضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سُنا ہے۔ پھر حضرت عثمان نے فرمایا ہاں حضرت کو یہ فرماتے میں نے بھی سُنا ہے۔ اسی بنا پر ابوعبیدہ وغیرہ حفاظ حدیث نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے۔

(مزید براں) اکثر علمار سلف وخلف نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ خاص اسی مسئلہ میں مستقل کتابیں تصنیف کردیں جن میں بہترین تحریرات جو میری نظر سے گزری ہیں چار اجلۂ علمار کی ہیں۔ اوّل علامہ ابوبکر باقلانی کی تحریر کتاب الانتصار میں کہ خوب ہی مسئلہ کو کھولا اور واضح کیا ہے۔ دوم حافظ کبیر ابن الجزری کی تحریر النشر میں کہ دس فصلیں بناکر پوری بحث کی ہے اور جن جن صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے ان کی بڑی تلاش کی ہے سوم امام المحدثین علامہ ابن حجر کی تحریر بخاری کی شرح میں بذیل کتاب فضائل القرآن۔ چہارم علامہ جلال الدین سیوطی کی تقریر کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں تفصیل وار چالیسؔ اقوال نقل کئے ہیں۔ مگر باوجودیکہ میں چاروں کا اکابر علمار کی تمامی تحقیق سے آگاہ ہوچکا اور از ابتدار تا انتہا اس کے ظاہر و باطن کو خوب سمجھ چکا ہوں مجھے اس کا غلبۂ ظن بھی نصیب نہ ہوا کہ لفظ حرف سے آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے۔ بلکہ اس کی تعیین بدستور مشتبہ رہی۔ لہٰذا میں نے حضرت ممدوح سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ میرا مقصود صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُراد سات حرفوں سے

کیا ہے۔ فرمایا اچھا کل کو انشاء اللہ جواب دیں گے۔ اگلا دن ہوا تو فرمایا اور بے شک جو فرمایا وہ سچ فرمایا کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق آپ کی مراد دریافت کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مراد یہ ظاہر فرمائی۔ چنانچہ کامل تین دن میں نے حضرت شیخ سے بحث کی اور آپ مراد محمدی کی وہ تفصیل بیان فرماتے رہے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس حدیث کی تو بڑی شان ہے، اور ایسے اسرار سننے میں آئے جن کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے۔ میں اس کے متعلق جتنا لکھ سکتا ہوں اس کو پیش کرتا ہوں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو فطرۃً ایک خاص قوت عطا فرمائی گئی ہے جس کے انوار کی سات قسمیں ہیں، اور ان ساتوں انوار کے دو دو رخ ہیں۔ ایک بجانب حقِ سبحانہ اور دوسرا بجانب خلق۔ پہلا رُخ (موسلا دھار بارش کی طرح) ہر وقت برستا رہتا ہے، نہ کبھی تھمتا ہے نہ اُس کی رفتار سُست پڑتی ہے۔ پس حق تعالیٰ جب آپ پر قرآن کی کوئی آیت نازل فرماتا تو اُس رُخِ اوّل کے نور کا سب نہیں بلکہ کچھ حصہ اس کے ساتھ نازل فرماتا تھا۔ اس لئے کہ وہ نور بجہت حقِ سبحانہ تھمتا تو کسی وقت بھی نہیں، لہذا جتنا بجہت خلق اُترتا تھا وہ اُس کا کچھ حصہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوسری آیت نازل فرماتا تو اس کے ساتھ دوسرے نور کا کچھ حصہ ہوتا تھا۔ پھر مثلاً تیسری آیت نازل ہوتی تو تیسرے نور کا کچھ حصہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر آیت کے ساتھ ان ساتوں انوار میں کسی نور کی معیت ضرور ہوتی تھی (اور سات حرفوں سے یہی ہفت انوار مراد ہیں)۔ میں نے عرض کیا کہ وہ ہفت انوار کیا کیا ہیں۔ فرمایا حرفِ نبوت، .... حرفِ رسالت، حرفِ آدمیت، حرفِ روح، حرفِ علم، حرفِ قبض اور حرفِ بسط۔ چنانچہ حرفِ نبوت کی شناخت یہ ہے کہ آیت شریفہ صبر کا حکم دے رہی ہو۔ حق کی راہ بتا رہی ہو۔ اور دنیا و لذاتِ دنیا سے زہد و نفرت دلا رہی ہو۔ کیونکہ نبوت کا طبعی خاصہ ہے حق کی طرف جھکنا اور زبان سے حق بات کا کہنا۔ راہِ حق پر چلانا۔ اور اس میں خیر خواہی خلق کا حق ادا کرنا۔ اور حرفِ رسالت کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ میں بحث ہو عالم آخرت اور اس کے درجات و مقامات سے اور تذکرہ ہو اُن کے ثواب وغیرہ کا۔ اور حرفِ آدمیت کا ماحصل وہ نور ہے جس کو حق تعالیٰ نے بنی آدم میں رکھا اور ان کو اس کلام کی قدرت بخشی جو آدم کی طرف منسوب ہے، اور جس کی بنا پر ان کا کلام ملائکہ اور جنات اور تمام متکلم مخلوقات کے کلام سے ممتاز اور جدا ہے۔ اور

نبوت
رسالت
آدمیت

اِس نور کو باوجودیکہ وہ ہر آدمی میں موجود ہے (ذات محمدی کے) ہفت انوار میں شامل اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ صفائی وطہارت میں (کہ خاصہ ہے اس نور کا) منتہا پر پہونچے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ذات محمدی کو طہارت وصفائی میں وہ کمال حاصل ہے جس سے اوپر کوئی کمال نہیں۔ اور نہ ذات محمدی کے سوا کسی میں اس کا ہونا ممکن۔ الغرض جب یہ نور جس سے انسانی کلام وقوع میں آتا ہے۔ ذات محمدی میں نور نبوت۔ نور رسالت۔ نور روح۔ نور علم نور قبض اور نور بسط کے ساتھ جمع ہو گا تو ظاہر ہے حد درجہ کامل ہو گا کہ اس نور کو مدد ملے گی ان چھ انوار مذکورہ سے لہٰذا آپ پر آیات قرآنیہ کا نزول ہو گا درانحالیکہ کوئی آیت بھی اس نور سے خالی نہ ہو گی۔ کیونکہ قرآن مجید کا نزول اسی بشری لغت میں ہوا ہے۔

کمال محمدی

اور حرف روح کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ کا تعلق محض حق تعالیٰ کی ذات وصفات علیہ کے ساتھ ہو اور مخلوق کا اس میں کوئی تذکرہ نہ ہو۔ اور حرف علم کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ میں امم ماضیہ اور گزرے ہوئے حالات کی بحث ہو مثلاً عاد وثمود وقوم نوح اور قوم ہود وقوم صالح وغیرہ کی خبریں یا تنبیہ ہو کسی رائے کے مذموم ہونے پر جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ الآیہ (اس میں رائے کی غلطی ظاہر فرمائی ہے کہ کافروں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی کو خرید لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بانفع نہ ہوئی بلکہ تجارت کا سلیقہ ہی کھو بیٹھے) الحاصل حرف علم ہی پر نزول ہو گا قصص اور مواعظ اور حکم وغیرہ کا۔ اور یہی وہ نور ہے کہ جس کو عطا ہوا اس کی ناواقفیت کو بالکلیہ زائل کر کے ایسا واقف کامل بنا دیتا ہے کہ فرض کرو ایک شخص کسی بلند پہاڑ میں پیدا ہوا اور وہیں رہا سہا ہو حتیٰ کہ جوان ہو گیا ہو اور کبھی کسی بشر یا جن سے نہ ملا ہو پھر اس کو شہر میں لایا جائے اور صورت یہ ہو کہ حق تعالےٰ نے اس نور علم سے اس کی مدد فرمائی ہو تو جس نے عمر بھر تحصیل علم میں عمر گزاری ہو وہ اس کے ساتھ کسی مبحث میں بات بھی نہ کر سکے گا) اور حرف قبض کی علامت یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل کفر وظلمت کی طرف ہو کہ کبھی ان پر بددعا ہو اور کبھی ڈانٹ اور دھمکی۔ مثلاً فرمان الٰہی فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ الآیۃ ان کے قلوب میں (ظلمت وشک کا) مرض ہے۔ پس اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ فرما دیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ان کے کرتوتوں کی سزا میں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ نور کا لشکر اور ظلمت کا لشکر

روح

علم

قبض

باہم ہمیشہ جنگ میں رہتے ہیں۔ پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جب ظلمت کی طرف جاتی تھی تو آپ کو انقباض ہوتا تھا اور آیات مذکورہ اس حالت میں دہن مبارک سے نکلتی تھیں۔ اور حرفِ بسط کی علامت یہ ہے کہ آیت شریفہ میں مخلوق پر نعمہائے خداوندی اور ان کی تفصیل سے بحث ہو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ جب اللہ کے انعامات پر جاتی تھی تو آپ کو انبساط ہوتا تھا اور آیت مقام بسط سے نکلتی تھی۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ یہ ہے حروف سبعہ میں حرف کی علامت تقریباً ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ساتوں حروف میں سے ہر حرف کی تین سو چھیاسٹھ وجوہ ہیں۔ ہر وجہ کی اگر شرح کی جائے اور ہر آیت میں جتنی بھی وجوہ ہیں ان کو واضح کیا جائے تو لوگوں کو باطن محمدی آفتاب کی طرح روشن ہو جائے (پھر ناممکن ہے کہ آپ پر ایمان لائے بغیر کوئی بھی رہے) مگر وہ سِرِّ الٰہی ہے جس کا اخفا واجب ہے۔ ہاں جس کو حق تعالیٰ نے فتح کبیر عطا فرمائی ہے۔ اُسے خود ہی علم حاصل ہو گیا ہے۔ مگر جس کو فتح نصیب نہیں ضروری ہے کہ اُسے اُس کی حالت پر چھوڑا جائے (کہ تقدیر الٰہی جہنم کے متعلق پوری ہو۔) میں نے عرض کیا کہ اس باب میں جتنی بھی حدیثیں آئی ہیں وہ تو اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ حروف سبعہ سے مراد ایسی شئے ہے جسے قرآنی الفاظ کے نطق کی کیفیت کے ساتھ تعلق ہے۔ مثلاً حضرت عمر کا ارشاد کہ میں نے ہشام بن حکیم کو ان حروف پر قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا صحیح ہونا ظاہر کیا اور ارشاد فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جسے جو بھی آسان معلوم ہو وہ پڑھے"۔ اور حضرت کی تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حروف سبعہ ذات محمدیہ کے باطنی اوصاف اور ربانی انوار ہیں۔ بھلا ان میں حضرت ہشام اور حضرت فاروق کا اختلاف کیسے ممکن ہے کہ ان کو حضرت یہ جواب عطا فرمادیں کہ قرآن سات انوار ربانیہ پر نازل ہوا ہے"۔ حضرت نے فرمایا کہ تلفظ کا اختلاف جو کچھ بھی اس بارہ میں حدیثوں کے اندر مذکور ہے وہ فرع ہے ان ہی انوار باطنیہ کے اختلاف کی۔ کہ حروف کا جزم اور پیش ناشی ہے نور فیصل سے۔ اور زبر ناشی ہے حروف رسالت سے۔ اور زیر ناشی ہے حروف آدمیت سے۔ اور ہر آیت کے لئے ایک فتح خاص اور ذوق مخصوص ہے۔ جب میں نے حضرت کی یہ نورانی تقریر سنی تو میں نے سورۂ فاتحہ اور شروع سورۂ بقر کی آیتیں پڑھیں

اور حضرت نے ان انوارِ باطنیہ کو ہر لفظ پر مرتب فرما کر مجھے دکھایا، اور پھر میں نے ان آیات کو امامؒ نافع ابنؒ کثیر، ابو عمرو ابن العلاء، ابنؒ عامر، عاصمؒ، حمزہؒ اور کسائی کی جدا جدا قرارت میں پڑھا تو حضرت سے عجیب و غریب لفظ میں نے سنے اور معلوم ہوا کہ ان قرارات سبعہ کے اختلافات بے تمسک انوارِ باطنیہ ہی کے اختلاف پر متفرع ہیں۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی اور جس بات کی جستجو کرتے مجھے بیس سال سے زائد گزر چکے تھے الحمدللہ مجھے مل گئی۔

اس تفریع کے ضمن میں چونکہ حضرت نے فرمایا کہ اس آیت میں مثلاً کچھ منجملہ اجزاء نبوت کے ہے اور کچھ منجملہ اجزاء رسالت کے۔ حتیٰ کہ اسی تفصیل سے انوارِ سبعہ کے اجزاء ظاہر کئے۔ لہٰذا میں نے عرض کیا کہ ان حروف سبعہ کے اجزاء کی تفصیل اور بیان فرما دیجئے تاکہ فائدہ مکمل اور نفع تام ہو جائے۔ فرمایا ہاں سنو ان ساتوں حروف میں سے ہر حرف کے سات اجزاء ہیں کہ سب کا مجموعہ انچاسؒ ہو جائے گا۔ پس آدمیۃ کا جزؒ اول۔ صورت ظاہری کا کمالِ حسن ہے۔ کہ مثلاً ہاتھ بھی نہایت حسین ہوں پاؤں بھی نہایت حسین ہوں انگلیاں بھی نہایت حسین ہوں غرض بدن کا ہر عضو کمال خوبصورت ہو۔ نیز ان کا منظر بھی حسن میں اکمل ہو کر رنگ میں مثلاً چمک اور صفائی اعلیٰ درجہ کی ہو وغیر ذٰلک جزؒ دوم۔ جسم کے ظاہری منافع کا کمال ہے۔ کہ مثلاً حواس خمسہ ظاہریہ میں قوت سماعت بھی اکمل ہو قوت بصر بھی اتم ہو۔ قوت شامہ بھی اکمل ہو قوت ذائقہ بھی اتم ہو قوت لامسہ بھی اکمل ہو۔ اسی طرح مثلاً آواز بھی نہایت پیاری ہو گفتار و گویائی بھی قوی تر اور بہترین ہو۔ فصاحت و بلاغت بھی بدرجہ اتم ہو وغیرہ وغیرہ۔ جزؒ سوم۔ صورت باطنیہ کا کمالِ حسن ہے کہ مثلاً قلب کی شکل بھی اعلیٰ درجہ کی معتدل ہو جگر کی ساخت بھی بہترین ہو دماغ کی خلقت بھی عجیب ترین ہو رگیں اور پٹھے بھی افضل ترین ہوں غرض اعضاء باطنیہ میں ہر عضو کمال اعتدال اور جس نفع اور کام کے لئے وہ بنایا گیا ہے اس میں حد درجہ کی خوبی لئے ہوئے ہو۔ جزؒ چہارم کمال حسن باطنی ہے کہ مثلاً لذت اور حسن سے وجدان کا متاثر ہونا بدرجہ کمال پہونچا ہوا ہو۔ جزؒ پنجم۔ ذکوریت ہے کہ جزء ہے کمالِ انسانی کا کہ اس میں سر فعل (اور قوت تاثیر) ہے اور انوثیت میں سر انفعال (اور مادۂ تاثر) ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آدم کو خاص اپنے لئے پیدا فرمایا اور باقی تمام چیزوں کو آدم کیلئے پیدا فرمایا، جن میں عورتیں بھی داخل ہیں۔ اور چونکہ سب چیزوں کو آدم کے لئے پیدا فرمایا لہٰذا ان کو سر فعل عطا

فرماکر خلیفہ بنایا (کہ تمامی اشیاء میں فاعل متصرف نہیں) اور یہی تخم فحل ان کی تمام اولاد ذکور میں قیامت تک کے لئے ودیعت فرمادیا۔ جزء ششم شیطانی حصہ کا نکال لینا ہے کہ آدمیت کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے شق صدر کی کہ فرشتوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک چاک کر کے قلب میں سے نکالا جو نکالنا تھا اور اس کو دھویا جس شی سے بھی دھونا تھا اور اس کو بھر دیا ایمان و دانش سے۔
جزء ہفتم۔ کمال عقل ہے کہ صفائی و معرفت میں حد درجہ پر پہونچی ہوئی ہو۔ اسی طرح قبض کے بھی سات اجزاء ہیں۔ اوّل وہ حاسہ ہے جو ذات انسانی میں رکھا ہوا اور اس کے تمامی جواہر میں پھیلا ہوا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہر عضو اور ہر جوہر اچھی چیز میں مزہ پاتا ہے اور بُری چیز سے تکلیف۔ مثلاً قوت ذوق کو شہد کی مٹھاس سے لذت ملتی ہے اور اندرائن کی کڑواہٹ سے کلفت پہونچتی ہے۔ دوم انصاف ہے کہ یہ بھی قبض کا جزو ہے اور اس کے بغیر قبض کامل نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت بحث نورانی قبض میں ہے پس اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوگا تو وہ قبض ظلمانی بن جائے گا۔ اور ایسے قبض والا شخص غضب الٰہی کا مستحق ہوگا۔ سوم ضد سے نفرت ہے جیسا کہ ہر چیز کو اپنی ضد سے نفرت ہوا کرتی ہے (پس اس نور کے ہر ہر جزو سے حسن کو اپنی ضد یعنی قبح سے ایسی نفرت ہوگی کہ) اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے گا۔ جیسے سپیدی نہیں جمع ہو سکتی سیاہی کے ساتھ اور قیام جمع نہیں ہو سکتا قعود کے ساتھ۔ چہارم حق بات کہنے میں نہ شرمانا ہے کہ کتنا ہی تلخ ہو کہنے سے نہ چوکے اور اللہ کے بارہ میں طعن و ملامت کا اندیشہ اس کی زبان کو نہ پکڑے۔ پنجم تعمیل احکام ہے کہ بحث قبض نورانی میں ہے اور جب قبض کے ساتھ شریعت کی مخالفت آملے گی تو وہ ظلمانی بن جائے گا اور ایسے قبض والے پر حق تعالیٰ کی ناراضی لازمی ہے ششم ہمجنس کی طرف میلان کامل ہے کہ اس میں گھل مل جائے۔ مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو یہ کہتا سنتے کہ اللہ برحق ہے اور وہ ہمارا خالق ہے وہ ہمارا روزی رساں ہے وہ یگانہ ہے کہ ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں وغیرہ وغیرہ تو آپ کا قلب اس قول کی طرف کھنچتا تھا اور اس کی محبت اس حد پر پہونچتی تھی کہ آپ کے اعضا میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ اس کلام کی کیفیت سے متکیف ہو جاتے اور آپ کی ذات اس نور کا اظہار کیا کرتی تھی جو اس کلام کے ساتھ نکلا ہے۔ پس جس طرح ضد (مثلاً کلمات کفریہ کے سننے

سننے سے کلی نفرت ہوتی تھی اسی طرح ہم جنس کی طرف بدرجۂ کمال کشش ہوتی تھی۔
ہفتم۔ گرفت کی قوّت کاملہ کہ جب کسی شئی کو پکڑے تو ناخن برابر بھی نہ گرنے پائے۔
محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے مثلاً دس چیزوں کو تھاما۔ اگر ان میں
سے ایک بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی تو گرفت میں اس کی قوت کامل نہیں ہے، اور اگر ایک
بھی نہ گری تو بے شک کامل ہے۔ اسی طرح کسی نے ایک شئی کو پکڑا اگر اس کو مضبوط
پکڑے نہ رہا تو قوّتِ گرفت ناقص ہے، اور اگر مضبوط پکڑے رہا تو بے شک قوّت کاملہ
ہے۔ اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہم جنس کی طرف میلان اور اس سے متاثر ہونا منجملہ
اجزاء قبض کے ہے، لہٰذا اس کے لئے اس قوت گرفت کا ہونا ضروری ہے (تاکہ اس
کشش میں دوام و استحکام رہے) اور اسی طرح ضد سے نفرت بھی منجملہ اجزاء قبض
کے ہے لہٰذا اس کے لئے بھی اسی قوّت گرفت کی ضرورت ہے تاکہ نفرت دائمی رہے اور
بسط کا پہلا جز فرح کامل ہے، اور وہ ایک نور جس کے باطن میں پڑتا ہے اس سے کینہ و
حسد اور تکبر و بخل اور لوگوں کے ساتھ بغض و عداوت کو نکال پھینکتا ہے کہ یہ چیزیں فرح
کامل کے منافی ہیں۔ (کیونکہ ان کا مقتضا ہے غصہ و رنج اور گھٹن اور کلسن نہ کہ فرح
و سرور) اور جب اس فرح کے ساتھ نورِ ایمان پایا جائے گا تو ذات کے اندر اس کا نزول
موافقت و مجانست کے ساتھ ہوگا اور خوب گھل مل جائے گا (کہ بشاشت ایمان فی القلب
کا یہی مفہوم ہے) اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بارش کسی زرخیز عمدہ زمین پر برسے
کہ اس سے (بہترین غلّہ کی طرح) بہترین اخلاق پیدا ہوں گے۔ دوسرا جز ذاتِ انسانی میں
خیر کا قیام ہے اور وہ ایک نور ہے جسے عطا ہوتا ہے خیر و صلاح کو اس کی طبیعت ثانیہ بنا دیتا
ہے کہ اس کو ہر کار خیر اور اہل خیر کے ساتھ محبت ہوتی ہے اور ایسی ہی باتوں میں فکر
دوڑاتا رہتا ہے جن سے خیر حاصل ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس کے ساتھ بھلائی کرتا ہے تو
کبھی اس کو بھولتا نہیں، اور جو اس کے ساتھ برائی کرتا یا ایذا پہونچاتا ہے تو جہاں
اس کا وقت گزرا اس کو بھول جاتا اور اس کا خیال بھی باقی نہیں رہتا۔ حتّٰی کہ اس کو
آزماؤ تو اس کا قلب بالکل خالی اور ایسا مطمئن و شاداں پاؤ گے گویا کوئی کلفت پہونچی
ہی نہیں۔ تیسرا جز فسحِ حواس ظاہری ہے جس کا ادراک بذریعہ حواس ہوتا ہے،
اور یہی لذت کمال ہے بسط کا۔ مثلاً حاسہ بصر میں ایک لذت رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے حسین

صورتوں کی طرف میلان ہوتا ہے (حتی کہ یہ لذت جب حد درجہ بڑھ جاتی ہے تو) اسی سے عشق اور انقطاع باطنی پیدا ہوتا ہے کہ جسے دیکھا ہے بس اسی کا ہو رہتا ہے۔ اسی طرح حاسہ سمع میں ایک لذّت رکھی گئی ہے جس سے خوش آوازی اور ساگ و نغمہ کی طرف کشش ہوتی ہے۔ (حتّٰے کہ یہ لذّت بڑھتے بڑھتے) اضطراب اور بدن میں حرکت و تڑپ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح تمامی خواس کا حال ہے کہ ان میں ایک لذّت کا مادہ ہے جو محض ادراک و شعور سے زائد چیز ہے اور کمال حواس اور فتح حواس میں کہ آدمیت کا جزو ہے یہی فرق بھی ہے کہ کمال حواس میں محض ادراک ہوتا ہے (مثلاً آنکھ نے خوبصورت اور بدصورت میں امتیاز کر لیا اور اس کو اچھا کہہ دیا اور اس کو بُرا) مگر فتح حواس میں عروق کا انشراح ہو جانے سے ایک لذت جاذبہ نصیب ہوتی ہے کہ اس ادراک کردہ شدہ خوبی کا گرویدہ بنا دیتی اور ہر طرف سے ہٹا کر صرف اسی کا بنا دیتی ہے۔ چنانچہ بہتیرے آدمی تم کو نظر آئیں گے کہ اچھی صورتوں پر ان کی نگاہ پڑتی ہے مگر متاثر نہیں ہوتے۔ اسی طرح بہتیرے ہیں کہ پیاری آوازیں اور نغمے ان کے کانوں میں پڑتے ہیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ نفس ادراک اور چیز ہے اور اس کا التذاذ و تاثر دوسری چیز ہے) چوتھا جزو فتح حواس باطنیہ ہے کہ جو حالت ظاہری حواس میں ادراک اور التذاذ میں فرق و امتیاز اور فتح حواس میں ادراک کردہ شے سے متاثر و گرویدہ ہونے کی بیان ہو چکی ہے، بعینہٖ وہی حواس باطنیہ کے کمال اور فتح میں جاری ہوگی۔ کہ جس کو فتح حواس باطنیہ نصیب ہوگا۔ اس کا وجدان و تخیل و تمامی اعضاء باطنیہ حسن معانی کے نفس ادراک سے زائد ایک تاثر و التذاذ بھی حاصل کریں گے، جو میلان اور پھر گرویدگی و انقطاع تام تک پہونچائے گا۔ پانچواں جزو مقام رفعت ہے۔ کہ انسان جب تمامی اجزاء آدمیت سے متصف اور پھر تمامی اجزاء قبض سے مزین اور پھر مذکورہ چہار اجزاء بسط سے آراستہ ہو جائے گا تو اس کو اپنی قدر معلوم ہوگی کہ اُسے کیا کچھ ملا ہے اور نیز یہ کہ یہ خوبیاں کسی بڑی ہی چیز کو عطا ہوا کرتی ہیں (ہر کس و ناکس کو نہیں ملتیں) لہٰذا وہ سمجھے گا کہ پروردگار عالم کے نزدیک اس کا درجہ (تمامی مخلوقات سے) بڑا ہے اور وہ عند اللہ رفیع القدر ہے۔ اور بڑے کو لازم ہے کہ بڑائی کے کام اور بہترین خصائل اختیار کرے (نہ یہ کہ چھچھورا بنے اور دنائت و ذلت کے کام کرے)۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ اور فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ اور جب اس کا علم ہوگا کہ وہ رفیع القدر اور کبیر الدرجہ ہے تو اس کا بسط کامل ہوگا اور اسی لئے مقام رفعت منجملہ اجزاء بسط کے ہے۔ چھٹا جزو حسن تجاوز ہے کہ کوئی اس پر ظلم کرے کرے تو اُسے معاف کرے، اور کوئی بدسلوکی کرے تو در گذر کرے۔ اور حسن تجاوز منجملہ اجزاء بسط کے اس لئے ہے کہ گفتگو بسط نورانی میں ہے۔ لہٰذا اگر اس کے ساتھ (بجائے عفو درگذر کے) بدسلوکی والی راہی ہوگی تو بسط ظلماتی بن جائے گا۔ اور غضب الٰہی کا سبب ہوگا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نورانی کی حقیقت اور اس کے اجزاء ضروریہ میں حسن تجاوز بھی داخل ہے۔ ساتواں جزو انکسار و تواضع ہے۔ اور اس کے بھی اجزاء بسط میں داخل ہونے کی وجہ وہی ہے جو حسن تجاوز میں بیان ہو چکی ہے کہ بسط والے کا مرتبہ چونکہ بلند ہے لہٰذا اس کو ابناء جنس کے سامنے جو کہ اس کے ہم عصر و رفیق سفر ہیں تواضع اور تذلل لازمی ہے۔ ورنہ اگر تکبر کیا اپنے کو اُن سے اونچا سمجھا تو بسط میں کبر کا دخل ہو گیا اور غضب الٰہی کا مستحق بن گیا۔

ہاں یہ بھی ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ آدمیت اور قبض اور بسط اور ان تینوں کے تمام اجزاء جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے ہیں اسی طرح دوسروں میں بلکہ غیر مسلم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ذات محمدی میں وہ خاص انسانیت موجود ہے جس سے اوپر کوئی انسانیت نہیں، اور آپ کے متعلق شیطانی حصہ نکال لینے سے جو کہ جزو ہے انسانیت کا اخراج مراد ہے جو شق صدر کی صورت میں پیش آیا، اور دوسرے میں محض درجۂ کمال مراد ہے نہ کہ اعلیٰ درجۂ کمال یعنی اس ذات سے بے حیائی و قباحت کو نکال لیا گیا ہے جن کی وجہ سے نہ وہ شریر رہا اور نہ بد خلقی سے متصف۔ نہ یہ کہ وہ مضغۂ گوشت ہی نکال لیا گیا (جس میں شیطانی اثر لینے کا مادہ ٹھیرتا ہے) کہ یہ مخصوص ہے درجہ نبوت کے ساتھ۔ اسی طرح قبض میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبض نورانی کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے۔ رہے دوسرے لوگ سو اگر وہ آپ کے طریقہ کے متبع اور آپ کی سیرت پر چل رہے ہیں تو حسب اتباع ان کا قبض نورانی ہوگا، اور منتہا یہ ہے کہ درجۂ کمال حاصل کر لیگا، نہ یہ کہ انتہائی کمال پر پہونچ جائے کہ انتہائی کمال مخصوص ہے مرتبہ نبوت کے ساتھ اور اگر آپ کی شریعت کے خلاف چل رہا ہے تو اس کا قبض

ظلمانی ہوگا اور قبض کے جزو اول میں حواس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے۔ یہاں اس کے برعکس ہوگی۔ کہ یہ شر سے لذت پائے گا اور خیر سے تکلیف پائے گا۔ اور قبض کا جزو ثانی کا جزو ثانی یعنی انصاف تو بالکل ہی جاتا رہے گا جب بدی میں اس کو مزہ آتا ہے اور بھلائی میں کلفت ہوتی ہے تو انصاف کا صدور قطعاً محال ہے۔ اس لئے کہ انصاف اسی سے ممکن ہے جس کو خیر میں لذت آوے اور شر سے دل دکھے۔ نیز قبض کا جزو سوم یعنی ضد سے نفرت بھی قبض ظلمانی میں معکوس ہو جائے گا کہ اب اس کو خیر سے نفرت ہوگی۔ اور یہی حال بقیہ اجزاء کا ہے کہ قبض ظلمانی میں ان کے سب اثرات عکس ہو جائیں گے پس اگر تمامی اجزاء قبض منعکس ہو گئے تو یہ قبض ظلمانی وہ ہے جو شیاطین متمرد و کفار میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معجزات محمدیہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ان کے کفر وطغیان میں اضافہ ہی ہوا (کہ کھار کی شوریت میٹھی سے میٹھی چیز کو بھی نمکین بنا دیتی ہے) اور اگر قبض کے بعض اجزاء منعکس ہوئے اور بعض نہ ہوئے تو یہ قبض عامۂ مومنین کا ہے۔ (پھر ان میں بھی انعکاس کے قوی وضعیف ہونے کے لحاظ سے بدحالی میں کمی وبیشی کا فرق ہوگا)۔ یہی حال بسط کا ہے کہ ذات محمدی میں بسط نورانی کا اعلیٰ ترین درجۂ کمال موجود ہے۔ اور دیگر ذوات میں وہی تفصیل جاری ہوگی جو قبض میں بیان ہوئی۔ وہاں بسط نورانی میں حسن تجاوز اور شان تواضع ہوگی کہ دونوں اس کے اجزاء میں ہیں۔ اور بسط ظلمانی میں یہ دونوں منتفی ہو جائیں گے (جیسا کہ قبض میں صرف ایک جزو یعنی انصاف منتفی ہوا تھا)

اسی طرح نبوت کے سات اجزاء ہیں اول حق گوئی اور اس کا منشا وہ نور ہے جو ذات میں قرار پاتا اور حق بات کہنے پر مجبور کیا کرتا ہے اور یہ اس کی طبیعت ثانیہ اور خصلت طبیعیہ بن جاتی ہے کہ اس بارہ میں کتنے ہی احباب سے مخالفت اور گھر بار سے مفارقت کیوں نہ ہو بلکہ گردن کٹنے کی نوبت آجائے مگر یہ حق گوئی سے باز نہیں آسکتا۔ چنانچہ مشرکین مکہ نے کتنا ہی چاہا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قول حق سے باز آجاویں۔ اور ہر حیلہ و تدبیر سے آپ کو پھسلایا مگر آپ نے نہ مانا۔ آخر دشمنی پر پل پڑے اور سب نے مل کر گویا ایک کمان بن کر آپ پر تیر برسائے مگر پاؤں تو کیا ڈگمگاتا آپ کے استقلال و ثبات قدم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس لئے کہ ذات مقدسہ میں حق گوئی امر طبعی اور فطری تھی کہ اس کے خلاف کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ اس کے بعد حضرت ممدوح

نے دو حکایتیں نقل فرمائیں کہ عجم کے کسی شہر میں پرندوں کو (ہمارے ہاں کے طوطے اور مینا کی طرح) پڑھایا جاتا اور گھر کے دروازہ پر رکھا جاتا تھا کہ جب کوئی چور گھر میں گھستا تو وہ بولتے تھے "چور آ گئے" کتنا ہی کوئی ان کو ڈراتا دھمکاتا، اشاروں سے خوف دلاتا یا کیسی ہی ان کو کھانے کی چیز دی جاتی حتیٰ کہ ان کو قتل بھی کر دیا جاتا مگر وہ اپنی صدا لگانے سے باز نہ آتے تھے۔ اس حکایت سے حضرت ممدوح کا مقصود حق گوئی کا مطلب سمجھانا تھا کہ جب تعلیم کا یہ اثر اور وہ بھی پرند جانوروں پر اتنا ہو گیا کہ حق بات کہنا اُن کی خصلت و طبیعت بن گیا تو کیا پوچھنا بنی آدم کا اور پھر کیا پوچھنا مومنین کا۔

دوسرا قصہ یہ بیان فرمایا کہ ایک مرید نے اپنے شیخ سے کہا مجھے کوئی بات ایسی بتایئے جس سے اللہ کے ہاں راحت نصیب ہو۔ شیخ نے کہا اوصافِ خداوندی کی مشابہت اختیار کر لو۔ کہ جب تم اس کے اوصاف کی ذرا سی بھی مشابہت کر لوگے تو وہ تم کو اپنے دشمنوں کے ساتھ جہنم میں بھیجنا گوارا نہ فرمائے گا بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ دارالنعیم میں جگہ دے گا۔ اُس نے کہا کہ حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ کے اوصاف تو بے شمار ہیں۔ فرمایا ایک ہی وصف میں اس کے شبیہ بن جاؤ۔ عرض کیا وہ کون سا وصف۔ فرمایا جو بات حق ہو وہ کہو کہ حق گوئی اس کی ایک صفت ہے۔ مرید نے اس کا وعدہ کر لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ مرید کے ہمسایہ میں ایک نا کتخدا لڑکی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ اتفاق سے زنا کا صدور ہو گیا۔ لڑکی نے حالانکہ طلب اور ابتدا اسی کی طرف سے ہوئی تھی مگر یہ سمجھ کر کہ قصہ چھپنے والا نہیں ہے۔ اپنے باپ سے کہہ دیا اور اس نے عدالت میں جا کر دعویٰ دائر کر دیا۔ یہ شخص گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے آیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ سنتے ہو مدعی کیا کہہ رہا ہے۔ چونکہ اپنے شیخ سے کیا ہوا عہد و پیمان مرید کو یاد تھا اس لئے جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہوئی اور بولا کہ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔ بے شک مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے۔ حاکم نے یہ سُن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص دیوانہ ہے اس کو پاگل خانہ میں داخل کرنا چاہئے کہ عقل رکھنے والا کبھی ایسا اقرار نہیں کر سکتا جس سے اس کی جان کو گزند پہونچے۔ چنانچہ اسے پاگل خانہ بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد کسی نے سفارش کی اور حاکم نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس قصہ سے حضرت ممدوح کا اشارہ اس طرف تھا کہ حق گوئی کا انجام ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جزوِ دوم صبر ہے اور وہ ایک نور ہے

واقعات پر بقاءِ حواس ثابت ہے۔ مثلاً صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر حزن ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یا بحالت نماز کسی عورت کا بچہ رونے لگا تو آپ کو خبر ہوئی اور نماز کو مختصر کر دیا۔ اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کا قوم کی ضد اور ایذا رسانی پر تاسف کرنا اور بد دعا دینا وغیرہ تو اس سے خلجان میں نہ پڑنا کہ حقیقت یہ ہے جیسا اُن کا منصب رفیع ہے ایسی ہی ان کو طاقتِ بے نظیر دی گئی ہے کہ بیک وقت دونوں مشاہدے قائم رکھتے ہیں۔ بلکہ جتنا مشاہدہ خالق میں کمال بڑھتا ہے اُسی قدر طبع کی نظافت اور حواس کی ذکاوت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ اجزاءِ آدمیت میں اس کا کمال ہونا مذکور ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کی بصیرت کاملہ کا ایک رُخ ہمہ وقت خلق کی طرف ہے کہ ارشاد و اصلاح کی ہر ممکن سے ممکن تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ ان کی عقل نہایت وسیع اور طبع لطیف ترین ...... ہے اس لئے روحانی ایذا کی طرح جسمانی ایذا کو بھی جلد اور زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جتنی ایذا مجھے دی گئی ہے کسی نبی کو بھی نہیں دی گئی۔ اور اس کا سبب یہی تھا کہ آپ کی سی لطافت و نزاکتِ طبع اور ذکاوتِ حس بھی کوئی دوسرا لے کر نہیں آیا۔ نیز اگر احساس قوی نہ ہو تو اجر بھی بھرپور نہ ہو۔ پس صبر کا کمال جس میں جامعیت ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح عمل میں ڈاکٹر کے نشتر لگانے سے کسی نازک بدن کو تکلیف بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے کہ رو دیتا ہے مگر اس کا دل ڈاکٹر کی عظمت و شفقت اور وجوب اطاعت و ضبط کی کوشش میں غرق رہتا ہے۔ کیونکہ خوب جانتا ہے اس کا انجام صحت دائمی ہے واللہ اعلم۔

جزو سوم رحمت ہے اور وہ ایک نور ہے جو تمامی مخلوق پر شفقت اور ترس کھانے کو مقتضی ہوتا ہے اور یہ ناشی ہوتا ہے اُس رحمت سے جو اللہ کی طرف سے بندہ پر ہوتی ہے۔ لہٰذا جس قدر اللہ کی رحمت بندہ پر ہوگی اسی قدر اس بندہ کی شفقت عام لوگوں پر ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور حضورؐ کی جو شفقت عام مخلوق پر ہے اس کی بھی کوئی برابری نہیں کر سکتا بلکہ قریب بھی نہیں پہونچ سکتا۔ آپ کی رحمت و شفقت اتنی عظیم ہے کہ عالم علوی اور عالم سفلی اہل دنیا و اہلِ آخرت سب کو شامل ہے۔ چنانچہ آیت شریفہ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ میں حق تعالیٰ نے چار باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ایکؔ یہ کہ (رافت محمدیہ کے) اس نور

سے اسی مخلوق کو سیراب کیا جاتا ہے جن کو خوشنودی حق کا پروانہ عطا ہوا ہے (یعنی مومنین کو) دوم یہ کہ اس نور کو حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہے۔ یعنی قرب مرتبہ نہ کہ قرب مکانی۔ سوم یہ کہ وہ نورِ مقرب بتمامہ ذات محمدی میں موجود ہے۔ چہارم یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ میں اس کے برداشت کی اتنی طاقت ہے کہ نہ اس میں آپ کو کلفت لاحق ہوتی ہے نہ کوئی مشقت۔ اور یہی وہ کمال ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمامی مخلوقات پر فوقیت لے گئے۔ آیت شریفہ کا ان چہار معانی کی طرف اشارہ منجملہ اسرار الٰہیہ کے ہے جن کا اخفا ضروری ہے اور ان کے علاوہ اس آیت میں اور بھی اشارات ہیں۔
جزو چہارم معرفت ہے اللہ جل جلالہٗ کی اس درجہ پر جو اس کی معرفت کے شایان ہے۔
جزو پنجم۔ خوف کامل ہے کہ اللہ جل جلالہٗ کا خوف باطن میں تو ہر شے کے موجود ہے مگر اس کے ساتھ ظاہر پر بھی خوف کا پورا اثر نمایاں ہو جس کا سبب عقل سلیم اور اللہ کی ظاہری معرفت ہے (جو شریعت تعلیم کر رہی ہے) پس باطنی خوف تو (مومن ہو یا کافر) ہر شخص میں ہے بلکہ جسم کے ہر عضو اور ہر جوہر پر حاوی ہے۔ کیونکہ ہر جوہر کتنا ہی کیوں نہ ہو اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور مخلوق کا طبعی تقاضہ ہے کہ اپنے خالق سے ڈرے کہ ہر فانی و حادث، قدیم سے ڈرا کرتا ہے۔ بلکہ یہ خوف ہر جماد و نبات میں بھی موجود ہے کہ سب ہی اس کے بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ۔ پھر حق تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی درانحالیکہ وہ دھوئیں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خواہ بخوشی یا بہ جبر۔ دونوں نے عرض کیا کہ ہم بخوشی حاضر ہیں" یہ اظہار اطاعت اسی خوف باطنی و اصلی کا اثر تھا جو ہر مخلوق کی فطرت میں موجود ہے۔ اور اسی خوف کا منشا ہے وہ تسبیح جو آیۃ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ میں مذکور ہے کہ ایک چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ ہاں اس خوف باطنی کا حکم تو دوام و استمرار ہے کہ ایک لمحہ کو بھی جدا نہیں ہوتا۔ مگر خوف ظاہری کا سبب چونکہ اللہ کی طرف توجہ و التفات ہے۔ لہذا جب تک توجہ قائم رہتی ہے وہ بھی قائم رہتا ہے، اور جب دوسری چیز میں مشغول ہو کر توجہ ہٹ جاتی ہے تو خوف بھی جاتا رہتا ہے مگر

جس پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے اس کے اور اس خوف باطنی کے درمیان جو پردہ حائل ہے اسکو ہٹا دیتا ہے اور اس کے لئے ظاہری خوف بھی ظلمت سے پاک صاف اور دائمی بن جاتا ہے پھر اس خوف کو مدد پہونچتی ہے معرفت الہٰیہ سے اور معرفت الہیہ غیر متناہی ہے لہذا اس کے خوف کی بھی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ غرض خوف ظاہر تو خوف باطنی سے صفائی اور دوام کا نفع حاصل کرتا ہے اور خوف باطن اس خوف ظاہری سے زیادتی اور فیضان کا نفع اٹھاتا ہے' اور اس مجموعہ کا نام خوف کامل رکھا جاتا ہے۔ رہا یہ امر کہ باطن کو ظاہر سے زیادتی و فیضان کا نفع کیسے ملتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف باطنی کو تمامی اجسام کے ساتھ برابر کی نسبت ہے۔ (کہ مخلوق ہونے کے درجہ میں چھوٹے ہوں یا بڑے سب اجرام مساوی ہیں) ۔ اگر ان میں فرق مراتب ہے تو خوف ظاہری کی وجہ سے ہے۔ کہ خوف ظاہری کا سبب معرفت الہٰیّہ ہے اور معرفت الہٰیہ میں اجسام کے درجات مختلف ہیں۔ جزو ششم باطل کا بغض ہے۔ جس کا منشاء وہ نور ہے جو ذات میں ہر وقت موجود ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ ظلمت کی انواع مختلفہ کی طرف توجہ کرے اور ان کا ایسا استحضار ہو گویا بالکل نظر کے سامنے ہیں۔ پھر دفع کرنے میں ان کا ایسا مقابلہ کرے جیسا کہ ہر شئی اپنی ضد کا مقابلہ کیا کرتی ہے۔ غرض ظلمت کا نظر کے سامنے آنا اس کے ساتھ بغض رکھنے میں مدد پہونچاتا رہے گا۔ اور جب اس کا استحضار دائمی ہو جائے گا تو بغض بھی دائمی ہو جائے گا۔ پس باطل کے ساتھ یہ دائمی بغض جو ایک لحظہ کے لئے بھی کم نہ ہو منجملہ اجزار نبوت کے ہے۔ جزو ہفتم عفو ہے اور اس کا منشاء وہ نور ہے جو دائماً ذات میں قائم ہے اور اس نور کا اقتضار طبعی یہ ہے کہ جو اس کو مضرت پہونچائے یہ اُس کو نفع پہونچائے' اور جو اس سے توڑے یہ اُس سے جوڑے' اور اس پر ظلم کرے یہ اس سے درگذر کرے' اور جو اس کے ساتھ بدسلوکی کرے یہ اُس پر احسان کرے۔ پس وہ عفو جس کی یہ شان ہو نبوت کا جزو ہے۔ اور اس کے لئے دوام بھی شرط ہے کیوں کہ اس کا سبب نور مذکور ہے۔ اور وہ ذات نبی میں دائماً رہتا ہے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم کی یہی شان تھی یہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ خصائل نبوت میں جامعیت کاملہ جس سے بالا کوئی درجہ نہیں بجز آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ آدمیت و قبض و بسط ہر سہ انوار کے تمامی اجزار کا جو کمال ذاتِ محمدی میں آیا ہے وہ کسی ذات میں نہیں آیا۔ جب ذاتِ محمدی میں

یہ اکیس خصائل بدرجۂ اتم آلئے اور پھر ان پر نزول ہوا خصائل نبوت کا تو ان کے انوار مثل زبیق ہوگئے اور اسرار کی شعاعیں دور دراز پھیل گئیں۔ کہ اوّل نبوّت کی پہلی خصلت ان اکیس خصائل پر اُتری تو یہ اکیس انوار اس خصلت نبوت میں پیوست ہوگئے۔ اور پھر دوسری خصلت نبوت کا نزول بائیس ۲۲ خصائل پر ہوا اور بائیس انوار اس میں گھل مل گئے۔ اور پھر تیسری خصلت نبوت کا نزول تیئیس خصائل پر ہوا اور ان کے تیئیس ۲۳ انوار اس میں مندرج ہوگئے۔ وعلی ہذا القیاس گویا نور حق (کہ نبوت کی پہلی خصلت ہے) مرکب بائیس انوار سے۔ یعنی ایک خود اس کا نور اور اکیس انوار آدمیت وقبض وبسط کے اور نور صبر (کہ نبوت کی دوسری خصلت ہے) مرکب ہوا چوبیس انوار سے کہ ایک خود اس کا نور اور تیئیس انوار پہلے کے۔ اور اسی وجہ سے آپ کی رحمت وشفقت تمامی مخلوقات پر عام ہوئی۔ (اور آپ رحمۃ للعلمین قرار پائے) اور آپکی معرفت الٰہیہ کی شرح تو بیرون از طاقت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوّل منصب نبوت کی عظمت شان اپنی نگاہ کے سامنے لاؤ' اور پھر اس کے اجزاء وخصائل کی جو تفصیل کی گئی ہے اس کی حقیقت اور شرح کو فرداً فرداً نظر کے سامنے لاؤ' اور پھر ان تمامی اجزاء کے انوار کو ان تمامی انوار پر آثار وحی کو بیان کیا جا چکا ہے' اور ایک ایک نور کو یکے بعد دیگرے انوار ماسبق میں سلسلہ وار درج کرتے جاؤ اور اب دیکھو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کتنی بے نظیر ولا مثال ہے کہ بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ بقدر حسنہ وجمالہ وکمالہ وخصالہ۔

اسی طرح روح کے سات اجزا ہیں۔ جزء اول ذوق الانوار۔ کہ ایک نور ہے جو روح میں سرایت کئے ہوئے ہے اور کائنات میں جتنے بھی تصرفات خداوندی جاری ہیں ان کے انوار' اور عالم علوی میں جتنے بھی انوار موجود ہیں ان سب کا ذائقہ لیتا ہے۔ اور جسمانی ذوق اور روحانی ذوق میں چند باتوں کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ روحانی ذوق کا تعلق صرف نور سے ہے' برخلاف جسمانی ذوق کے کہ اس کا تعلق اشیاء کے جرم سے ہے۔ مثلاً شہد کی مٹھاس ہمیں اسی وقت محسوس ہوگی جبکہ اس کا جرم ہماری زبان کو لگے' اور روح کو شہد کا ذائقہ اس کے جرم سے نہیں بلکہ اس نور عقل سے محسوس ہوگا جو مٹھاس کی حقیقت کے ساتھ قائم ہے۔ دوم یہ کہ اس میں اتصال بھی شرط نہیں۔ یعنی جسمانی ذوق جب تک شہد کا جرم زبان سے متصل نہ ہوجائے کبھی حاصل نہ ہوگا'

برخلاف روحانی ذوق کے کہ جُرم متصل ہو یا غیر متصل دونوں کا مساوی ذائقہ لے گا۔ سوم
سوم یہ کہ ذوقِ روحانی روح کے کسی خاص حصہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ اُس کے
ظاہری و باطنی تمامی جواہر میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ برخلاف ذوق جسمانی کے کہ
وہ عادۃً صرف زبان کے ساتھ مخصوص ہے کہ جسم کے کسی دوسرے حصہ کو شہد کا مٹھاس کبھی
محسوس نہ ہوگا۔ چہارم یہ کہ ذوقِ روحانی کے لئے انسان کے تمامی حواس ظاہریہ و باطنیہ واسطہ
بنتے ہیں کہ مثلاً شہد پر نظر بھی جائے گی تو شہد کا ذائقہ بواسطہ اُس نور کے جو حلاوت کے
ساتھ قائم ہے روح کو محسوس ہوگا۔ اسی طرح مثلاً شہد کا لفظ سنے گا تو روح اس نور کو
جو شہد کے ساتھ قائم ہے چکھے گی اور اس طرح شہد کا مٹھاس محسوس کرے گی۔
برخلاف جسمانی کے کہ آنکھ سے دیکھ کر یا کان سے سُن کر اُس کو شہد کا ذائقہ نہ آئے گا اسی طرح
جب تم مثلاً لفظِ جنت یا لفظ رضوان یا لفظ رحمت سنو گے تو روح کو بواسطہ حسن باطنی اُس کا
مزہ آئے گا۔ علیٰ ہذا جب تم قرآن مجید سنو گے تو سب سے پہلے روح کو اُس روح کا ذائقہ آئیگا
جو کلامِ الٰہی میں رکھا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد دوسرے مزے آئیں گے جن کی کیفیت ناقابل
بیان ہے۔

الغرض روح اپنے تمامی جواہر و اجزا سے مزہ لیتی ہے' اور نیز تمامی حواس کے ذریعہ
ذائقہ پاتی ہے' برخلاف جسمانی کے کہ صرف زبان ذائقہ لے گی' اور اس ذائقہ کا واسطہ بھی
صرف زبان ہی بنے گی۔ مثلاً اگر شہد کو دیکھیں یا اُس کا لفظ سنیں تو اُس سے زبان میٹھی
نہ ہو گی۔ اور اگر شہد کو زبان پر رکھیں تو زبان کو مٹھاس ضرور محسوس ہوگا مگر آنکھ اور کان
کو نہ مٹھاس آئے گا نہ کوئی مزہ معلوم ہوگا۔ پھر تمامی ارواح بصفت مذکورہ نفسِ ذوق
میں تو متفق ہیں مگر قوت وضعف کے اعتبار سے اُن کے مراتب بہت مختلف ہیں (کہ کسی کا
ذوق ضعیف ہے اور کسی کا اس سے قوی پھر قوی تر ہے) پس جو روح سب میں قوی تر
ہو گی اس کا ذوق تمامی عوام کو عرش سے لے کر فرش تک چاک کرتا چلا جائے گا (کہ کوئی
چیز بھی ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اس کے ادراک سے ...... باہر نہ نکل سکیگی) اور یہ قوت صرف
روح محمدی کو حاصل ہے کہ وہ سلطان الارواح ہے۔ اور ذاتِ محمدی میں اس کی
رہائش و سکونت ..... بھی برضا و محبت تھی جس کی وجہ سے وہ پردہ اٹھ چکا تھا جو
جسم و روح میں حائل تھا اس لئے جو ذوق خارق للعوالم آپ کی روح شریفہ کو حاصل

تھا وہ آپ کی ذاتِ ترابی کو حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہی کمال ہے جس سے بالا کوئی کمال نہیں
جزو دوم طہارت ہے۔ یعنی روح کی وہ فطری صفائی و ستھرائی جس پر وہ پیدا کی گئی ہے
اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ حسی اور معنوی۔ صفائے حسی کے روح میں ہونے کی وجہ تو
ظاہر ہے کہ روح ایک نور ہے اور نور سب کا سب نہایت درجہ صاف ستھرا ہوتا ہی ہے۔ رہی
معنوی صفائی سو اس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت باطنیہ و معرفت ظاہر یہ دونوں مخلوط اور
ممتزج ہو جائیں۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اپنے رب کی پہچان تو تمامی مخلوقات کو حاصل
ہے کہ ناطق ہو یا صامت اور جامد ہو یا ذی حیات ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کے جز جز
میں یہ باطنی معرفت موجود نہ ہو (کیونکہ عدم سے وجود میں آنا موجد کے بغیر نہیں ہو سکتا
لہٰذا جو شئی بھی نیست سے ہست ہوئی وہ اپنے خالق سبحانہ سے واقف و عارف ہوئی) جیسا
کہ خوف تام کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ پھر حق تعالیٰ جس بندہ پر مہربانی فرماتا ہے
اس کے باطن کو ظاہر بنا دیتا ہے اور اس کا ظاہر . . . . اپنے رب
کی اس معرفت سے جو اس کے جز جز کو باطناً نصیب تھی باخبر و آگاہ ہو جاتا ہے کہ باطن
کی طرح ظاہر بھی بتمام اجزائہا عارف بن جاتا ہے اور یہی معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے جو
حق تعالیٰ نے تمامی ارواح کو بخشا ہے کہ وہ بجمیع اجزائہا اپنے رب سے واقف اور اللہ
کی عارف ہیں۔ مگر باوجود اس صفائی و عرفان میں متفق ہونے کے ذاتی چھٹائی بڑائی کے
اختلاف سے باہم ان میں بہت فرق ہے کہ کسی روح کا حجم چھوٹا ہے اور کسی کا بڑا۔ پس
جس کا حجم بڑا ہو گا ظاہر ہے کہ اس کے اجزا بھی کثیر ہوں گے اور اسی قدر اس کے معارف
زیادہ ہوں گے۔ اور تمامی ارواح میں باعتبار مقدار کے بھی سب میں بڑی اور ضخامت و
حجم کے اعتبار سے بھی سب سے اعظم و اکبر روح محمدی ہے کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان کو
پُر کیے ہوئے ہے، مگر بایں وسعت آپ کی ذات مطہرہ نے اس کو اپنے اندر لے لیا اور
اس کے تمامی اسرار پر حاوی ہو گئی ہے۔ سبحان اس کی قدرت جس نے ذات محمدی
کو یہ قدرت بخشی۔ پھر روح کا قیام چونکہ ذات میں برضا و محبت ہے (نہ کہ قیدی کی طرح
گرانی اور دونوں کے درمیان کا پردہ اُٹھ چکا ہے، اس لئے روح نے اپنی حسی و معنوی
صفائی سے ذات کو مدد پہونچائی۔ کہ صفائی حسی سے ذات میں خون صالح پیدا ہوتا ہے اور

صالح خون میں چار باتیں ہوتی ہیں۔ اوّل ہلکا پن کہ خون کا ثقل جاتا رہے کیونکہ خون جتنا بھاری ہوگا اسی قدر اس میں خباثت ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ شہوتیں بڑھیںگی۔ دوم بُو صاف ہو یعنی اس میں گندھے ہوئے آٹے کی سی بُو آوے کیونکہ خراب خون کی بُو ایسی ہوتی ہے جیسے سڑی ہوئی کیچڑ کی بدبو۔ سوم رنگ کی صفائی۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ زردی مائل ہو کہ خراب خون کا رنگ سیاہی مائل ہوا کرتا ہے۔ اور جتنا سیاہی کی طرف بڑھے گا اسی قدر اس میں خبث زیادہ ہوگا۔ چہارم مزہ صاف ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ شیریں ہو کیونکہ خبیث خون کا مزہ جلی ہوئی چیز کا سا ہوتا ہے۔ غرض جب جوہر خون ہر طرح صاف ہوگا تو تمام خطوط شیطانی اس سے نکل جائیں گے اور شہوات نفسانیہ کی رسیاں کٹ جائیں گی پھر جب ذات کو یہ صفا حسی حاصل ہو لیتی ہے تب روح اس کو صفا معنوی دیتی ہے۔ اور اس کا ظاہر بھی بجمیع اجزائہا اپنے رب کا عارف بن جاتا ہے۔ پس ذات محمدی چونکہ روح شریفہ پر محیط تھی اس لئے اس کی صفاء حسی معنوی ذات مطہرہ کو حاصل ہوئی۔ اور اُس کے تمامی اسرار جسد مبارک پر نمایاں ہوئے۔ فصلی اللہ علیہ صلوٰۃً لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی۔ جزو سوم تمیز ہے اور وہ روح میں ایک نور ہے جو ہر شے کی نفس الامری حقیقت جانچ لیتا اور پوری طرح اس کو تمیز کر لیتا ہے اور اُن میں پڑھنے یا سیکھنے کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ ہر شئ کو دیکھتے ہی یا اس کا نام سنتے ہی اس کے تمامی حالات اور مبتدا و منتہا کو سمجھ لیتا ہے، اور یہ کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے، اور کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پھر اس نور میں بھی ارواح کے درجات مختلف ہیں کہ روح کو جتنی خبر اور اطلاع ہوتی ہے اسی قدر اشیاء کو متمیز کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ اور اطلاع میں قوت و ضعف کا بہت کچھ فرق ہے۔ پس روح محمدی چونکہ اطلاع میں بھی قوی ترین ہے۔ کہ عالم کی کوئی چیز آپ سے محجوب نہیں رکھی گئی اور آپ کو عرش و فرش علو و سفل دنیا و آخرت اور دوزخ جنت سب کی اطلاع دی گئی ہے کہ یہ سب کچھ پیدا ہی آپ کی وجہ سے ہوا ہے، لہٰذا آپ کی شان تمیز و حقیقت شناسی بھی تمامی عوام پر حاوی ہے یعنی آپ کو افلاک کے متعلق واقفیت ہے کہ کس چیز سے بنائے گئے ہیں، اور کب بنائے گئے ہیں، اور کیوں بنائے گئے ہیں، اور ہر جرم فلک کا مرجع و منتہا کیا ہے۔ اسی طرح ہر آسمان کے فرشتوں کی حقیقت آپ کو معلوم ہے کہ کون فرشتہ کس فلک پر ہے، اور کہاں پیدا کئے گئے ہیں، اور کب پیدا کئے گئے ہیں، اور کس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور انجام کار

کیا ہوں گے۔ نیز ان کے اختلافِ مراتب اور منتہا درجات سے بھی واقف ہیں۔ اور آپ کو ستر ہزار حجابوں اور حجاب کے فرشتوں کے متعلق بھی، نیز عالمِ علوی کے نورانی اجرام مثلاً ستارے، چاند، سورج، لوح، قلم، برزخ اور برزخی ارواح کے متعلق بھی تمیز حاصل ہے۔ اسی طرح ساتوں زمینوں، اور ہر زمین کی تمامی مخلوقات، اور بر و بحر میں جو کچھ بھی آباد ہے سب کی تمیز اسی تفصیل کے ساتھ حاصل ہے۔ اور اسی طرح جنتیوں اور ان کے درجات اور ان میں رہنے والوں کی تعداد، اور جنت میں ان کے مقامات وغیرہ کی پوری حقیقت سے آگاہی حاصل ہے۔ علیٰ ہٰذا دیگر عوالم کے متعلق بھی اسی کیفیت و صفت کے ساتھ آپ کو واقفیت حاصل ہے۔ اور اس میں اللہ جل جلالہٗ کے علمِ قدیم و ازلی سے کہ اس کی معلومات غیر متناہی ہیں کوئی مزاحمت نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے علمِ قدیم کی معلومات اِن عوالم ہی میں منحصر نہیں ہیں۔ اور ربوبیت کے رازہائے مخفیہ اور الوہیت کے اوصاف و کمالات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ ان کو اس عالم سے بھلا کیا نسبت۔ پھر جب روح کو ذات کے ساتھ محبت ہوتی تو وہ نورِ تمیز اس کو دے دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ذاتِ محمدی (باوجود اُمّی ہونے کے تمام عوالم کی) ہر شئی کو متمیز کرتی اور سب کی حقیقت سے آگاہ تھی۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ذاتِ مطہرہ کو یہ فضل و شرف بخشا اور اتنی طاقت عطا فرمائی۔

ف - یہ ہے تفسیر آیت شریفہ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ کی کہ حق تعالیٰ نے اپنے علمِ ازلی کے معلوماتِ غیر متناہیہ میں اوّل تمامی ارواح کو حقیقت شناسی و قوتِ تمیز عطا فرما کر بہت کچھ مغیبات کو شہادت اور غائب کو حاضر بنایا۔ اور پھر روحِ محمدی کو سید الارواح بنا کر تمامی عوالم کے بے شمار مغیبات پر مطلع کیا۔ اور ہر شئے کی حقیقت کو دوسری سے جدا کرنے کی قابلیت بخشی۔ کہ مثلاً ایمان کا نور ایک نور ہے۔ مگر اس کی بے شمار انواع ہیں کہ ہر مومن کا نور جدا ہے اور اسی لئے ہر ایک کا مقام بہشت میں جدا ہوگا۔ مگر عوالم ستر تو کیا معنی اگر مہا سنکھ بھی ہوں تب بھی متناہی ہوئے اور ان کی معلومات بھی کتنی ہی شمار سے بیرون کیوں نہ ہوں بہر حال محدود ہوئیں، جن کو غیر متناہی معلوماتِ الٰہیہ سے ایسی نسبت ہے جیسے سیدنا خضر علیہ السلام نے ایک سمندر سے چونچ بھر پانی لینے والے پرند کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میری تمامی تکوینی معلومات اور آپ کی تمامی تشریعی معلومات ظاہریہ و باطنیہ کو معلوماتِ الٰہیہ

سے یہ نسبت ہے جو اس پرند کے چونچ بھر قطرہ کو اس بحر ناپیداکنار کے لبریز پانی سے نسبت ہے۔ اور یہ بھی محض سمجھانے کے لیے تھا ورنہ ظاہر ہے کہ سمندر کا پانی ایک قطرۂ آب سے کتنا ہی بے شمار افزوں کیوں نہ ہو پھر بھی قطرہ کی طرح محدود و متناہی ہے' اور معلومات الٰہیہ کی نہ کہیں حد ہے نہ کوئی انتہا۔ لہٰذا معلومات محمدیہ تمامی مخلوقات کی معلومات سے بے شک بیش از بیش اور شمار سے اتنی بیرون ہیں کہ دائرۂ عقل انسانی میں بھی نہیں سماسکتیں مگر معلومات الٰہیہ کے سامنے بہت کم اور محدود ہیں۔ رہا یہ امر کہ متعدد واقعات اور ان کے عواقب سے آپ کی ناواقفیت احادیث میں آئی ہے' تو اس کا جواب یہ ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ ذات انسانی کے لیے معلومات کے استحضار میں توجہ اور التفات کی ضرورت ہے کہ ایک شے معلوم ضرور ہوتی ہے مگر چونکہ اُدھر توجہ نہیں ہے اور التفات مشغول ہے اس سے اہم دوسرے معاملہ میں' لہٰذا اس معلوم کا استحضار نہ ہوگا۔ چنانچہ آگے عدم غفلت کی شرح میں مولف نے اس کو بیان کیا ہے۔ یا ممکن ہے کہ ابتلاء و امتحان یا اور کسی مصلحت سے حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے اس مغیب کو شہادت نہیں بنایا اور جس طرح اپنی معلومات غیر متناہیہ میں بے شمار معلومات پر مطلع نہیں فرمایا' ان جزئیات اور ان کے عواقب پر بھی مطلع نہیں فرمایا کہ مصالح خداوندی کا احاطہ کون کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس میں شان محمدی کی تنقیص بھی نہیں اور آپ کی وسیع ولاثانی معلومات کا مخلوق میں کوئی ہم پلہ بلکہ پاسنگ بھی نہیں۔ جزو چہارم بصیرت ہے۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ روح کے تمامی اجزا میں فہم اس طرح سرایت کرجائے جیسے تمامی حواس یعنی بصارت و سماعت اور قوت شامہ ولمس و ذوق' اجزاء روح میں سرایت کیے ہوتے ہیں کہ علم بھی روح کے تمامی اجزاء میں قائم ہے اور بصر بھی تمامی اجزاء میں موجود ہے اور سمع بھی تمامی اجزاء میں پائی جاتی ہے حتیٰ کہ روح کا ایک جزو بھی ایسا نہیں جس میں علم و سمع و بصر و شم و ذوق ولمس موجود نہ ہوں۔ چنانچہ وہ ہر جہت سے دیکھتی ہے' اور ہر جانب سے سنتی سونگھتی' چکھتی' اور چھوتی ہے۔ پس روح کو جب ذات سے محبت ہو جاتی اور وہ پردہ اٹھ جاتا ہے جو دونوں میں حائل تھا تو روح اس بصیرت کو ذات تک پہونچاتی ہے' اور ذات بھی اپنے تمام اجزاء سے آگے اور پیچھے اور اوپر اور نیچے اور دائیں اور بائیں ہر جہت سے دیکھنے لگتی اور سننے اور سونگھنے اور چکھنے لگتی ہے۔ غرض جو شان روح کی تھی وہ ذات

ترابی کی ہوجاتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہرہ اور روح مبارک کا درمیانی پردہ بچپن ہی میں اُس روز اٹھ چکا تھا جس دن فرشتوں نے آپ کا شق صدر کیا تھا اس لئے آپ کی روح اور ذات کے درمیان خلا ملا اور اتحاد اسی وقت ہوگیا تھا اور آپ کی ذات ان چیزوں پر مطلع ہوگئی تھی جن پر روح مبارک مطلع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے پیچھے سے ایسا ہی دیکھتے تھے جیسا آگے سے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ صاحبو! اپنے رکوع اور سجدہ کو ٹھیک ادا کیا کرو کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے واللہ اعلم۔ جزو پنجم عدم غفلت ہے۔ یعنی جو مقدار روح کا مبلغ علم ہے اور جہاں تک روح کی نظر پہونچی ہے اس سے علم کی ضد اور جہل کی تمام کیفیات ایسی منتفی ہوجائیں کہ شئی معلومہ میں نہ بھول چوک پیش آوے نہ غفلت لاحق ہو۔ اور روح کے لئے معلومات کا حصول تدریجی نہیں ہے بلکہ دفعی ہے کہ تمامی معلومات روح کی ایک نگاہ میں یک دفعہ حاصل ہوجاتی ہیں۔ نہ یہ کہ ایک شئی کی طرف اگر توجہ کرے تو دوسری سے غافل ہوجائے۔ چونکہ علوم اس کے فطری وخلقی ہیں کہ اس کی ابتدائی فطرت ہی میں یک دم اس کو علوم حاصل ہوچکے ہیں لہذا وہ جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ دوسری چیزوں کا علم اس کو فوراً حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ دوسری چیز کی طرف بھی توجہ کرے۔ پھر جب تک روح کا وجود قائم ہے، اس کے اس کے ساتھ اس کے علوم بھی قائم ہیں۔ اور عدم غفلت سے یہی مراد ہے۔ یہ شان ہر روح کو حاصل ہے۔ مگر علوم کی مقدار میں فرق ضروری ہے کہ کسی کی معلومات تھوڑی ہوتی ہیں اور کسی کی زیادہ۔ اور چونکہ معلومات کی کثرت علوم کی عظمت اور نظر کی وسعت وقوت میں روح محمدی تمامی ارواح کی بادشاہ ہے۔ لہذا وہ تمامی عوالم کی موجودات پر بلا تدریج وترتیب یک دفعہ مطلع ہوچکی ہے۔ اور پھر روح شریف اور ذات مطہرہ میں یگانگت ومحبت ہے اس لئے ذات محمدی بھی غفلت لاحق ہوئے بغیر موجوات عالم پر مطلع ہے۔ البتہ نوعیت اطلاع دونوں کی جُدا ہے کہ روح کی اطلاع دفعی ہے بلا ترتیب۔ اور ذات کی اطلاع بتدریج وبا ترتیب ہے کہ عوالم میں جس شئی کی طرف توجہ کرے گی اس کو معلوم کرلے گی، یہ نہ ہوگا کہ توجہ کئے بغیر معلوم کرلے۔ اسی طرح اول ایک چیز کی طرف توجہ کرے گی اور اس کے بعد دوسری چیز کی طرف۔ حتیٰ کہ

اسی ترتیب سے تمامی عوالم کی موجودات اس کے دائرۂ علم میں داخل ہوجائیں گی۔
جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات کا تسلط تمامی معلومات پر ہے مگر توجہ کا محتاج ہے۔ اور
وہ بھی یکے بعد دیگرے بترتیب۔ کیونکہ وقتی حصولِ معلومات کی جو طاقت روح میں
ہے وہ ذات میں نہیں ہے۔ اور اسی درجہ کا فرق دونوں میں عدم غفلت کے اندر ہے کہ
ذات کو توجہ قائم رکھتے ہوئے بے شک بھول چوک پیش نہ آئے گی۔ نہ یہ کہ توجہ ہٹ
جانے پر بھی سہو و نسیان لاحق نہ ہو۔ چنانچہ بخاری میں روایت آئی ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں ایک دفعہ سہو پیش آیا اور صحابہ نے آپ کو (ادباً و نیز
یہ سمجھ کر کہ حکم ہی بدل گیا ہوگا کہ آپ شارع ہیں) اس پر آگاہ نہ کیا تو آپ نے ارشاد
فرمایا کہ بشریت میرے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے۔ اور جس طرح تم کو بھول ہوتی ہے۔ مجھے
بھی بھول ہوتی ہے۔ رہی وہ حدیث جس میں حضرت کا یہ ارشاد مروی ہے کہ میں
بھولتا نہیں بلکہ (منجانب اللہ) مجھ پر بھول ڈالی جاتی ہے۔ سو حفاظ حدیث مثلاً امام
ابن عبدالبر نے تمہید میں اور ابن حجر نے فتح میں اور جلال الدین سیوطی نے موطا
کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک
کسی حدیث کی کتاب میں بھی متصل نہیں ہے اور ابن حجر نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث
کے رد میں آپ کا یہی ارشاد کافی ہے کہ آپ نے اپنی صرف بشریت کے اظہار پر اکتفا نہیں
فرمایا بلکہ اپنے نسیان کو صحابہ کے نسیان کے ساتھ تشبیہ بھی دی واللہ اعلم جزو ششم۔
قوۃ سریان ہے کہ حق تعالیٰ نے اجرام کے چاک کرنے اور ان میں داخل ہوجانے کی روح
کو طاقت دی ہے کہ وہ پہاڑوں اور سخت پتھروں اور دیواروں کو پھاڑتی ہوئی ان کے
اندر گھس جاتی اور (کھلے راستہ کی طرح) ان میں جہاں چاہتی ہے (جیسے ایکسرے
کی برق سخت ہڈی اور کھال کو پھاڑ کر اندرونِ شکم گھس جاتی اور اجزاء لحمیہ میں جہاں
چاہتی ہے گشت لگاتی ہے کہ اس کے لئے ٹھوس اجرام ایسے ہیں جیسے بدن کے لئے
جو کی ہوا کہ جسم انسانی اس کو پھاڑتا ہوا آگے قدم بڑھاتا اور فضاء ارضی میں جہاں
چاہتا ہے بے تکلف بھاگا پھرتا ہے)۔ اور جب روح کی سکونت ذات ترابی میں محبت و
یگانگت کے ساتھ ہوتی ہے تو روح یہ طاقت ذات کو دے دیتی ہے کہ کالبد خاکی بھی
وہ کام کرنے لگتا ہے جو روح کیا کرتی ہے۔ اسی قبیل سے ہے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا

قصّہ کہ آپ کی قوم نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا تو آپ بھاگ کر ایک درخت کے اندر گھس گئے کہ آپ کی روح نے بدن کو باہمی محبت کے سبب خرقِ اجرام کی طاقت دی اور ذاتِ ترابی جرمِ شجر کو پھاڑ کر اندر داخل ہوگئی اور اسی قبیل سے ہیں حضرات اولیار کے واقعات کہ دروازہ کھلے بغیر مکان میں داخل ہوگئے اور بند مکانوں میں پائے گئے۔ اور اسی قبیل سے ہیں اہل اللہ کے یہ قصّے کہ ایک قدم مشرق میں رکھا تو دوسرا قدم مغرب میں۔ ذات ترابی میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ افق مشرق اور افق مغرب کے درمیان جو ہوا بھری ہوئی ہے اس کو ایک لحظہ میں قطع کر سکے کیونکہ ہوا اس کا جوڑ جوڑ پھینکے گی' ایک ایک عضو کا چورا کر دے گی' اور بدن کے سارے خون اور رطوبتوں کو سکھا دے گی۔ مگر چونکہ روح نے اس کو یہ قوت دے دی لہذا یہ واقعات صادر ہوئے۔ اور اسی قبیل سے ہے معراج کا واقعہ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آن کی آن میں پہونچے جہاں بھی پہونچے اور واپس بھی ہوگئے کہ یہ سب کچھ روح کا فعل تھا اور اس نے اپنی قوت سریان سے ذات مطہرہ کو مدد پہونچائی تھی واللہ اعلم۔

جزوِ ہفتم۔ جسم کو تکلیف پہونچانے والی چیزوں کا عدم احساس ہے کہ روح کو نہ بھوک پیاس اور گرمی سردی وغیرہ کا احساس ہوتا ہے' اور نہ جب وہ کسی تیز چیز میں نفوذ کرتی ہے تو اس کی تیزی یا تکلیف محسوس ہوتی ہے' نہ کسی متعفن جگہ پر عبور کرنے سے اس کو کلفت لاحق ہوتی ہے۔ برخلاف فرشتوں کے کہ صرف صورت اخیرہ ان کے لئے تکلیف کا سبب ہے۔ کیونکہ ان کی فطرت خوشبو کی طرف جھکتی ہے اور بدبو سے گھنیاتی ہے لیکن روح میں اگر یہ عدم احساس نہ ہو تو وہ ذات ترابی میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھیر سکے (کہ کالبد خاکی تو ہر قسم کی گرم و سرد کلفتوں کا مجسمہ اور سنک تھوک بول و براز کی مختلف عفونتوں کا تھیلا ہے۔ لہذا قدرت الٰہیہ نے روح کو بے حس بنا دیا کہ اجل مقرر تک اس کو سکون کے ساتھ اپنا مسکن بنائے ہے)۔ غرض ان ساتوں باتوں کا ہونا ہر روح میں ضروری ہے' اور اسی لئے ہم نے ان کو اجزاء روح بنایا ہے۔ مگر ان امور میں قوت ضعف کے لحاظ سے چونکہ ارواح مختلف ہیں اور سب میں اعلیٰ درجہ روح محمدی کا ہے اس لئے ساتوں قوتیں بدرجۂ کمال ذات محمدی کو حاصل ہیں۔ اب ان ساتوں انوار پر آدمیت و قبض و بسط اور نبوت کے اٹھائیس انوار کا اضافہ کرو کہ مثلاً پہلا نور ذات محمدیہ میں ذوق الانوار ہے'

اور وہ گذشتہ اٹھائیس انوار میں مندرج ہو کر گویا انتیس انوار کا مرکب مجموعہ ہو گیا۔ اور پھر دوسرا نور یعنی طہارت شامل ہوئی نورِ ذوق اور دیگر انوار میں کہ تیس انوار کا مرکب ذاتِ محمدی میں پایا گیا اور پھر اسی طرح تیسرا چوتھا حتیٰ کہ ساتواں نور یعنی عدم الاحساس سابقہ چونتیس انوار پر آتا اور مجموعہ پینتیس ہو گیا۔ اس کے بعد سوچو اور دیکھو کہ نبی امی کی کیا شان رفیع ہے۔ چھٹا جزو نورِ علم ہے۔ اور علم کامل ہے جو طہارت وصفائی میں انتہا پر پہونچا ہوا کہ سات خوبیاں جن کو ہم بیان کریں گے اسی میں جمع ہونگی (نہ کہ مطلق علم میں) اور اس سے قبل علم کی حقیقت بھی سمجھ لو کہ علم درحقیقت عقل کا نور ہے، اور عقل روح کا نور ہے، اور روح ذات کا نور ہے، اور پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب پاک ذاتِ ترابی کے اور اس کی روح کے درمیان کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو جو حقیقت نورِ عقل کے لئے ثابت ہے اور اسی کا نام علم ہے وہی صفت ذاتِ ترابی میں آجاتی ہے۔ لہذا علم روح پر جو اپنے انوار سبعہ سے متصف تھی۔ اب علم کے ساتوں انوار کا اضافہ ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی صفات بن جاتے ہیں۔ اور علم کے سات اجزاء یہ ہیں۔ اول معلومات کا بار اٹھانا۔ اور وہ ایک نور ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ معلومات اس درجہ حاصل ہوں کہ آنکھ کو اپنی دیکھی ہوئی اور کان کو اپنی سنی ہوئی۔ غرض حواس خمسہ کو اپنی ادراک کی ہوئی چیزوں کا جتنا حصول ہوتا ہے ان سب پر فوقیت لے جائے۔ غرض نورِ علم میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ذات کے ہوتا ہے۔ اور نورِ نظر و سماعت وغیرہ میں اشیاء کا حصول بمنزلہ ظل اور خیال کے ہوتا ہے۔ یعنی علم میں اشیاء کا حصول حقیقی ہوتا ہے اور حواس خمسہ میں خیالی ہوتا ہے۔ اگرچہ عام لوگوں کے نزدیک اس کا عکس ہے کہ وہ نورِ بصر میں آئی ہوئی چیزوں کو اصلی سمجھتے ہیں اور نورِ علم کی حاصل کردہ چیزوں کو خیالی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں نورِ علم بہت کم حتیٰ کہ بال برابر ہے اس لئے ان کا اعتماد صرف حواس خمسہ پر ہوتا ہے۔ مگر جس کو حق تعالیٰ علم کامل عطا فرماتا ہے۔ اس کے نزدیک نظر و دیگر حواس اس کی معلومات بمقابلہ اس علم کے جو اس کو حاصل ہے مثلِ خیال کے معلوم ہوتی ہیں۔ وضاحت حال کے لئے ایک مثال سمجھو کہ فرض کرو ایک شخص نے مکان تعمیر کیا اور بنیاد سے لے کر اوپر تک ہر چھوٹا اور بڑا کام خود اپنے ہاتھوں کیا کہ مٹی بھی خود ہی لایا ان کی اینٹیں بھی خود ہی پکائیں پھر

پتھر بھی خود لایا اور خود ہی اس کو پھونکا۔ اور خود ہی اس کا چونہ بنایا اور پیسا۔ پھر خود ہی
لکڑی لایا خود ہی اس کو چیرا اور خود ہی چوکھٹ اور کواڑ بنائے۔ پھر خود ہی چنائی کی اور
روّدے رکھے۔ غرض مضبوط بنیادوں پر مستحکم ستونوں کا خوبصورت مکان مکمل کر لیا
اور ازاول تا آخر کسی ایک کام میں بھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی، اور جو کچھ بھی کیا وہ اپنے
فکر اپنے دماغ اپنے ارادہ اپنی تجویز اور اپنی قابلیت سے کیا۔ حتیٰ کہ مکان کا ہر جزو اور
ہر شئی ایسی ہوگئی گویا اس کی طبعی و فطری ہے اور اس کے فکر و دماغ میں ہر وقت حاضر
ہے کہ کبھی غائب نہیں ہوتی۔ اب فرض کرو کہ وہ کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا اور اپنے
ساتھ ایک اور شخص کو لے کر واپس آیا، اور دونوں اس مکان کو دیکھنے لگے۔ ہر چند
کہ آنکھ سے دیکھنا دونوں کا یکساں ہے، مگر پہلے شخص کو اس مکان کا جتنا علم ہے وہ
اس دوسرے شخص کے علم سے بدرجہا بڑھا ہوا ہوگا کہ اس کو مکان اور اس کے تمامی اجزاء
اور اجزاء کے اجزاء اور عمل کی تفصیل اور تفصیل کی تفصیل سب ہی کچھ معلوم ہے کیونکہ
خود اسی نے بنایا ہے اس لئے مکان کے ظاہر و باطن اور بیرون و اندرون کا جتنا اسے علم
ہے دوسرے کو ہرگز نصیب نہیں۔ یہی حال علم کامل کا ہے کہ وہ شئی کے ظاہر و باطن اور
اجزاء و اجزاء الاجزاء اور تفاصیل التفاصیل کو محیط ہوتا ہے۔ اور نور بصر گھر کی سطح
میں بھی صرف ظاہر تک پہونچتی ہے، اندر نفوذ کر کے باطن تک پہونچنا تو بڑی بات ہے۔
اور یہ مثال بھی محض تقریبی ہے کہ علم کامل کی حقیقت کسی تمثیل میں آ ہی نہیں سکتی،
جسے حق تعالیٰ نصیب فرماتا ہے وہی خوب سمجھتا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اشیاء نور
علم میں آتی کیونکر ہیں؟ فرمایا کہ نور علم بمنزلہ برتن کے ہے جس میں سفید و صاف اور ایسا
خالص پانی ہو جیسا کہ وہ اپنی اصل خلقت میں ہے۔ اور فرض کرو دوسرے برتن میں
مختلف قسم کے متباین قطرات آب سے مرکب پانی موجود ہے کہ ایک قطرہ کھاری اور ایک
شیریں اور ایک ترش اور ایک گرم اور ایک ٹھنڈا وغیرہ وغیرہ۔ پھر مثلاً ہم اس مرکب پانی کو
اس خالص پانی کے برتن میں ڈال دیں تو یہ دونوں مخلوط اور آمیز ہو کر بمنزلہ ایک پانی
کے بن جائیں گے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں بن جائیں گے فرمایا بس پہلا برتن گویا علم
ہے اور دوسرا برتن بمنزلہ معلومات کے ہے کہ معلومات (مختلف قطرات کی طرح)
متبائن و مختلف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مختلف قطرے مل جل کر ایک ہو جاتے ہیں یا

ہر قطرہ متمیز و علیحدہ رہتا ہے؟ فرمایا سب خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے پانی اپنی ہتیلی پر ڈالا اور فرمایا دیکھو مثلاً یہ تو علم ہے۔ اس کے بعد دوسرے پانی کا ایک قطرہ لے کر اس پہ ڈال دیا اور فرمایا بتاؤ یہ قطرہ اس میں خلط ملط ہو گیا یا جدا ہے؟ میں نے کہا کہ خلط ملط ہو گیا۔ فرمایا یہ گویا منجملہ معلومات کے ایک معلوم ہے۔ پھر دوسرا قطرہ لیا اور اس کو بھی اس پہ ڈال دیا اور فرمایا بتاؤ یہ دوسرا بھی مل جل گیا یا علیحدہ ہے؟ میں نے کہا سب میں مخلوط ہو گیا۔ فرمایا فرمایا یہ گویا دوسرا معلوم ہے۔ پھر تیسرا قطرہ لیا اور اس کو بھی ڈال کر یہی فرمایا۔ اور کہا بس علم میں معلومات کے آنے کی یہی شان ہے کہ نور علم ابتدا میں ہر شے سے بالکل خالی ہوتا ہے اور پھر تدریجاً اس میں معلومات آتے رہتے ہیں اور نور علم بڑھتا رہتا ہے۔ کہ علم بمنزلہ غلاف کے ہے اور شے اگر چھوٹی ہے تو اس کا غلاف بھی چھوٹا ہوگا۔ اور چیزیں جتنی زیادہ ہوں گی۔ اسی قدر غلاف بڑا ہوگا۔ البتہ اس غلاف میں یہ عجیب خاصیت ہے کہ پہلے قطرہ پر بہت چھوٹا یعنی صرف اتنا ہے جس میں فقط ایک معلوم سما سکے' اور جب دوسرا معلوم آتا ہے تو اسی مقدار پر وہ بڑھ جاتا ہے۔ اور جب تیسرا معلوم حاصل ہو جاتا ہے تو اتنا اور بڑھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ معلومات کی کوئی حد و شمار نہیں لہذا نور علم کی وسعت اور بڑھوتری کی بھی کوئی حد نہیں رہتی۔ جزو دوم عدم اضاعت ہے اور وہ ایک نور ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ معلومات میں سے ایک بات بھی نہ جانے دے مگر مستحق کے پاس۔ یعنی اول تو نا اہل کے پاس جانے ہی سے اسے محفوظ رکھے اور اگر بہ تقدیر نا اہل کے پاس چلی جائے تو اس کے پاس قائم نہ رکھے بلکہ خزانہ میں واپس لے آئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان تھی کہ انوار علوم کا تکلم فرماتے اور نیک و بد مومن و منافق سب ہی ان کو سنتے۔ مگر جو منافق و بد طینت ہوتے تھے ان میں جوں بھی نہ رینگتی تھی کیونکہ یہ نور نبوت ان انوار علم کو نا اہلوں کے پاس نہ چھوڑتا تھا۔ بلکہ اپنی اصل طاہر یعنی ذات محمدی کی طرف واپس لے آتا تھا' اور جو انوار علم کے مستحق تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ فرماتا ہے وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا انوار علوم ان کے پاس پہونچ کر قائم و برقرار رہتے تھے۔ غرض علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک پاک علم جس کے نور میں سفیدی ہے اور دوسرا ناپاک علم جس کی روشنی میں دگندھک کی سی) نیلگونی ہے۔ اور پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کامل دوم ناقص پس فرض کرو کہ چار شخص ہیں۔ ایک کا علم طاہر ہے اور کامل بھی ہے۔ دوسرے کا طاہر ہے مگر تھوڑا ہے۔ اور تیسرے کا علم کامل' ناپاک ہے۔

اور جو تھے کا ناپاک ہے۔ مگر تھوڑا۔ اگر چاروں کسی ایک مجمع میں بیٹھ کر باتیں کریں گے تو طاہر ناقص علم والا نفع اٹھائے گا طاہر کامل علم والے سے اور ناپاک علم کا کچھ بھی اثر نہ لے گا کیونکہ وہ نا جنس ہے۔ اور ناپاک ناقص علم والا مستفید ہوگا ناپاک کامل علم والے سے اور پاک علم کا کچھ بھی اثر نہ لے گا کیونکہ وہ اس کا ہم جنس نہیں۔ اور چونکہ مطلق علم کی شان ہے عدم اضاعت اس لئے علم طاہر کبھی علم نجس کے پاس نہ ٹھہر سکے گا۔ اور اسی طرح علم نجس کبھی علم طاہر کے پاس قرار نہ پا سکے گا۔ بلکہ ہر ایک اپنے ہم جنس کی طرف لپکے گا کہ خبیث خبیثہ کے پاس جایا کرتا ہے۔ اور طیب طیب کے پاس۔ جزو سوم معرفت لغات و اصوات ہے یعنی چونکہ علم کامل میں تمامی چیزیں آتی ہیں اور مع اپنے حقائق و لوازم اور ذاتیات و عرضیات کے آتی ہیں۔ اس لئے تمامی مختلف زبانیں اور حیوانات کی بولیاں اور جمادات کی آوازیں بھی اُس کو معلوم ہوں گی۔ کہ معلومات کی دو قسمیں ہیں۔ حیوان اور جماد جماد کی بھی مختلف آوازیں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کی سر سراہٹ جدا ہے۔ اور دروازہ کی کھڑکھڑاہٹ جدا۔ پھر حیوان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ناطق اور غیر ناطق یعنی انسان کی مختلف زبانیں ہیں اور مختلف لغات۔ اسی طرح غیر ناطق یعنی پرند اور دیگر حیوانات کی بھی جدا جدا بولیاں ہیں کہ انسان ان کو سن کر فوراً معلوم کر لیتا ہے کہ فلاں جانور بول رہا ہے۔ اور صاحب علم کامل ان سب لغات و اصوات سے واقفیت رکھتا ہے۔ اس بارہ میں حضرت ممدوح سے بہتیری حکایتیں میرے سننے میں آئیں جن میں سے چند کا تذکرہ اس کتاب میں بھی آئیگا ہاں صامت مخلوق جس کی کوئی آواز نہیں مثلاً دیوار، پہاڑ، درخت وغیرہ ان کی گفتگو کا علم صرف اللہ جل جلالہ کو ہے کہ ان کا نطق باطنی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان مخصوص ہے اور حق تعالیٰ کسی نبی کے لئے معجزہ بنا کر اور کسی ولی کے لئے کرامت کی صورت میں کبھی اس کو ظاہر فرما دیتا ہے۔ جزو چہارم۔ انجام سے واقفیت ہے کہ اجزاء روح میں نور تمیز کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ہر شے کی حقیقت نفس الامری کو دوسری شے سے متمیز و جدا کر دیتی ہے۔ پس جب درجہ بدرجہ تمامی اشیاء متمیز ہو کر اپنے انجام و اختتام پہ پہونچتی ہیں تو نور تمیز کا کام ختم اور اس جزو علم یعنی معرفت عواقب کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کہ یہ ہر شے کا نفس الامری انجام تفصیل وار نظر کے سامنے لے آتا ہے۔ اور انجام صرف دو ہیں۔ یا عالم آخرت میں فناء و عدم جیسا کہ جمادات وغیرہ کے بارہ میں تجویز ہوا ہے اور یا بقاء و وجود جیسا کہ

(انسان وجنات وغیرہا) مکلفین کے بارہ میں ہے۔ پس یہ نور واضح کر دیتا ہے کہ فنائیت کب ہوگی،
اور کس طرح ہوگی اور یہ شے درجہ بدرجہ فنا کو کیونکر قبول کرے گی۔ اور اس کے اجزاء کم ہو نیست و
نابود کیسے ہوتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ انجام کار معدوم محض بن جائیں گے۔ اور یہ فنائیت کس جگہ
ہوگی اور فنا کے اسباب اور اُن کے مقتضیات کیا ہوں گے۔ حتیٰ کہ ہر شے کے متعلق یہ فنائیت ایک
امر واضح اور معقول بن جائے گی کہ نہ وہ خرق عادت رہے گا۔ نہ اُس میں کوئی بعد اور اشکال اسی
طرح دوسری نوع جس کے متعلق اخروی بقاء تجویز ہوئی ہے اول نور تمیز ان کے ہر فرد کو
متمیز کر کے جنت یا دوزخ تک پہونچا دے اور پھر یہ نور معرفت عواقب آکر واقعہ کے مطابق
ہر جنتی کے ثواب کی اور ہر دوزخی کے عذاب کی پوری تفصیل نظر کے سامنے لا دے گا۔ اس کی
شرح بہت طویل ہے اور ممکن ہے کہ حضرت ممدوح سے سنتے ہوئے کچھ واقعات اس مبحث کے
ہم آئندہ اثناء کتاب میں بیان بھی کریں۔ جزو پنجم ثقلین یعنی جن وانس کے حالات سے تعلق
رکھنے والے علوم کی معرفت ہے کہ احوال انسان سے متعلقہ علوم کی تعداد تین سو چھیاسٹھ
ہے اور احوال جنات سے متعلقہ علوم ان سے تین کم یعنی تین سو تریسٹھ ہیں۔ انہیں علوم میں
ان کی معاش ظاہری کے اسباب وذرائع داخل ہیں جن پر جسم کا قیام اور زندگی کا بقاء
موقوف ہے۔ خواہ وہ از قبیل کسب واکتساب ہوں جیسے کھیتی کرنا ہل چلانا اور لوہار کا کام،
بڑھئی کا کام وغیرہ یا ہاتھ کی صنعت ہو جیسے زردوزی اور سینا اور مٹی ولکڑی وغیرہ کے
برتن بنانا وغیرہ وغیرہ کہ اس نور والے کو سب کی معرفت ضروری ہے نیز یہ بھی کہ کیا طریق ہے
جس سے نفع حاصل ہو اور کیا صورت ہے جس سے نقصان ہو۔ نیز انہیں علوم میں علم الادب
داخل ہے جس کو فی زمانہ علم سیاست کہتے ہیں، کہ اس نور والے کو اسباب معاشرت کی بھی
واقفیت ہوتی ہے اور اُن طریقوں کی بھی جن کو تعلقات کے استوار اور خلاملا کے پائدار
بنانے میں دخل ہے۔ اور اس کے ماتحت کثیر در کثیر علوم ہیں۔ نیز اس نور والے کو اسباب
معاد کی معرفت بھی کامل ہوتی ہے جن کو ثقلین کی معاش باطنی کہنا چاہئے یعنی وہ باتیں
جو بندہ کو سمیٹ سمیٹ کر اس کے رب کی طرف لائیں ان کا راستہ بتائیں اور اس کو اللہ والا
بنائیں۔ انہیں علوم میں تمام شریعتوں کی معرفت داخل ہے کہ ہر شریعت کے انوار اُن اسرار سے
واقفیت ہوتی ہے جو اللہ تک پہونچانے والے ہیں۔ کہ ہر واقعہ کے متعلق حکم الٰہی جاننا ہے،
اور یہ کہ اس کے مشروع ہونے میں حکمت ومصلحت کیا ہے اور بندہ کو اس سے دنیا میں

کیا نفع پہونچے گا، اور آخرت میں کیا نفع۔ اس مبحث میں حضرت ممدوح سے جو باتیں سننے میں آئیں اگر ہم ان کو درج کتاب کریں تو بے شمار عجائب وغرائب کا مجموعہ بن جائے نیز اس نور والا حکم شرعی کو سنتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ بے شک یہی حق اور بلحاظ وقت و موقع بہترین وانسب ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت ممدوح سے اول اُس اختلاف میں بحث کی جو (علماء متاخرین) شیوخ مذہب میں (مسائل شرعیہ کے متعلق) واقع ہوا ہے۔ اور پھر اس اختلاف میں بحث کی جو (امام ابوحنیفہ وشافعی وغیرہ) ائمہ مذہب میں واقع ہوا ہے اور پھر اُس اختلاف میں بحث کی جو دیگر انبیاء علیہم السلام کی شرائع سابقہ (مثلاً شریعت موسویہ وعیسویہ وابراہیمیہ وغیرہا) میں واقع ہوا ہے اور برسوں اس تحقیق کو جاری رکھا تو وہ اسرار وحکم سننے میں آئے جو شمار سے بیرون ہیں۔ نیز انہیں علوم میں ان عوارض و آفات کی واقفیت داخل ہے جو معاش ظاہری ومعاش باطنی کو پیش آتی رہتی ہیں کہ وہ امور کیا کیا ہیں، اور اُن سے بچنے کی صورت کیا ہے۔ غرض ان کے تمامی اسباب سے پوری آگاہی ہوتی ہے کہ کون چیز اور کون سا عمل دین اور دنیا میں کیا خاص نفع پہونچاتا ہے، اور کونسا فعل اور کیا شے دنیا ودین میں کیا خاص نقصان پہونچاتی ہے۔ اسی طرح پورا علم طب اس میں داخل ہے کہ ظاہری وجسمانی ہو جس کا اثر معاش ظاہری پر پڑتا ہے۔ یا باطنی وروحانی جس کا اثر معاش باطنی پر پڑتا ہے۔ اور ان کے معالجات واصلاحات بھی (دنیوی طبیب وڈاکٹر کی طرح قیاسی وظنی نہیں بلکہ) نفس الامری اور حقیقی ہوتے ہیں (کہ گویا مرض کی علت آنکھوں سے دیکھی اور دوا کی خاصیت کو مشاہدہ کر لیا ہے، لہذا اثر بھی باذن اللہ یقینی ہوتا ہے)۔ جزو ششم۔ کونین یعنی عالم علوی وعالم سفلی سے تعلق رکھنے والے علوم کی واقفیت۔ عالم سفلی میں صرف سات چیزیں ہیں۔ عناصر اربعہ یعنی پانی۔ مٹی۔ ہوا۔ آگ اور مرکبات ثلثہ یعنی نباتات (اشجار وگھاس وسبزی وغیرہ) اور معادن (پتھر سونا چاندی لوہا وغیرہ)۔ حیوانات (پرند وگزند ودرند وانسان وجن وغیرہ) پس علم کامل کے لئے ضروری ہے کہ ان سب کی حقائق وماہیات معلوم ہوں، ان کے خواص سے جو کہ مابہ الامتیاز ہیں واقفیت ہو، ان کے منافع ومضار سے آگاہی ہو، ان کی قوتوں کا علم ہو، اور قوتوں میں تمامی افراد کے اختلاف کا علم ہو، کہ ایک آگ کا جرم مثلاً وسیع ہے مگر قوت اس کی کمزور ہے، اور دوسری آگ اس کے برعکس ہے کہ جرم چھوٹا ہے

مگر اُس کے قویٰ بہت قوی ہیں۔ جزوِ ہفتم تمامی جوانب کا صرف سامنے کی ایک جانب میں منحصر ہوجاتا ہے۔ کہ علم ایک نور ہے جو ہر جانب دیکھ کر اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔ مگر جب حق تعالیٰ کسی کو زائد قوت بخشتا ہے تو دوسری جانبوں کی چیزیں بھی اس کو بے کم وکاست ایسی ہی نظر آتی ہیں جیسے سامنے کی چیز۔ پس اُس وقت اس کی نگاہ میں صرف سامنے کی ایک جہت رہ جاتی ہے اور باقی جہات اس کی نظر میں محو ہوجاتی ہیں۔ یہ حالت علم کامل کہلاتی ہے جو صرف صاحب فتح کو نصیب ہوتی ہے۔ اور یہی مفہوم ہے اُس حدیث کا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں، کہ باوجودیکہ صحابہ آپ کے پیچھے ہوتے تھے مگر آپ ان کو اپنے سامنے کے رُخ دیکھتے تھے، جیسا کہ سامنے کے رُخ کی چیزوں کو دیکھتے تھے۔ پس اگر صاحب علم اطراف وجوانب میں کچھ بھی فرق محسوس کرے تو اس کا علم ناقص ہے کامل نہیں۔ ساتواں حرف نور رسالت ہے اور اس کا پہلا جزو روح کا ذات انسانی میں برضاد محبت قیام کرنا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ پاک ذوات میں انوار ہوا کرتے ہیں جو ان کے ایمان باللہ سے مدد پاتے ہیں۔ اور اُن انوار کے ضعف وقوت پر مدار ہے روح کے قیام وسکونت میں ضعف اور قوت کا۔ کہ ہر نور میں مادہ ہے کشش کا اور ارواح خود انوار مجسم ہیں البتہ ایمان کا نور ان کے انوار سے بہت زیادہ صاف اور چمکدار ہے۔ لہٰذا روح جب کسی ذات میں اس نور ایمان کو دیکھتی ہے تو اس کی طرف کھینچتی ہے اور اس کو شیریں وخوشگوار پاکر لذت لیتی ہے۔ پھر جس ذات میں نور ایمانی مثلاً ایک ہاتھ برابر ہے اس میں روح کی سکونت جس محبت ورضا کے ساتھ ہوگی اس سے بدرجہا زیادہ اُس کی سکونت بالرضا اُس ذات میں ہوگی جس کے اندر نور ایمان مثلاً دو ہاتھ کی برابر ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ علاوہ ازیں ایمان کا نور بڑھا کرتا ہے اعمال صالحہ کے اجور سے، کہ ہر عمل صالح کے اجر کا ایک خاص نور ہے، اور اُن اجور کے انوار کا عکس ذات پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کو دُنیا میں بھی پہونچتا ہے کہ نور ایمان قوی وعظیم ہوجاتا ہے۔ اور اخروی نفع تو ظاہر ہی ہے کہ یہی اجور جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور عامل اُن سے متمتع ہوگا۔ فرض کرو کہ دو شخص ایمان میں بالکل مساوی ہیں۔ مگر ایک نے دن بھر اعمال حسنہ کئے اور دوسرے نے کوئی نیک عمل نہیں کیا۔ تو جس وقت دونوں سو

سو جائیں گے نیکوکار کا نور ایمان زائد اور چمک دار اور پھیلا ہوا ہو گا دوسرے کے نور ایمان کی بہ نسبت (کہ صاحب بصیرت ان انوار کو دیکھتے ہی سمجھ لے گا کہ اُس نے اعمال حسنہ کئے تھے۔ نیز یہ کہ فلاں فلاں نیک کام کئے تھے کہ ہر عمل نیک کا نور بھی جُدا ہوتا ہے)۔ اور ظاہر ہے کہ رسالت یعنی حق تعالیٰ کی پیام رسانی سے بڑا کوئی کام نہیں اس لئے اس کے اجر اور نور سے بڑا کسی اجر کا بھی نور نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرات رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ایمان کے لگ بھگ بھی کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ پھر حضرات انبیاء میں متبعین کی قلت و کثرت کے لحاظ سے بھی فرق مراتب ہوتا ہے (کہ چونکہ متبعین کی ہدایت و صلاح کا واسطہ پیغمبر ہی بنا ہے اس لئے ان ایمان اور تمامی اعمال صالحہ بمقتضاء الدَّالُّ علی الخیرِ کفاعلِہ
پیغمبر کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں، لہٰذا جس کے متبعین جتنے زیادہ ہوں گے اُسی قدر اس کے اجور و اعمال صالحہ زیادہ ہوں گے) اور ظاہر ہے کہ کثرت متبعین میں کوئی رسول بھی ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر نہیں پہونچا (بلکہ عجب نہیں کہ اُمّت محمدیہ تمامی مرسلین کے متبعین کے مجموعہ سے بھی زائد ہو) اس لئے آپ کا اجر تمامی پیغمبروں کے اجور سے مافوق ہے۔ اور اس لئے آپ کے ایمان کا نور بھی اتنا ضخیم اور عظیم ہے جس کی کیفیت نہ بیان ہو سکتی ہے نہ کوئی اس تک پہونچ سکتا ہے۔ غرض انبیاء و مرسلین کی ذوات میں ان کی ارواح کی رہائش جس محبت و رضا کے ساتھ ہے وہ دوسروں کی ارواح کو نصیب نہیں۔ اور یہی خاص رہائش ہے جس کو ہم نے اجزاء رسالت میں شمار کیا ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ذاتِ محمدی میں روح محمدی کی رہائش تمامی مرسلین سے بھی مافوق ہے، لہٰذا یہ جزو رسالت بھی ذات محمدی میں انتہا کمال پر تھا۔ نیز روح کی رہائش میں اس اعتبار سے بھی فرق مراتب ہوا ہوا کرتا ہے کہ کسی کا نور ایمان جرم روح کے مساوی ہوتا ہے، اور کسی کا چھوٹا اور کسی کا بڑا۔ پس جس کا نور ایمان جرم روح سے بڑا ہوتا ہے اُس مومن کی ذات میں اس کی روح کا قیام زیادہ قوی ہوتا ہے بہ نسبت مساوی اور کم نور والوں کے۔ اور جن میں مطلق نور ایمان نہیں یعنی ذوات کفار ان کے اندر ارواح کی رہائش (برضا نہیں بلکہ قیدی کی طرح) قہری و جبری ہے بحکم تقدیر۔ ورنہ درحقیقت ان کی ارواح کو ان سے انتہا درجہ کا بغض و تنفر ہے۔

جزو دوم۔ علم کامل ہے اُن چیزوں کا جن کا تعلق حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت

سے ہے اور اُن چیزوں کا بھی جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے۔ پس وہ علوم جن کا تعلق
احوال کونین سے ہے۔ اور نیز وہ علوم جن کا تعلق انجام کی واقفیت سے ہے (کہ یہ تینوں علوم
اجزاء علم میں بیان کرنا اس لحاظ سے ہے کہ یہاں اُن تمامی علوم ثلثہ کی کمال معرفت مراد ہے۔
کہ علومِ مذکورہ کا انتہائی کمال منجلہ اجزاء رسالت کے ہے لہذا وہ ہر رسول میں ہونا لازمی ہے۔
اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ کمال انتہا بہ انتہا درجہ پر ہے۔ جزوِ سوم ہر شخص کے ساتھ
قول و فعل میں سچائی کا برتاؤ ہے کہ اقوال ہوں یا افعال سب ہی حق تعالیٰ کی محبت و رضا
کے موافق ہوں۔ کیونکہ مخلوق کو حضرات مرسلین کے اقتدا کا حکم ہے کہ ان حضرات کے ہر قول
و فعل میں یہ شان ضروری ہے کہ جو بات کہتے ہیں حق ہی کہتے ہیں، اور بولتے ہیں تو سچ
ہی بولتے ہیں، اور خوش طبعی میں بھی واقعہ کے مطابق وہی بات زبان سے نکالتے ہیں،
اور جب کسی بات کی خبر دیتے ہیں تو وہ ضرور ہو کر رہتی ہے۔ اور اگر کہیں بظاہر اس کا خلاف نظر
آوے تو اس کی صحیح تاویل کی جاوے گی (کہ حقیقت یہی نکلے گی جو ہم نے بیان کی ہے)۔
اور اس قسم کے چند واقعات اثنار کتاب میں بھی مذکور ہوں گے۔ الحاصل حضرات انبیاء علیہم السلام
کی شان کلام کے بارہ میں وہ ہے جو جنتیوں کی شان جنت میں خواہشات کے بارہ میں ہوگی۔
کہ جس طرح اہلِ جنت جس شے کی بھی خواہش کریں گے وہ ضرور پوری ہو کر رہے گی اسی
طرح حضرات انبیاء علیہم السلام جب کوئی بات زبان سے نکالیں گے وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی
اور یہی مضمون صدق میں جو کہ جزو رسالت ہے زائد ہے حق گوئی سے جو کہ جزو نبوت ہے۔
اور اس کا بیان نور نبوت کے اجزار میں ہو چکا ہے) کہ یہ صدق جس کا ذکر ہو رہا ہے حکایت
و نقل ہے امر مقدر کی (کہ گویا لوح محفوظ میں دیکھ کر ہونے والے واقعہ کے وقوع کی
خبر دی ہے) لہذا اس کا قائل گویا مسلوب الاختیار ہے۔ برخلاف حق گوئی کے (کہ وہاں
واقعہ کے مطابق زبان سے بات نکالنے میں اختیار و ارادہ کا دخل ہوتا ہے) پس سچائی
میں بہ نسبت حق گوئی کے ایک نور زائد ہوا۔ جزوِ چہارم سکینت و وقار ہے۔ اور وہ قلب میں
ایک نور ہے جو اللہ پر اطمینان اور اعتماد کو ضروری کر دیتا ہے کہ بندہ ہر قسم کی طاقت اور زور کو
خدا کی طرف پھیرتا ہے اور کسی غیر اللہ کی پرواہی نہیں کرتا۔ حتی کہ اس نور والے (پیغمبر) کو
جب حق تعالیٰ کسی امر کی تبلیغ کا حکم دیتا ہے تو ساری دُنیا مل کر بھی براہ ضد و عداوت
اس کا مقابلہ کرے تو اس کو مطلق پرواہ نہ ہوگی۔ اور وہ سب کو معدوم محض سمجھے گا بساری

دنیا اُس کی موافقت کرے اور یار و مددگار بنے یا مخالفت و عداوت کرے، دونوں حالتیں اس کے نزدیک برابر ہوتی ہیں۔ کہ نہ موافقت میں کسی کی طاقت پر اس کی نظر جاتی ہے اور نہ مخالفت میں کسی کی قوت اس کی نگاہ میں سماتی ہے۔ اور جس کو یہ سکینت نصیب نہ ہو وہ جب سُنے گا کہ کوئی شخص اس کے ساتھ بدی کا ارادہ رکھتا ہے اور ضرر پہونچاتا ہے تو اس کی نظر اپنی طاقت پر بھی جائے گی اور دشمن کی قوت پر بھی جائے گی۔ کہ دشمن کی مدافعت کے متعلق تدبیریں سوچے گا اور طرح طرح کے خیالات سوجھیں گے کہ کبھی فکر ہوگا اگر دشمن سے مقابلہ ہو گیا تو بھاگنے کی کیا صورت کروں گا اور اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہو گی۔ اور کبھی خیال آئے گا۔ کہ یوں اس کو دفع کروں گا اور اس طرح اس کو نیچا دکھاؤں گا حتّٰی کہ دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے گی اور اس کا دل پیچ و تاب میں میلا اور حیلہ اور تدبیر میں غلطاں پیچاں ہوگا کہ نہ کچھ بن پڑے گا نہ کچھ ہو سکے گا اور یہی وجہ ہے کہ سکینت کو جزو رسالت قرار دیا گیا ہے کیونکہ صاحبان رسالت کو حکم دیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے باشندوں سے عداوت رکھیں جب تک کہ وہ اپنے کفر سے باز نہ آ جائیں اور طریق باطل کو چھوڑ نہ دیں۔ لہذا ان کو پروا نہ کرنی چاہیے ان کی توجہ پر اور نہ ان کی بے توجہی پر۔ اور نہ ان کی نظر پڑنی چاہیے ان کی محبت پر اور نہ ان کی روگردانی پر۔ چنانچہ حضرات مرسلین کی یہی حالت تھی کہ باشندگان روئے زمین نے ان کے دشمن بن کر متفقہ کوشش سے ان کا مقابلہ کیا مگر ان حضرات پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس سکینت کا تذکرہ قرآنِ مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ مثلاً ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اللہ نے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مؤمنین پر۔ رسول پر انزال سکینت کا مطلب ہے اُس کا اظہار (کہ جو سکینت جزو رسالت بنا کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے دی ہوئی تھی) اس کے آثار کا مشاہدہ اور کثیر در کثیر دشمنوں کے مقابلہ پر آپ کا ثباتِ قدم مخلوق نے آنکھوں سے دیکھ لیا اور صحابہ پر انزال سکینت سے مراد حقیقی انزال اور بہ برکت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طمانیت قلب کا عطا فرمانا ہے۔ اس کے بعد حضرت ممدوح سے گفتگو ہوتے ہوتے اُس سکینت کا تذکرہ آیا جو بنی اسرائیل کے تابوت میں تھی۔ جس کا تذکرہ آیت شریفہ اَنْ یَّاتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ میں آیا ہے اور اُس سکینت کا جو حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اور اُس سکینت کا جو دیگر احادیث

میں آئی ہے۔ پس حالانکہ مجھے معلوم تھا مفسرین و محدثین نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے مگر حضرت ممدوح نے جو شرح فرمائی وہ ایسی تھی جیسے کوئی آنکھوں سے دیکھ کر شرح کر رہا ہے۔ حتی کہ سلسلۂ گفتگو حضرت جبریل کے وحیہ کلبی کی شکل میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) تشریف لانے کی کیفیت تک پہونچا اور اندیشۂ طوالت نہ ہوتا تو میں ان تمام مضامین کو بیان کرتا۔ جزو پنجم مشاہدۂ کاملہ ہے۔ اور اس کی شرح کی تو کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ عقول سے بالا ہے جیسے معرفت الٰہیہ کی شرح کہ اجزاء نبوت میں سے ہے کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ جزو ششم۔ موت بحالت حیات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالت حیات اُن تمام امور کا مشاہدہ فرماتے تھے جن کا مشاہدہ مُردوں کو مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اُس کے جزو رسالت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء دُنیا میں ترغیب اور ترہیب کے لئے بھیجے گئے ہیں اور یہ اسی سے انجام پا سکتی ہیں جو احوال آخرت کا خود معائنہ کر لے کہ لوگوں کو رغبت دلائے دار ثواب یعنی جنت کی، اور ڈرائے دار عذاب یعنی جہنم سے، اور تفصیل بیان کرے قبر کے عذاب کی۔ اور یہ کہ ارواح کا عالم برزخ میں جانا کس طرح ہوتا ہے وغیرہ اور تمام وہ باتیں جو محض عقل سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس امور میں پیغمبروں پر وحی الٰہی کا آجانا کافی تھا۔ مشاہدہ کی کیا ضرورت تھی۔ فرمایا کہ وحی ایک خطاب ہے، اور خطاب کلام ہے، اور کلام اُسی سے ہوا کرتا ہے جو اس کے معنی سے بھی واقف ہو پس یہ مشاہدہ پیغمبر پر معاد کے حالات کو کھول دیتا ہے اور وہ اس سے عینی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ پھر وحی کے ذریعہ اللہ کی طرف سے صرف ان باتوں کی تبلیغ کی اجازت ملتی ہے جن کی عقل متحمل ہوسکتی اور کان ان کو سُن سکتے ہیں اور وہ باتیں جن کو عقل برداشت نہیں کر سکتی اور جن کے سننے سے جگر پھٹ جائیں گے اُن میں تو پیغمبر اپنے مشاہدۂ سابقہ ہی پر رہتا ہے اور اس کے متعلق وحی نہیں ہوا کرتی۔ اور اگر کلام ایسے شخص سے کیا جائے جو معنی سے واقف نہ ہو تو اُسے اس کا سمجھنا اور سمجھانا ہی محال ہو جائے گا۔ جزو ہفتم۔ جنتیوں کی سی زندگی نصیب ہونا ہے کہ حضرات مرسلین کو اُن (انوار معارف و رضا) سے سیراب کیا جاتا ہے جن سے اہل جنت کو جنت میں داخل کرنے کے بعد سیراب کیا جائے گا۔ لہٰذا ذوات انبیاء کی شان دُنیا میں وہ ہوتی ہے جو اہل جنت کی شان ہو گی جنت میں۔ اس کی شرح یہ ہے کہ عالم دو ہیں۔ دار فنا اور دار بقا پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں یعنی ظلمانی اور

اور جب حجاب زائل ہو جاتا ہے تو دار بقا کی ہر قسم' دار فنا کی ہم جنس نوع کو مدد پہونچاتی ہے۔ کہ آخرت کی نورانی نوع یعنی جنت قوت پہونچاتی ہے۔ دنیا کی نورانی جنس یعنی ایمان وصلاح کو' اور ظلماتی قسم یعنی جہنم قوت پہونچاتی ہے اپنے ہم جنس ظلماتی نوع یعنی کفر و معصیت کو۔ مگر زوال حجاب کی صورتیں مختلف ہیں۔ کہ حضرت انبیاء کی ذات میں یہ پردہ پہلے سے اٹھا ہوا ہوتا ہے (اور یہ نورانی مدد ان کو اسی عالم دنیا میں حاصل ہوتی ہے) برخلاف دیگر ذوات کے ان کے لئے یہ پردہ بروز قیامت اُٹھے گا۔ اور اسی وقت عالم آخرت میں یہ استمداد واقع ہوگی کہ اہل ایمان مستفیض ہوں گے۔ انوار جنت سے اور اہل کفر وطغیان مستفید ہوں گے آتش دوزخ سے۔ الحاصل ہر جنس کا اپنے ہم جنس سے استفادہ موقوف ہے پردہ اٹھنے پر۔ اور چونکہ حضرات انبیاء علیہم السّلام کے حق میں یہ پردہ اسی دنیا میں اٹھ جاتا ہے اس لئے ان کی دنیوی زندگی بھی اہل جنت کی اخروی زندگی جیسی ہوتی ہے۔

یہ ہے تفصیل حروف سبعہ میں سے ہر حرف کے اجزاء سبعہ کی جن کو بطور خلاصہ دوبارہ بیان کرتے ہیں تاکہ اختلاف کی تفریع واضح اور حدیث کا مطلب جس کے متعلق حضرت ممدوح سے سوال کیا گیا تھا منکشف ہو جائے' اور وہ یہ ہے کہ حروف سبعہ سے مراد سات انوار ہیں۔ یعنی آدمیت' قبض' بسط' نبوت' روح' علم' رسالت' اور ہر ایک کے سات سات اجزاء' کمال حسن ظاہری' کمال حواس ظاہری' کمال حسن باطنی' کمال حواس' باطنی ذکوریت' نزع حظ شیطان' کمال عقل ہیں۔ اور قبض کے اجزاء ہیں وہ حاسہ جس سے خیر میں لذت اور باطل سے کلفت حاصل ہو انصاف' ضد سے نفرت امتثال امر جنس کی طرف میلان انقباض کی قوت کاملہ حق گوئی سے شرم نہ کرنا۔ اور بسط کے اجزاء ہیں۔ فرح کامل ذات میں خیر کا قیام۔ فتح حواس ظاہری۔ فتح حواس باطنی' رفعت حسن تجاوز' انکسار۔ اور نبوت کے اجزاء ہیں حق گوئی صبر' رحمت۔ معرفت الٰہیہ' خوف تام' بغض باطل' عفو اور روح کے اجزاء ہیں ذوق انوار۔ طہارت۔ تمیز۔ بصیرت۔ عدم الغفلۃ قوۃ سریان تکلیف دینے والے اجرام سے بے حسی اور علم کے اجزاء ہیں حمل علوم' عدم اضاعت معرفت لغات انجام سے واقفیت احوال کونین سے تعلق رکھنے والے علوم سے آگاہی احوال ثقلین سے تعلق رکھنے والے علوم کی واقفیت۔ تمامی جہات کا صرف سامنے کی جہت میں منحصر رہ جانا۔ اور رسالت کے اجزاء ہیں ذات میں روح کا قیام بر ضاد محبت۔ علم کامل ہر شخص کے ساتھ

سچائی. سکنیت[۲۷] وقار۔ مشاہدہ[۲۸] کاملہ موت بحالت حیات۔ اہلِ جنت کی سی زندگی۔ اب صحابہؓ دیگر قراء میں جو اختلافات تلفظ قرآن کے متعلق وارد ہوتے ہیں ان کا مذکورہ انوار سبعہ باطنیہ ہونا معلوم کرو کہ حروف تہجی جن سے عربی کلام مرکب ہوتا ہے انتیس ہیں۔ اور ہر حرف کے لئے انوار مذکورہ میں سے ایک نور ہے کہ آ کے لئے امتثال ہے جو قبض کے اجزاء میں ہے۔ ب[۲] کے لئے سکنیت ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے۔ ت[۳] کے لئے کمال حواس ظاہری ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے۔ ث کے لئے انصاف ہے کہ اجزاء قبض میں ہے ج[۵] کے لئے صبر ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے۔ ح[۶] کے لئے رحمت کاملہ ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے خ کے لئے ذوق الانوار ہے کہ اجزاء روح میں ہے۔ د[۸] کے لئے طہارت ہے کہ اجزاء روح میں ہے۔ ذ[۹] کے لئے معرفت لغات ہے کہ اجزاء علم میں ہے۔ ر[۱۰] کے لئے حسن تجاوز ہے کہ اجزاء بسط میں ہے۔ ز[۱۱] کے لئے ہر شخص کے ساتھ سچائی ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے۔ س[۱۲] کے لئے انکسار ہے کہ اجزاء بسط میں ہے۔ ش[۱۳] کے لئے انقباض کامل ہے کہ اجزاء قبض میں ہے ص[۱۴] کے لئے عقل کامل ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے۔ ض[۱۵] کے لئے حق گوئی ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے۔ ط[۱۶] کے لئے تمیز ہے کہ اجزاء روح میں ہے۔ ظ کے لئے نزع حظ شیطان ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے۔ ع[۱۸] کے لئے عفو ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے۔ غ[۱۹] کے لئے کمال صورت ظاہری ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے۔ ف[۲۰] کے لئے حمل علوم ہے کہ اجزاء علم میں ہے۔ ق[۲۱] کے لئے بصیرت ہے کہ اجزاء روح میں ہے۔ ک[۲۲] کے لئے معرفت الٰہیہ ہے کہ اجزاء نبوت میں ہے۔ ل[۲۳] کے لئے علم کامل ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے۔ م[۲۴] کے لئے ذکوریت ہے کہ اجزاء آدمیت میں ہے۔ ن[۲۵] کے لئے فرح کامل ہے کہ اجزاء بسط میں ہے۔ و[۲۶] کے لئے موت بحالت حیات ہے کہ اجزاء رسالت میں ہے ہ[۲۷] کے لئے ضد سے نفرت ہے کہ اجزاء قبض میں ہے لا[۲۸] کے لئے عدم غفلت ہے کہ اجزاء روح میں ہے۔ اور آخری حرف ی[۲۹] کے لئے خوف تام ہے کہ اجزاء نبوت میں سے ہے۔ پس انچاس اجزاء میں سے حروف تہجی کے انتیس اجزاء نکل کر باقی رہے بیس[۲۰]۔ ان میں اٹھارہ اجزاء متفرع ہوں گے حروف مدولین یعنی ا و ی پر کہ ہر حرف کے لئے چھ اجزاء ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے ان پر مد کیا ہے چھ مراتب تک۔ یعنی کبھی[۱] ایک الف کی مقدار اور کبھی[۲] دو الف کی مقدار اور کبھی تین الف کی مقدار۔ اور کبھی چار[۴] الف کی مقدار

اور کبھی پانچ الف کی مقدار - اور کبھی چھ الف کی مقدار - اور یہ مقدار تحقیقی نہیں بلکہ تقریبی ہے - چنانچہ شیخ القراء علامہ ابن الجزری نے النشر میں اس کی تفصیل کی ہے کہ پہلا مرتبہ قصر کہلاتا ہے یعنی مد کرنا بقدر ایک الف کے - اور وہ قرارت ہے ابن کثیر اور ابو جعفر کی - دوسرا مرتبہ فوق القصر ہے یعنی مد کرنا بقدر دو الف کے جو کہ قرارت ہے دوری اور قالون کی تیسرا مرتبہ توسط ہے یعنی مد کرنا بقدر تین الف کے کہ قرارت ہے کسائی کی - چوتھا مرتبہ فوق التوسط ہے یعنی مد کرنا بقدر چار الف کے کہ قرارت ہے عاصم اور ابن عامر کی - پانچواں مرتبہ اس سے اوپر ہے یعنی مد کرنا بقدر پانچ الف کے کہ قرارت ہے حمزہ اور ورش کی - چھٹا مرتبہ تمطیط ہے یعنی مد کرنا بقدر چھ الف کے کہ ابو قاسم کے نزدیک قرارت ہے ورش کی اور پانچواں مرتبہ مخصوص کیا ہے حمزہ کے ساتھ - الحاصل ا کے لئے بلحاظ مراتب مدات چھ اجزاء ہیں - کمال صورت باطنی قیام روح برضا و محبت حاسہ التذاذ بالخیر والکلف بالشر - کمال حواس باطنی بغض باطل اور ذات میں خیر کا قیام - پھر مد والے الف کی بھی دو قسمیں ہیں - ایک وہ جو ایسے کلمہ میں ہو جس سے نفس متکلم امراد ہے مثلاً اَنَا اٰمَنَّا کہ ضمیر متکلم سے خارج ہے جیسے مِنَ السَّمَآءِ مَآءً کہ سماء اور ماء میں مد آیا ہے جو ذات متکلم سے خارج چیزیں ہیں پس اگر مد ایسے کلمہ میں آیا ہو جو متکلم کی طرف اشارہ کر رہا ہے تب تو اجزاء ستہ کی تفریع اس طرح ہوگی - کہ مد کے پہلے مرتبہ یعنی قصر کے لئے کمال حس باطنی ہے، اور دوسرے مرتبہ یعنی مد بقدر دو الف کے لئے اس کمال حس باطنی پر اضافہ ہوگا قیام روح برضا کا - اور تیسرے مرتبہ کے لئے ان دونوں اجزاء پر زیادتی ہوگی حاسہ التذاذ بالخیر کی - اور چوتھے مرتبہ یعنی مد بقدر چار الف کے لئے یہ تینوں اجزاء ثابت ہوں گے مع کمال حواس باطنیہ کے - اور پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں اجزاء مع بغض باطل کے، اور چھٹے مرتبہ یعنی مد بقدر چھ الف کے لئے ان پانچوں اجزاء میں شامل ہوگا ذات میں خیر کا قیام - اور اگر الف ممدود ایسے کلمہ میں آئے جو ذات متکلم سے خارج ہے تو تفریع اس طرح ہوگی - کہ مرتبۂ اولیٰ میں کمال صورت باطنیہ ہوگا - اور دوسرے مرتبہ میں یہ مع بغض باطل کے - اور تیسرے مرتبہ یعنی مد بقدر تین الف میں یہ دونوں اجزاء مع سکون خیر و رفات - اور چوتھے میں یہ تینوں مع حاسہ التذاذ کے - اور پانچویں درجہ میں ان چار پر اضافہ ہوگا کمال حس باطنی کا اور چھٹے مرتبہ یعنی مد بقدر چھ الف میں یہ پانچوں اجزاء مع سکون روح برضا و

محبت کے۔ اور پہلی صورت میں ابتداء کمال حسِ باطنی سے اور دوسرے میں ابتداء کمال صورتِ باطنی سے ہونے کا راز یہ ہے کہ مد والف جب کلمہ نفس متکلم میں آیا تو باطن کی طرف اشارہ ہوا اور کمالِ حسِ باطنی ظاہر ہوا۔ برخلاف مثلاً ماءِ اور سماء کے کہ غیر متکلم ہونے کے سبب وہ الفاظ میں داخل ہیں، اور الفاظ کی خوش آوازی کو تخلیق باطنی سے تعلق ہے۔ لہٰذا کمال صورتِ باطنیہ کی طرف اشارہ ہوا کہ حسِ باطنی کا مرجع قوائے نفسانیہ کی تکمیل ہے، اور صورتِ باطنیہ کا مرجع۔ خلقی وغیر اختیاری محاسن مثلاً خوش آوازی وغیرہ ہیں۔ اور وَ کے لئے بلحاظ مراتب مدات چھ اجزا یہ ہیں۔ حق بات میں نہ شرمانا ہم جنس کی طرف میلان۔ حواس ظاہری کی کشود حواس باطنی کی کشود۔ اجسام موذیہ کا عدم احساس اور اجرام میں گھس جانے کی طاقت۔ پھر اگر مدّ والی واؤ نفس سے خارج کلمہ میں ہے جیسے لِيَسُوْٓءُا وُجُوْهَكُمْ تب تو مد کے پہلے مرتبہ یعنی قصر کے لئے نہ شرمانا اور دوسرے مرتبہ یعنی دو واؤ کی مقدار کے لئے مع ہم جنس کی طرف میلان کے۔ اور تیسرے مرتبہ یعنی تین واؤ کی مقدار کے لئے یہ دونوں مع فتح حواس ظاہری کے اور چوتھے مرتبہ یعنی مد بقدر چار واؤ کے لئے تینوں مع فتح حواس باطنی کے۔ اور پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں مع عدم احساس کے اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے پانچوں اجزاء مع قوت سریان کے۔ کہ ہر مرتبہ میں ماقبل پر ایک کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اگر واؤ ممدودہ نفس متکلم میں ہوگی جیسے قَالُوْٓا اٰمَنَّا تو پہلے مرتبہ یعنی قصر کے لئے فتح حواس باطنی دوسرے مرتبہ کے لئے باضافہ فتح حواس ظاہری۔ تیسرے مرتبہ کے لئے یہ دونوں میلان بسوئے ہم جنس۔ چوتھے مرتبہ کے لئے یہ تینوں اور حق گوئی میں شرم نہ کرنا۔ پانچویں مرتبہ کے لئے باضافہ عدم احساس اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے یہ پانچوں اجزاء مع قوت سریان کے ثابت ہوں گے کہ ہر مرتبہ میں ماقبل پر ایک بڑھتا رہے گا اور اس اضافہ کا سبب ظاہر ہے کہ بقدر دو واؤ کے مد میں گویا دو دو واؤ ہیں۔ اور یہی حال الف اور یا کا ہے کہ جتنا مد کھینچے گا اسی قدر گویا اس میں الف اور بڑھ جائیں گے چنانچہ یٰ کے لئے بلحاظ مراتب مدات یہ چھ جزو ہیں۔ عدم اضاعت۔ جہات کا صرف سامنے کی جہت میں انحصار انجام سے واقفیت۔ احوال ثقلین کی معرفت۔ علوم احوال کونین سے واقفیت۔ اور اہل جنت کی سی حیات۔ پھر اگر مدّ والی یا متکلم میں ہے جیسے اِنِّیْٓ اُلْقِیَ تب تو تخریج اس طرح ہوگی کہ مرتبہ اولی کے لئے علوم احوال کونین کی معرفت۔ دوسرے مرتبہ یعنی

مد بقدر دو یا کے لئے مع عدم اضاعت کے تیسرے مرتبہ کے لئے یہ دونوں مع واقفیت انجام کے۔ چوتھے مرتبہ کے لئے یہ تینوں مع انحصار جہات کے۔ پانچویں مرتبہ کے لئے یہ چاروں باضافہ معرفت علوم احوال الثقلین کے۔ چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے کہ بقدر چھ یا کے مد ہوگا یہ پانچوں مع اضافہ اہل جنت جیسی حیات کے۔ اور اگر ی خارج از متکلم ہوگی جیسے وَفِي اَنْفُسِكُمْ۔ تو پہلے مرتبہ کے لئے انحصار جہات۔ دوسرے مرتبہ کیلئے باضافہ علوم ثقلین۔ تیسرے مرتبہ کے لئے باضافہ اہل جنت جیسی حیات کے۔ چوتھے مرتبہ کے لئے باضافہ معرفت انجام۔ پانچویں مرتبہ کے لئے باضافہ عدم اضاعت اور چھٹے مرتبہ یعنی تمطیط کے لئے باضافہ علوم احوال کونین۔ یہ ہے تفصیل اٹھارہ اجزا کی اور ان پر متفرع ہونے کے مراتب کا خلاصہ۔ باقی رہے دو جزو یعنی مشاہدہ اور کمال رفعت سو ان کے انوار و اسرار پر قرآن مجید کی کتابت مرتب ہوئی ہے یعنی وہ حروف جو لکھنے میں آتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔ جیسے الصلوٰۃ کی وَاو اور موسیٰ کی ی وغیرہ کہ ہر ایک میں مذکورہ دو اسرار میں سے کوئی سِر رکھا ہوا ہے یعنی اگر کلمہ کا مدلول امر محسوس اور نظر آنے والا ہے مثلاً مُوسیٰ عِیسیٰ کہ نام ہیں دو پیغمبروں کے جو محسوس و مشاہد ہیں اور ان میں ی مکتوب ہے مگر مقروء نہیں ہے اور مَلَائِہٖ بمعنی جماعت کہ ا مکتوب ہے، مگر پڑھا نہیں جاتا' اور مثلاً منوۃ اور مشکوٰۃ کہ منات نام ہے بت کا اور مشکوٰۃ بمعنی فتیل سوز کہ دونوں نظر آنے والی چیز ہیں اور ان میں و لکھی جاتی ہے مگر پڑھی نہیں جاتی تو ان میں سِر مشاہدہ ہے۔ اور اگر کلمہ کا مدلول غیر محسوس کوئی امر معنوی ہے تو اس میں مقام رفعت کا نور ہوگا جیسے هُدٰهُمْ بمعنی ہدایت' کہ نظر آنے والی شئے نہیں اور اس میں ی مکتوب ہے مگر پڑھی نہیں جاتی۔ اور جیسے سَاُورِيكُمْ جس کا ترجمہ ہے عنقریب میں تم کو دکھاؤں گا۔ اس میں و مکتوب ہے غیر مقروء اور مدلول کلمہ امر محسوس نہیں ہے۔ اور جیسے بِاَيْيدٍ بمعنی قوت کہ غیر محسوس ہے اور ی لکھنے میں آتی ہے مگر پڑھنے میں نہیں آتی۔ تو ان میں سِر رفعت رکھا ہوا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کلام اللہ کی اس طریق پر کتابت کا صدور (کہ بعض حروف کو باوجودیکہ پڑھا نہیں جاتا مگر لکھا جاتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا ہے یا حضرات صحابہ کی طرف سے۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا ہے'

کہ آپ نے صحابہ کو اسی طریق پر قرآن مجید لکھنے کا حکم فرمایا۔ اور صحابہ نے بلا کمی بیشی جیسا سُنا اُسی کے موافق لکھا۔ (حالانکہ بعض علماء نے اس کو صحابہ کی اصطلاح بتایا اور قرار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قریش نے کتابت اہل حیرہ سے سیکھی تھی اور اہل حیرہ لفظ الربوا کو واؤ کے ساتھ پڑھتے ہیں اس لیے قریش نے باوجودیکہ وہ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں کتابت میں اُن کی تقلید کی ہے۔ اور قاضی بوبکر باقلانی نے اپنی کتاب الانتصار میں طویل بحث لکھی ہے کہ کتابت کے نقوش محض علامات ہیں بمنزلہ اشارات و رموز کے کہ ہر نقش ایک کلمہ پر دلالت کرتا اور بتلاتا ہے کہ اُس کو اس طرح پڑھنا چاہیئے۔ پس جس صورت میں یہ مقصود حاصل ہوتا ہے وہ ٹھیک ہے خواہ صورت کچھ ہی ہو۔ پس جس طرح قرآن مجید کی کتابت خواہ بخط کوفی ہو یا بخط قدیم یا بخط نستعلیق یا بخط نسخ جس قوم اور جس ملک میں جس خط کا رواج ہو وہ صحیح ہے کہ کوئی خاص خط مامور شرعی نہیں ہے اسی طرح السابوا وغیرہ کی کتابت بغیر واؤ اور تلفظ کو درست کرنے کے موافق جس طرح بھی ہو صحیح ہے کوئی خاص طریق مامور شرعی نہیں۔ مگر حضرت شیخ کی تحقیق یہ ہے کہ) قرآن مجید کا یہ رسم الخط توقیفی ہے اور بارگاہ نبوت سے اس کی تعیین ہوئی ہے، نہ حضرات صحابہ کا اس میں بال برابر دخل ہے نہ کسی اور کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے امر فرمایا تھا کہ فلاں کلمہ میں فلاں حرف کا اضافہ ہو اور فلاں کلمہ میں فلاں حرف کی کمی۔ کہ اس اضافہ و کمی میں وہ اسرار پوشیدہ ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اور نہ اہل عرب بزمانہ جاہلیت ان سے واقف تھے نہ دیگر امتیں اپنے ادیان و ازمنہ میں اُن سے آگاہ تھیں اور نہ اب یا آئندہ اپنی عقل کے ذریعہ اس کے ایک سر کو بھی کوئی سمجھ سکے۔ کہ ان اسرار کو حق تعالیٰ نے خاص اپنے کلام مجید کے ساتھ مخصوص رکھا ہے اور یہ رسم الخط نہ توریت و انجیل میں پائی گئی نہ زبور یا صحف انبیاء میں اور جس طرح نظم قرآن با اعجاز ہے (کہ اس کا مثل لانے سے مخلوق عاجز ہے) اسی طرح اس کا رسم الخط بھی معجز ہے (کہ ساری دُنیا مل کر بھی ان اسرار کی رعایت حروف میں لانا تو درکنار ان کو سمجھ بھی نہیں سکتی)۔ اور بھلا عقل کیا سمجھے کہ مِائَۃٌ میں الف زائد فلاں سر کی وجہ سے ہے جو کہ فِئَۃٌ میں نہیں ہے (حالانکہ پڑھنے میں دونوں یکساں ہیں۔ نیز کوئی کیا سمجھے کہ وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْیدٍ میں ی زائد ہے اور اس میں کیا راز ہے۔ اور سورہ حج میں وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ

کے لفظ سعوا میں الف زائد ہے اور سورۂ سبا میں بھی یہی ہے وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِیْ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ ط مگر سَعَوْ مِنَ الف نہیں ہے اس میں راز کیا ہے اور فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ کے لفظ عتوا میں الف مکتوب ہے اور وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا میں الف نہیں ہے اس میں کیا راز ہے اور آیت اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ میں یعفوا کے آگے الف ہے اور اُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ میں نہیں ہے۔ اس میں کیا راز ہے اور اٰمَنُوْا۔ كَفَرُوْا۔ خَرَجُوْا میں الف ہے اور بَآءُوْ۔ جَآءُوْ تَبَوَّءُوْ وَاِنْ فَآءُوْ میں نہیں ہے۔ اس میں کیا راز ہے۔ نیز بے چاری عقل کیا سمجھے اور کیسے سمجھے کہ صرف سورۂ یوسف و سورۂ زخرف میں لفظ قُرْاٰنًا میں سے الف کیوں حذف کیا گیا۔ اور باقی جہاں یہ لفظ آیا الف کے ساتھ کیوں آیا۔ یا سورۂ فصلت میں لفظ سمٰوٰت میں الف آیا اور دوسری جگہ اس لفظ میں اس کو حذف کیا گیا۔ اور لفظ المیعاد میں سب جگہ الف آیا مگر سورۂ انفال میں اس کو حذف کر دیا گیا۔ اور سِرَاجًا جہاں کہیں آیا الف کے ساتھ آیا سورۂ فرقان میں بغیر الف کے آیا۔ ان میں کیا اسرار ہیں۔ نیز رَحْمَتْ نِعْمَتْ، قُرَّتُ، شَجَرَتْ بعض جگہ بصورت ہا لکھے گئے اور بعض جگہ لمبی تاء کی صورت میں۔ اسی طرح لفظ الصلوٰۃ۔ الحیاۃ۔ بعض جگہ بصورت الف آئے جیسے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِیْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ وغیرہا۔ اور بعض جگہ بصورت و لکھا گیا جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ وَعَلٰى حَيٰوةٍ۔ ان سب میں اسرار الٰہیہ اور اغراض نبویہ مستور ہیں جن کو لوگوں سے اس لئے مخفی رکھا گیا ہے کہ باطنی اسرار بغیر فتح ربانی کے ادراک نہیں ہو سکتے۔ ان۔ کی شان شروع سورتوں کے حروف مقطعات کی سی ہے کہ ان میں بڑے بڑے اسرار اور کثیر معانی رکھے ہوئے ہیں حتیٰ کہ سورۂ ق میں جتنے مضامین ہیں وہ سب حرف ق میں موجود ہیں جو شروع سورت میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نٓ کے سارے مضامین حرف نٓ میں اور سورۂ صٓ کے سارے مضامین حرف صٓ میں سمائے ہوئے ہیں وغیرہ ذلک مگر اکثر آدمی نہ ان اسرار سے واقف ہیں اور نہ ان معانی الٰہیہ کو سمجھ سکتے ہیں جن کی طرف ان حروف میں اشارہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن کے اول میں آئے

ہیں۔ اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان سے اعداد مراد ہیں۔ (مثلاً الف کا ایک اور لام کے تیس اور میم کے چالیس۔ لہٰذا الم سے مراد ہے اکہتر۔ اور تمامی حروف مقطعات کے مجموعی اعداد سے اشارہ ہے۔ اس مدت تک دنیا میں مذہب اسلام کا بقا) اور ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ حروف مہملہ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں (اور بعض سورتوں کے شروع میں صرف اس پر متنبہ کرنے کی غرض سے ان کو لایا گیا ہے کہ قرآن مجید بھی ان ہی حروف ہجائیہ سے مرکب ہے جن سے ہر شخص کا کلام ترکیب کھاتا ہے مگر باوجود اس کے معجز ہے اور ساری دنیا مل کر بھی اس جیسی ایک سورت نہیں لا سکتی)۔ غرض حروف مقطعات میں معانی عجیبہ کو مستور کر دیا گیا اور کوئی عقل وہاں تک نہ پہونچ سکی۔ بالکل یہی شان قرآنی رسم الخط کی ہے۔ ورنہ اس کو اگر صحابہ کی اصطلاح قرار دیا جائے تو قرآن مجید پر سے اعتماد ہی اُٹھ جائے گا کیوں کہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کی موجودگی میں کسی ہیئت اور شکل پر ضرور رکھا گیا۔ پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ بعد میں حضرات صحابہ نے جب اس کی کتابت کی تو اُسی شکل وہیئت پر کی یا اس کے خلاف؟ اگر اُسی شکل پر کی تب تو اس کو اصطلاح صحابہ کہنا ایسا ہی غلط ہے جیسے کوئی کہنے لگے کہ مثلاً فرض نمازیں پانچ ہیں، اور رکعات ظہر کی تعداد چار ہے، یہ صحابہ کی اصطلاح ہے۔ بھلا پہلے سے معین شدہ چیز کو اُن کی اصطلاح کہنے کا کیا مطلب ہوا۔ اور اگر کہو کہ زمانۂ محمدی کی کتابت کے خلاف کتابت کی گئی تو اس پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل مشاعل ہدایت حضرات صحابہ کی طرف مخالفت رسول کا انتساب جن کی بدولت ہمیں نور اسلام نظر آیا۔ دوم صحابہ سے لے کر آج تک تمامی امت محمدیہ کا اس پر اجماع واتفاق ہے کہ قرآن مجید میں نہ کسی حرف کا بڑھانا جائز ہے نہ کسی حرف کا گھٹانا۔ تو جب مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الرحمٰن اور العالمین میں الف زیادہ کیا (اور پڑھنے کی رعایت رکھ کر اس طرح لکھا تھا الرحمان اور العالمین) اور مائۃ میں الف نہیں بڑھایا۔ (بلکہ مئۃ لکھا) نیز کفُواً اخرجوا الف میں نہیں لکھا تھا اور بایید میں ایک یا نہیں لکھی تھی (بلکہ بایدٍ لکھا تھا جیسا کہ پڑھا جاتا ہے) اور اَفَاۡئِنْ مِّتَّ وغیرہ میں الف نہیں لکھی تھی (بلکہ اَفَئِنْ مِّتَّ لکھا تھا) تو لازم آیا کہ حضرات صحابہ نے نعوذ باللہ قرآن مجید میں تصرف کیا اور کوئی حرف گھٹایا اور کوئی بڑھایا۔ اور ایسے فعل کے مرتکب ہوئے جس کی بحکم اجماع کسی کو

بھی اجازت نہیں تھی۔ علاوہ اس کے جب اس قرآن پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور آپ کے علم میں تھا ایسے حروف کا اضافہ ہوگیا جو وحی میں نازل نہیں ہوئے تھے تو شک پیدا ہوگیا کہ کیا عجب ہے نازل شدہ وحی میں کچھ حروف کم بھی کر دیئے گئے ہوں کہ جو شان اللہ کی طرف سے آئے ہوئے کلام میں اضافہ کی ہے وہی کم کرنے کی بھی ہے پس اسلام کا شیرازہ ہی منتشر ہو جائے گا کہ اسلام کا اصل الاصول ہی محرف اور ناقابل اعتماد بن گیا۔ ہاں صحابہ نے وفات محمدی کے بعد قرآن کی کتابت کی ہوتی تو ممکن تھا کہ اس کو اصطلاح صحابہ کہہ دیتے۔ مگر اب تو محقق یہی ہے کہ موجودہ رسم الخط توقیفی ہے اور اس شکل پر قرآن مجید کی کتابت کا حکم بارگاہ محمدی سے صادر ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تو امی تھے اور لکھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ۔ نہ تم پہلے کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے (ایسا ہوتا تو اہل باطل کو شک کا موقع تھا کہ چونکہ پڑھے لکھے ہیں اس لیے قرآن تصنیف کر لیا ہے) حضرت نے جواب دیا کہ اس آیت میں اصطلاحی کتابت اور لوگوں سے سیکھنے کی نفی کی گئی ہے نہ یہ کہ فتح ربانی کی جہت سے بھی آپ کتابت سے ناواقف تھے۔ اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ آپ کی امت کے اولیاء میں صدہا امی موجود ہیں جو بوئے فتح ربانی بطفیل و برکت نعال محمدی زمانہ آدم سے لے کر اب تک ہر قوم اور ہر امت کی زبان اور رسم الخط اور قلم سے واقف ہیں۔ پھر آپ کی ذات مبارکہ کا تو کیا پوچھنا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی ہے اور اس نے قرآن مجید کے اوراق میں موجودہ رسم الخط اور اشکال حروف پر نظر ڈالی ہے اور پھر اس نے (بچشم بصیرت) اس کتابت قرآن مجید کو دیکھا ہے جو لوح محفوظ میں ہے تو دونوں میں بہت کچھ مشابہت پائی ہے، اور کفروا اور امنوا وغیرہ میں وہاں بھی الف زائد لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے اسرار سے واقف ہوا اور یہ معلوم کیا ہے کہ یہ اسرار عقول سے بالا ہیں۔

پھر میں نے بطور امتحان آپ سے دریافت کیا کہ بایئد میں پہلی ی زائد ہے یا دوسری؟ فرمایا دوسری۔ میں نے آپ کو شبہ میں بھی ڈالا مگر آپ یقین کے ساتھ یہی فرماتے رہے کہ دوسری ی زائد ہے۔ چنانچہ ابو عبداللہ خراز نے بھی یہی لکھا ہے۔ پھر

پھر میں نے دریافت کیا کہ صلاتہ میں الف زائد ہے جو لام سے ملا ہوا ہے یا ہمزہ جو بصورت ی مکتوب ہے۔ فرمایا الف زائد ہے۔ غرض اس مبحث میں متعدد سوال کئے اور حضرت نے ایسے جواب دیئے جیسے بڑا ماہر حافظ قرآن جواب دیتا ہے اور نیز رسم الخط کے اکثر حروف زائد کے اسرار بھی میں نے سُنے اور آئمہ رسم الخط کے اقوال سے مقابلہ کیا تو اصابت واقعیت حضرت ممدوح ہی کے قول میں پائی اور وہ اشکال جو رسم الخط کے متعلق سالہا سال سے مجھے پریشان کئے ہوئے تھا بالکل رفع ہو گیا۔ حالانکہ آپ اُمّی محض تھے اور حزب بحر بھی آپ کو حفظ نہ تھا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ مانا قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے۔ مگر مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر قیاسی رسم پر قرآن مجید کو لکھا جائے اور مثلاً الف زائدہ کو حذف کر دیا جائے تو آخر اس میں حرج کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کلام اللہ میں بہت کچھ اسرار ہیں۔ اور کتابت کو بھی اُن اسرار میں دخل ہے۔ لہٰذا جس نے توقیفی رسم کے موافق (الف زائد وغیرہ کو قائم رکھتے ہوئے الفاظِ قرآنی لکھے تو اُس نے اسرارِ کلامِ الٰہیہ کا حق ادا کیا' اور جس نے اس کو چھوڑ کر قیاسی رسم کے موافق الفاظ لکھے تو اُس نے بعض اسرار کو چھوڑ دیا اور ایسا ہوا گو یا اپنی طرف سے الفاظ لکھ رہا ہے نہ کہ وہ الفاظ ...... جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے تھے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ مثلاً کسی شخص نے لفظ کان جو کہ افعال ناقصہ میں سے ہے (الصلوٰۃ کی طرح) واؤ کے ساتھ اس طرح لکھا کہ کوٰن اور اس میں کوئی راز رکھا جس کی اطلاع بعض کو ہے اور بعض کو نہیں۔ اب ایک شخص آیا جو راز پر مطلع نہ تھا اور کہنے لگا کہ میں تو اس کو (واؤ کے ساتھ نہیں بلکہ) الف کی ساتھ لکھوں گا۔ کیونکہ معنی دونوں کے ایک ہیں اور اصل کتابت الف ہی کے ساتھ ہے۔ تو جو شخص راز پر مطلع ہے وہ کہے گا کہ ایسا کرتے میں لفظ کے اسرار ناقص ہو جائیں گے اور تمہارا یہ لفظ کان وہ نہ ہو گا جو اس شخص کا مقصود تھا بلکہ دوسرا کان ہو گا جس کو تم نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ کیونکہ واؤ کے ساتھ کوٰن لکھنے میں ایک چیز کی ہستی وجود کے ساتھ ایجاد اور تکوین کی طرف بھی اشارہ تھا۔ کوٰن کا مطلب یہ تھا کہ فلاں شے موجود ہوئی اور نیز اس کو اللہ نے وجود بخشا کہ و کو با وجود نہ پڑھے جانے کے کتابت میں لانے سے تکوین کی طرف اشارہ ہوا' اور و کے حذف کر لینے سے وہ خوبی فوت ہو گئی بس یہی حال ہے الصلوٰۃ' الزکوٰۃ' الربوا وغیرہ کا کہ جب ان میں سے و حذف کر کے کتابت اس طرح کی

الصلوٰۃ' الربٰوا' الربٰا' تو اسرار الٰہیہ میں کمی کر دی۔ میں نے کہا کہ اگر یہ رسم الخط توقیفی ہے اور بذریعہ وحی کے مامور ہے تو الفاظ قرآن کی طرح یہ بھی بطریق تواتر منقول ہونا چاہیے تاکہ نہ اختلاف باقی رہے نہ شک و شبہ۔ حالانکہ اس فن کی تمام کتابوں سے ثبوت ملتا ہے کہ رسم الخط خبر واحد کے ذریعہ منقول ہے۔ اور اسی لئے اس میں اختلاف بھی ہوا اور نہ کیسے ممکن ہے کہ امت محمدیہ وحی الٰہی کا ذرا سا حصہ بھی ضائع کرے۔ فرمایا امت نے وحی الٰہی کو بال برابر بھی ضائع نہیں کیا اور الحمدللہ قرآن مجید بلحاظ الفاظ اور بلحاظ رسم الخط ہر طرح محفوظ ہے۔ کہ اہل عرفان نے جن کو عینی مشاہدہ کی بصیرت حاصل ہے رسم الخط کو محفوظ رکھا اور (لوح محفوظ کی کتابت سے) بال برابر بھی فرق نہ آنے دیا' اور ان کا یہ ادراک جو مشاہدہ و معاینہ سے حاصل ہوا ہے خبر متواتر سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ اور دوسروں نے الفاظ کو محفوظ کیا بذریعہ اخبار متواترہ کے۔ رہا بعض الفاظ میں رسم خط کا اختلاف سو یہ ایسا ہی مُضر نہیں جیسا کہ عوام کا الفاظ قرآنی سے جہل اور الفاظ کا حافظ نہ ہونا نہ مضر ہے نہ تواتر کے خلاف ہے اور قاضی ابوبکر کا یہ کہنا کہ رسم الخط کے اتباع کا وجوب نہ کتاب اللہ سے ثابت ہے نہ کلام الرسول سے نہ اجماع سے نہ قیاس سے' (لہٰذا اختیار ہے جس طرح چاہے لکھے) صحیح نہیں ہے۔ کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے جو کچھ بھی تم کو رسول دیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں اس سے باز آؤ۔ اور یہ واضح ہو چکا کہ رسم الخط توقیفی ہے صحابہ کی اصطلاح نہیں ہے (لہٰذا رسول کا دیا ہوا ہے۔ اور اس کا لینا واجب ہے) اور اگر یہ شبہ کرو کہ حضرتؐ نے اس طریق پر کتابت قرآن کا حکم نہیں فرمایا' تو آپ کے زمانہ میں صحابہ کا اس طریق پر لکھنا اور حضرتؐ کا اس کو قائم و برقرار رکھنا ہی حکم کے درجہ میں ہے۔ اور ائمۂ مجتہدین کے اقوال تو عام طور پر متفق ہیں کہ قرآنِ مجید کے رسم الخط میں تغیر جائز نہیں۔ چنانچہ ابو عمرانی نے مقنع میں روایت کی ہے کہ امام مالک سے کسی نے دریافت کیا کہ قرآن مجید کی کتابت اگر جدید حروفِ تہجی کے موافق کی جائے تو آپ کی رائے میں کیسا ہے؟ فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ کتابت قرآن بطریق قدیم ہونی چاہیے۔ دوسری روایت ہے کہ کسی نے امام مالک سے پوچھا کہ قرآن میں جہاں واؤ یا الف زائد ہیں اگر نہ لکھے جائیں تو کچھ حرج تو نہیں؟ فرمایا کہ صحیح نہیں۔ ان کو لکھنا چاہیے مثلاً اُولٰٓئِكَ۔ اُولِی۔ اُولَاتِ وغیرہ کی واؤ اور لَنْ نَّدْعُوَا قُتِلُوْٓا وَلَا اَوْضَعُوْا وَلَا اَذْبَحَنَّهٗ مِائَةٌ مِائَتَیْنِ۔ لَا تَایْئَسُوْا اَیْٮدُ اَفْتُلُوْا

یَعبُوُ ا وغیرہ کا الف۔ اور مِنَ نَبِیِّ الْمُرسلِیْنَ۔ مَلاَئِہٖ وغیرہ کی ی۔ اور امام جعبری نے عقیلہ کی شرح میں یہ روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ چاروں ائمہ کا یہی مذہب ہے۔ اور صرف امام مالک کا نام اس لئے آیا کہ مؤلف مقنع مالکی المذہب تھے۔ لہٰذا اپنے امام کا فتویٰ نقل کر دیا۔ الحاصل انچاس انوار پر انتیس حروف ہجائی اور تینوں حروف مدہ اور رسم الخط میں حروف زوائد کی تفریع مفصل مذکور ہو چکی ہے۔ رہیں حرکات ثلثہ یعنی زیر۔ زبر۔ پیش اور چوتھا جزم سوان کا تفرع انوار سبعہ پر مستقل ہے۔ کہ پیش اور جزم منجملہ قبض کے ہے۔ اور زبر منجملہ رسالت کے اور زیر منجملہ آدمیت کے۔ پس اگر کوئی حروف جو منجملہ قبض کے ہو پیش یا جزم والا ہو گا تو اس میں قبض کے دو نور ہوں گے ایک بلحاظ حرف اور دوسرا بلحاظ اعراب۔ اور اگر قبض کے علاوہ دوسرے نور والے حرف پر پیش یا جزم ہو گا تو حرف اپنے نور کی طرف منسوب ہو گا اور اعراب قبض کی طرف منسوب ہوں گے۔ مثلاً شَ ہَ قبض کے حروف ہیں، لہٰذا اگر مضموم یا مجزوم آئیں گے تو اس میں دوہرا نور قبض ہو گا۔ اور یَ اَ تَ غیر قبض کے حروف ہیں اگر یہ مضموم یا مجزوم ہوں گے تو حرف اپنے نور کی طرف جائے گا اور اعراب قبض کی طرف یہی حکم فتح اور کسرہ کا ہو گا کہ حرف رسالت اگر مفتوح ہو گا تو اس میں دو نور ہوں گے رسالت کے۔ اور اگر حرف آدمیت مکسور ہو گا تو اس میں دو نور ہوں گے آدمیت کے۔ اور دیگر حروف اگر مفتوح یا مکسور ہوں گے تو حرف میں اس کا نور ہو گا اور اعراب میں رسالت یا آدمیت کا نور۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ قبض و رسالت و آدمیت کا نور (کہ حرکات ثلثہ و جزم کا مرجع ہیں) باقی چار حروف یعنی روح و علم و بسط و نبوت کے انوار پر داخل ہوں گے (کیونکہ ان کے حروف پر بھی یہی اعراب آئیں گے۔) پھر رفع جو کہ قبض کے لئے ہے اجزاء قبض کے لحاظ سے سات قسم کا ہو گا کہ ھُدًی للمُتَّقِیْن یُوْمِنُوْن الحمدُ للهِ نَعبُدُ نَستَعِینُ وغیرہ کا رفع حاسہ التذاذ بالخیر و تألم بالشر کے لئے ہے۔ اور کفرُوا الکافِرُون ھُمُ الظالمُون وغیرہ کا رفع نفرت از ضد کے لئے۔ اور اُنزِل وغیرہ کا رفع امتثال کے لئے۔ اور اُولٰئِكَ جہاں بھی آئے اس کا رفع میل بسوئے ہم جنس کے لئے۔ اور خُوجُوا۔ اخرجُوھُم تنذرھم وغیرہ کا رفع قوت القباض کے لئے۔ اور انكَ لعلٰی خُلُقٍ وغیرہ کا رفع انصاف کے لئے۔

اور تَعَالَ اللّٰہُ وغیرہ کا رفع حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لئے۔ اسی طرح جزم کی بھی سات قسمیں ہیں کہ الحمد وغیرہ کا جزم حاسۂ التذاذ بالخیر کے لئے اور العلمین کا جزم انصاف کے لئے۔ اور الرحمٰن کا امتثال کے لئے۔ اور نعبد کا القباض کے لئے۔ اور اھدنا کا نفرت از ضد کے لئے۔ اور غیر کا حق گوئی سے شرم نہ کرنے کے لئے۔ اور ربھم وغیرہ کا جزم میل بسوئے ہم جنس کے لئے اسی طرح زبر کی بلحاظ اجزار رسالت کے سات قسمیں ہیں کہ آلحمد کے ہمزاد کا زبر مشاہدہ کے لئے ہے۔ اور ح کا زبر سکینت کے لئے۔ اور العلمین کے ن کا زبر حیات اہل جنت کے لئے۔ اور ملک یوم الدین کے م اور ی کا زبر صدق کے لئے اور ایاک کے کا اور علیھم کے ع اور ل کا زبر علم کامل کے لئے۔ اور نستعین کی ت کا اور الصراط کی ط کا زبر روح کی رہائش برضا و محبت کے لئے۔ اور اولیٰک عبدک عبادک وغیرہ کے ک کا زبر موت بحالت حیات کے لئے۔ اسی طرح زیر کی بلحاظ اجزار آدمیت کے سات قسمیں ہیں کہ لِلّٰہِ کے لام پر یا جہاں بھی پہلے یا بیچ کے حرف پر زبر آئے گا وہ کمال حس باطنی کے لئے ہوگا اور لِلّٰہِ کے ہ کا زیر ذکوریت کے لئے۔ اور ربّ کی ب کا زبر عقل کامل کے لئے۔ اور العلمین کی میم کا زبر کمال حس ظاہری کے لئے۔ اور الرحمٰن کی ن کا کمال صورت باطنی کے لئے اور ملک کے لئے۔ اور الدین کے ن کا نزع حفظ شیطان کے لئے۔ اب حدیث کا مطلب واضح ہوگیا کہ تلفظ قرآن مجید کے اختلاف سے انوار حروف میں اختلاف ہوگا۔ اور قرار کی تمام روایات مشہورہ وغیر مشہورہ اسی پر متفرع ہوں گی۔ مثلاً الحمدُ لِلّٰہِ میں آدمیت کے تین اجزار ہیں۔ ایک مدکہ ذکوریت کے لئے ہے دوم لا کا زیر کہ وہ بھی ذکوریت کے لئے ہے۔ سوم ل کا زیر کہ کمال حس باطنی کے لئے ہے۔ اور ایک جزو نبوت کا ہے یعنی ح کہ وہ رحمت کے لئے ہے۔ اور ایک جزو روح کا ہے یعنی د کہ وہ طہارت کے لئے ہے۔ اور پانچ اجزار قبض کے ہیں یعنی ا کہ امتثال کے لئے ہے' اور ل کا جزم اور م کا جزم اور دٗ کا پیش کہ وہ تینوں حاسۂ التذاذ کے لئے ہیں (سورۂ فاتحہ میں ہر پیش اسی حاسۂ التذاذ کے لئے ہے) اور ہ نفرت از ضد کے لئے ہے۔ اور چھ اجزار رسالت کے ہیں اَ کا زبر کہ مشاہدہ کے لئے ہے لْ مجزوم و مکسور و مشدد تینوں علم کامل کے لئے۔ حَ کا زبر سکینت کے لئے۔ اور لّ کا تشدید مفتوح مشاہدہ کے لئے (کہ سورۂ فاتحہ میں جہاں بھی فتح معہ تشدید آیا ہے۔

وہ مشاہدہ کے لئے ہے) پس اَ میں بروئے حرف نور قبض ہے اور بروئے حرکت نور رسالت،
اور لام میں اس کے برعکس ہے کہ حرف کی جہت سے نور رسالت ہے اور جزم کی رُو سے نور قبض۔
اور حَ میں بروئے حرف نور نبوت ہے اور بروئے حرکت نور رسالت، اور مَ میں بروئے حرف
نور آدمیت ہے اور بروئے جزم نور قبض۔ اور دَ میں بروئے حرف نور روح ہے اور بروئے
حرکت نور قبض۔ اور پہلے لام میں بروئے حرف نور رسالت ہے اور بروئے حرکت نور آدمیت۔
اور دوسرے لام مشدد میں بروئے حرف نور رسالت ہے اور بروئے حرکت بھی نور رسالت۔
اور ہ میں بروئے حرف نور قبض ہے اور بروئے حرکت نور آدمیت۔ اور دوسری قراتوں
میں اختلاف تلفظ سے انوار بدل جائیں گے۔ مثلاً زید بن روبہ اور عتکی کی قرأت سبعہ سے
خارج اور شاذہ ہے دال مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ اَلْحَمْدَ لِلّٰہِ۔ جس کی لفظی توجیہ تو
یہ ہے کہ مفعول مطلق ہے بمعنی احمد اللہ حمداً۔ اور قرارت مشہورہ میں رفع
بنا بر مبتدأ ہونے کے تھا۔ اور باطنی توجیہ تابع ہے پیش اور زبر کے نور کے پیش حاسۃ
التذاذ کے لئے تھا۔

لہٰذا یہ مطلب ہوا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے لئے حمد کا استحقاق
زبانِ مبارک سے بھی ظاہر فرمایا اور آپ کی ذات مطہرہ نے تکلیف ہو کر اس کا التذاذ و مزہ
بھی لیا۔ اور زبر چونکہ علم کامل کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ مطلب ہوگا کہ آپ کو اس کا علم کامل
حاصل تھا کہ ہر قسم کی حمد و ثناء کا اللہ ہی مستحق ہے۔ باقی یہ کہ آپ کی ذات بھی اس
سے ساکت ہے۔ اسی بنار پر پیش کی قرأت مشہورہ اصح وافضل ہوئی۔ اگرچہ بلحاظِ ترکیب
لفظی و بتر باطنی دونوں قرارتیں صحیح ہیں۔ یا مثلاً قرأت شاذہ میں امام حسن بصری کی
قرأت ہے دؔ اور لؔ دونوں پر زبر اَلْحَمْدَ لَلّٰہِ۔ ظاہر کی توجیہ میں لام کا نصب
اتباعاً ہے کہ دال کے تبعاً لام کو بھی فتحہ دے دیا۔ اور باطنی توجیہ یہ ہے کہ زبر کی حرکت
تو کمال حس باطنی کے لئے تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ حمد الٰہی کو وجدان نے بھی محسوس
کیا اور اس کے مفہوم سے متاثر ہوا۔ برخلاف نصب کے کہ وہ علم کامل کے لئے ہے
جس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا مستحق حمد ہونا معلوم کیا۔ اور تکیف و تاثر سے سکوت ہے۔
لہٰذا قرأت مشہورہ اصح واحسن ہوئی۔ یا مثلاً قتیبہ کی قرأت ہے لِلّٰہِ میں لام مشدد پر امالہ
کہ خفیف سا جھکاؤ کسرہ کی طرف ہو۔ امالہ میں چونکہ کسرہ کا جزو آ گیا اور کسرہ جہاں بھی لام پہ

شروع یا درمیان میں آئے گا وہ کمالِ حسِ باطنی کے لئے ہوگا لہٰذا اس میں اگرچہ وجدان کا تاثر و احساس ضرور ظاہر ہوا کہ شانِ تعظیم و تبلیغ کے زیادہ مناسب ہے مگر چونکہ یہ احساس کلمہ کے تمام ہونے سے قبل (درمیانی لام سے) ہوا ہے لہٰذا اس کا مرجع صرف لفظ ہوگا۔ کہ لفظ کا احساس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی یعنی صرف ہوتا تھا جب کہ طبع شریف کو نشاط ہوتا اور ذاتی تلاوت کے درجہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ورنہ عام طور پر امت کی تبلیغ اور تعلیم کے لئے آپ کی قرأت ہوا کرتی تھی اور اس وقت آپ کے باطن شریف کا اشتغال خالص الفاظ کی طرف نہ رہتا تھا۔ لہٰذا قرأتِ مشہور افضل ہوئی کہ آپ کی عادتِ غالبہ پر متفرع ہے۔

ف۔ اسی طرح جامع کتاب نے تمامی سورۂ فاتحہ کی شرح کی ہے اور قراءات سبعہ متواترہ و قراءت شاذہ کے تمامی اختلافات لفظیہ بیان کرکے ان کی ظاہری توجیہ جدا کی ہے اور معنوی توجیہ جدا۔ اس کے بعد انوار باطنیہ کی تفریع میں قراءات مشہورہ کی وجہ ترجیح بیان کی ہے جس کو نمونہ کے طور پر ہم نے بیان کر دیا اور پوری شرح کو بخوف طوالت چھوڑ دیا کہ اول تو اس مبحث کا سمجھنا مشکل ہے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو ہر نور کی تفریع حروف پر یاد رہنی دشوار ہے اور اگر یاد ہو جائے تو ایک ذکی و فہیم شخص کو اتنے نمونہ ہی سے ساری سورت بلکہ تمامی قرآن مجید کے لفظ لفظ کا انوار سبعہ پر مرتب کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا اس بحث کو کہ صرف ایک حدیث کی شرح نے باوجود اختصار کے مستقل رسالہ کی صورت لے لی۔ چند نتائج پر ختم کرتے ہیں جن پر جامع کتاب نے خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے۔ اور وہ نو ہیں۔ اول اس تقریر سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن شریف کی شرح اور آپ کی رفعت شان نظر آئی کہ انچاس اجزائے ہر نور کو پاس پاس رکھتے جاؤ اور نور بھی انتہائی کہ دنیا میں کسی بڑی سے بڑی ہستی کو اس درجہ اور مقدار کا نصیب نہیں ہوا۔ پھر انچاس انوار کو ان کی پوری تفصیل کے ساتھ مرکب کرکے دیکھو کہ کتنا بڑا نور ہے اور وہ باطن محمدی میں رکھا ہوا ومک رہا ہے۔ اس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کی صورت ظاہریہ و باطنیہ کا علم نصیب ہوگا۔ دوم اس تقریر سے روح کی تفسیر اور اس کے خصائل حمیدہ اور اوصاف غریبہ معلوم ہوئے۔ یعنی ذوقِ انوار طہارت و صفائی تمیز بصیرت۔ عدم

سورہ فاتحہ کی شرح

غفلت قوت سریان اور اجرام موملہ کا عدم احساس - ان اوصاف کا علم اور ان کے معانی اور مفہوم سے پوری واقفیت جس کو حاصل ہو جائے گی اس کو روح اور اس کے لوازم اور خواص کا علم کبیر نصیب ہو گا کہ علما کا اس میں بہت اختلاف ہے - بعض کہتے ہیں کہ اس بارہ میں گفتگو اور غور و خوض ہی نہ کرنا چاہیئے - اور بعض نے غور و خوض کو جائز رکھا ہے مگر خواص روح کچھ بھی بیان نہیں کئے جس کی وجہ سے عقول اس بارہ میں بدستور متحیر و پریشان رہیں - مگر شیخ کی تقریر میں روح کے خواص کا بھی ذکر ہے - اور یہ امور کہ روح کیا چیز ہے، اور اس کی ماہیت کیا ہے، اور باہم ارواح کا توافق و تخالف کیسے ہوتا ہے، اور اجسام میں داخل ہونے سے قبل ان کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ انشاء اللہ اثنار کتاب میں مذکور ہوں گے - سوم اس تقریر سے اولیاء اللہ کے علوم و معارف کا پتہ چلا کہ معرفت و ولایت کیا چیز ہے' یعنی یہ کہ ولی وہ ہے جس کی ذات اور روح کا درمیانی پردہ اٹھ جائے اور روح اپنے اسرار کو ذات پر کھول دے - ورنہ اگر ذات محجوب ہے روح سے تو وہ عارف نہیں بلکہ عامی ہے اگرچہ آسمان پر اڑتا اور پانی میں چلتا ہو (کہ خوارق عادت محض مشقی و سطحی چیزیں ہیں جو مجاہدہ و ریاضت سے کفار کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں -) چہارم اس تقریر میں حدیث شریف انزل القرآن علی سبعۃ احرف کی شرح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسرار قلبیہ و انوار باطنیہ پر اس کی تفریع مذکور ہے کہ نبی کریم اور رسول عظیم کے قلب کو قرآن کریم اور فرقان عظیم کے نزول کی خاطر جتنا کبیر اور صاحب انوار ہونا چاہیئے وہ شیخ ہی کی تقریر سے مکشوف ہوا اور نہ عام طور پر ظاہر عبارت اور عربی زبان کے لحاظ سے جو معنی اس حدیث کے بیان کئے گئے ہیں ان کو مقام نبوت سے نہ کوئی مس ہے نہ واسطہ - کیونکہ محض تلفظات کا اختلاف جس میں اسرار باطنیہ کا دخل نہ ہو باطن سے بے بہرہ و محروم کا کلام ہوا کرتا ہے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سید الانبیاء پر نازل ہونے والا کلام اللہ - یا مثلاً یہ تفسیر کہ سات حروف سے مراد (قرآن مجید کے سات مضامین ہیں) حلال حرام وعدہ وعید خبر استخبار اور نداء - بھلا اس کے متعلق یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ قرآن سات مضامین پر نازل ہوا ہے - لہذا جس طرح آسان سمجھو پڑھو - نیز اس بارہ میں صحابہ کا اختلاف و باہمی نزاع کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جب کہ یہ مضامین سبعہ سب کے نزدیک

مسلم ہیں۔ یا مثلاً یہ تفسیر کہ حروف سبعہ سے مراد اَمر نہی وعدہ وعید وغیرہ ہیں کہ قرآن مجید کی کسی آیت میں حکم ہے کسی کام کے کرنے کا، اور کسی میں ممانعت ہے کسی کام کی وغیرہ) کہ یہ امور صحابہ کے درمیان مخاصمت کا سبب نہیں ہو سکتے۔ پنجم ائمۂ قرآن نے قراءت سبعہ وشاذہ کی جو توجیہات کی ہیں ان کو اور حضرت شیخ کی تقریر کو سامنے رکھ کر مقابلہ کرو تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا۔ کہ قراء کی توجیہات بھی اگرچہ صحیح ہیں مگر عام ہیں، ان کی کوئی خصوصیت ذات محمدی کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً مَلْكِ يَوْمِ الدِّينِ ؕ لام کے سکون کی قراءت کے متعلق قراء کہتے ہیں کہ عَضْدٌ اور کَتْفٌ کی طرح تخفیف کے لئے ہے (کہ اہل عرب ان کو بھی عَضْدٌ اور کَتْفٌ پڑھ دیتے ہیں)۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ عضد اور کتف قرآن مجید کے الفاظ نہیں ہیں۔ عام عربی زبان کے الفاظ ہیں جن کو تمام اہل عرب بولتے ہیں پس اس کے سکون بغرض تخفیف کو نبوت اور کلام اللہ کے ساتھ کیا تخصیص ہوئی۔ اسی طرح مثلاً اِيَّاكَ يُعْبَدُ کی قراءت میں (کہ تیری ہی عبادت کی جاتی ہے) توجیہہ فرمائی ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے) یعنی غائب کے صیغے استعمال کرتے کرتے خطاب کا صیغہ لے آنا یا اس کا برعکس) عام طور پر عربی کلام میں مستعمل ہے۔ اس کو نبوت محمدیہ سے کیا خصوصیت۔ ہاں شیخ کی تقریر سے معلوم ہو گا کہ یٰ کا ضمہ اور عٓ کا جزم القباض کے لئے ہے۔ اور القباض اس مقام پر حرف ی اور عٓ کے معنی کی ضد سے ہو گا کہ ی خوف من اللہ کے لئے ہے جس کی ضد ہے نڈر ہونا یعنی ارتکاب معصیت، اور عٓ عفو کے لئے ہے جس کی ضد ہے ظلم کرنا۔ گویا اس کلمہ کا ادا کرنے والا اوّل ہر دو حروف کے معنی یعنی خوفِ خدا اور شانِ عفو ودرگذر سے متصف ہو کر معصیت اور ظلم سے منقبض ہوا۔ اور القباض بھی اتنا قوی ہوا کہ عارفین میں سے بن گیا جن کی زندگی اہل جنت کی سی ہوتی ہے، یعنی اہل باطن، جو تمامی مخلوق کی عبادت اللہ کے لئے اور ہر شے کی تسبیح ذات باری کے لئے مشاہدہ کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح وحمد نہ کرتی ہو، (مگر ان کی یہ حمد و تسبیح عوام الناس کو سُنائی نہیں دیتی البتہ خواص اور عارفین واولیاء اللہ کو سُنائی دیتی ہے)۔ اور یہ اہل جنت کی سی حیات بَ کے زبر سے معلوم ہوئی جو اس قراءت کے اختلاف کا جزو سوم ہے کہ وسط کلام میں حرف ساکن کے بعد والے حرف کا زبر حیات مثل اہل جنت کے لئے ہوا کرتا ہے۔ پس یہ قراءت کسی عارف ہی کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی یہی قراءت تھی کہ اکابر عارفین

میں سے بھتے۔ برخلاف قرارت مشہورہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے کہ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں)
کہہ کر متکلم نے اپنے نفس کو عبادت میں داخل کر لیا کہ عارف کو اگرچہ اس کی حاجت نہیں
کیونکہ وہ ہر شے کو خدا کی عبادت میں دیکھ رہا ہے اور شے میں اس کا نفس بھی داخل
ہے مگر غیر عارف کو ضرورت ہے کہ قولاً و قراراً اپنے آپ کو داخل عبادت کرے۔ لہذا قرارت
مشہورہ اصح و افضل ہوئی کہ وہ شامل ہے عوام اور خواص دونوں کو برخلاف قرارت
شاذہ کے کہ مخصوص ہے عارف کے ساتھ (دونوں تقریروں کا مقابلہ ایسا ہے جیسے زمین و
آسمان کہ کارہ آمد اور مخلوقِ خدا دونوں ہیں مگر دونوں میں بے حد فرق ہے) ششم یہ خیال
نہ کرنا کہ باطنی حروف سبعہ ہی قرآنِ مجید کی تفسیر ہیں کہ ایسا خیال صحیح نہیں۔ قرآن مجید
کی ہر آیت کا ایک مفہوم ہے۔ اور تمامی علوم اولین و آخرین اس میں درج ہیں۔ یہ حروف
سبعہ اس مفہوم کے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور مفہوم دوسری چیز ہے اور اس کا لباس
دوسری شے۔ الحمد للہ کی تفسیر سے یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ پس اگر قرآن مجید
کی تفسیر اس کے حقیقی مفہوم و معنی میں کی جائے تو قرآن کا ظاہر و باطن منکشف ہو جائے۔ اور
باطن سے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اجسام میں داخل ہونے سے قبل ارواح کی کیا کیفیت تھی۔
اور مفارقت اجسام کے بعد ان کی کیا صورت ہو گی۔ نیز معلوم ہو جائے کہ قرآن سے تمامی علوم
کیسے مستخرج ہوتے اور شریعت محمدیہ بلکہ تمامی شرائع سابقہ و لاحقہ اس سے کس طرح اخذ
کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ علم کے اجزار سابقہ یعنی انجام سے واقفیت احوال کونین سے
تعلق رکھنے والے۔ احوال ثقلین سے تعلق رکھنے والے علوم اور تمامی لغات کی معرفت وغیرہ
میں داخل ہے جو کہ باطن محمدی کے سمندر کا ایک قطرہ ہے پس اگر قرآن مجید کو اس طریق پر
سمجھا جائے اور پھر اس تفسیر کو ان حروف سبعہ کے انوار سے مرکب کیا جائے اور معانی کو ان کو
لباس پہنایا جائے تو وہ معارف ظاہر ہوں گے جن کو سنکر عقل حیران ہو جائے گی۔ اور
اس وقت معلوم ہو گا کہ بے شک تمام آسمانوں اور زمینوں کی مخلوق سب ملکر بھی قرآن مجید
کی ایک سطر کے برابر لانا چاہیں تو ہرگز نہیں لا سکتے۔ ہفتم الفاظ قرآن کے اسرار کی واقفیت
اور ہر حرف کے ایک سر خاص کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ مثلاً یہ کہ اَ امتثال کے لئے ہے اور
بَ سکینت کے لئے اور تَ کمال حسن ظاہری کے لئے وغیرہ وغیرہ بجز اہل فتح اور صاحب
عرفان و ارباب شہود کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اعرابی حرکات کا

خاص خاص اسرار کے ساتھ متصف ہونا بغیر فتح و عرفان کے ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر اس کا کوئی خاص ضابطہ وقاعدہ ہوتا تو ہر شخص مذکورہ اسرار کو معلوم کر لیتا۔ لہٰذا اگر کوئی اس سے واقف ہونا چاہے تو ارباب شہود سے گفتگو کرے۔ اور کل حروف و اعراب کا راز دریافت کرے۔ انشاء اللہ حق تک رسائی نصیب ہو گی۔ شیخ رسم الخط کے متعلق مذکورہ تقریر کہ توقیفی اور بامر نبوی ہے اور اس میں خاص اسرار ہیں۔ تمامی اشکالات کو دُور کر دے گی جن لوگوں نے اس کو صحابہ کی اصطلاح قرار دیا ہے ان میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح صحیح ہے اور اس میں اسرار رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بعض کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور بعض کو نہیں سمجھ سکتے۔ پس جن کو سمجھ سکتے ہیں ان کا اتباع بلحاظ معقول کرنا چاہیے۔ اور جن کو نہیں سمجھ سکتے ان کا اتباع تعبدی طور پر اور محض اطاعت کے ذریعہ میں کرنا چاہیے، اس فریق نے رسم الخط کو اگرچہ محفوظ تو رکھا مگر اتنا نہ سمجھے کہ تعبدی اتباع صرف احکام الٰہی میں ہوا کرتا ہے۔ انسانوں کی تجویز کردہ اصطلاح میں نہیں ہوا کرتا۔ (کہ یہ منصب صرف حق تعالیٰ کا ہے کہ اس کے کسی حکم کی مصلحت اگر سمجھ میں نہ آئے تب بھی اس کو تسلیم کیا جائے کہ عبدیت و غلامی کا تقاضہ یہی ہے۔ اور اسی لئے ایسے حکم کے ماننے کو تعبدی کہا جاتا ہے)۔ پس اس فریق کی تقریر اگر امر معقول اور امر تعبدی کے متعلق صحیح کہی جا سکتی ہے تو اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ رسم الخط کو توقیفی قرار دیا جائے۔ اور دوسرا فریق وہ ہے جس نے اصطلاح کی کوئی رعایت نہیں رکھی اور کہہ دیا کہ چونکہ اہل عرب خود لکھنا نہیں جانتے تھے اس لئے الصلوٰۃ وغیرہ کو بجائے الف کے واؤ کے ساتھ لکھ دیا۔ چنانچہ فرار کا کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور ولی الدین ابن خلدون نے بھی اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ نیز شیخ کی تقریر میں انہوں نے دو شبہ پیش کئے تھے ان کو بھی معہ جواب کے یہاں بیان کر دینا مناسب ہے۔ اوّل میں نے عرض کیا کہ حروف تہجی کو جب ہم نے انوار باطنیہ پر تقسیم کیا تو ت۱ ط۲ م۳ ص۴ ع۵ آدمیت کے لئے نکلے۔ اور ا۶ ث۷ ش۸ ک۹ حروف قبض کے لئے اور ہ۱۰ ن۱۱ س۱۲ حروف بسط کے لئے۔ اور ج۱۳ ح۱۴ ل۱۵ ض۱۶ غ۱۷ ی۱۸ حروف نبوت کے لئے اور خ۱۹ ذ۲۰ ظ۲۱ ق۲۲ ک۲۳ حروف روح کے لئے اور ز۲۴ ف۲۵ حروف علم کے لئے اور ب۲۶ د۲۷ ل۲۸ و۲۹ حروف رسالت کے لئے۔ مگر یہی حروف تہجی کلام الناس میں بھی موجود ہیں۔ قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہیں کہ ہر بشر کا کلام

انہیں حروف سے ترکیب کھاتا ہے۔ پس لازم آیا ہر کلام سات حروف پر آیا اور یہی انوار سبعہ ہر بشر کے کلام میں پائے گئے۔ حالانکہ یہ شان صرف قرآن مجید کی ہے۔ دیگر کتب آسمانی کی بھی نہیں چہ جائیکہ ہر بشر کا کلام۔ چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ آسمانی کتابیں ایک دروازہ سے اور ایک حرف پر نازل ہوا کرتی تھیں۔ اور قرآن مجید سات دروازوں سے اور سات حروف پر نازل ہوا ہے' حضرت شیخ نے جواب دیا کہ حروف تہجی کی یہ تقسیم صرف قرآن مجید کے حروف کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے کلام کے حروف کے لئے ثابت نہ ہو گی۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر الف قبض کے لئے ہے اور نہ یہ کہ ہر ب سکینت کے لئے اور نہ یہ کہ ہر ت کمال حسن ظاہری کے لئے نہ یہ کہ ہر ت کمال حسن ظاہری کے لئے۔ اور نہ ہر ج صبر کے لئے ہے اور نہ ہر ح رحمت کے لئے اور نہ ہر خ ذوق انوار کے لئے۔ بلکہ یہ انوار حروف مذکورہ کے لئے اُس وقت ہیں جب کہ قرآن مجید میں آویں۔ اور اگر یہ حروف قرآن کے علاوہ دوسرے کے کلام میں آئیں گے تو اُن کی تقسیم دوسری ہو گی اور وہ یہ ہے کہ انتیس کے انتیس حروف' آدمیت کے سات اجزاء میں محصور ہیں کہ کمال صورت باطنی تو ہر حرف کے لئے ہے' اور ذکوریت پیش کے لئے اور کمال صورت ظاہری زیر کے لئے' اور کمال عقل زبر کے لئے' اور کمال حس باطنی جزم کے لئے۔ اور نزع حظ شیطان الف کے مد کے لئے' اور کمال حس ظاہری یا کے مد کے لئے۔ رہا واؤ کا مد سو وہ کچھ حصہ نزع حظ شیطان کا لیتا ہے اور کچھ حصہ کمال حس ظاہری کا۔ پس یہ تقسیم آسمانی کتابوں اور احادیث قدسیہ اور انسانوں کے عام کلام میں موجود ہے۔ باقی حروف ستہ یعنی قبض' بسط' نبوت روح علم اور رسالت کے انوار ان کاموں میں راکد و ساکت ہوں گے کہ ان میں اشتعال نہ ہو گا۔ میں نے یہ عرض کیا کہ یہ انوار ستہ جب ذوات انبیاء علیہم السلام میں موجود ہیں تو اُن پر نازل شدہ کتاب بھی ......

...... ان انوار پر نازل ہونی چاہیے۔ ان کے معطل و بے کار ہونے کا کیا سبب؟

فرمایا کہ بے شک چھیوں انوار ذوات انبیا میں موجود ہیں۔ مگر اس طرح جیسے ذات محمدی میں حدیث قدسی وغیرہ کے تکلم کے وقت میں موجود ہیں کہ موجود ہونے کے لئے مشتعل ہونا اور اسرار کا قیام ضرور نہیں (جیسے لال ٹین کی بتی نیچی کر دی جائے کہ روشنی ضرور موجود ہے مگر مشتعل نہیں) یہ اشتعال انوار ستہ کا بس قرآن مجید کے ساتھ مخصوص

مطلب ہی نہیں ہو سکتا) حضرت شیخ نے فرمایا کہ انوار باطنیہ کی شان بمنزلہ جسم کے ہے اور تلفظی اختلافات بمنزلہ سایہ کے۔ تو جو شخص سایہ کو ثابت کرے گا وہ جسم کا منکر نہیں بلکہ درحقیقت جسم ہی کو ثابت کر رہا ہے (کہ سایہ نام ہی جسم کے عکس کا ہے) پس سایہ کی وحدت جسم کی وحدت چاہتی ہے اور سایہ کا تعداد جسم کا تعدد چاہتا ہے۔ لہٰذا جس نے ایک حرف ظل یعنی ایک تلفظ لیا اُس نے ایک حرف جسم لیا۔ یعنی قرارت کے لئے ایک نور باطن معین کیا اگرچہ اس کا وجود ذات محمدی میں پہلے سے تھا۔ اور جس نے ظل کے دو حرف لئے اُس نے دو حرف جسم لئے۔ یعنی جس نے دو تلفظ اختیار کئے اُس نے قرأت کے لئے انوار طبعیہ کے دو نور معین کئے اگرچہ وہ پہلے سے موجود تھے۔ علیٰ ہذا جس نے سات حروف ظل لئے اُس نے سات انوار جسم لئے یعنی ساتوں تلفظی اختلافات پر قادر ہوا تو ساتوں انوار باطنیہ محمدیہ کو جو کہ طبیعت محمدیہ میں قدیم سے موجود تھے اخذ کرنے کی طاقت پائی پس اختلاف تلفظی کا ثبوت عین اختلاف انوار باطنیہ کا مثبت ہے۔ اور اس پر قدرت وضعف ہی تحمل انوار باطنیہ کی طاقت وکمزوری کا مشعر و مظہر ہے۔ تب میں نے عرض کیا کہ حضرت کی برکت وعنایت سے الحمد للہ انوار سبعہ باطینہ تو خوب سمجھ میں آ گئے مگر سبعہ اختلافات تلفظہ بھی اگر حضرت والا سمجھا دیں تو بڑا کرم ہو گا کہ اس سے مراد اختلاف لغات کچھ بیان کئے اور کسی نے کچھ۔ یا اختلاف احکام مراد ہے جیساکہ دیگر علماء کا قول ہے۔ اور انہوں نے اپنی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ حدیث مرفوع قرار دی ہے کہ قرآن سات حروف نازل ہے۔ یعنی زجر امر حلال حرام، محکم متشابہ اور ضرب المثل۔ لہٰذا حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام۔ اور جس بات کا امر ہے اس کو کرو۔ اور جس سے زجر د ممانعت ہے اس سے بچو اور محکم (وصریح المعنیٰ آیات) پر عمل کرو اور متشابہ (مثلاً حروف مقطعات یا جن آیتوں میں اللہ کے لئے وجہ اور ید وغیرہ ثابت ہے) ان پر ایمان لاؤ اور کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے' یہ سب اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے (کہ جو کچھ بھی اُن سے اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے۔ اور ہمیں اس کی کرید کرنے کی ضرورت نہیں) اور ضرب المثل سے عبرت کا سبق لو (جیسے ارشاد ہے" کافروں کی مثال جانوروں کی سی ہے کہ صرف آواز اور پکار کو سنتے ہیں" ان کا مقصود اور مفہوم کچھ نہیں سمجھتے) وغیرہ۔ یا اختلاف قرارت مراد ہے جیساکہ دیگر علماء کا قول ہے مگر

پھر اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ سات سے مراد خاص عدد نہیں بلکہ توسع اور تسہیل ہے کہ تلاوت قرآن میں گنجائش ہے جس طرح سہولت ہو اس طرح پڑھو (اس میں مشہورہ سبع قرارت کے علاوہ سب قراءات شاذہ بھی داخل ہو جائیں گی جن کی تعداد چودہ سے بھی زائد ہے) حضرت ممدوح نے فرمایا کہ وجوہ قرارت کے اختلافات مراد ہیں جن کی تعداد سات ہے مگر میں تم کو کس طرح سمجھاؤں جب کہ میرے گھر والوں نے بچپن میں مجھے قرآن پڑھایا ہی نہیں کہ اصطلاحی نام سمجھ لیتا اور اب سمجھا سکتا۔ اس لئے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ سات صورتیں مراد ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد قرارتوں سے ظاہر ہوتیں مگر وہ مجھے طریق معلوم نہیں جس سے تم کو بتلا اور سمجھا سکوں۔ اس کے بعد حضرت ممدوح اپنے اس مشاہدہ کو مثالوں وغیرہ کے ذریعہ سمجھاتے اور سات اقسام کرنے کی سعی فرماتے رہے حتی کہ آپ کی مراد میری سمجھ میں آگئی۔ اور میں نے عرض کیا کہ غالباً حضرت کی مراد یہ ہے۔ فرمایا ہاں ہاں یہی مراد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اختلاف وجوہ قرارت سات صورتوں میں منحصر ہے۔ اوّل اختلاف قرارت بنا بر حرکت وسکون۔ مثلاً لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٍ میں ایک قرارت ہے الیم کی م پر کسرہ کی تنوین کے ساتھ (کہ صفت ہے رجز کی) اور دوسری قرارت ہے م پر ضمہ کی تنوین (کہ صفت ہے عذابٌ کی) دوم اختلاف قرأت بنا بر زیادتی وکمی حروف۔ مثلاً وَسَارِعُوْا اور قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ اور دوسری قرأت ہے۔ سَارِعُوْا اور قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ یعنی بحذف واو۔ سوم اختلاف کمی وزیادتی کلمات مثلاً اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ اور دوسری قرارت ہے بحذف کلمہ هُوَ۔ چہارم اختلاف بنا بر تقدیم وتاخیر جیسے وَقُتِلُوْا وَقَاتَلُوْا۔ اور دوسری قرارت ہے وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا۔ اسی طرح فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ پہلا کلمہ بصیغہ معروف۔ اور دوسرا بصیغہ مجہول۔ اور دوسری قرارت ہے اس کے برعکس کہ اول بصیغہ مجہول اور دوسرا بصیغہ معروف۔ یا مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ اور سیدنا ابو بکر صدیق کی قرارت ہے وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ ؕ پنجم اختلاف قرارت بنا بر مخارج۔ مثلاً الصِّرَاط بمخرج صٓ اور دوسری قرارت میں اشمام کے ساتھ کہ پوشیدا ہو صفٓ کی اس کا مخرج دوسرا ہے۔ اسی طرح قِيْلَ حِيْلَ جِيْءَ سِيْءَ اور سِيْقَ میں کسرہ اور دوسری قرارت میں

اشمام کہ بو پیدا ہو ضمہ کی۔ یا الصّلوٰۃ کے لام میں تفخیم اور ترقیق کا اختلاف ششم اختلاف قرارت بنا بر فتح اور امالہ (کہ بو پیدا ہو کسرہ کی جیسے مُوسٰی عیسٰی والضحٰی اذا سجٰی وغیرہا میں دونوں طرح قرار نے پڑھا ہے) یا مثلاً اختلاف بنا بر اظہار وادغام (کہ قراء کے پڑھنے کو سنو گے تب سمجھ میں آئے گا) ہفتم اختلاف قرارت بالبطور والسرعت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترتیل کے ساتھ ٹھیر ٹھیر کر تلاوت فرماتے تھے۔ اور کبھی رواں جس کو حدر کہتے ہیں۔ بس یہ ہیں وجوہ اختلافات جو علاوہ گزشتہ تقسیم حروف وحرکات کے مستقل طور پر انوار باطنیہ کے ساتھ مربوط ہیں کہ ترتیل پیدا ہوتی ہے روح سے اور حدر روانی بشرطیکہ حروف کٹنے نہ پائیں پیدا ہوتی ہے قبض سے۔ اور امالہ کا منشا ہے نبوت اور فتح کا رسالت۔ اور اشمام ہر قسم کا مخصوص ہے روح کے لئے اور عدم اشمام نبوت کے لئے۔ اور زیادتی حرف کو تعلق ہے قبض سے، اور کمی حروف کو روح سے۔ اور بیشی کلمات کو رسالت سے اور کمی کلمات کو علم سے۔ اور تقدیم کو نور آدمیت سے، اور تاخیر کو نور علم سے، اور حرکات کا تعلق جن میں اختلاف نہیں مثلاً وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى نور لبسط سے ہے۔ واللہ اعلم۔ (۳) میں نے ایک مرتبہ عرض کیا۔ بخاری میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک شخص کی اچھی خواب نبوت کے چھیالیس۴۶ اجزا میں کا ایک جزو ہے، اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ پینتالیس اجزا میں سے ایک جزو ہے، اور طبری میں امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کی ہے انچاس اجزا میں کا ایک جزو، اور شرح قرطبی میں منقول ہے سینتالیس اجزا میں کا ایک جزو، اور طبری نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی ہے چوالیس۴۴ اجزا میں کا ایک جزو۔ اور ابن عبد البر نے حضرت انس سے موقوفاً روایت کی ہے چھبیس۲۶ اجزا میں کا ایک جزو، اور شرح نووی میں آیا ہے۔ چوبیس۲۴ اجزا میں کا ایک جزو، اور شرح ابن ابی جمرہ میں آیا ہے پچیس اجزا میں کا ایک جزو۔ اور اسی میں آیا ہے ستائیس اجزا میں کا ایک جزو۔ اور دوسری روایتیں اور ہیں جن میں ایک روایت ستر کی ہے۔ ایک بہتر۷۲ کی۔ ایک چھہتر کی۔ ایک پچاس کی ایک چالیس کی۔ ایک بیالیس کی۔ یہ کل پندرہ روایتیں ہوئیں جن میں صحیح ترین روایت چھیالیس کی ہے۔ اور پھر پینتالیس کی۔ اور باقی روایتوں میں کلام ہے بجز بہتر۷۲ کی روایت کے

کہ اس کو مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ میں نے یہ حدیثیں سنا کر حضرت ممدوحؒ سے دریافت کیا کہ اجزاء نبوت سے کیا مراد ہے اور ان روایتوں کے اختلاف میں کیا حکمت ہے۔ اور ان میں تطبیق کس صورت سے ہوگی۔ علماء کی عقلیں اس میں حیران ہیں اور ان کی تقریروں سے کوئی تسکین بخش نتیجہ نہیں نکلتا۔ فرمایا اجزاء نبوت سے مُراد وہی آدمیت اور قبض وبسط اور خود نبوت کے اجزاء ہیں جو گذشتہ بحث میں مذکور ہو چکے ہیں۔ یعنی آدمیت کے سات اجزاء۔ کمال صورت ظاہریہ۔ کمال حواس ظاہریہ۔ کمال صورت باطنیہ۔ کمال حواس باطنیہ۔ ذکوریت۔ نزع حظ شیطان۔ کمال عقل اور قبض کے سات اجزاء حاسہ التذاذ بالخیر۔ انصاف۔ نفرت از ضد حق بات سے نہ شرمانا۔ امتثال امر۔ ہمجنس کی طرف میلان۔ قوت القباض اور بسط کے سات اجزاء فرح کامل۔ ذات میں خیر کا قیام۔ حواس ظاہری کی کشود۔ حواس باطنی کی کشود۔ مقام رفعت۔ درگذر۔ انکسار۔ اور نبوت کے سات اجزاء حق گوئی صبر رحمت۔ معرفت الہیہ۔ خوف تام۔ بغض باطل۔ عفو کہ مجموعہ اٹھائیس ہوا۔ اور ہر جز کی پوری شرح تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس کو دوبارہ دیکھ لو۔ پھر چونکہ خواب میں ذکوریت کی خصوصیت نہیں کہ مرد ہو یا عورت دونوں کو اچھی خواب نظر آتی ہے۔ لہذا اس کو ساقط کردو تو ستائیس اجزاء باقی رہے۔ اور ابن ابی حمزہ کی روایت اس پر محمول ہوگی اور اگر کمال صورت ظاہری کو بھی ساقط کردو کہ اگرچہ اجزاء نبوت میں سے ہے مگر خواب کے ساتھ اس کا کوئی خصوصی تعلق نہیں ہے۔ (کیونکہ خوبصورت ہو یا بدصورت دونوں کو خواب مساوی نظر آیا کرتی ہے) تو چھبیس اجزاء باقی رہ جائیں گے۔ اور اس کو ابن عبدالبر کی روایت کا محمل قرار دیں گے اور اگر کمالِ صورت باطنیہ کو بھی اسی بنا پر ساقط کردیں (کہ خواب کے ساتھ جگر و معدہ وغیرہ کے حسن و قبح کا بھی تعلق نہیں) تو پچیس باقی بچیں گے اور ابن ابی حمزہ کی دوسری روایت اس پر محمول ہو جائے گی۔ اور اگر کمال حواس ظاہریہ کو بھی اسی سبب سے ساقط کردو (کہ سماعت و بصارت وغیرہ کے قوت و ضعف کو بھی خواب میں کوئی دخل نہیں) تو چوبیس باقی رہیں گے اور نودی کی روایت کو اس پر حمل کریں گے۔ یہ تفصیل تو اس صورت میں ہوگی جب کہ صرف نبوت کے اجزاء لئے جائیں گے بغیر رسالت کے۔ ورنہ روح و علم اور رسالت تینوں کے

سات سات اجزاء جن کی تفصیل و شرح گزر چکی ہے اس پر اضافہ ہوں گے۔ اور اجزاء نبوت پورے انچاس ہو جائیں گے۔ اس پر طبری اور امام احمد کی روایت محمول ہوگی۔ اور ۲۷ اگر ذکوریت و کمال صورت ظاہریہ کو ساقط کر دیا جائے گا تو سینتالیس باقی بچیں گے۔ اور اس پر قرطبی کی روایت محمول ہوگی۔ اور اگر کمال صورت باطنیہ کو بھی ساقط کر دیا جائے گا۔ (کہ ان تینوں کا خواب میں کوئی خاص دخل نہیں) تو چھیالیس ۴۶ بچیں گے اور اس پر حمل ہوگی روایت مشہورہ و متفق علیہ جس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ اور ۲۸ اگر کمال حواس ظاہری کو بھی ساقط کر دیں تو پینتالیس بچیں گے جو محمل ہوگا مسلم کی روایت کا۔ یہ توجیہات ہیں سات روایتوں کی۔ اور باقی روایات کی صحت میں کلام ہے۔ لہٰذا ان کی توجیہہ فضول ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت والا کی تقریر سے یہ ثابت نہ ہوا کہ اچھی خواب منجملہ اجزاء نبوت کے ہے، کیونکہ انچاس اجزاء میں خواب کہیں نہیں آئی۔ حالانکہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ خواب کا شمار اجزاء نبوت میں ہے۔ فرمایا کہ رویاء صالحہ اجزاء آدمیت میں سے ایک جزو یعنی نزع حظ شیطان' اور اجزاء روح میں سے ایک جزو یعنی بصیرت سے مستفید ہوتی ہے، کہ جب بصیرت کا نزول ہوتا ہے شیطانی حصہ کے نکل جانے پر تو اچھی خوابیں نظر آیا کرتی ہیں جن کو رویاء صالحہ کہتے ہیں (لہٰذا اجزاء نبوت میں داخل ہوئی) میں نے کہا کہ اس بناء پر تو دو جزو ہوئے اجزاء نبوت کے۔ لہٰذا حدیث میں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اچھی خواب دو جزو ہیں منجملہ اجزاء نبوت کے حالانکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجزاء نبوت کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ خواب کا مدار درحقیقت نزع حظ شیطان پر ہے کہ جزو آدمیت ہے۔ باقی بصیرت کہ جزو روح ہے اس کی موافقت کرتی اور مددگار بنتی ہے۔ (جیسے دوربین سے کسی چیز کو دیکھیں تو دیکھنا درحقیقت کام صرف نظر اور قوت باصرہ کا ہے۔ دوربین نے مدد پہونچائی اور نگاہ کی مواقفیت کی ہے۔ لہٰذا دو جزو نہیں بلکہ ایک ہی جزو ہوا) حق تعالیٰ شانہ جب کسی بندہ سے شیطانی حصہ نکال لیتا (اور مادۂ ظلمت سلب فرما لیتا) ہے تو اس کے افکار و تخیلات سب امور خیر میں گھوما کرتے ہیں لہٰذا اس کو اچھی خوابیں نظر آتی ہیں۔ اور جن میں یہ شیطانی حصہ موجود ہوتا ہے اس کے افکار اسکے

برعکس ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کو بُری خوابیں نظر آیا کرتی ہیں۔" شیخ کی یہ تقریر محض کشف اور صفاء معرفت ہے ورنہ علماء میں کسی ایک نے بھی نبوت کے اجزاء بیان نہیں کیے۔ بلکہ ان کی شمار کو حقائق نبوت کی معرفت رکھنے والوں پر محمول کر دیا ہے البتہ علامہ حلیمی نے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جزو ثابت کرنے کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کے علمی خصائص کی ایک فہرست دی اور چھیالیس کی شمار پورا کرنے کے لئے بہت کچھ تکلیف سے کام لیا ہے کہ لکھتے ہیں۔ نبوت کا سب سے [۱] اوّل جزو اللہ پاک سے بلاواسطہ کلام کرنا ہے۔ اور [۲] دوسرے الہام جس میں کلام نہ ہو [۳] سوم وحی بزبان فرشتہ۔ [۴] چہارم فرشتہ کا قلب میں القاء [۵] پنجم کمال عقل۔ [۶] ششم۔ قوت حافظ کہ ایک بار سن کر پوری سورت یاد ہو جائے۔ [۷] ہفتم۔ اجتہادی مسائل میں غلطی نہ کھانا [۸] ہشتم ذہن کی فہم کہ ایک حکم منصوص سے کثیر در کثیر مسائل استنباط کر سکے۔ [۹] نہم کمال بصر کہ وہ چیز دیکھ سکے جو دوسروں کو نظر نہ آوے۔ [۱۰] دہم کمال سماعت کہ منتہائے زمین کی وہ باتیں سن سکے جن کو دوسرے نہ سن سکیں [۱۱] یازدہم کمال شم جیسا کہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ حضرت یوسف کے کرتہ کی بو کو (مسافت بعیدہ سے) سونگھ لیا۔ [۱۲] دوازدہم بدنی طاقت کہ ایک شب میں مہینہ بھر کی مسافت طے کر سکے۔ [۱۳] سیزدہم۔ آسمانوں پر عروج (جیسا کہ شب معراج میں ظاہر ہوا) [۱۴] چہاردہم وحی کا آنا گھڑیال کی گونج کی طرح۔ [۱۵] پنجدہم۔ بکری [۱۶] کا کلام کرنا (جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی ایک یہودی عورت نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر دیا اور خود گوشت نے آپ کو خبر دی کہ میرے اندر زہر ملا ہوا ہے) نباتات [۱۷] کا بولنا (کہ جس شب میں جنات نے قرآن مجید سنا تھا اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درخت نے دی تھی)۔ تنہ [۱۸] کھجور کا بولنا (جیسا کہ ممبر کی تیاری کے وقت وہ تنہ بچوں کی طرح رویا جس سے سہارا لگا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھا کرتے تھے) پتھر [۱۹] کا بولنا (کہ حضرت علی سے روایت ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو بھی درخت یا پتھر پڑتا تھا وہ آپ کو سلام کرتا تھا)۔ بھیڑیوں کی بولی سمجھنا (جیسا کہ مروی ہے ایک مرتبہ سو بھیڑیے بعد نماز فجر مسجد نبوی کے پاس آ بیٹھے۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھانا مانگتے ہیں ان کو کھلاؤ)۔ [۲۰] اونٹ کی بولی کا سمجھنا (کہ ایک مرتبہ ایک اونٹ نے حضرت سے شکایت کی کہ مجھ پر طاقت سے زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے) [۲۱] آواز سننا بولنے والے کی جس کا متکلم نظر نہ آوے۔ (جیسا کہ جنات کی باتیں آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنیں) جنات کو دیکھنا۔ نظر[۲۳] سے اوجھل چیزوں کا سامنے آجانا جیسے شب معراج کی صبح کو بیت المقدس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لارکھا گیا کہ آپ اس کو دیکھتے جاتے اور سوال کرنے والوں کو اس کے طاق وکڑی وغیرہ بتاتے جاتے تھے)۔ کسی واقعہ کا پیش[۲۴] آنا جس سے انجام کا علم حاصل ہو۔ مثلاً غزوۂ حدیبیہ کے راستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی چلتے چلتے بیٹھ گئی تو آپ نے (اس سے نتیجہ نکالا کہ اشارہ ہے اندرونِ حرم جنگ نہ کی جائے اور فرمایا کہ) میری اونٹنی کو اس اندیشہ نے روکا ہے جس نے اصحابِ فیل کے (محمود نامی) ہاتھی کو روکا تھا کہ وہ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور حرم محترم کے ادب کا اشارہ کر رہا تھا)۔ نام[۲۵] سے کسی معاملہ پر استدلال کرنا، جیسا کہ حضرت سہیل بن عمرو جب حاضرِ خدمت ہوئے تو آں حضرتؐ نے صحابہ سے فرمایا تمہارے معاملہ میں سہولت نصیب ہوئی۔ کسی[۲۶] آسمانی چیز کو دیکھ کر زمین کے کسی واقعہ پر استدلال کرنا۔ مثلاً بادل کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قبیلۂ بنی کعب کی فتح و نصرت کا اعلان کر رہا ہے۔ پشت[۲۷] کی طرف سے دیکھنا کسی[۲۸] کی زندگی میں ایسے واقعہ کا معلوم ہوجانا جو اس کے مرنے کے بعد اس کو پیش آئے گا۔ جیسے حضرتؓ حنظلہؓ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ فرشتے غسل دے رہے ہیں (چنانچہ بحالت جنابت ان کو شہادت نصیب ہوئی اور یہاں بلا غسل بحکم شہداء دفن ہوئے مگر وہاں ملائکہ نے غسل جنابت دیا)۔ ایسی[۲۹] صورتوں کا ظہور جن سے آئندہ کی فتوحات پر استدلال کیا جائے۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں ظاہر ہوا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑے پتھر کو توڑنے کے لئے کدال ماری تو اس سے ایک چمک پیدا ہوئی جس میں فارس کے شہر نظر آئے اور آپ نے فرمایا کہ ملک کسریٰ مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوگا۔ اور پھر دوسری ضرب میں چمک پیدا ہوئی تو بلادِ روم نظر آئے اور آپ نے فرمایا کہ ملک روم اہل اسلام کا مفتوح بنے گا)۔ دنیا[۳۰] میں جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرنا۔ فراست[۳۱] (کہ نورِ قلب سے نامعلوم شے معلوم ہوجائے)۔ درخت[۳۲] کا

؎ بکری کے باتیں کرنے کا معجزہ باوجود سوچنے کے اس وقت مجھے یاد نہیں آیا البتہ اس کے گوشت کا کلام صحاح میں مذکور ہے لہٰذا وہ نقل کر دیا۔ ۱۲۔

مطیع ہونا۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی پر دو درخت اپنی عروق اور شاخوں سمیت (آدمی کی طرح چل کر) ایک جگہ سے دوسری جگہ آئے (اور قضاء حاجت کے لئے حضرت کے واسطے پردہ کر لیا)۔ ہرنی[۳۳] کا شکایت کرنا کہ بچوں کو بھوکا چھوڑ کر صیاد کے جال میں مقید ہوگئی ہوں۔ (اتنی رہائی دلا دیجئے کہ ان کو دودھ پلا آؤں)۔ خواب[۳۴] کی تعبیر کا علم کہ بالکل اور کبھی غلطی واقع نہ ہو۔ کنکوٹ[۳۵] سے واقفیت (کہ تخمینہ عین حقیقت کے موافق پڑے)۔ مخلوق[۳۶] کو احکام الٰہی کی تعلیم۔ امت[۳۷] کو دینی و دنیوی انتظام کا سلیقہ سکھانا۔ نیکیوں[۳۸] اور خوبیوں کی رہبری۔ طبی[۳۹] طریق سے اصلاح جسمانی کی تعلیم۔ قرب[۴۰] الٰہی کے طریقے تعلیم کرنا۔ مفید[۴۱] صنعتوں کی تعلیم۔ نظر[۴۲] سے اوجھل چیزوں کا علم جو کسی نے نہیں بتایا۔ آئندہ[۴۳] پیش آنے والے واقعات کا علم۔ لوگوں[۴۴] کے مخفی معاملات سے واقفیت استدلال[۴۵] کے طریقوں کی تعلیم اور برتاؤ[۴۶] میں طریق لطف و کرم کی اطلاع کہ خصائل نبوت کی تعداد چھیالیس[۴۷] پوری ہوگئی۔ جن میں ہر خصلت اس قابل ہے کہ رویاء صالحہ اس کے ساتھ مل جائے اور اس طرح پر نبوت کے چھیالیس[۴۸] اجزاء میں کا ایک جزو بن جائے۔ اور گو خصائل میں (تعبیر و اجتہاد کلام وغیرہ) غیر نبی میں بھی پائے جا سکتے ہیں مگر (اجزاء نبوت میں ان کا شمار اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ) نبی سے اس میں کبھی غلطی واقع نہ ہوگی۔ اور غیر نبی کبھی غلطی کھائے گا اور کبھی مصیب رہے گا" علامہ حلیمی نے بہت کچھ دماغ سوزی سے چھیالیس[۴۹] کی گنتی کو پورا کیا لیکن ذرا غور کرو مقصود تھا مطلق نبوت کے اجزا بیان کرنا مگر ان میں بہتیرے خصائل وہ ہیں جو صرف ذات محمدی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً بکری[۱] کا کلام کرنا۔ پتھر[۲] کا سلام کرنا۔ تنہ درخت[۳] کا آہ کرنا گرگ[۴] اور شتر[۵] اور ہرنی[۶] کی بات کا سمجھنا۔ بیت المقدس[۷] کا سامنے آجانا۔ آپ[۸] کا یہ فرمانا کہ فیل کو جس نے روکا تھا اسی نے میری ناقہ کو روکا ہے۔ سہیل[۹] کے آنے پر سہولت امر کا اظہار۔ بادل[۱۰] کی نصرت قبیلہ بنی کعب کے متعلق اعلان کا ارشاد۔ خندق[۱۱] کھودتے وقت چمک کا واقعہ۔ درخت[۱۲] کا اپنی جگہ سے دوسری جگہ انتقال وغیرہ کہ جزئیات اور واقعات ہیں جو ہو چکے اور گزر چکے۔ ان کو اجزاء نبوت میں کا ایک جزو ہونے سے کیا تعلق۔ پھر ان میں ۱ لغایت ۹ صرف ایک جزو نبوت یعنی معرفت لغات میں مندرج ہیں۔ اور ۸ سے لے کر آخر تک انجام سے واقفیت میں شامل ہیں لہٰذا گیارہ خصلتیں درحقیقت دو خصلتیں ہوئیں۔

بھر چھیالیس کی چھیالیس خصلتیں اگر غور کرو تو رسالت کے اجزاء و خصائل میں سے صرف
ایک جزو یعنی علم کامل میں داخل ہیں کہ علم کامل کی جو شرح بیان ہو چکی ہے اس کو دیکھ لو
اور نتیجہ نکال لو۔ الحاصل علامہ حلیمی نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے چند معجزات جو بطریق خرق عادت آپ کے ہاتھوں کو ظاہر ہوئے تھے
ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا اور مطلق نبوت کے اجزاء میں جس کا وجود ذات محمدی
اور دیگر تمامی انبیاء علیہم السلام کی ذوات میں مشترک ہے' ان کو شمار کر لیا علاوہ ازیں
معجزات کی شان یہ ہے کہ ممکن ہے سب یا اکثر ان میں اولیاء امت کی کرامت بنجائیں۔
کیونکہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے' کہ جو واقعہ حضرات انبیاء کے لئے معجزہ کہلاتا ہے
وہی اولیاء سے صادر ہو کر کرامت کہلاتا ہے پس جب یہ واقعات غیر نبی کے
لئے بھی ثابت ہو سکتے ہیں تو ان کا اجزاء نبوت سے ہونا کسی حال بھی صحیح
نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔ حکیم الامت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔
یہ کہ رویاء صالحہ نبوت کے چھیالیس اجزا میں کا ایک جزو ہے' وہ اتفاقیہ طور پر آپ کی
زبان سے نکل جاتا تھا۔ نہیں بلکہ یہ واقعی اور حقیقی ہے مگر دوسرے لوگ بجز تخمینہ کے
اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے کہ نبوت اس مرتبہ کا نام ہے جو نبی کے ساتھ
مخصوص ہے اور وہی نبی کا ما بہ الفرق والامتیاز ہے۔ اور اس کے چند خواص ہیں۔
مثلاً اللہ کی ذات وصفات اور ملائکہ و دار آخرت سے متعلق امور کی حقیقی معرفت جو
نبی کو حاصل ہوتی ہے اور وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکتی' نہ نبی کے مثل کثیر
معلومات اور نہ اتنی زیادہ تحقیق اور قوت یقین۔ نیز نبی کو ایک خاص نور ملتا ہے
جس کے ذریعہ وہ ملائکہ کو دیکھتا اور عالم ملکوت کا ایسا مشاہدہ کرتا ہے کہ اس میں
اور دوسروں میں ایسا فرق ہوتا ہے جیسا بینا اور نابینا میں۔ نبیؑ کو وہ نور ملتا ہے
جس کے ذریعہ وہ آئندہ ہونے والے واقعات کا ادراک اور لوح محفوظ کی کتابت کا
ایسا مطالعہ کرتا ہے کہ اس میں اور دوسروں میں ذکیُ الطبع اور بلید کا سا فرق ہوتا
ہے۔ نبی کی ایک خاص شان ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے خوارق عادات امور
ایسے بن جاتے ہیں جیسے دوسروں کے لئے اختیاری افعال پس ممکن ہے کہ ان خواص نبوت
کی انواع اور پھر ان کے اجزاء نکالے جائیں۔ مگر اول تو کیا ضرورت ہے کہ چھیالیس ہی

نکلیں۔ ممکن ہے چالیس نکلیں یا پچاس نکلیں۔ دوم اگر چھیالیس پورے ہی کر لیں اور خواب کو اس کا ایک جزو بنا دیں تو ظاہر ہے کہ وہ محض تخمینی اور عقلی ہوں گے۔ نہ وہ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تھی۔ نیز علامہ مازری لکھتے ہیں کہ عالم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر شے کا اجمالاً و تفصیلاً علم ہی رکھتا ہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر عالم کے لئے ایک حد تجویز فرما دی جہاں پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا ہے (اور آگے اس کا علم کچھ کام نہیں دیتا)۔ پس بعض مسائل وہ ہیں جن کی مراد ہی معلوم نہیں نہ اجمالاً نہ تفصیلاً (جیسے حروف مقطعات وغیرہ)۔ اور بعض وہ ہیں جن کی مراد اجمالی کا ہمیں علم ہے مگر تفصیلی کا علم نہیں۔ اور یہ مسئلہ کہ رویاء صالحہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں کا ایک جزو ہے' اسی قبیل سے ہے (کہ اجمالی علم حاصل ہو گیا۔ مگر چھیالیس کی تفصیل معلوم نہیں) اور ابو سعید سفاقسی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بزمانہ ابتداء رسالت چھ مہینہ تک خواب میں وحی فرمائی (کہ خواب میں جو کچھ دیکھتے صبح ہی اس کا ظہور ہو جاتا) پھر اس کے بعد بقیہ عمر تیئیس سال تک بیداری میں وحی نازل ہوتی رہی۔ لہذا وحی منامی کی مدت' وحی بیداری کی مدت کا چھیالیسواں حصہ ہوا۔" مگر اس تقریر پر چند اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ وحی منامی کے بعد کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے (کسی کے نزدیک پچیس[۲۵] سال ہے اور کسی کے نزدیک بیس[۲۰] سال) تیئیس سالہ مدت متفق علیہ نہیں ہے۔ دوم اگر تیئیس[۲۳] سال تسلیم بھی کر لی جائے۔ تو چھیالیس کی روایت کے متعلق یہ توجیہ صحیح ہوئی۔ مگر دیگر روایات کا (جن میں ۴۵-۴۹-۴۷-۴۴-۲۶-۲۵-۲۷- اور ۷۰ وغیرہ اجزاء آئے ہیں) کیا جواب ہو گا۔ سوم وحی منامی کی مدت کا چھ ماہ ہونا بھی بے دلیل ہے اول یہی محتاج ثبوت ہے۔ چہارم وحی منامی کے بعد کی مدت تیئیس سال بھی خالص وحی بیداری کے لئے نہ تھی بلکہ اس میں بھی آنحضرت کو سچی خوابیں نظر آئیں۔ لہذا اس وحی منامی کا اتنا حصہ اُدھر سے نکال کر ابتدائی چھ ماہ میں شامل کرو گے تو بنا بنایا ہوا تناسب بگڑ جائے گا۔

الحاصل ان اعتراضات مذکورہ کے جواب دینے کی بھی اگرچہ کوشش کی گئی ہے مگر سب میں بڑا اشکال تو یہ ہے کہ اس حدیث سے مقصود تو مومن کی رویاء صالحہ کا شرف و فضل بیان کرنا (کہ اس کو نبوت کے ساتھ ایسی مناسبت ہے جیسی ایک کو چھیالیس

کے ساتھ ہے) اور اس توجیہ کا مطلب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات شریفہ میں جو صورت اتفاقیہ پیش آئی (کہ چھ مہینے صرف سچی خوابیں نظر آتی رہیں اور پھر تا وفات بواسطہ جبریل امین نزولِ وحی ہوتا رہا) محض اس کا ظاہر کرنا ہوا جس کا مفہوم یہ ہوا کہ (خود رویا ر صالحہ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سچی خوابیں دیکھنے کا زمانہ آپ کی بیداری کی وحی کے زمانہ کا چھیالیسواں حصہ تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر صالح کی ہر خواب میں یہی نسبت ہوا کرے۔ چنانچہ ابن ابی جمرہ نے بھی اس کو رد کیا اور لکھا ہے کہ اس میں (دین یا دنیا کا) کون بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ اور ایسا کلام ایسے فصیح و بلیغ پیغمبر کی طرف منسوب کرنا جس کا جامع الکلم ہونا مسلم ہو کس طرح مناسب ہو سکتا ہے۔ شاید اس قائل کا مقصود صرف اتنا ہے کہ نبوت میں اور رویار صالحہ میں فی الجملہ مناسبت ثابت کر دے اور اجزار کا عدد کسی طرح کھپا دے (مگر یہ سید الاولین والآخرین کی شان کے شایان نہیں) پھر روایات مذکورہ کے اختلافات رفع کرنے میں علمار نے بہت کچھ تکلفات کئے ہیں کہ امام طبری نے تو یہ لکھا ہے کہ ستر اجزار کی روایت ہر مسلمان کی سچی خواب کے بارہ میں ہے۔ اور چالیس کی روایت سچے مومن دیندار کی خواب کے بارہ میں۔ اور اس کے درمیان کی روایتیں بلحاظ مراتب صلاح و دینداری درمیانی مومنین کے بارہ میں۔ اور ابن بطال کہتے ہیں کہ اعداد میں صحیح ترین روایتیں دو ہیں۔ ایک چھیالیس اجزار والی اور دوسری ستر اجزار والی۔ اور خواب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جلی و واضح۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ کسی نے اس کو پھل دیا ہے اور صبح بیداری میں یہی صورت پیش آ دے کہ کوئی شخص اس کو پھل دے جائے۔ دوسری قسم وہ خواب ہے جس میں تعبیر کی ضرورت ہو پس محتاج تعبیر خواب نبوت کے ستر اجزار میں سے ایک جز ہوگی اور واضح خواب چھیالیسواں جز۔ کہ جتنے عدد کم ہوں گے اسی قدر خواب غلطی سے بعید اور صدق سے قریب ہوگی۔ اور بعض علمار نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ وحی کی بھی دو صورتیں ہوتی تھیں کہ کبھی حضرت جبریل وحی لاتے اور آپ اس کو بلا کلفت اخذ فرما لیتے اور کبھی وحی آتی تو آپ کو سخت سردی میں پسینہ آجاتا تھا۔ واللہ اعلم۔

(۴) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ کوئی خواب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور کوئی خواب شیطان کی طرف سے۔ فرمایا ذات انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ہر وقت حق میں مشغول اور حق کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور دوم وہ جو ہر وقت

باطل میں منہمک اور باطل سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں ہر قسم ہمیشہ وہی چیز آتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی اور اس کی حالت کو قائم رکھتی ہے۔ مثلاً دو سائل دس دس دینار کا سوال کرتے ہیں اور حسب سوال جب ان کو دیا جاتا ہے تو دونوں خوش ہوتے ہیں۔ مگر ایک کی خوشی کا تعلق تو صاحبِ عطا کے ساتھ ہے (کہ دس دینار ملنے سے عطا کنندہ کی اپنے اوپر توجہ وعنایت کا اندازہ کیا اور) اس خوشی میں میں پھولا نہیں سماتا۔ اور یہی اس کی ہمیشہ کی عادت بن گئی (کہ جب کبھی کچھ ملتا ہے اس کی نظر عطا کنندہ پر جاتی ہے اور اس کے لطف وکرم اور اپنے اوپر اس کی شفقت کا ادراک ہو کر فرح وسرور حاصل ہوتا ہے) شب و روز یہی معمول ہو گیا ہے۔ پس اس شخص کو تو کہا جائے گا کہ حق میں مشغول اور حق کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دوسرے شخص کی خوشی کا تعلق نفس عطاء یعنی دیناروں کے ساتھ ہے کہ ان سے میری ضرورت پوری ہوگی (اور فلاں فلاں مزے اڑاؤں گا)۔ غرض جب دینار اس کے ہاتھ میں آئیں گے تو فوراً اس کا خیال ان ضروریات کی طرف جائے گا جن کو پورا کرنا ہے، اور جب وہ ختم ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ ہاتھ پھیلائے گا کہ اے میرے پروردگار مجھے دس دینار اور دے دے۔ اس شخص کا دل تو ضروریات میں مبتلا اور اسی دھیان میں منہمک ہے مگر زبان پر اللہ کا نام برائے نام جاری ہے کہ قلب اس کے معنی سے خالی اور بے تعلقی وحجابات سے لبریز ہے۔ پس اس کو کہا جائے گا کہ باطل میں منہمک اور باطل کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہٰذا پہلے شخص کی خوابیں بھی اللہ کی طرف سے ہوں گی کہ (سوتے جاگتے) اس کو تعلق اپنے اللہ سے ہے، اور دوسرے شخص کی خوابیں شیطان کی طرف سے ہوں گی کہ اس کا تعلق شیطان کے ساتھ ہے۔ اور خوابیں تو سب اللہ ہی کی طرف سے ہیں مگر شیطان کی طرف انتساب صرف اس بناء پر ہے کہ وہ ان سے راضی ہوتا اور بنی آدم کے لئے ان کو پسند کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا منشاء ظلمت ہے اور ظلمت شیطان کو محبوب ہے"

فقط۔ ائمۂ حدیث ابن الحجر ابن العربی اور ابن بطال وغیرہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ خوابیں کسی قسم کی بھی ہوں سب خدا کی طرف سے ہیں (کہ متصرف و خالق بجز اس کے کوئی نہیں) مگر شیطان کی طرف نسبت صرف اس لئے ہے کہ وہ ان سے راضی ہوتا ہے۔ پھر میں نے سچی اور جھوٹی خواب کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سچی خواب اس کی ہوتی ہے جس کا قلب سونے کی حالت میں بھی اللہ جل جلالہٗ کے مشاہدہ میں رہتا ہے جیسا کہ اکثر

جاگتے میں رہتا ہے اور جھوٹی خواب اس کے برعکس حالت والے کی ہوتی ہے کہ اس کا قلب سوتے میں ایسا ہوتا ہے جیسے عام لوگ کہا کرتے ہیں کہ مجھے فلاں خیال آیا، اور اس کو یہ دھیان آیا۔ غرض جس طرح بحالت بیداری وہ مشاہدۂ حق سے محجوب ہوتا ہے، بحالت خواب بھی محجوب ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ بعض اہلِ ظلمت (کافروں) کی خواب بھی کبھی سچی ہوتی ہے۔ کیا ان کا قلب محجوب نہیں ہوتا؟ حالانکہ محقق ہو چکا ہے کہ اہلِ ظلمت کی خوابیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اور جو شیطان کی طرف سے ہوگی اس میں حجاب لازمی ہے۔ چنانچہ بادشاہ مصر نے جو خواب دیکھا وہ قرآن مجید میں مذکور ہے (کہ ساتؔ فربہ گائیں کھا جاتی ہیں سات لاغر گاؤں کو اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی کہ سات سال کی پیداوار کو خشک سالی کے سات سال کھائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا)۔ فرمایا چونکہ اس میں حصہ تھا سیدنا یوسف علیہ السلام کا کہ آپ کی شہرت اور جیل خانہ سے رہائی اور مُلک پر تسلّط کا یہی سبب ہوا لہذا اس کی خواب سچی ہو گئی۔ علاوہ ازیں کافر کو بھی خواب سچی نظر آجاتی ہے بشرطیکہ دوسروں کے اس خواب کا تعلق ہو۔ اور بادشاہ مصر کی اس خواب کا تعلق تمامی رعایا اور اہلِ ملک کے ساتھ (کہ قحط کی مصیبت سب ہی پر پڑنے والی تھی) لہذا اس خواب کا واقعہ کے موافق نظر آنا دوسروں کی غرض سے ہوا۔ نہ کہ خاص دیکھنے والے کی خاطر میں نے کہا اچھا مصری جیل خانہ کے قیدیوں کی خوابیں تو ان ہی کے لئے خاص تھیں غیر کا اُن سے کوئی تعلق نہ تھا حالانکہ وہ واقعہ کے موافق اور سچی ہوئیں۔ فرمایا وہ اس لئے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا حق اس میں شامل تھا کہ جیل خانہ سے رہائی اور فنِ تعبیر میں کمال یوسفی کی شہرت اور مصر پر تسلط کامل کا سبب وہی خوابیں بنیں۔ الحاصل اہلِ ظلمت کی خواب کبھی سچی نہ ہوگی مگر جب کہ اس میں کسی دوسرے کا حق شامل ہو یا اس میں خواب دیکھنے والے کے لئے مذہب حق کے حق ہونے کی شہادت ہو۔ یا اُس کی توبہ و اصلاح کا سبب بنے وغیرہ۔ پھر میں نے پریشان کن خواب کے متعلق دریافت کیا کہ کون سی (واقعی ہوتی اور) نقصان پہونچاتی ہے اور کون سی (محض پریشان کرنے کے لئے شیطان کی طرف سے ہوتی اور) کسی قسم کا بھی نقصان نہیں پہونچاتی نیز وہ قصہ بھی سُنایا جس کو دارمی نے سلیمان بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے جس کا شوہر بغرض تجارت پردیس میں گیا ہوا تھا خواب دیکھا گویا اس کے گھر کا ستون گر گیا اور اس کے کانا بچہ پیدا ہوا ہے۔

اُس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا انشاء اللہ تمہارا شوہر بعافیت واپس آئے گا اور تمہارے بطن سے دیندار بچہ پیدا ہو گا' اس کے بعد وہ دوبارہ آئی اور حضرت تشریف فرما نہ تھے اس لئے حضرت عائشہ سے اپنی خواب بیان کی حضرت عائشہ نے فرمایا اگر تمہاری خواب سچی ہے تو (تعبیر یہ ہے کہ) تمہارا شوہر انتقال کر جائے گا اور تمہارے پیٹ سے بددین بچہ پیدا ہو گا' جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے اس خواب کا اور اپنی تعبیر کا آپ سے تذکرہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا اور فرمایا اے عائشہ جب کسی مسلمان کو تعبیر دیا کرو تو اچھی تعبیر دیا کرو کہ خواب اپنی تعبیر کے موافق ظہور پکڑتی ہے"۔

خواب کی تعبیر

ف۔ جس طرح پانی تابع ہے ظرف کا کہ گول یا لمبے یا چوکور جیسے برتن میں بھی پانی ڈالو گے پانی اُسی شکل پر ہو جائے گا۔ اسی طرح خواب میں حق تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ تعبیر دینے والا بُری یا بھلی جیسی بھی تعبیر دے گا وہ اسی شکل پر ہو جائے گی۔ پھر ممکن ہے کہ صحیح تعبیر یہی خیر و خوبی والی ہو جو معبر نے دی ہے۔ اور اگر معبر کے نزدیک صحیح تعبیر اس کے خلاف ہے تب بھی اس کو بدل کر اطمینان بخش تعبیر دینا کذب میں داخل نہ ہو گا۔ اور اس کی ایسی مثال ہو گی جیسے دق کے مریض کو یہ یقین کرتے ہوئے کہ جاں بر نہ ہو گا یوں کہا جائے کہ انشاء اللہ تندرست ہو جاؤ گے کہ اوّل تو علم الٰہی کے سامنے ہمارا علم و یقین ہی کیا۔ دوم اس کی تبدیل پر حق تعالیٰ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ خصوصاً جبکہ ہونا تو ہی ہے جو مقدر ہو چکا پھر ہم اپنے مسلمان بھائی کو قوی و مطمئن بنانے کے لئے کم از کم ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن کر شفقت و درد کا آخری برتاؤ کیوں نہ کر گزریں۔ بالخصوص جب کہ عالم خواب کا یہ قانون بھی ہمیں معلوم ہو گیا کہ واقعہ کو تعبیر کے موافق بدل دیا جاتا ہے دارمی میں یہ قصہ مفصّل مذکور اور خود حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ اس عورت کا شوہر تاجر تھا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اس کو حاملہ چھوڑ کر سفر میں گیا اور اس کو یہی خواب نظر آئی۔ ہر مرتبہ وہ پریشان ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تعبیر لینے آئی اور حضرت نے خوش کن تعبیر دی اور اُسی کے موافق ظہور ہوا۔ مگر امر مقدر پورا ہو کر رہتا ہے۔ چوتھی مرتبہ اسکو پھر یہی خواب نظر آئی اور وہ حسب عادت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضرت کو موجود نہ پایا اور حضرت عائشہ نے اصرار فرمایا کہ آخر کیا کام تھا مجھے تو سناؤ۔ اس نے اپنی خواب

ان کو سُنادی اور اُنہوں نے بیوہ ہونے اور بدکار بچّے کی ماں بننے کی تعبیر دی جس کو سُنتے ہی وہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور زار زار رونے لگی۔ اتنے میں حضرت تشریف لے آئے اور قصّہ سُنا تو افسوس فرمایا اور حضرت صدیقہ کو اس قانون الٰہی سے باخبر کیا کہ واقعہ کو تعبیر کے سانچہ میں ڈھال دیا جاتا ہے اس لئے ہمیں اپنے مُسلمان بھائی کے ساتھ شفقت و درد کا برتاؤ کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ امت محمدیہ کو حضرت عائشہ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ آپ ہی کے اس قصہ سے ہم کو یہ بہترین سبق ملا۔ واللہ اعلم۔

پریشان کن خواب

حضرت شیخ نے فرمایا کہ پریشان کن خواب حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے تنبیہ اور آزمائش ہوتی ہے کہ (یہ خواب دیکھ کر بھی) اپنے رب کے ساتھ رہتا ہے یا نہیں پس اگر بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو جب وہ پریشان کن خواب دیکھتا ہے نہ اُس کی پرواہ کرتا ہے نہ اُس کی طرف توجہ۔ کیوں کہ جانتا ہے کہ یہ خواب بھی اسی کی طرف سے ہے جس کے ہاتھ میں (دکھ سکھ کے) تمامی معاملات ہیں، اور ہر امر میں تبدیل و تغیر کا اس کو اختیار ہے، اور اس کی جو مشیت ہے اور جیسا کچھ وہ تقدیر میں لکھ چکا ہے وہ بہرحال ہو کر رہے گا۔ لہٰذا وہ اس خواب کی طرف التفات ہی نہیں کرتا پس ایسے شخص کے لئے تو یہ خواب باذن الٰہی کچھ بھی مضر نہیں ہوتی۔ اور جس بندہ کا تعلق اپنے رب کے ساتھ نہیں ہوتا اور اس کو پریشان کن خواب نظر آتا ہے تو اس کو فکر و اہتمام ہوتا اور یہی دھیان ہمہ وقت اس کی نظروں کے سامنے جما رہتا ہے۔ اپنے رب سے غافل بن جاتا اور یقین رکھتا ہے کہ پریشانی ضرور پیش آکر رہے گی۔ تقدیر کو بھول جاتا اور مشیت و تصرف الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے وہ اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کو یہ خواب مضرت پہونچاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر ایسی خواب دیکھنے والے کو یہ حکم کیوں کیا گیا کہ اعوذ پڑھے اور شیطان کے اور اس خواب کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے۔ اور بائیں جانب کو تین بار تھوتھو کر دے۔ فرمایا کہ مومنین کے قلوب اللہ ہی کے دھیان میں سوتے اور اسی کے دھیان میں جاگتے ہیں تب بھی اُن کا رب اُن کے دلوں میں ہوتا ہے لہٰذا جب ان میں کسی کو پریشان کن خواب نظر آتی اور پھر آنکھ کھلتی ہے تو ان کا قلب جس حالت پر سویا تھا اس سے (با قتضاء بشریت) متزلزل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آں

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی حالت پر رجوع کرنے کا حکم فرمایا اور اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے اور پریشان کن خواب کے درمیان اپنے رب کو لے کہ اُعُوذُ کا یہی مطلب ہے۔ ایسا کرنے سے وہ تذبذب رفع اور خواب سے تعلق قطع ہو کر اللہ سے وابستہ ہو جائے گا۔ اور چونکہ شیطان کو اس کا اللہ کی طرف رجوع کرنا پسند نہیں آتا (اور وہ کوشش کرتا ہے کہ ایسا نہ کرے) لہذا اس سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم ہوا تاکہ اللہ کو اپنی سپر بنا کر شیطان سے بے تعلق اور اللہ سے باتعلق بن جائے۔ اور تھتکارنے کا حکم اُس حالت سے گھِنیانے کا اظہار ہے کہ اُس میں اللہ سے بے تعلقی ہو رہی تھی۔ اور بائیں جانب اس کے لئے بایں سبب معین کی گئی کہ شیطان کی آمد بائیں جانب سے ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر قسم کی خیر و خوبی کے لئے داہنی جہت تجویز فرمائی کہ محافظ و نویسندۂ اعمال فرشتہ جس کا نور قوی ہے۔ داہنی جانب ہے، اور دوسرا محافظ و نویسندہ جس کا نور ضعیف ہے وہ بائیں جانب ہے جنّت بھی بجانب یمین ہے، اور جہنّم بجانب شمال۔ حضرت جبریل آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب آئے داہنی جانب سے آئے۔ اور شہداء کی ارواح کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا داہنی جانب دیکھا کہ غزوات بدر و احد وغیرہ میں دُنیا سے رخصت ہونے والے صحابہ کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی پریشانی لاحق ہوئی تو آپ ان کو اپنی داہنی جانب دیکھتے کہ گھوڑوں پر سوار جنگ کفار میں مشغول ہیں۔ عرش بھی بجانب یمین ہے اور زمین بجہت شمال جس قطعۂ زمین پر مومنین بنی آدم آباد ہیں وہ بجانب راست ہے اور جس حصّہ زمین پر جنّات آباد ہیں وہ بجانب چپ ہے داہنی جانب جو رگیں ہیں وہ اللہ کی تسبیح زیادہ کرتی ہیں برخلاف اُن رگوں کے جو بائیں جانب ہیں کہ وہ گونگی اور خاموش ہیں۔ نورِ حق بھی جہت یمین سے آتا ہے، اور باطل جہت شمال سے۔ غرض خیر بتمامہ بجانب یمین ہے اور شر بتمامہ بجانب شمال۔ میں نے عرض کیا کہ داہنی جانب سے مراد کیا ہے؟ فرمایا جس کو حق تعالیٰ فتح نصیب فرماتا ہے وہ ہر قسم کی خیر اپنی داہنی جانب دیکھتا ہے؟ اور قسم قسم کا شر اپنی بائیں جانب۔ پھر جب وہ دوسری جانب رخ پھیرتا ہے تو صورتِ حال بھی پھر جاتی ہے۔ حتیٰ کہ فرض کرو اس کا مُنہ مشرق کی طرف ہو تو ہر قسم کی خیر مثلاً جنّت و

وعرش وارواح شہداء سب اس کو داہنی جانب یعنی جنوبی سمت نظر آئیں گی اور بائیں جانب یعنی سمت شمال جہنم وشیاطین وارواح اشقیاء وغیرہ ظلمانی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اور جب وہ اپنا رُخ پھیر کر مغرب کی جانب منہ کرلیگا تو اُس کی داہنی جانب بسمت شمال ہو جائے گی۔ اور بائیں جانب سمت جنوب۔ اور اب تمامی خیر مثلاً جنت وغیرہ سب ان کو شمالی سمت نظر آئیں گی، اور تمامی اقسام شر دوزخ وغیرہ جنوبی سمت میں۔ اسی طرح اگر شمال یا جنوب کی طرف منہ پھیرے گا تو چیزوں کا بھی رُخ بدل جائے گا (کہ ہر چہار جوانب میں جس رُخ بھی اُس کا داہنا پڑے گا اُدھر اُمور حسنہ نظر آئیں گے۔ اور جس رُخ اس کا بایاں پڑے گا اُدھر امور قبیحہ دکھائی دیں گے) اور اس میں راز یہ ہے کہ صاحب معرفت کو دیکھنے کے لئے حق تعالیٰ نے دو آئینہ عطا فرمائے ہیں کہ ایک سے صرف نورانی چیزیں دیکھتا ہے اور دوسرے سے صرف ظلمانی چیزیں۔ اور چونکہ اس کے داہنی جانب نورانیت ہے یعنی اس کا نور ایمان، اور بائیں جانب ظلمانیت ہے۔ یعنی نفس خبیث کی شہوات۔ کہ اس کا خبث بلحاظ نور ایمان ہے (ورنہ عارف کے نفس میں شہوات کا غلبہ تو رہتا ہی نہیں) لہٰذا جب بجانب راست دیکھے گا تو یہ دیکھنا نور ایمان سے ہوگا اس لئے ایمان کی تمام ہمشکل چیزیں کہ جن میں حقانیت اور نور ہے اس کو نظر آئیں گی۔ اور جب بجانب چپ دیکھے گا تو یہ دیکھنا ظلمت شہوات نفس سے ہوگا۔ اس لئے اس کی تمام ہمشکل یعنی باطل اور مظلم چیزیں اس کو نظر آئیں گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا یہ دیکھنا طبیعت ذات کی نگاہ سے ہوتا ہے (نہ کہ آنکھوں کی بصارت سے)۔ کیونکہ دو چیزیں ہیں۔ ایک روح اور ایک ذات۔ اور چونکہ ذات میں اس کی روح کا قرار برضا محبت ہے بمعیت ایمان، لہٰذا دونوں کے ساتھ نور قائم ہے۔ یعنی اس کا نور ایمان۔ اور وہ ذات میں مل جل کر ایک ہوگیا ہے اور دیکھنے والی چیز ہے عقل۔ لہٰذا جس وقت نور روح کے آئینہ میں دیکھتا ہے تو پاکیزہ چیزیں نظر آتی ہیں، اور جب نور ذات کے آئینہ میں دیکھتا ہے تو مظلم وتاریک چیزیں نظر آتی ہیں۔ اور اسی پر وہ حدیث محمول ہے جس میں آتا ہے کہ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا کہ ایک جماعت ان کی داہنی جانب بیٹھی ہوئی ہے اور دوسری جماعت ان کی بائیں جانب) حضرت آدمؑ جب داہنی طرف نظر فرماتے تو ہنس دیتے تھے۔ اور جب بائیں جانب

نگاہ ڈالتے تو روپڑتے تھے" کیونکہ داہنی جانب والی جماعت ارواح صلحاء کی تھی اور بائیں جانب والی جماعت ارواح اشقیاء کی۔ (ف اس کی حقیقت تو وہی سمجھے جسے حق تعالیٰ معرفت نصیب فرمائے۔ مگر توضیح کے لئے اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ تم نے دیکھا ہوگا شیشوں کی خاصیتیں جُدا جُدا ہوتی ہیں۔ فرض کرو عینک میں داہنا شیشہ ایسا لگایا جائے جس سے صرف سفید چیز نظر آئے اور دوسرے رنگ کی کوئی چیز نظر نہ آوے۔ اور بایاں شیشہ اس خاصیت کا لگایا جائے کہ اس سے صرف سیاہ رنگ کی چیز نظر آئے اور دوسرے رنگ کی کوئی چیز نظر نہ آوے۔ تو جس وقت ایک بینا شخص اس عینک کو لگائے گا تو داہنی طرف اس کو صرف سفید اور چمکتی چیزیں نظر آئیں گی۔ خواہ قلعی ہو یا کپڑا یا سنگ مرمر یا سفید بادل۔ اور بائیں طرف سیاہ اور تاریک چیزیں نظر آئیں گی خواہ توا ہو یا کاجل یا دھواں یا سیاہ کپڑا وغیرہ۔ مگر یہ دیکھنا بواسطہ چشم ہے جو محدود ہے۔ اور اس کے لئے سمت معین ہے کہ نظر اُن اشیاء کی تابع ہے مگر عقل کی بصارت نہ کسی سمت کی تابع ہے نہ گوشت و پوست میں محدود ہے۔ بلکہ اشیاء اس کی تابع ہیں کہ شرقی ہوں یا غربی اور شمالی ہوں یا جنوبی اور بعید ہوں یا قریب اور گرم ہوں یا سرد اور اجسام ہوں یا اعراض اور ماضی ہوں یا مستقبل سب کی سب حال بن کر اس کے سامنے کے رُخ بیک وقت آجاتی ہیں۔ اور جب اُس پر دو خاصیتوں والے دو شیشوں کی عینک چڑھ جائے گی تو اُس کے داہنے شیشے سے بلا پابندی جہت و بلا قید قرب و بعد ہر نورانی چیز خواہ جنت ہو یا نورِ ایمان اور ارواح صلحاء ہوں یا حور و غلماں سب داہنی جانب نظر آئیں گی کہ اُس کی خاصیت ہی صرف نورانی چیزوں کا نظر آنا ہے۔ اور بائیں شیشہ سے بلا قید جہت و سمت ہر تاریک و مظلم شے خواہ جہنم ہو یا ظلمت و کفر و طغیان اور ارواح کفار و شیاطین ہو یا تاریکی عذاب و عصیان سب بائیں جانب نظر آئیں گی۔ کہ اس شیشہ کی خاصیت ہی صرف ظلمانی چیزوں کا دکھلانا ہے۔ لہٰذا اس کی رویت میں بدن کے رُخ بدلنے کو دخل نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

اور تھتکارنا تین مرتبہ بائیں وجہ ہے کہ پہلا ذات کی طرف سے ہے۔ اور دوسرا روح کی طرف سے۔ (کہ دونوں جُدا جُدا اس حالت سے گھنیاہٹ کا اظہار کرتی ہیں) اور تیسرا بندہ کی حق تعالیٰ سے اعانت چاہنے کی خاطر ہے۔ اور یہ جو حکم ہے کہ آنکھ کھلنے

پر کروٹ بدل لے۔ تو اس لئے ہے کہ پہلی نیند کا حکم بدل جائے اور ایسا ہو جائے گویا ابتدائً سویا اور حسبِ تقاضائے ایمان اللہ کے دھیان میں سویا) ہے ۔ اور نماز پڑھنے کا حکم ایکبار تو فرمانا (اور وہ بخاری کی روایت ہے) اور ایک مرتبہ نہ فرمانا (اور وہ مسلم کی روایت ہے) اس لئے کہ جس کا دل چاہے پڑھے اور جس کا دل نہ چاہے نہ پڑھے ۔ اور نماز کے حکم میں راز یہ ہے کہ پریشان خواب کی وجہ سے ذات میں جو ظلمت آگئی ہے وہ نماز سے دور ہو جائے گی اور ذاتِ مومن پاک صاف بن جائے گی ۔ یہ ہیں پریشان کن خواب کے آداب جن میں چار تو ضروری ہیں ۔ یعنی اعوذ پڑھنا ۔ خواب کے شر سے اللہ کی پناہ چاہنا ۔ بائیں جانب تین مرتبہ تھتکارنا اور کروٹ بدل لینا ہے کہ یہ چاروں حکم عام روایتوں میں آئے ہیں ۔ اور ایک اختیاری ہے یعنی نماز پڑھنا کہ کرلے یا نہ کرلے کیونکہ اس کا حکم کسی روایت میں آیا ہے اور کسی میں نہیں ۔ (اور دو آداب علماء نے اور بھی بیان کئے ہیں) ایک یہ کہ آنکھ کھلنے پر آیۃ الکرسی پڑھے مگر یہ کسی حدیث میں نہیں آیا ۔ دوم یہ کہ کسی سے اس خواب کا تذکرہ نہ کرئے اور یہ بخاری میں مذکور ہے ۔ اور اعوذ کے متعلق حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں اَعُوْذُ بِمَا اَعَاذَتْ مَلٰئِکَۃُ اللّٰہِ وَرُسُلُہٗ مِنْ شَرِّ رُؤْیَا ھٰذِہٖ اَنْ یُّصِیْبَنِیْ مِنْہَا ۔ اور ڈراونی خوابیں نظر آویں تو سوتے وقت یہ پڑھے ۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَبِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَعَذَابِہٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝

(۵) میں نے حضرت ممدوح سے اس خواب کے متعلق سوال کیا جس کی تعبیر حضرت ابوبکر نے دی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ ٹھیک بتائی اور کچھ غلط ۔ چنانچہ بخاری میں مفصل قصہ مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ رات میں نے یہ خواب دیکھی ہے، ایک بادل ہے (سائبان کی طرح سروں پر چھایا ہوا) جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اور لوگ ہاتھ پھیلائے اس کو لے رہے ہیں ۔ کسی نے زیادہ لے لیا ہے اور کسی نے کم ۔ پھر دیکھتا ہوں کہ ایک رسی ہے جو زمین سے آسمان تک پہونچی ہوئی ہے چنانچہ آپ اس کو پکڑ کر اوپر پہونچ گئے ۔ پھر اس کو ایک اور شخص نے تھاما اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا ۔

خواب کی تعبیر

پھر تیسرے نے اس کو پکڑا اور وہ بھی چڑھ گیا۔ پھر چوتھے شخص نے اس کو پکڑا تو رسی ٹوٹ گئی اور پھر اُس کو جوڑا گیا۔" حضرت ابوبکر نے کہا کہ یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مجھے واللہ توقع ہے کہ آپ مجھ کو اس کی تعبیر بیان کرنے دیں گے۔ حضرت نے فرمایا بہتر ہے تعبیر دو۔ حضرت صدیق نے کہا وہ سائبان تو اسلام (کی صورت مثالیہ) ہے اور اس سے گھی اور شہد جو ٹپک رہا ہے وہ قرآن ہے کہ اُس کی حلاوت (مخلوق پر) ٹپک رہی ہے اور کوئی زیادہ لے رہا ہے کوئی کم۔ اور وہ رسّی ہے کہ زمین سے آسمان تک پہونچی ہوئی ہے وہ طریق حق ہے جس پر آپ قائم ہیں کہ آپ اس کو (حاکمانہ ومبلغانہ درجہ میں) تھامے ہوئے ہیں اور حق تعالیٰ آپ کو اوپر چڑھا رہا (اور غالب وکامیاب بنا رہا) ہے۔ پھر آپ (کی وفات) کے بعد اس کو دوسرا شخص تھامے گا اور اوپر چڑھے گا اور پھر تیسرا اُس کو تھامے گا اور اوپر چڑھے گا اور پھر چوتھا شخص اس کو تھامے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی (کہ چلتے کام میں رُکاوٹ لاحق ہو گی)۔ اور پھر وہ اس کے لئے جوڑ دی جائے گی (کہ عارض رفع ہو کر سیاست دوبارہ قائم ہو گی) اوپر چڑھ جائے گا (کہ اعلاء کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر دُنیا سے اُٹھے گا)۔ یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے اطلاع بخشئیں کہ میں نے ٹھیک تعبیر دی یا غلط؟ حضرت نے فرمایا کچھ ٹھیک دی ہے اور کچھ غلط۔ عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ کو قسم ہے اللہ کی مجھے ضرور بتائیے کہ میں نے کیا غلطی کی۔ حضرت نے فرمایا قسم نہ دو۔" علماء کے اقوال اس بارہ میں کہ حضرت صدیق کی تعبیر میں کیا غلطی تھی بہت مختلف ہیں۔ ابوالمہلب اور اُن کے تابعین تو کہتے ہیں غلطی اُس رسّی کے جوڑے جانے میں ہوئی کہ تعبیر حضرت صدیق نے یہ دی کہ اس چڑھنے والے کے لئے اس کو جوڑا جائے گا (جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہی شخص رکاوٹ کے بعد پھر کامیاب ہو گا)۔ حالانکہ خواب میں رسّی کے صرف جوڑے جانے کا تذکرہ ہے لہذا حضرت صدیق کو چاہیئے تھا کہ خواب میں جتنا لفظ ہے اُسی کی تعبیر پر اکتفا فرماتے اور اس کا اضافہ نہ کرتے کہ وہ رسّی کس کے لئے جوڑی جاتے۔ کیونکہ تعبیر کی صورت وقوع میں آئی کہ حضرت عثمان کے لئے رسی ٹوٹی (کہ شہید کئے گئے) اور دوسرے کے لئے جوڑی گئی (یعنی سیاست حقہ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی)۔ مگر امام عیاض نے اس کا جواب دیا ہے کہ لہ کا لفظ (جس سے رسی کا اسی کے لئے جوڑا جانا ثابت

ہوا جس کے لئے وہ ٹوٹی تھی) اگرچہ اس حدیث میں نہیں آیا مگر مسلم، ترمذی نسائی، ابو ابن ماجہ، مسند احمد اور دارمی کی متعدد روایتوں میں یہ لفظ آیا ہے۔ لہذا تعبیر صدیقی کا محل خطا اس کو قرار دینا اپنی خطا ہے۔ اور اب مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عثمان پر ایسے ایسے اعتراض اور بلوے ہوئے کہ قریب تھا ان کی رسی ٹوٹ جائے۔ مگر (حق تعالیٰ نے فضل فرمایا اور) ان کو شہادت نصیب ہوئی (کہ جس جنت عالیہ میں صاحبین پہونچے اُسی میں یہ بھی داخل ہوئے)۔ اور حضرت قتیبہ بن سعد ابو محمد ابی زید۔ ابو محمد اصیلی، ابو بکر اسماعیلی اور احمد بن نصر داودی وغیرہ علمار اس طرف گئے ہیں کہ حضرت صدیق کی غلطی (تعبیر میں نہ تھی بلکہ) اس عجلت میں تھی (کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعبیر بیان فرمانے کا انتظار نہ دیکھا اور خود بیان کرنے میں سبقت کی)۔ لہذا کچھ صحیح اور کچھ غلط ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ تعبیر تو صحیح بتائی مگر سبقت وعجلت میں غلطی کھائی"۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت صدیق نے تعبیر دینے کے متعلق اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی اور جب اجازت مل گئی تب تعبیر دی تھی، لہذا نہ سبقت وعجلت ہے، نہ خطا وغلطی۔ نیز حضرت کے ارشاد کچھ ٹھیک بتائے کچھ غلط، کا صاف مطلب یہی ہے کہ تعبیر تو ساری صحیح ہے مگر فعل سبقت وعجلت میں غلطی کھائی اور امام طحاوی وخطابی اور ابن العربی وابن الجوزی وغیرہ کی ایک جماعت علمار کا یہ قول ہے کہ گھی اور شہد کی تعبیر قرآن کے ساتھ دینے میں حضرت صدیق نے غلطی کھائی کہ دو چیزوں کی تعبیر ایک شے سے دے دی۔ حالانکہ چاہئے تھا کہ تعبیر بھی دو چیزوں سے دی جاتی۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے مروی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا میری ایک انگلی میں گھی لگا ہوا ہے اور دوسری انگلی میں شہد، اور میں دونوں کو چاٹ رہا ہوں۔ جب صبح ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم توریت اور قرآن دونوں پڑھو گے۔ چنانچہ یہ دونوں آسمانی کتابوں کے قاری ہوئے۔ پس جس طرح اس حدیث میں گھی اور شہد کی تعبیر دو چیزوں سے کی گئی اسی طرح اس حدیث میں بھی دونوں کی تعبیر دو چیزوں سے ہونا چاہئے تھی کہ قرآن اور سنت یا علم اور عمل یا حفظ کرنا اور سمجھنا وغیرہ۔ اور بعض علمار کہتے ہیں کہ خطا واقعی ہوئی یا دل کو اسلام کے ساتھ تعبیر دینے میں

کہ اس کی مناسب تعبیر ذات محمدی تھی (جس کا نور عالم پر سایہ افگن اور فیضان حسب استعداد مستفیضین قلیل او رکثیر برس رہا ہے) - اور گھی اور شہد کی تعبیر دیتے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے - اور بعض نے کہا ہے کہ خطا جس تعرک ہے اور اے ابو بکر خواب کے کچھ حصہ کی تعبیر تم نے چھوڑ دی اور بیان نہ کی - یعنی وہ تین آدمی معین نہ کیے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حق کو تھامیں گے - اور اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق کے قسم دلانے کی پرواہ نہ کی اور اس کو پورا نہ فرمایا کہ دوسرے کی قسم دلانے کو پورا کرنا شرعاً صرف اُس وقت محبوب ہے جبکہ اس پر کوئی مفسدہ مرتب نہ ہو - اور جہاں کسی مفسدہ کا اندیشہ ہو وہاں دوسرے کا قسم دلانا کوئی چیز نہیں - اور یہاں مفسدہ عجب نہیں یہ ہو کہ حضرت عثمان کی رسّی کا کٹنا جو کہ ان کی شہادت اور اشتعال آتش جنگ اور طرح طرح کے فتنوں کی صورت میں ظاہر ہوا قبل از وقت بیان کرنا اور اس کا چرچا لوگوں میں پھیلانا خالی از مضرت نہ تھا - نیز اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق کی قسم کو سچا فرماتے تو ضروری تھا کہ خلفاء ثلثہ کی تعیین فرماتے - اور تعیین فرماتے تو خلافت بایں ترتیب منصوص ہو جاتی - حالانکہ مشیت الہیہ پہلے سے طے کر چکی تھی کہ خلافت بغیر تنصیص کے اسی ترتیب سے ہو گی (چنانچہ تینوں حضرات کی عمریں اس کا ثبوت دے رہی ہیں کہ حضرت صدیق کی جگہ اگر خلیفہ اول حضرت فاروق بنا ئے جاتے تو حضرت صدیق رض ان کی زندگی میں انتقال فرما جاتے اور خلافت کا وقت ہی نہ پاتے - علی ہذا حضرت عثمان رض خلیفہ اول بنا دیے جاتے تو خلفاء ثلاثہ میں کسی کو بھی خلافت کا موقع نہ ملتا کہ چاروں کو خلافت کا موقع ملنا اسی ترتیب پر موقوف تھا) لہذا اس مفسدہ کے اندیشہ سے آنحضرت نے تعیین کو چھوڑ دیا (اور اسی بنا پر حضرت صدیق کا تعبیر خواب میں تینوں کے نام وغیرہ کی تعیین کو چھوڑنا غلطی نہیں ہے - اگرچہ ایک قسم کی کمی ضرور ہے اور اسی لئے لفظ خطا سے اس کو تعبیر کر دیا گیا مگر صورت خطا اور شے ہے اور حقیقت خطا دوسری چیز) - اور ایک گروہ علماء حضرت صدیق رض کے ادب و احترام کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں غور و فکر سے باز رہنے کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہے حتیٰ کہ ابو بکر ابن العربی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عارف سے جو فن تعبیر کی خاص مہارت بھی رکھتے تھے دریافت کیا کہ حضرت صدیق کی تعبیر میں غلطی

کیا تھی ؟ تو فرمانے لگے بھلا یہ کون بتا سکتا ہے۔ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے تعبیر بیان کرنے میں حضرت صدیق کی سبقت و پیش قدمی خطا و غلطی تھی، تو حضرت صدیق کی غلطی پکڑنے میں کسی شخص کی دلیری و سبقت اس سے بدرجہا بڑی غلطی و خطا ہے۔ لہٰذا احتیاط اور تدین کا مقتضا اس مبحث میں سکوت ہی کرنا ہے۔ الحاصل حضرت شیخ نے میرے سوال کا اس طرح جواب دیا کہ سایہ دار بادل کی تعبیر مذہب اسلام ہے۔ اور شہد و گھی جو اس سے ٹپک رہا ہے وہ صرف تلاوت قرآن نہیں بلکہ مطلقاً بندوں کے اعمال مقبولہ ہیں خواہ نماز روزہ ہو یا حج و زکوٰۃ اور صدقات و مومن کی حاجب براری ہو یا شرکت جنازہ و رہائی قیدیان وغیرہ کہ یہ ظاہری اعمال برزخ کی طرف چڑھتے ہیں اور وہاں تمامی ارواح ان کا مشاہدہ کرتی اور کہتی ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں کا عمل صالح ہے جو کہ فلاں دن ہمارے پاس آئے گا۔ غرض ہر شخص کے عمل صالح کو اس کا باپ دادا پردادا اور اس کے سارے جان پہچان والے اعزہ و احباب دیکھتے ہیں۔ اور اس مشاہدہ میں جو روحیں اب تک زمین پر نہیں آئیں وہ اور جو اجسام میں آکر (بعد الموت) برزخ کی طرف واپس گئیں وہ سب مساوی ہیں۔ حتیٰ کہ طفل شیر خوار بھی اگر حق تعالیٰ اس کو فتح نصیب فرمائے (اور ظلمت ذات نے جو پردہ روحانی معلومات پر ڈال دیا ہے وہ اٹھ جائے) تو لوگوں کو اُن کے اعمالِ صالحہ مقبولہ سے آگاہ کردے کہ اے فلاں ترا فلاں صالح عمل فلاں دن ہمارے پاس پہونچا تھا جبکہ ہم برزخ میں تھے، اور اے فلاں تیرا فلاں عمل مقبول و صالح ہمارے برزخ میں رہنے کے وقت فلاں دن ہمارے پاس پہونچا تھا۔ مگر حق تعالیٰ کی مشیت نے چونکہ اس کو پوشیدہ رکھنا طے فرمایا ہے اس لئے ارواح کو جب اجسام میں داخل کیا تو تمامی برزخی مشاہدات ان کو بھلا دئے۔

پھر ان اعمال ظاہرہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق محض اللہ کے ساتھ ہے اور مخلوق کو اُن سے کوئی ظاہری نفع نہیں پہونچتا۔ مثلاً رکوع، سجدہ، نماز روزہ، اللہ کا خوف اور اسی کی طرف رغبت و توجہ۔ یعنی وہ عبادتیں جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں۔ دوم وہ اعمال جن سے مخلوق کا ظاہری نفع پہونچتا ہے۔ مثلاً بردہ آزاد کرنا، صدقہ و خیرات، تعزیت، مسکین کی حاجت روائی اور قیدیوں کا چھڑانا یعنی وہ قربات جن سے مخلوق منتفع ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے اعمال کا صلہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے

یہ ہے کہ اپنے ہاں سے ایک نور اس کو عطا فرماتا ہے جس کی وجہ سے اُس کے ایمان میں ترقی ہوتی اور اُس کی معرفت کو وہ قوت پہونچتی ہے جو اُس کے قلبی خطرات کو محو اور شکوک وشبہات کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اور دوسری قسم کے اعمال کا بدلہ ہے ذات کی اصلاح کہ رزق اس کا کثیر ہو جاتا اور مصائب نازلہ اُس پر سے دفع کر دیئے جاتے ہیں جس سے اُس کی ذات کو نفع پہونچتا ہے کیونکہ جب مصیبتوں کو اُس سے دور کر دیا گیا اور رزق وافر اس کو عطا کیا گیا تو ذات اس سے متمتع ہو کر دنیا میں خوب نشوونمو پائے گی۔ اور آخرت میں یہی اس کے صدقات جن سے مخلوق نے نفع اٹھایا تھا اس کی رغبت وخواہش والی نعمتیں بن جائیں گے مثلاً بریانی، متنجن، پھل، پھول، لذیذ گوشت والے پرند۔ اور مجامعت کے لئے صاحبِ جمال حوریں وغیرہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قسم اول کا صلہ مفید ہے ایمان کے لئے۔ اور قسم دوم کا صلہ نافع ہے اصلاحِ اجسام کے لئے۔ قسم اول کی طرف خواب میں اشارہ کیا گیا ہے شہد سے، اور قسم دوم کی طرف اشارہ ہوا ہے گھی سے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شہد مقوی بدن ہے اور قوت جسمانی کے لئے جو چیزیں مانع ہیں ان کو دور کرتا ہے، مگر نہ گوشت پیدا کرتا ہے نہ فربہ بناتا ہے۔ لہذا قسم اول کے مشابہ ہوا کہ عبادتوں سے نور ایمانی بڑھتا ہے۔ رزق میں وسعت اور جسمانی راحت میں ترقی نہیں ہوتی۔ اور گھی کا نفع خاص جسم کے لئے ہے کہ پروان چڑھاتا اور بدن کو موٹا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ طاقت نہیں لاتا جو شہد سے حاصل ہوتی ہے۔ لہذا قسم دوم کے مشابہ ہے کہ صد سے فراخی معاش نصیب ہوتی اور مصائب وحوادث دور ہوتے ہیں۔ نور ایمانی میں نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ شہد سے اندرونی قوت آتی ہے اور گھی سے بیرونی فربہی اور جسمانی نشوونمو۔ اسی طرح قسم اول سے نور ایمان وعرفان میں قوت آتی ہے اور قسم ثانی سے بدنی عیش ولذت اور جسمانی تازگی وفرحت حاصل ہوتی ہے۔ لہذا شہد کی تعبیر ہوئی عبادات خالصہ اور گھی کی تعبیر ہوئی صدقات وتبرعات۔ میں نے عرض کیا کہ ان دونوں میں افضل وبہتر کون چیز ہے؟ فرمایا تم کس صورت کو اپنے لئے پسند کرتے ہو آیا یہ کہ گھاس کی طرح دُبلے پتلے ہو مگر طاقت ہو چالیس آدمیوں کی برابر یا یہ کہ موٹے ہو ہاتھی کی طرح مگر طاقت نہ ہو چلنے اور اٹھنے کی بھی۔ میں نے کہا کہ پہلی صورت بدرجہا بہتر ہے کہ گو تنکے کی طرح دُبلا پتلا ہوں مگر طاقت ہو چالیس مردوں کی برابر۔ فرمایا اسی پر قیاس کر لو اعمال ظاہری کو کہ ایک

قسم مفہومی ایمان ہے اور دوسری قسم مضمن ایدان ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اعمال کی دونوں قسمیں تو زمین سے آسمان کی طرف چڑھتی ہیں اور خواب میں شہد اور گھی ٹپک رہا تھا آسمان سے زمین کی طرف، پھر ضدیت کا اختلاف ہوتے ہوئے تعبیر میں مماثلت کیسے صحیح ہوئی فرمایا کہ چڑھنا اور اُترنا لوامر اضافی ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے (جب کہ ہم نیچے ہوں اوپر چڑھ رہی ہے، اور وہی چیز دوسرے کے لئے (جبکہ وہ اوپر ہو) نیچے اتر رہی ہے۔ پس ممکن ہے کہ خواب دیکھنے والے کی روح خواب دیکھتے وقت آسمان میں ہو ہمارے مقابل جہت میں (کہ اس کا سر ہمارے سروں کی طرف ہو اور پاؤں آسمان دوم کی جانب)۔ لہٰذا لہذا ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اعمال چڑھ رہے اور جا رہے ہیں زمین سے اوپر آسمان کی طرف، اور اس کے نزدیک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اعمال اتر اور ٹپک رہے ہیں زمین سے میرے سر پہ آسمان کی طرف سے۔ اور چونکہ خواب کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ خواب دیکھنے والا اس کو سمجھ لے اور خوب آنکھ سے دیکھ لے پس اگر اسلام کا سائبان زمین پہ ہمارے سروں سے اونچا رکھا جاتا تو وہ اعمال جو اُس سے نکل کر اوپر چڑھ رہے تھے اس کو نظر نہ آتے (کہ سائبان نے آڑ بن کر خواب دیکھنے والے کی نظر سے اوجھل کر دیا) اس ضرورت سے چڑھنے کو اُترنے کی صورت دے دی گئی کہ صعود اور نزول میں بھی تعبیر کی ضرورت ہوئی۔ نہ یہ کہ نزول وصعود حقیقی اور اپنی حالت پر ہے۔ اور وہ رسی جو آسمان سے زمین تک کھنچی ہوئی ہے ایمان کامل ہے۔ مگر ہر ایمان کامل مراد نہیں۔ بلکہ خاص ایمان جو سلاطین و امراء میں ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے متعلق بھی وہ سب رد رعایت پوری پوری حدود شرعیہ قائم کرتے ہیں اور عام رعایا کے متعلق بھی۔ اور اس شرط کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ وہ رسی ملی ہوئی ہے بادل سے، اور سبب و وسیلہ بنی ہوئی ہے اس میں سے شہد اور گھی ٹپکو لانے کا وہ لوگوں پہ برستا ہے، اور کوئی کم مقدار میں لے رہا ہے اور کوئی زیادہ مقدار میں۔ اسی طرح وہ ایمان کامل جو لوگوں کے ہر دو قسم اعمال ظاہر یہ کی مقبولیت عند اللہ کا سبب بنتا ہے وہی ہے جس کے ساتھ حکومت بھی ہو کہ مومن سلطان ہی امن عامہ قائم رکھے گا۔ اور حدود شرعیہ جاری کرے گا اور ضعفاء کا مددگار بنے گا۔ ظلمہ کی دست درازی کا سدباب کرے گا اور اللہ و رسول کے فیصلہ کو نافذ کرے گا کہ اس کے ایمان کامل کا مقتضیٰ ہی یہ ہے۔ اور جب ایسا ہوگا تو ملک میں حسنات زیادہ ہوں گے اور معاصی کا صدور

بہت کم۔ کہ نہ لوگ زنا کر سکیں گے نہ چوری نہ ڈکیتیاں ہوں گی نہ باطل خون ریزی۔ بلکہ مساجد آباد ہوں گی۔ نمازیوں سے بازار بریز ہوں گے صلحار اور متبعین شریعت سوداگروں سے کوچہ کوچہ چرچا ہوگا علم اور عمل کا اور گوشہ گوشہ سے صدا بلند ہوگی عبادت خدا و اطاعت رسول کی۔ غرض تمامی رعایا اخیار و ابرار ہوگی اور سلطان بمنزلہ اس کے ہوگا جو لوگوں کے لئے اسلام کا ستون مضبوط کر رہا اور ان پر حسنات و خیرات کا مینہ برسا رہا ہے۔ یہ حالت پورے کمال کے درجہ پر صرف زمانۂ سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی (جب کہ خواب دیکھنے والے نے خواب دیکھا تھا)۔

رہی یہ بات کہ وہ امراء ثلثہ کون حضرات ہیں جن کا اس خواب میں تذکرہ ہے (اور ان کا شاہانہ نور ایمان بھی عہد نبوی کا نمونہ ہے) اولیاء عارفین کا اس میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ جن کا لقب طائفہ صدیقیہ ہے اور وہ متبعین ہیں حضرت ابوبکر صدیق کے اور میرے شیوخ بھی اسی طائفہ میں سے ہیں اس کی رائے تو یہ ہے کہ خلفاء ثلثہ یعنی ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ اور (تیسرے کی رسی کٹنے یعنی) حضرت عثمان کے متعلق قطع رسن سے مراد وہ بلوہ اور اعتراضات ہیں جو آپ پر کئے گئے۔ اور اس کے جڑ جانے سے مراد آپ کی شہادت ہے (کہ خلافت حقہ ہی پر وفات پائی۔ دست بردار یا معزول نہیں ہوئے) اور ایک گروہ کی جن کا لقب طائفہ حسنیہ ہے کہ وہ متبعین ہیں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ان کی رائے یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت اور اہل بیت رسالت کے وہ اشراف مراد ہیں جن میں دو کی خلافت پر امت اسلامیہ کا اتفاق ہوگا اور تیسرے پر پہلے تو سب متفق ہوں گے مگر پھر اختلاف و افتراق ہوگا اور اس کے بعد پھر سب متفق ہو جائیں گے رسی کٹنے اور پھر اس کے جڑ سے جانے سے یہی مراد ہے۔ اور در حقیقت یہی رائے صحیح ہے اور خواب سے مقصود آل رسول ہی کے تین حضرات ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بہت بڑا ہے اور آپ کی جگہ پر بیٹھنا اور آپ کی سیڑھی پر چڑھنا صرف نبی کا کام ہے، یا اولاد نبی کا۔ اور جب (خواب میں نظر آنے والی) رسی ایک ہی تھی اور اس پر تین امراء اسی طرح چڑھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چڑھے تھے تو اس میں گویا اطلاع ہے کہ امراء ثلاثہ ہم جنس ہوں گے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور یہ معلوم ہی ہو چکا کہ

آپ کے ایمان کامل ہیں آپ کا ہم جلس کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا نسبی ہم جلس باقی رہ گئی اور وہ آل رسول اشراف ہی کے لئے ثابت ہے۔ ممکن ہے کوئی شبہ کرے کہ یہ دلیل چاہتی ہے حضرت علی کی خلافت بلا فصل کو کہ حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق چونکہ آل رسول نہ تھے لہذا خلیفہ نہیں بن سکتے۔ سو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس قاعدہ پر تو حضرت علی بھی خلیفہ نہیں بن سکتے کہ وہ بھی ذریت رسول اور اولاد محمدی میں نہیں تھے۔ دوم یہاں بحث خواب کی رسی کی تعبیر میں ہے جس کا مقتضیٰ عروج میں مجانست نسبیہ ہونا ہے۔ جیسے مثلاً گھر میں بے تکلف آنا جانا صرف اولاد کا منصب ہے۔ اگرچہ ناسمجھ اور معذور ہو اور غیر کتنا ہی زیادہ محبوب و مقرب اور امور خانہ داری سنبھالنے کا سلیقہ و قابلیت کیوں نہ رکھتا ہو مگر بلا اجازت گھر میں نہیں آسکتا۔ اس لئے اصلاح امت و سیاست دینیہ کے سنبھالنے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ اس کا مدار مجانست نسبی پر نہیں بلکہ استعداد ملک گیری و قابلیت نیابت ہے۔ جیسے نماز کی امامت میں آں حضرت کو کسی صحابی کا اپنی جگہ کھڑا کرنا کہ اس نسبی مجانست سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ سوم فضل و شرف کے اسباب و وجوہ مختلف اور جدا جدا شان رکھتے ہیں کہ مثلاً نسبی مجانست جو تمامی ذریت محمدیہ اور اشراف و سادات کو حاصل ہے خواہ کسی زمانہ میں بھی وہ پیدا ہوں اور بلحاظ تقویٰ و طہارت کسی حال میں بھی ہوں، ایک جدا اور مستقل شرف و فضل ہے۔ اور مثلاً رویت جمال محمدی و صحبت نبو یہ ایک جدا و مستقل شرف و فضل ہے۔ پس صحابی کو اگرچہ وہ روم یا حبش کے باشندہ ہوں جدا نوعیت کا شرف ہے، اور شریف النسب سید کو اگرچہ وہ چودھویں صدی میں پیدا ہو جدا نوعیت کا فضل حاصل ہے۔ دونوں کا ہم مقابلہ عقل کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ پس حضرت صدیق کی قائم مقامی کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ حضرت علی و عباس و حسنین رضی اللہ عنہم کے موجود ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وصال میں ان کو نماز پڑھانے کے لئے اپنی جگہ محراب میں کھڑا کر دیا۔ اور حضرت فاروق کی قائم مقامی کے لئے اتنا کافی ہے کہ رسول کے قائم مقام شخص نے ان کو اپنا قائم مقام بنا دیا۔ حضرت شیخ کی تقریر کا رخ صرف خواب کی تعبیر میں رسی کے متعلق ہے کہ خلفاء ثلثہ مراد ہیں یا امراء آل رسول۔ نہ کہ مطلق قائم مقامی کے استحقاق و عدم

استحقاق کے متعلق) نیز اگر خلفاء ثلثہ مراد ہوتے تو خواب دیکھنے والا چونکہ اُن سے واقف تھا لہٰذا صاف ان کا نام لے کر ذکر کرتا کہ آپ کے بعد ابو بکر نے اس رسّی کو پکڑا اور اوپر چڑھ گئے۔ اور پھر حضرت عمر نے رسی کو پکڑا اور وہ چڑھ گئے۔ اور پھر حضرت عثمان نے رسّی کو پکڑا اور وہ ٹوٹ گئی اور پھر جوڑ دی گئی۔ حالانکہ بیان کیا ان لفظوں میں کہ آپ کے بعد ایک شخص نے رسی کو پکڑا اور پھر دوسرے نے اور پھر تیسرے نے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان تینوں چڑھنے والوں سے خواب دیکھنے والے صحابی واقف نہ تھے۔ لہٰذا خلفاء ثلثہ مراد نہیں۔ غرض میں نے اس کے متعلق حضرت ممدوح سے بہت ہی بحث کی اور بار بار طرح طرح سے مناظرہ کیا مگر آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا کہ خلفاء ثلثہ مُراد نہیں بلکہ اُمراء اشراف مُراد ہیں (جو غالباً زمانہ خلافت فاطمیین میں ہوئے)۔ اس کے بعد یہی دو دلیلیں بیان فرمائیں اور کہا کہ میں حالانکہ صدیقیہ گروہ میں سے ہوں مگر بات وہی کہنی چاہیے جو حق اور واقعی ہو۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تعبیر میں غلطی کیوں ہوئی؟ مانا کہ اصابت تعبیر بھی اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمادے مگر حضرت ابو بکر تو امام الاولیاء ہیں اور صحابہ میں بھی سب سے افضل و برتر۔ اور آپ نے بھی بارہا فرمایا ہے کہ عرفان الٰہی اور معرفت باطن محمدی میں جو درجہ سیدنا ابوبکر کا ہے وہ امت محمدیہ میں کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ پھر ایسے سید العارفین اور امام المحبین کا صحیح تعبیر سے ناواقف رہنا بڑے تعجب کی بات ہے۔ فرمایا کہ سیدنا ابو بکر کو تعبیر کا علم تو اس سے بھی ہزاراں ہزار درجہ بڑھا ہوا تھا۔ مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضری کے سبب وہ سب غائب ہو گیا تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی حالت میں تمامی حاضرین مجلس کے انوار علمیہ غائب ہو جایا کرتے تھے اور ان میں اشتعال باقی نہ رہتا تھا (جیسے سورج کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی غائب ہو جاتی ہے اور اس میں شعاع وچمک باقی نہیں رہتی) اور اس کا سبب یہ تھا کہ تمامی علوم کے انوار صرف محبت کے نور پر پڑنے لگتے تھے اور ان تمام شعاعوں کے ایک جگہ پڑنے سے آتش شوق بھڑک جاتی تھی۔ لہٰذا قوت فکر یہ اس میں مشغول ہو جاتی اور سارے باطن واندرون کو جمال وکمال محمدی میں محو کر دیا کرتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ محبت وشوق کے انوار جب مشتعل ہوتے ہیں اور انوار علم غائب ہو جاتے ہیں تو اس وقت

علمی مبحث میں گفتگو کرنے والے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے بھولا ہوا انسان (کہ علم تھا مگر غائب ہو گیا) - کیونکہ قلب کی توجہ ایک ہی شئی کی طرف ہو سکتی ہے جب ایک چیز کی طرف ہو سکتی ہے جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہو جائے گا تو دوسری تمام چیزوں سے قطعاً بے تعلق ہو جائے گا - اور عارفین کے لئے جن کے سردار سیدنا ابوبکر صدیق رض ہیں ذات محمدی سے بڑا کوئی مقصود نہیں - اس لئے جب وہ ذات مطہرہ نظروں کے سامنے ہوتی تھی تو نہ علم کی طرف التفات جاتا تھا نہ کسی دوسری طرف - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم خود ذاتِ محمدی کا نور ہے - لہذا جب ذات نظروں سے اوجھل ہوتی تو اُس کے انوار سے تعلق ہوتا تھا تاکہ وہ صاحب انوار کو ذات تک پہونچا دیں - مگر جب خود ذات سامنے موجود ہے تو وسائط و وسائل سب ساقط ہو گئے اور ساری توجہ ذات میں مستغرق ہو گئی میں نے عرض کیا کہ ذات کی طرف توجہ کس شئے سے نصیب ہوتی ہے ؟ فرمایا تین باتوں سے - محبت اور تعظیم اور حق تعالیٰ نے جو کمال آنحضرتؐ کو عطا فرمایا ہے تو اس پر تعجب - کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر جب عورتیں بے اختیار بول پڑیں " یہ انسان تو نہیں ہے، یہ تو بڑی خوبیوں والا فرشتہ ہے' تو کیا پوچھنا سیدالوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ کو دیکھ کر عارفین کیا کہیں گے - ہاں یہ تینوں امر کامل نہیں ہوتے جب تک کہ عارف کو ذاتِ محمدی کے متعلق سات باتیں حصر کے درجہ میں حاصل نہ ہو جاویں کہ ساتوں میں بجز ذاتِ محمدی کے کوئی دوسری چیز مقصود نہ ہو - اور وہ یہ ہیں - فکر[۱] نفس[۲] خیال[۳] یعنی نفس کی نظر - عقل[۴] - مثال[۵] یعنی عقل کی نظر - ذات[۶]، روح[۷] اور علم - کہ ان ساتوں چیزوں کا دھیان صرف ذات محمدی میں محصور رہو - اگر ان میں سے کسی ایک کے دھیان و تصور میں بھی کچھ کمی ہو گی تو توجہ ناقص کہلائے گی - اور جب ساتوں کے انوار محض ذات محمدی میں منحصر ہوں گے تو اب محبت و تعظیم اور تعجب کے ساتھ ذات محمدی کی طرف توجہ نصیب ہو گی اور (وہ لطف وحظ آئے گا) کہ اس کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ رہے گی - جب عارف اس حالت میں ہو (کہ اس کا فکر و خیال اور روح و علم وغیرہ سب ذاتِ محمدی کی طرف متوجہ و مستغرق ہو) تو اُس سے اگر اُس کے فرزند کا رنگ بھی دریافت کیا جائے کہ گورا ہے یا کالا تو وہ حیران ہو جائے گا اور کچھ نہ بتا سکے گا - اور اگر کچھ جواب بھی دے گا بھی تو سمجھ کر نہ دے گا (ایسا دے گا) جیسے مست و مدہوش کی زبان

سات باتیں

سے بات نکلتی ہے)۔ پس اگر جواب ٹھیک ہو گا تو محض عادت کی وجہ سے ہو گا۔ (جیسے بعض حافظ قرآن سونے کی حالت میں بھی سوتے میں کی سورتیں کی سورتیں پڑھ جاتے ہیں) پس یہ سبب تھا کہ حضرت ابوبکر سے تعبیر خواب میں غلطی واقع ہوئی ورنہ یہی سائل اگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانہ خلافت میں آتا (کہ ذات محمدی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی) اور اسی خواب کی تعبیر دریافت کرتا تو عجائب وغرائب باتیں سنتا اور میں نے اس خواب کے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ مجھے بواسطۂ سیدنا صدیق ہی تو معلوم ہوا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہمیں تو ایک بات معلوم ہو مگر ہمارے آقا وسردار کو معلوم نہ ہو۔ یہ تو امر محال ہے۔ ہاں بات وہی تھی کہ حضوری ذات محمدی نے علوم صدیقی کو گویا معدوم کر دیا تھا۔ (کہ تعبیر خواب جتنی صحیح بھی دی وہ بھی بنا بر عادت بے خبری کے ساتھ زبان سے نکل گئی ورنہ آتشِ محبت کے اشتعال نے کسی طرف توجہ والتفات کے قابل ہی نہ رکھا تھا)۔

خواب کی حقیقت

(۶) میں نے حضرت ممدوح سے خواب کے متعلق دریافت کیا کہ کیا چیز ہے۔ اور کیسے نظر آتی ہے؟ اور کس وجہ سے دکھائی دیتی ہے۔ کہ لوگوں کی رائے اس بارہ میں بہت مختلف ہے۔ اطبار کی رائے تو یہ ہے کہ وہ اخلاط اربعہ ہیں۔ جس کے مزاج میں بلغم کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے چونکہ بلغم کی طبیعت کو پانی سے مناسبت ہے اس لئے وہ سوتے میں دیکھتا ہے گویا پانی پر تیر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور جس میں صفرا کا غلبہ ہو گا اس کو آگ اور ہوا میں اڑنا یا فضا میں چڑھنا وغیرہ پریشان کن صورتیں نظر آئیں گی۔ اور جس میں خون کا غلبہ ہو گا اس کو شیریں چیزیں اور خوش کن باتیں نظر آئیں گی کہ خون میٹھا اور مفرح ہوتا ہے۔ اور جس پر سودا کا غلبہ ہو گا وہ سوداویت کی باتیں اور ترش چیزیں دیکھے گا۔ مگر علامہ مازری نے اس کی تردید کی ہے کہ گو عقل اس کو جائز رکھتی ہے کہ ایسا ہو مگر اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی۔ اور جہاں یقین کی ضرورت ہو وہاں ظن اور تجویز سے کام لینا صحیح نہیں ہے۔ اور اہل فلسفہ کا قول یہ ہے کہ جو واقعات سطح زمین پر ہو رہے ہیں وہ عالم علوی میں نقوش کی طرح منتقش ہیں۔ لہذا نفس کے سامنے ان میں سے جو شے بھی آجاتی ہے اس کا نقشہ نفس میں اتر آتا ہے، مگر علامہ مازری نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ یہ بھی دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور انتقاش صفت ہے اجسام کی

(کہ نقشہ جسم ہی کا کھچتا ہے۔ بڑائی، چھٹائی، قرب، بعد، صلاح وطلاح وغیرہ اعراض کا نہیں کا نہیں کھنچ سکتا)۔ حالانکہ عالم علوی میں اکثر چیزیں از قسم اعراض ہیں۔ اور معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ وہ محض خیالات ہیں جن کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ بنیاد۔ اس سے مقصود ان کا خواب کی حقیقت کا انکار کرنا ہے۔ جیسا کہ عذاب قبر کا انکار کر دیا ہے (کہ جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس کے منکر ہو جاتے ہیں)۔ چنانچہ ابن العربی نے لکھا ہے کہ خواب کے متعلق بھی معتزلہ اپنے اصول پر چلے کہ عوام پر ملمع کاری کر کے اصول شرع کا انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ نہ جنات کوئی چیز ہیں نہ ان کا باتیں کرنا کوئی چیز ہے حتیٰ کہ جبریل علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باتیں کرتے تو حاضرین مجلس بھی تو سنتے۔ (ان کے نزدیک رسول اور اس کے ارشاد کی کوئی وقعت ہی نہیں جو بات ان کی عقول قاصرہ سے بالا ہوئی اس کا انکار کر دیا)۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ قلب کو بھی حق تعالیٰ نے دو کان اور دو آنکھیں دی ہیں۔ ان کے ذریعہ جو بات سنائی یا دکھائی دیتی ہے وہ خواب کہلاتی ہے۔ غرض انشراح حاصل نہیں ہوتا کہ خواب کی حقیقت و سبب کیا ہے۔ فرمایا کہ جس طرح بیداری میں بشر کے لئے دو چیزیں ہیں ایک خواطر یعنی وہ خیالات جو دل پر گزرا کرتے ہیں دوم ادراکات یعنی وہ علوم جو عقل کے ذریعہ معلوم ہوتے یا وہ محسوسات جن کو حواس کے ذریعہ ادراک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سونے کی حالت میں خواب نظر آتی ہے کبھی خواطر کے ذریعہ جن کو حق تعالیٰ قلب میں ڈالتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کے ادراک اور مشاہدہ کے ذریعہ۔ لہٰذا خواب کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔ ادراک۔ اور خواطر۔ پھر ادراکات کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو منسوب ہیں روح کی طرف اور دوسری وہ جو منسوب ہیں ذات کی طرف اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والی شے درحقیقت روح ہے، اور اس کا دیکھنا بواسطہ بصیرت ہوتا ہے۔ اور بصیرت کی تحقیق سبعتہ احرف کی حدیث میں منجملہ اجزاء روح کے مفصل ہو چکی ہے۔ پس جو شے روح کو بصیرت کے ذریعہ نظر آتی ہے وہ منسوب ہے روح کی طرف۔ اور جو ذات انسانی اور اس کے قلب کی نگاہ سے روح کو نظر آتی ہے کہ بمقتضائے عادت خواب میں مکان یا مسجد یا باغ وغیرہ دیکھتا ہے، وہ منسوب ہے ذات کی طرف۔ وضاحت کے لئے یہ سمجھو کہ روح کو دو قسم کی سماعت نصیب ہے۔

ایک بدن میں محبوس ہونے سے قبل کی کہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ کی بات اس کو سنائی دیتی تھی۔ دوسری بدن میں مقید ہونے کے بعد کی کہ صرف کان کے ذریعہ سن سکتی ہے (اور وہ بھی ایک معین مسافت تک کی)۔ اسی طرح اس کو دو نگاہیں حاصل ہیں ایک حجاب ذات سے قبل کی جو کہ بصیرت سے ہوتی ہے اور روح کے ہر جزو سے ہوتی ہے۔ کہ ایک لمحہ میں تمامی معلومات اس کے سامنے آجاتے ہیں' اور نزدیک و دور کا کوئی فرق اس درجہ میں نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ خود اس کا بدن اور عرش اس کے نزدیک مساوی ہوتے ہیں۔ اور دوسری حجاب ذات سے بعد کی جو صرف قلب کے ذریعہ ہوتی ہے (کہ قلب جن معلومات کو غور و فکر کے ذریعہ اپنے اندر لاسکتا ہے وہی ادراک ہوتے ہیں) پس انسان جب سوجاتا اور کوئی شے دیکھتا ہے تو کبھی نظر روح سے اور کبھی نظر قلب سے۔ اور ان دونوں میں فرق صرف صفائی و ستھرائی کا ہوتا ہے کہ جو دیکھنا منسوب ہے روح کی طرف وہ پاک صاف ہوتا ہے۔ پس اس کو یا تو مطلق ہی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی اور یا ہوتی ہے تو بہت قریب تعبیر کی ہوتی ہے۔ اور جو منسوب ہے ذات کی طرف (کہ قلب اسی کا ایک مضغۂ گوشت ہے) اسمیں صفائی نہیں ہوتی۔ بلکہ اشارہ ہوتا ہے۔ اور وہ بھی دور کا اور خفی۔ کہ اس کی تعبیر دقیق اور مشکل پڑجاتی ہے۔ مثلاً فرض کرو زید نے عمر کو زخمی کردیا۔ اب یہی واقعہ قبل از وقوع عمر کو خواب میں نظر آیا۔ پس اگر بہ نگاہِ روح دیکھا تب تو بعینہٖ یہی صورت نظر آئے گی۔ اور اگر بہ نگاہِ قلب دیکھے گا تو اسی طرح دیکھے گا کہ مثلاً راستہ میں جارہا ہے اور کوئی لکڑی لگی جس سے زخم آگیا چوں کہ پہلی صورت میں صفائی و ستھرائی تھی کہ نور روح سے دیکھا اور نور ہر شے کا صحیح نقشہ اتارا کرتا ہے۔ لہذا واقعہ اپنی اصل حقیقت پر دکھائی دیا۔ اور دوسری صورت میں نورِ ذات سے دیکھا ہے اور ذات کے نور میں باطل شریک ہے اور باطل کسی شئے کا اصل نقشہ نہیں اتار سکتا بلکہ اس کو متغیر و متبدل کردیتا ہے۔ لہذا اونٹ خواب میں بصورت مینڈک اور پرندہ بصورت پتھر اور انسان بشکل لکڑی دکھائی دے گا۔ اور چونکہ بجز نبی کے کہ اس کی ذات معصوم ہے اور کوئی ذات خالی از ظلمت نہیں ہے اس لئے امتی کے ہر خواب میں کم و بیش تغیر ہوتا اور تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور ظلمت کے دس درجے ہیں۔ پہلا درجہ وہ ظلمت ہے جو فعل مکروہ کے سہواً مرتکب ہونے سے ذات پر آتی ہے۔ مثلاً

بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا بھول کر۔ کہ اس سے اس کی ذات میں ایک خفیف سی ظلمت ضرور آئے گی (کہ گناہ ہونا تو ارادہ پر موقوف ہے مگر خاصیت ہر چیز کی بہر حال اثر کرتی ہے۔ جیسے کسی نے بھولے سے تمباکو کھالیا تو معتوب بے شک نہ ہوگا مگر چکر اور قے آنے سے تو نہ بچے گا)۔ پس یہ شخص جب قلب میں اس ظلمت کو لیے ہوئے سوئے گا اور کوئی چیز دیکھے گا۔ تو ضرور اس میں خفیف سا تغیر آئے گا۔ مثلاً اس نے خواب میں جنّت کو دیکھا اور اس کے اندر جانے کا ارادہ نہیں کیا' تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ نفل کے درجہ میں کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کرے گا اور پھر اس سے رُک جائے گا۔ چونکہ کارِ نیک سبب ہے دخول جنّت کا لہٰذا خواب میں وہ بصورت جنّت نظر آیا۔ اور اس کے اندر جانے کا ارادہ نہ کرنا اشارہ ہے کارِ خیر سے باز آنے کی طرف۔ ورنہ واقعہ نظر آتا تو صاف نظر آتا کہ کارِ خیر کا ارادہ کیا اور عمل میں نہ لایا۔ مگر خواب میں خفیف تغیر آگیا۔ اور اس کا سبب وہی ظلمت خفیفہ ہے جو سہواً مکروہ سے قلب میں آئی تھی۔ دوسرا درجہ وہ ظلمت ہے جو سہواً حرام کے ارتکاب سے ذات میں آتی ہے' جیسے کسی نے بحالت صوم بھول کر کھا پی لیا کہ گو سہو کی وجہ سے گناہ نہ ہوگا مگر اس کی ظلمت پہلے درجہ سے زیادہ ہوگی اور اس کے خواب میں تغیر نسبتہً زیادہ ہوگا۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ جنّت ہے اور وہ اس میں جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ مگر کسی نے اندر جانے سے روک دیا ہے'۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ فرض کفایہ (مثلاً نماز جنازہ وغیرہ پڑھنے) کا ارادہ کرتا ہے مگر رُک جاتا ہے اور ادا نہیں کرتا۔ وجہ تعبیر وہی ہے (کہ فرض کفایہ سبب دخول جنّت ہے) اور اس میں ظلمت قوی ہے کہ جنّت میں داخلہ سے روکنے کی صورت نظر آئی جو گویا وہ ظلمت ہے جو فرض کفایہ سے روک رہی ہے۔ اور وہ پیدا ہوئی ہے سہواً حرام کے مرتکب ہونے سے۔ تیسرا درجہ وہ ظلمت ہے جو فعلِ مکروہ کے قصداً ارتکاب سے آتی ہے۔ مثلاً کوئی بائیں ہاتھ سے قصداً کھائے پیئے تو اس قصد کی وجہ سے ظلمت نسبتہً سہواً حرام سے بڑھ جائے گی۔ اور خواب میں تغیر زیادہ ہوگا۔ مثلاً دیکھے کہ شیاطین اس کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی عورت زانیہ ہے۔ کیونکہ شیاطین سے مراد ہے زانی' اور گھر سے اشارہ ہے عورت۔ اور اس میں گھسنا گویا زنا کرنا ہے۔ یہاں اگرچہ تعبیر میں زیادہ تغیر نہیں مگر خواب کے مقصود میں خبث و ظلمت زیادہ ہے کہ بے غیرتی و ہتک حرمت اور آبروریزی سب شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلمت کا اثر کبھی نفس

تعبیر پر پڑتا ہے (کہ تعبیر دقیق و خفی ہوتی ہے) اور کبھی خواب میں دیکھی ہوئی چیز پر پڑتا ہے (کہ تعبیر دقیق و خفی ہوتی ہے) اور کبھی خواب میں دیکھی ہوئی چیز پر پڑتا ہے (کہ وہ گندی اور فحش ہوتی ہے) چوتھا درجہ وہ ظلمت ہے جو بالقصد ارتکاب حرام سے آتی ہے۔ مثلاً کوئی قصداً زنا کرے یا روزۂ رمضان توڑے کہ یہ قصداً حرام پہلے درجوں سے زیادہ ظلمت لائے گا۔ مثلاً خواب دیکھا کہ ایک بوڑھے مسلمان کے آگے چل رہا ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے مگر معاصی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کیونکہ معمر مسلمان اس خواب دیکھنے والے کا ایمان ہے کہ کبر سنی و بڑھاپا دلالت کر رہے ہیں بصیرت و تجربہ پر۔ لہٰذا ایمان کی صحت کی معلوم ہوئی۔ مگر اس کے آگے چلنا دلالت کر رہا ہے۔ معاصی پر کہ یہ صاحبِ ایمان اپنے ایمان کا اتباع نہیں کرتا۔ اور بے پروائی برتتا ہے پس اس خواب کی تعبیر میں ظلمت قوی ہوئی۔ کہ نہ بوڑھے مسلمان کا اطلاق ایمانِ صحیح پر واضح ہے اور نہ آگے چلنے کا اطلاق ارتکاب معاصی پر کھلا ہوا ہے۔ دونوں میں خفا اور بُعد ہے۔ نیز نفس خواب میں بھی ظلمت قوی ہے۔ کہ معصیتوں کا معاملہ گندگی و خباثت میں کوئی معمولی چیز نہیں۔ پانچواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدۂ خفیفہ میں جہل بسیط کی وجہ سے پیدا ہوا۔ کہ عقیدہ دو طرح کا ہے۔ ایک ثقیلہ۔ دوم خفیفہ۔ خفیفہ وہ ہے جس کی سزا دائمی جہنم نہیں۔ مگر عذاب ہے۔ مثلاً عقیدہ ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ جزا و سزا اللہ پر واجب نہیں بلکہ ثواب اس کا فضل و کرم ہے اور عذاب اس کا عدل و انصاف نیز اللہ جل جلالہٗ اپنے افعال میں کسی سبب اور واسطہ کا محتاج نہیں۔ بلکہ وسائط خود منجملہ افعال الٰہیہ کے ہیں۔ پس آگ (کہ واسطہ ہے جلانے کا) اور جلانا اور طعام (کہ سبب ہے پیٹ بھرنے کا) اور پیٹ بھرنا اور تلوار (کہ آلہ ہے کاٹنے کا) اور کاٹنا سب اللہ ہی کا فعل ہے۔ نیز جنت و دوزخ اس وقت بھی موجود ہیں (یہ نہیں کہ بعد قیامت پیدا کی جائیں گی)۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نہ دُنیا میں نہ آخرت میں۔ یہ سب عقائد خفیفہ میں داخل ہیں کہ ان کا معتقد سچا مسلمان اور کامل الایمان ہے، اور جو اس سے جاہل ہو مثلاً اس کا عقیدہ ہو کہ دیدار خدا نہ ہوگا یا یہ کہ جزا اس پر واجب ہے۔ یا یہ کہ وہ اپنے افعال میں آلات و وسائط کا محتاج ہے۔ یا یہ کہ جنت و دوزخ اسوقت موجود نہیں، تو اس کو بروز قیامت عذاب دیا جائے گا اور وہ غیر اعتقادی اعمال معاصی

عقیدہ

سے زیادہ ہوگا۔ اور عقیدہ ثقیلہ وہ ہے جس کے خلاف کی سزا خلود جہنم ہے۔ مثلاً عقیدہ ہے کہ اللہ موجود ہے۔ اس کا وجود قدیم ہے نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ وہ فاعل مختار ہے کہ جو کچھ کرتا ہے ارادہ اختیار سے کرتا ہے۔ نہ اس کا فعل باقتضاء طبیعت ہے نہ کسی وجہ اور سبب کا ضرورت مند ہے (کہ ان دونوں صورتوں میں اختیار سلب ہوجاتا ہے) وہی ہمارے افعال کا خالق ہے۔ اور اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں (اگر دخل ہے تو صرف کسب اور ان کے انتساب میں ہے)۔ اس کے ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ اہل زمین کی بڑی سے بڑی ہستی جیسے ملوک و وزراء اور نہ آسمانی مخلوق کا کوئی فرد مثلاً چاند، سورج، ستارے اور فرشتے وغیرہ۔ وہ سب کی سنتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے۔ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ . . . . پس یہ عقائد ثقیلہ ہیں کہ ان کا معتقد کامل الایمان کہا جائے گا اور جو ان میں کسی ایک عقیدہ سے بھی جاہل رہا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا مستحق ہوا۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اصل بحث کو لو کہ عقیدہ خفیفہ میں جہل بسیط وہ ظلمت پیدا کرے گا جو درجات سابقہ سے مافوق ہوگی اور خواب میں تغیر بہت زیادہ ہوگا۔ مثلاً خواب میں کسی مردہ کو دیکھا اور جان بھی رہا ہے کہ یہ مر چکا ہے اور اس سے پوچھ رہا ہے کہ کہو کیا حال ہے اور کیسی گذری۔ اور مُردہ اس سے اپنی بدحالی و تکالیف کا اظہار کر رہا ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والا دیندار ہے اور آخرت اس کی احسن اور بہتر ہے۔ اور جن گناہوں میں مبتلا ہے عنقریب ان سے توبہ کرے گا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ خواب کی حالت کا وعظ بہت زیادہ موثر ہوا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو دھمکانے اور ڈانٹنے کے قائم مقام بنایا ہے۔ اور جو چیز اللہ کی طرف سے ہوا کرتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ اور مُردہ سے ملاقات کرنا اور اس کا حال پوچھنا آدمی کی طاقت سے باہر ہے۔ پس یہ جو کچھ بھی ہوا اللہ کی طرف سے ہوا کہ مُردہ سے ملا اور سنا جو کچھ بھی اس نے کہا۔ یہ علامت ہے کہ حق تعالیٰ کی اس پر رحمت ہے۔ ورنہ (اس طرح خواب میں اس کو تنبیہ نہ ہوتی اور) اپنی اندھی حالت میں ڈوبا رہتا۔ پس اس تعبیر میں ظلمت قوی ہوئی کہ اشارہ بہت خفی اور تعبیر بہت دقیق ہوگئی۔ چھٹا درجہ عقیدہ خفیفہ میں جہل مرکب ہے، کہ مثلاً عقیدہ ہو کہ دیدار خدا نہ ہوگا اور پھر اس پر اڑ بھی ہو کہ میرا یہ عقیدہ بالکل ٹھیک۔ پس وہ ظلمت جو ذات میں اس جہل مرکب سے آئے گی پہلی تمام ظلمتوں سے بڑھی ہوئی

ہوگی۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ دوزخ کا زقوم کھا رہا اور کھولتا پانی پی رہا ہے۔ تو اس کی تعبیر یہ ہے داخلاً وخارجاً ہر طرح حرام میں ڈوبے گا۔ حرام ذریعہ سے روپیہ کمائیگا اور پھر مستحق پر خرچ بھی نہ کرے گا۔ اور وجہ تعبیر یہ ہے کہ حرام فعل لے جانے والا ہے جہنم کی طرف اور سبب ہے اس کے سینڈٹ کھانے اور گرم پانی پینے کا۔ اور اس کی ظلمت بلحاظ تعبیر یہی ہے کہ زقوم اور کھولتا پانی دونوں چیزیں طبعاً مکروہ ہیں۔ اور مال وزر طبعاً محبوب چیز ہے۔ لہٰذا یہ تعبیر بالاضداد ہوئی۔ نیز مال تو دنیا کی چیز ہے اور زقوم وگرم پانی آخرت کی چیزیں اور دار دنیا سے دار آخرت بہت دور اور مبائن ہے۔ نیز جہنم اور اس کا زقوم وآب گرم مکروہ اور وحشتناک چیزیں ہیں (اس لئے یہاں تین وجہ سے ظلمت قوی ہوگئی کہ پہلی ظلمتوں میں ایک وجہ بھی اتنی قوی نہ تھی) ساتواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدۂ ثقیلہ میں جہل بسیط کی وجہ سے ذات پر داخل ہو۔ مثلاً وجود باری وغیرہ کے خلاف کسی کا عقیدہ ہو مگر ایسا کہ کوئی اس کو سمجھا دے تو مان لے اور اس کا یہ جہل بدل جائے علم سے (کہ بسیط ہونے سے یہی ناواقفیت محضہ مراد ہے جس پر اڑ نہیں ہوتی)۔ اس کی ظلمت درجات سابقہ سے زائد ہوگی۔ مثلاً خواب دیکھا کہ جہنم میں داخل ہوا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ نافرمانی والدین وغیرہ کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا ہے۔ اس کی ظلمت کا قوی ہونا بلحاظ تعبیر بھی ہے کہ گناہ کبیرہ دار دنیا میں ہے اور جہنم دار آخرت میں۔ اور دونوں میں تباین ہے۔ نیز بلحاظ خواب بھی ہے کہ عقوق والدین کا خبث کسب حرام کی گندگی سے بھی زیادہ ہے۔ اور بلحاظ جزا بھی ہے کہ جہنم بڑی تکلیف واندوہ کی جگہ ہے۔ لہٰذا اس میں ہر سہ جہت سے ظلمت آئی اور اس کی قوت درجات سابقہ سے بڑھ گئی۔ آٹھواں درجہ وہ ظلمت ہے جو عقیدۂ ثقیلہ میں جہل مرکب کی وجہ سے ذات پر آوے۔ مثلاً یہ عقیدہ ہو کہ بندہ اپنے افعال کو خود پیدا کرتا ہے اور پھر اس کا بھی معتقد ہو کہ یہی عقیدہ حق اور صواب ہے۔ اس کی ظلمت سب سے مافوق ہو کر خواب کو بہت زیادہ بدلے گی۔ مثلاً اپنے آپ کو دیکھا کہ فرشتہ نے پکڑ کر جہنم میں ڈال دیا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تقدیر اس کو معصیت کی طرف کھینچ کر لائے گی۔ اور وجہ تعبیر یہ ہے کہ فرشتہ اشارہ ہے تقدیر کی طرف اور جہنم اشارہ ہے معصیت کی طرف۔ اور اس میں ظلمت اس لحاظ سے ہے۔ کہ فرشتہ سے اشارہ تقدیر کی طرف نہایت خفی اور بے حد دقیق ہے۔ نیز بلحاظ خواب بھی ظلمت زیادہ ہے کہ فرشتہ کا

بندہ کو قہراً پکڑنا اور دوزخ میں جھونکنا از خود زقوم کھانے اور گرم پانی پینے سے زیادہ شدید ہے کہ وہاں کوئی جابرو قاسر تو نہ تھا۔ نواں درجہ وہ ظلمت ہے جو بارگاہِ نبوت میں جہل بسیط سے ذات میں آتا ہے۔ مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں (صدور خطا وغیر) ایسی بات کا معتقد ہو جس سے آپ کی ذات مقدسہ پاک صاف ہے۔ مگر محض ناواقفیت کے سبب ہو کہ کوئی بتلائے تو باز آجائے۔ اس کی ظلمت درجات مذکورہ سے بڑھی ہوئی ہے۔ کہ آپ دروازۂ الٰہی ہیں۔ اور جو شخص دروازہ سے ناواقف، اور اس کے راستے سے جاہل ہوگا اس کے اندرون مکان داخل ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو ہمیں نہ اللہ پر ایمان نصیب ہوتا نہ دُنیا یا آخرت کی کوئی خوبی ہاتھ آتی۔ مثلاً کسی بوڑھے شخص نے خواب دیکھا کہ جوان بن گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ دُنیا بہت کچھ ملے گی مگر طالت الٰہی میں کام نہ آئے گی۔ اور اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپا اشارہ ہے فقر کی طرف، اور جوانی کی طرف عود کرنا اشارہ ہے تونگری کی طرف۔ اور یہ اشارہ چوں کہ بہت دقیق ہے (کہ کہاں اعادۂ شباب۔ اور کہاں غنا و ثروت کا حصول) اس لئے تعبیر میں ظلمت قوی ہوئی۔ نیز نفس خواب میں ظلمت قوی ہے کہ دُنیا اصل ہے ہر گناہ کی خصوصاً جب کہ بکثرت ملے (کہ مالدار ہو کر آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا)۔ اور اس لحاظ سے بھی ظلمت ہے کہ وہ طاعت خدا میں صرف نہ ہوگی اور اس کے ذریعہ کوئی نیک کام عمل میں نہ آئے گا۔ دسواں درجہ وہ ظلمت ہے جو ذات میں داخل ہو بارگاہ محمدیہ میں جہل مرکب کی وجہ سے کہ خلاف شان کسی صفت کا معتقد ہو اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ عقیدہ یہی صحیح ہے۔ اس کی ظلمت سب سے بالا ہے۔ مثلاً خواب میں دیکھے کہ جوان کے پیچھے چل رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اغلام کرے گا۔ وجہ تعبیر ظاہر ہے۔ اور ظلمت تو یہ نفس خواب میں ہے کہ لواطت اکبر الکبائر ہے۔ یہ ہیں اس اس ظلمت کے درجات عشرہ جو نگاہِ ذات کی طرف منسوب ہیں۔ رہے درجات طہارت جو روح کی طرف منسوب ہیں وہ بھی دس ہیں یعنی ان کی نقیضیں اور مذکورہ درجات عشرہ کا عدم۔ اور اسی لئے درجات طہارت کا حال ثقل اور خفت میں درجات ظلمت کے برعکس ہوگا کہ ظلمت ذات میں ثقیل ترین اور آخری درجہ بارگاہ محمدیہ میں جہل مرکب کا ہے

اور یہاں درجات طہارت میں نور روح کا خفیف ترین اور پہلا درجہ یہی بارگاہ عالیہ میں جہل مرکب سے پاک صاف ہونے کا ہے (کہ بجز کفار کے شاید ہی کوئی روح اس طہارت سے خالی ہو) - اور ظلمت ذات کے لئے سہواً مکروہ خفیف ترین و پہلا درجہ تھا کہ (شاید ہی بجز انبیاء کے کوئی ذات اس سے خالی ہو) - مگر نور روح کے لئے سہواً ارتکاب مکروہ کا عدم ثقیل ترین اور آخری درجہ ہے - کہ ممکن ہے یہ صفائی و طہارت دوسری ظلمتوں مثلاً جہل بسیط یا مرکب کے ساتھ جمع ہو جائے - پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ روح جب اپنی بصیرت اور صاف نگاہ سے کوئی چیز دیکھتی ہے تو اصلی حالت پر دیکھتی ہے کہ نہ تغیر ہوتا ہے نہ ضرورتِ تعبیر - مگر جب وہ اُسے ذات کے حوالہ کرنے لگتی ہے تو ذات اگر معصوم اور ظلمت سے من کل الوجوہ پاک ہوتی ہے تب تو بجنسہٖ بلا تبدل و تغیر اس کو دے دیتی ہے (اور صبح کو جب آنکھ کھلتی ہے تو وہی ظہور ہوتا ہے) اور اگر ذات میں کم یا زیادہ ظلمت ہوتی ہے تو روح جب اپنی دیکھی ہوئی خواب اس کے حوالہ کرتی ہے تو حسب مقدار ظلمت اس میں تبدل و تغیر آجاتا اور اسی درجہ کی جلی یا خفی تعبیر کی ضرورت پڑ جاتی ہے - اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ روح اور ذات کی جُدا جُدا نظر سے جس طرح خواب کی دو قسمیں ہوئیں اسی طرح روح کے اس خواب کو ذات کے حوالہ کرتے وقت بھی دو قسمیں ہو جائیں گی - کہ اگر ذات معصوم ہے تو روح کا دیکھا ہوا خواب اپنی اصل صورت پر ذات کو مل جاتا ہے اور جیسا خواب میں دیکھا تھا وہی واقعہ کی صورت میں پیش آجاتا ہے - اور اگر ذات مظلم ہے تو روح کا دیکھا ہوا خواب اگرچہ اصل واقعہ اور غیر محتاج تعبیر تھا مگر ذات کو جب ملتا ہے تو حسب درجات ظلمت متغیر اور محتاج تعبیر ہو کر ملتا ہے - کیونکہ ممکن ہے ایک اعتبار سے ذات میں ظلمت ہے مگر دوسرے لحاظ سے اس میں نور ہے - لہٰذا صفائی کی بھی دو قسمیں ہو گئیں - ایک صفاء کلی اور یہ ذوات معصومین یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو حاصل نہیں - دوم صفاء جزئی - اور وہ یہ ہے کہ ایک وجہ سے ہو اور دوسری وجہ سے نہ ہو - اور اسی لئے اس کے بھی دس درجہ ہیں - پہلا درجہ بارگاہ عالیہ میں عدم جہل مرکب کا ہے کہ اس جہل سے صفائی تمام صفائیوں سے بالا ہے - اور اسی لئے اس کی خواب کو گویا تعبیر کی ضرورت ہی نہیں - مثلاً حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ اس سے خوش ہے اور تبسم

فرما رہا ہے۔ اس کی تعبیر واضح ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے اور اس کے اعمال پاک صاف ہیں۔
دوسرا درجہ جو اس کے بعد ہے بارگاہ محمدیہ میں عدم جہل بسیط کا ہے کہ اس کی صفائی پہلے درجہ سے نسبتاً کم ہے مگر قریب قریب ہے۔ اور اسی لئے اس میں قلیل تعبیر کی ضرورت ہے۔ مثلاً خواب میں دیکھے کہ فرشتوں کے ساتھ لڑ جھگڑ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی یا کھجلی لاحق ہوگی یا بلا سبب عادی اس کا کوئی عضو یا ہڈی ٹوٹے گی۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ دیکھنے والی درحقیقت روح ہے۔ اور اس نے جن فرشتوں کو دیکھا ہے وہ اس کی ذات کے حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں' لہٰذا وہ ان سے مخاصمت کر رہی ہے۔ یعنی روح نے جب (بواسطۂ بصیرت) بدن پر نکلنے والی پھنسیوں وغیرہ کا واقعہ دیکھا تو محافظین بدن فرشتوں سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ گویا کہنے لگی کہ یہ (مرض) حفاظت بدن میں تمہاری کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ پس یہ خواب گویا ایسا کلام ہے جس میں ایک لفظ حذف کر دیا گیا کہ جس وقت اس کو مقدر مان لیا گیا تو فوراً کلام صحیح اور مطلب واضح ہو گیا۔ تیسرا درجہ جو اس کے بعد ہے عقیدۂ تقلید میں عدم جہل مرکب کا ہے۔ کہ یہ صفائی ماقبل سے کچھ کم ہے اور اس لئے اس کو تعبیر کی احتیاج ہوگی۔ مثلاً خواب میں دیکھا کہ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہے خوف زدہ پریشان۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگا' مگر حق تعالیٰ اس سے نجات بخشے گا اور اس میں اس کو اجر عظیم ملے گا۔ وجہ تعبیر یہ ہے کہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونا صرف آخرت ہی میں ہوگا اور صرف مومنین کے لئے ہوگا۔ پس اگر خواب دیکھنے والے کی ذات ظلمتوں سے پاک صاف نہ ہوتی تو ضرور خواب میں دھمکاتی اور ڈرائی جاتی' اور اس کے بعد انجام ہوتا رہائی اور دخول جنت مگر جب اس نے اپنے آپ کو رب کے سامنے کھڑا ہوا اور اس حالت میں دیکھا (کہ گھبرا رہا ہے مگر زجر و توبیخ نہیں ہوئی) تو تعبیر وہ ہوئی جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔ اس کی دیکھنے والی حقیقتہً وہی روح ہے اور تعبیر کی ضرورت ذات کے حوالہ کرتے وقت ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ روح کی نگاہ میں کوئی ظلمت تھی۔ (اور اس لئے تعبیر کی حاجت ہوئی) پس اگر اس خواب کا دیکھنے والا عارفین و اولیاء میں سے کوئی ہوگا۔ یا حضرات انبیاء و مرسلین میں سے تو اس کی تعبیر دوسری ہوگی (کہ وہاں ذات کے حوالہ ہوتے وقت بھی کسی ظلمت کا دخل نہیں ہوا)۔ چوتھا درجہ عقیدۂ تقلید میں عدم جہل بسیط کا ہے۔ اور اس کی صفائی

نسبتاً اس سے بھی کم ہے۔ مثلاً حضرت عزرائیلؑ کو دیکھا کہ اسے دیکھ کر ہنس رہے اور خوش ہو رہے ہیں۔ اس کی تعبیر درازیٔ عمر ہے اور اس شخص کے لئے ملک الموت کی خوشی کی وجہ اس کی درازیٔ عمر ہی ہو سکتی ہے۔ مگر ذات کے حوالہ کرتے وقت اس میں ظلمت آئی۔ اور تعبیر میں دقت واقع ہوئی کہ ملک الموت کے ہنسنے کا اشارہ درازیٔ عمر کی طرف ایک خفی اور دقیق اشارہ ہے۔ پانچواں درجہ عقیدۂ خفیہ میں عدم جہل مرکب کا ہے۔ اور یہ صفائیٔ ماقبل سے بھی نیچے درجہ کی ہے۔ مثلاً خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہ حضرت ابوبکر میں اور خواب دیکھنے والے کی آنحضرتؐ کے ساتھ محبت عظیمہ میں کوئی تلازم نہیں ہے اس لئے یہ اشارہ بہت خفی ہوا اور ذات کے حوالہ ہوتے وقت ظلمت کی وجہ سے خفا لاحق ہوا اس لئے اس کی ظلمت پہلے سے زیادہ ہوئی۔ چھٹا درجہ عقیدۂ خفیہ میں عدم جہل بسیط کا ہے کہ یہ عدم اپنے ماقبل کے قریب قریب ہے۔ مثلاً کسی مقام پہ فرشتوں کو موجود دیکھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ عنقریب اس جگہ مسجد تعمیر ہوگی جس میں اللہ کی عبادت اور تسبیح و تقدیس ہوا کرے گی۔ وجہ تعبیر تو ظاہر ہے مگر ظلمت ذات کے حوالہ ہوتے وقت آئی کہ کہاں عالم انوار کے فرشتے اور کہاں عالم اغیار کی مسجد۔ برخلاف ماقبل کے کہ وہاں بھی اگرچہ حضرت صدیق اور محبت محمدیہ میں تلازم نہ تھا مگر عالم تو ایک ہی تھا۔ ساتواں درجہ بالقصد ارتکاب حرام کا عدم ہے۔ مثلاً کسی جگہ پر حضرت اسرافیلؑ کو دیکھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہاں کوئی بڑا فتنہ واقع ہوگا یا بڑے درجہ کی خوشی۔ وجہ تعبیر یہ ہے کہ حضرت اسرافیلؑ کی تعیناتی فتن اور افراح کے معاملات پر ہے۔ اور اس میں حوالہ ذات ہونے کے وقت کی ظلمت ماقبل سے زیادہ قوی اس اعتبار سے ہے کہ فتنہ و سرور کے ساتھ حضرت اسرافیلؑ کا تعلق اتنا مشہور نہیں جتنا حضرت عزرائیل کا تعلق عمر و زندگی کے ساتھ معروف و مشہور ہے۔ اور باوجود اس کے عالم انوار و عالم اغیار کا بعد بھی اس میں موجود ہے۔ لہٰذا اس میں ماقبل سے زیادہ ظلمت ہوئی۔ آٹھواں درجہ بالقصد ارتکاب مکروہ کا عدم ہے۔ مثلاً خواب میں شیاطین کو دیکھا کہ اسے گھیرے کھڑے ہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ چوروں کا اس پر حملہ ہوگا یا مال اس کا چوری جائے گا یا لوگ اس کی بلاوجہ غیبت کریں گے۔ وجہ تعبیر ظاہر ہے اور ظلمت تو یہ نفس خواب میں ہے کہ مال چوری جانا اور

غلبت ہونا اس خواب دیکھنے والے کے لئے پریشان کن اور ناگوار امر ہے جو کہ پہلی صورت میں نہ تھا۔ نواں۹ درجہ عدم سہو حرام ہے۔ مثلاً کسی مقام پر دیکھا کہ قیامت برپا ہوئی ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس جگہ کی حالت تبدیل ہو جائے گی کہ ظلم ہو رہا تھا تو عدل ہونے لگے گا اور عدل ہو رہا تھا تو ظلم ہونے لگے گا۔ اس میں ظلمت ذات کے حوالہ ہوتے وقت تعبیر میں آئی ہے کہ حقیقی قیامت سے تبدیل حالت کی طرف اشارہ اوّل تو دقیق ہے، پھر عدل سے ظلم کی طرف انتقال تو بہت ہی بعید ہے کہ قیامت کے دن ظلم بالکل نہ ہوگا اس لئے حضرت اسرافیلؑ کو دیکھنے کی بہ نسبت اس میں زیادہ ظلمت ہوئی کہ ان کا تعلق فتنہ و فرح دونوں حالتوں کے ساتھ یکساں تھا۔ دسواں۱۰ درجہ عدم سہو مکروہ ہے۔ کہ ظلمت و ثقل کے لحاظ سے سب میں آخری درجہ ہے۔ مثلاً خواب دیکھا کہ شیطانوں کا دوست اور یار بنا ہوا ہے۔ اس کی تعبیر یہ کہ اس کے احباب و ہمنشین بُرے لوگ ہیں۔ وجہ تعبیر تو ظاہر ہے مگر یہ رُوح کا دیکھا ہوا واقعہ جب ذات کے حوالہ ہوا تو اتنی ظلمت آئی کہ نسگاہ ذات سے دیکھی ہوئی خواب کے قریب پہونچ گئی۔ کیونکہ ہر شخص اپنے دوست کی روش پر چلا کرتا ہے۔ پس جب اس کے دوستوں میں صلاح نہیں تو خود اس میں صلاح نہیں۔ گویا خواب کی یہ ظلمت ذات کی خباثت و بدکاری کا اشارہ کر رہی ہے جیسے وہ ظلمتیں جو ذات کی طرف منسوب ہونے والے درجات عشرہ میں تھیں کہ ان میں بھی ہر ظلمت ذات کی گندگی کی طرف اشارہ کر رہی تھی اگرچہ درجات بلحاظ قوت و ضعف کے مختلف تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کی اس تقریر کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ تعبیر کا سبب وہ ظلمت ہے جو ذات میں ہوتی ہے۔ اگرچہ صورت مختلف ہوتی ہے کہ روح کو دیکھے ہوئے میں تعبیر کی ضرورت ذات کو حوالہ کرتے وقت ہوئی اور ذات کے دیکھے ہوئے میں تعبیر کی ضرورت نفس خواب میں ہوئی۔ لیکن جب کسی ذات میں ہر طرح معصوم ہونے کے سبب ظلمت ہی نہ ہو جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں تو ان کی خواب کو احتیاج تعبیر مطلق نہ ہونی چاہیئے کہ جو تعبیر کا سبب تھا یعنی ظلمت اُن میں وہی مفقود ہے۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی بہت خوابیں ہیں جن میں تعبیر واقع ہوئی ہے۔ مثلاً سیدنا یوسف علیہ السلام کی خواب جو قرآن میں مذکور ہے کہ گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو سجدہ کرتے دیکھا۔ حالانکہ سجدہ کرنے والے ان کے گیارہ بھائی اور ماں باپ تھے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی خواب کہ بیٹے کو ذبح کرتے دیکھا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہوا کہ مینڈھے کو ذبح کیا تھا۔ یا مثلاً سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب کہ گائے کو دیکھا کہ ذبح کی جارہی ہے جس کی تعبیر صحابہ کا شہید ہونا تھا کہ اشارہ تھا جماعت صحابہ کی طرف۔ یا آپ نے اپنی تلوار کو دیکھا کہ اس کی دھار میں شکستگی ہے۔ تو تعبیر بیان فرمائی کہ اہل بیت میں کسی شخص کی وفات ہوگی۔ اور مضبوط زرہ آپ نے خواب میں دیکھی جس کی تعبیر فرمائی کہ مدینہ مراد ہے کہ اگر اس میں رہ کر دشمن کی مدافعت کریں گے اور اس سے باہر نہ نکلیں گے تو (زرہ پوش کی طرح محفوظ رہیں گے اور) کوئی گزند نہ پہونچے گا۔ اسی طرح آپ کا خواب کہ لوگ آپ پر پیش کئے گئے جن میں کوئی قمیص پہنے ہوئے تھا صرف اپنی چھاتیوں تک اور کوئی اس سے نیچا، اور حضرت عمر کو دیکھا ان کا کرتا اتنا نیچا ہے کہ اس کو زمین پر کھینچتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس کی تعبیر کیا ہوئی یا رسول اللہ۔ فرمایا دین (کہ جس طرح قمیص ساتر عیوب جسمانی و محافظ بدن ہے۔ اسی طرح صلاح و دینداری ساتر عیوب روحانی و محافظ روح ہے)۔ غرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد خوابیں ہیں جن میں تعبیر کی ضرورت پیش آئی۔ پھر ایسا کیوں ہوا۔ فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کا سونا دوسروں کا سا سونا نہیں ہے۔ وہ بحالت نوم بھی مشاہدۂ حق میں رہتے ہیں۔ اور یہی مطلب ہے اس کا کہ صرف اس کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتا۔ لہٰذا ان کی خوابوں کی دو قسمیں ہیں یعنی معاینہ اور وحی۔ معاینہ تو یہ ہے کہ نبی کو سوتے میں کوئی چیز نظر آوے اور بیداری میں اس کا بعینہٖ ظہور ہو کہ نہ مطلق کمی ہو نہ بیشی اور نہ تبدل ہو نہ تغیر۔ مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ مع صحابہ کے باامن و امان مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور کسی نے (عمرہ پورا کر کے سر کا) حلق کرایا ہے اور کسی نے بال کتروائے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ الآیۃ (اور چند ماہ بعد اس کا بجنسہٖ ظہور ہوا کہ باطمینان عمرہ کرنا نصیب ہوا) اس خواب کو نہ صرف روح کی طرف منسوب کریں گے نہ صرف ذات کی طرف۔ بلکہ دونوں کی طرف اس کا انتساب ہوگا کیونکہ صفائی و ستھرائی دونوں میں یکساں ہے (اور اس لئے نہ اس میں ظلمت آئی نہ تعبیر کی حاجت ہوئی)۔ نیز اسی قبیل سے ہے جو آپ نے شب معراج میں دیکھا کہ جس طرح آپ کو جسمانی معراج ہوئی کہ اسی جسد اطہر سے افلاک کی سیر فرمائی اسی طرح کبھی آپ کو روحانی معراج بھی ہوئی کہ بحالت خواب آپ نے دیکھا جو کچھ

بھی عالم بالا پر ہے۔ اور یہ رویت روح کی تھی جس میں نہ تعبیر کی ضرورت تھی نہ تاویل کی۔
خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی خواب ایسی ہے گویا آنکھ نے دیکھ لیا۔ لہذا جس طرح آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔
دوسری قسم یعنی وحی حضرات انبیاء کی وہ خوابیں ہیں جن میں تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی خواب میں کسی خارجی وجود والی چیز کا نظارہ نہیں ہوتا اور نہ اس کی طرف روح بالذات متوجہ ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ شانہٗ جو بھی حکم یا ممانعت فرماتا یا کسی بات کی خبر دینا چاہتا ہے تو ایک شے پیدا فرما کر نبی کو دکھاتا اور اور اس کو کلام کا قائم مقام بنا دیتا ہے کہ وہ وحی الہٰی کے معلوم کر لینے کا واسطہ بن جاتی ہے۔ اس کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی رمز اور اشارہ سے باتیں کرے غرض چیزیں (جو نبی کو خواب میں نظر آتی ہیں) وہ امور ہیں جن کو حق تعالیٰ نے نبی کے ساتھ مخاطبت کرنے کے لئے وضع فرمایا ہے۔ اور حضرات انبیاء اس کی مراد ایسی ہی سمجھ لیتے ہیں جیسے ہم مخصوص اشاروں اور رمز وغمز کو سمجھ لیتے ہیں (کہ کسی کام کا حکم دینا ہوتا ہے تو آنکھ یا ہاتھ سے ایک خاص اشارہ کرتے ہیں اور اگر منع کرنا ہوتا ہے تو دوسرا خاص اشارہ کرتے ہیں) اور اسی لئے حضرات انبیاء بے تامل اس کی تعمیل کرتے اور اس کو بیداری کی وحی کی مثل واجب العمل سمجھتے ہیں۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ نبی کو خطاب اسی تنے میں واقع ہوتا ہے جس میں مشاہدہ حق ہو رہا ہے۔ اور حضرات انبیاء بیداری میں مسلسل یا بحالت نوم ہمیشہ و ہر وقت مشاہدہ ہی میں رہتے ہیں کہ مخلوقات عالم میں ان کے مشاہدۂ حق کی مثال پرندکی سی ہے کہ کبھی سکون سے نہیں بیٹھتا۔ کبھی درخت کی اس شاخ پر ہے کبھی اس شاخ پر اور کبھی زمین پر ہے کبھی فضا میں۔ اسی طرح ان حضرات کو بھی مشاہدۂ حق حاصل ہوتا ہے۔ آسمان و زمین کے دیکھتے وقت اور کبھی حاصل ہوتا ہے ستاروں اور سورج چاند پر نظر جانے کے وقت۔ کہ جب کسی چیز پر نگاہ جاتی ہے تو خالق برتر کی عظمت و جلالتِ شان کا استحضار ہوتا اور ناقابل بیان مشاہدۂ عظیم الشان حاصل ہوتا ہے پس جب حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس مشاہدہ کی حالت میں ان کو کسی اجنبی چیز پر مطلع فرمائے تو وہ چیز ان کو اسی شئی میں دکھلاتا ہے جس میں ان کو مشاہدۂ حق ہو رہا ہے۔ چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام

کی روح بحالت نوم آسمان کی طرف چڑھی اور آپ کی نظر کواکب اور شمس وقمر پر پڑی تو آپ کو ان نورانی اجرام کے خالق قدیم کا مشاہدہ حاصل ہوا۔ اور حق تعالیٰ نے ان کو اس پیش آنے والے واقعہ سے باخبر بنانا چاہا کہ اُن کے والدین اور ان کے گیارہ بھائی اُن کو سجدہ کریں گے (کہ شریعت یعقوبیہ میں اظہارِ عقیدت کے لئے سجدہ کرنا جائز تھا) لہذا کواکب اور شمس وقمر ہی میں سجدہ کی صورت ان کو دکھائی کیونکہ اسی میں ان کو مشاہدہ حق ہو رہا تھا۔ تاکہ باطن جس مشاہدہ میں مشغول ہے بدستور مشغول رہے اور حضرت یوسف کا قصد وارادہ اس کے سوا کسی دوسری شئے کی طرف نہ جائے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نظر جب لڑکے پر گئی تو نعمت الٰہیہ کا مشاہدہ ہوا کہ اللہ کریم کا کتنا بڑا انعام ہے۔ لہذا جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ مینڈھا ذبح کرنے سے (جو واقعہ بن کر پیش آنے والا ہے) اُن کو مطلع فرمائے تو اسی مشاہدہ یعنی صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل) اور اس انعام کی عظمت کے اشتغال میں اس کو دکھایا۔ یہی حال ہے تمامی انبیاء کی ان خوابوں کا جن میں تعبیر کی ضرورت ہوئی۔ الحاصل یہ تفصیل تو قسم اوّل کے متعلق ہے جن کو ادراکات کہتے ہیں۔ رہی دوسری قسم جس کا نام خواطر ہے۔ سو اسکی حقیقت یہ ہے کہ طرح طرح کی خوابوں کا نظر آنا اس کا اثر ہے کہ خواطرذات قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ اور خواطر کے مختلف الاقسام ہونے کا سبب ایک امرِ غیبی ہے جس سے اکثر مخلوق کو مطلع نہیں کیا گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا وہ فعل ہے اللہ سبحانہٗ کا بندہ کے قلب میں کہ خواب ہو یا بیداری جب تک بدن میں روح موجود ہے قلب میں حق تعالیٰ کا فعل جاری ہے کہ کسی حال بند نہیں ہوتا۔ اور بندہ کے ابتداءِ وجود سے لے کر مرتے دم تک قلب کی ہر حرکت (اور ہر خیال) اثر ونتیجہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسی فعل کا کہ وہ قلب سے جو امر معین مخصوص چاہتا ہے اس کا گذر قلب پر ہوتا ہے۔ اور جب دوسری حرکت ہوتی ہے تو دوسرا امر معین خطور کرتا ہے۔ اور جب تیسری حرکت ہوتی ہے تو تیسرے امر کا خیال قلب پر گزرتا ہے (چنانچہ وہ کہتا ہے کہ میرے قلب میں فلاں بات کی حرکت پیدا ہوئی۔ مثلاً یہ کہ دوست سے ملنے جاؤں یا کھانا کھاؤں یا سو رہوں وغیرہ وغیرہ) حتیٰ کہ عمر بھر یہی ہوتا رہتا ہے (کہ ایک حرکت ختم ہوتی ہے اور دوسری پیدا ہوتی ہے) پس اگر حق تعالیٰ

بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو پہلی حرکتِ قلب، کارِ خیر کی ہوتی ہے اور دوسری و تیسری بھی (کہ یکے بعد دیگرے نیک کام کرنے کے خیالات آتے رہتے ہیں) - اور اگر بندہ کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتا ہے تو قلب کی پہلی حرکت بھی اس کارِ بد کی ہوتی ہے جس کا حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا اور پھر دوسری حرکت بھی کارِ بد کی جس کا اُس وقت کے لیے ارادہ فرمایا۔ غرض قلب کی تمام حرکتیں ایسی ہی ہوتی رہتی ہیں حتّٰی کہ حق تعالیٰ کرم فرمائے اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے تو یہ خواطرِ بد متبدل ہو جاتے ہیں خطراتِ خیر سے (اور پھر خیالات نیک ہی قلب پر آنے لگتے ہیں) خلاصہ یہ ہے کہ بندوں کے تمامی اعمال تابع ہیں خواطر کے، اور خواطر تابع ہیں حرکاتِ قلب کے، اور حرکاتِ قلب تابع ہیں اللہ کے افعال اور ارادہ کے جو قلوب میں جاری ہیں میں نے کہا کیا یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ بندہ کا قلب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے کہ جس طرح چاہتا ہے اس کو پلٹ دیتا ہے۔ فرمایا ہاں یہی مُراد ہے۔ تب مجھے حرکاتِ قلب اور اُن کے تغیّرات کے دھیان سے بڑا خوف و لرزہ پیدا ہوا اور مجھے علم ہوا کہ تمامی سعادت و خوش حالی کا اور ہر قسم کی شقاوت و بدحالی کا مدار ان ہی حرکاتِ قلب پر ہے (جو خیالات بن کر دل میں پیدا ہوتے اور محرکِ عمل بنتے رہتے ہیں)۔ دعا و سوال ہے اللہ سے جس کے ہاتھ میں ہمارے قلوب اور جس کے تحت قہر و حکومت ہمارے تمامی معاملات ہیں کہ ہمارے دلوں کو اپنے پسندیدہ افعال میں حرکت دے اور ان میں اعمالِ حسنہ کی تحریک ڈالے۔ حضرت ممدوح نے فرمایا پھر ان نیک اور بد حرکاتِ قلبیہ کے ثمرات کی عمر سات دن ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکتِ قلب سے حق تعالیٰ کی جو مراد ہوتی ہے یا تو فوراً ہی بندہ سے صادر ہو جاتی ہے۔ یا تھوڑی دیر بعد یا اور کچھ تاخیر سے جس کی انتہا سات دن ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ ایک کام آج کر رہا ہے حالانکہ دل میں اس کی حرکت ایک یا دو دن پہلے پیدا ہوئی تھی (مگر حرکت اور عمل میں سات دن سے زیادہ کا وقفہ نہ ہوگا) اس کی مثال نباتات کی سی ہے کہ باوجودیکہ سب کا ذریعہ ایک ہے مگر کوئی چیز بیج ڈالنے سے ایک دن بعد اُگتی ہے اور کوئی اس سے بھی قبل اور کوئی اس کے بعد۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ خواطر کا مدار قلب میں ارادۂ الٰہی پر ہے تو اب یہ سمجھو کہ انسان کی دو حالتیں ہیں حالتِ نوم اور حالتِ بیداری۔ حالتِ بیداری

میں تو ذات اصل ہے اور روح اس کی تابع۔ اور ذات کا حکم ہے حقیقت سے جہل اور اشیاء کی ناواقفیت۔ لہذا بندہ کے قلب پر بحالت بیداری مثلاً حج کا خیال گزرا تو نقط حج ہی کا گزرے گا کوئی زائد امر نہ آئے گا۔ یا مثلاً آسمان یا جنت یا دوزخ کا خیال آیا تو فقط ان چیزوں کا شعور آئے گا (نہ کہ آسمان پر چڑھنا یا جنت کی سیر)۔ مگر حالت نوم میں حواس حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اعضاء کو سکون و آرام ملتا ہے۔ اور فعل الہٰی قلب میں ہر وقت جاری ہے کہ نہ جاگنے میں بند ہوتا ہے نہ سونے میں۔ لہذا اب جو قلب پر اشیاء مذکورہ میں سے کسی شے کا خیال گزرے گا تو روح اُس طرف متوجہ ہو گی۔ کیونکہ ذات کا حکم منقطع ہو چکا ہے۔ اور روح فطری طور پر ہر شے سے واقف پیدا کی گئی ہے۔ لہذا توجہ کرتے ہی اس کو ایسا ادراک کر لیتی ہے گویا آنکھ سے دیکھ لیا۔ پس اگر خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ مثلاً آسمانوں کے اوپر ہے یا حج میں ہے یا کسی خاص جگہ پر ہے تو اس کی حقیقت یہی ہے کہ قلب پر آسمان یا حج کا خیال گزرا اور روح نے متوجہ ہو کر آسمان اور حج کی حقیقت تک رسائی پائی (اور نظر آیا کہ آسمان پر ہوں یا حج کر رہا ہوں) غرض ادراک تو خواطر اور ادراکات دونوں میں ہوتا ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ ادراک سے پہلے اگر خیالات کا قلب پر ورود ہوا ہے تب تو اضغاث احلام ہیں (جن کو پریشان خیالا کہتے ہیں) اور ان کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی۔ اور اگر خیالات کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی بلکہ ذات یا روح کی طرف سے ابتداءً توجہ واقع ہوئی ہے تو وہ خواب ہے اور اس کی بلیس قسمیں ہیں جن کا بیان مفصل کیا جا چکا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں نظر آنے کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں تعبیر کی ضرورت نہیں، اور وہ یہ ہے کہ ذات محمدی کی رویت ہو یعنی بعینہٖ وہ ذات مطہرہ نظر آوے جس کا حضرات صحابہ نے آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں کہ خواب دیکھنے والا اگر اہل فتح اور عارف ہوتا ہے تو عین ذات محمدی کو دیکھتا ہے (کہ آپ دنیوی حیات کی طرح اپنے مقام رفیع میں تشریف فرما ہیں) اور اگر اہل فتح نہیں تو کبھی تو اس کو بھی عین ذات کی رویت نصیب ہو جاتی ہے، ورنہ اکثر اس کو عین ذات کی نہیں بلکہ صورت ذات کی رویت ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات سے ایک نور جدا ہو کر سارے عالم میں لبریز ہو گیا ہے اور اس نور میں

نبی کریم کی زیارت کی ایک صورت

آپ کی صورت اس طرح مرتسم ہوئی ہے جیسے آئینہ کے سامنے کوئی کھڑا ہوا ہو تو وہ خود آئینہ کے اندر نہیں آیا بلکہ اس کی صورت اس میں اُتر آئی ہے (اور جتنے آدمی بھی آئینہ پر نظر ڈالیں گے وہ صورت بیک وقت سب کو نظر آئے گی) یہی وجہ ہے کہ بے شمار مخلوق ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر خوابوں میں آپ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے کہ کوئی مشرق میں ہے اور کوئی مغرب میں اور ایک شمال میں ہے تو دوسرا جنوب میں (مگر سارا عالم چونکہ ذات محمدی کا آئینہ بنا ہوا ہے اس لئے اپنے اپنے مقام پر بیٹھے ہوئے سب نے صورت مبارکہ کو دیکھ لیا۔ نہ یہ کہ آپ کی ذات مطہرہ بیک وقت اماکن مختلفہ میں سب کے پاس پہنچ گئی) پس صاحب فتح جب اس صورت مبارکہ کو دیکھتا ہے (خواہ حالت بیداری میں ہو یا بحالت خواب) تو اس کی بصیرت پیچھے پیچھے چلتی اور (چشم قلب کو جس نے صورت محمدیہ دیکھی ہے قوت اور مدد پہونچاکر) نور عالم کو پھاڑتی ہوئی ذات مبارکہ تک پہونچتی (اور عین ذات کے مشاہدہ سے فیضیاب ہوتی) ہے۔ اور جو شخص بصیرت سے محروم ہے اگر حق تعالیٰ فضل و احسان فرمائے تو کبھی وہ بھی عین ذات کا مشاہدہ کر لیتا ہے کہ ذات مطہرہ اس مقام پر خود تشریف لے آتی ہے۔ کیونکہ اپنے متعلق اس کی کمال محبت اور سچے تعلق کو معلوم فرما لیتی ہے۔ غرض یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پر موقوف ہے کہ جس کو چاہیں اپنی ذات مطہرہ کا نظارہ کرادیں اور جس کو چاہیں صرف صورت شریفہ دکھائیں۔ نیز آپ کی صورت اصلیہ کا ظہور دوسری صورتوں میں بھی ہوا کرتا ہے کہ تمامی انبیاء علیہم السلام اور آپ کی امت مرحومہ کے تمامی اولیاء کی صورتیں آپ کی صورت شریفہ کے مظاہر ہیں (کہ اپنے زمانہ کا ہر نبی اس لحاظ سے کہ آپ ہی کے انوار و فیضان روحی سے مستفیض ہو کر نبی بنا ہے' اور آپ کی اُمت کا ہر ولی اس اعتبار سے کہ آپ ہی کی روح مع الجسد کی تعلیم و تربیت سے ولی بنا ہے' معنوی لحاظ سے گویا ذات محمدی کی صورت مثالیہ ہے) اور یہی سبب ہے کہ اکثر مریدوں کو خواب میں آپ کی زیارت اپنے شیخ کی صورت میں ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کی تعداد صحیح تو یہی ہے کہ کسی کو صحیح معلوم نہیں۔ مگر بعض کا قول ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ اور اتنی ہی تعداد اولیاء امت (بلکہ صرف حضرات صحابہ کی تھی جنہوں نے بلا واسطہ جسم اطہر سے استفادہ فرماکر انبیاء بنی اسرائیل کا سا درجہ حاصل کیا اور قیامت تک بعد کے آنے والے اولیاء میں ہر ولی انہیں حضرات میں کسی ایک کے رنگ پر

آیا اور سب گویا صحابہ ہی کی صورتوں کی صورِ مثالیہ بنتے رہے) لہذا صورت محمدیہ کے ظہور کے لیئے دنیا میں دو لاکھ اڑتالیس ہزار صورتیں ہوئیں (کہ جس طرح کسی کے پاس دو لاکھ اڑتالیس ہزار لباس ہوں کہ جس لباس کو چاہے پہن لے سب اسی کے ہیں۔ اسی طرح ذات محمدی کو اختیار ہے کہ جس نبی یا جس ولی کی صورت میں چاہے مصور ہو جائے کہ سب آپ ہی کے روحانی بچے ہیں اور سب کی صورتیں آپ ہی کے ثمرات فیضان و نتائج جود و کرم ہیں)۔ چنانچہ جامع کتاب کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے شیخ (عبدالعزیز) کی صورت میں دیکھا اور گود میں لے کر چاہا کہ آپ کو اپنے اندر داخل کر لوں۔ صبح کو حضرت شیخ سے تعبیر پوچھی تو فرمایا کہ ایک دفعہ نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے انوار و تجلیات خاصہ) کا اپنے اندر لینا تدریجی طور پر نصیب ہوا کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری صورت

دوسری وہ ہے جس میں تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔ اور تعبیر اس میں نفس خواب کے اندر نہیں ہوتی کہ جس نے خواب میں آں حضرتؐ کو دیکھا درحقیقت دیکھا تو آپ ہی کو ہے (کہ شیطان آپ کی صورت نہیں لے سکتا لہذا خواب محتاج تاویل نہیں) البتہ ظلمت کے درجات میں تعبیر ہوگی۔ (کہ جس درجہ کی دیکھنے والے کے قلب میں ظلمت ہے اسی درجہ پر صورت مبارکہ میں تغیر نظر آئے گا۔ جیسے بعض شیشوں کی خاصیت ہے کوئی صورت ملبوتری دکھاتا ہے اور کوئی شیشہ چوڑی یا موٹی دکھاتا ہے۔ اصل شیشہ میں صورت تو وہی آئی جو اصل شے کی تھی مگر شیشہ کی مادیت نے اس کو بدل دیا ہے)۔ اور ظلمت کے درجات جو اس میں واقع ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مثلاً کسی نے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ اس کو دنیا کمانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ یہ علامت ہے کہ خواب دیکھنے والے کی ذات میں ظلمت پہلے درجہ یعنی سہو مکروہ کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات محمدی کی طبعی شان تو حی قیوم کے راستہ کی طرف رغبت دلانا ہے نہ کہ دنیا ر فانی کی طرف اور جس نے آپ کو خواب میں دیکھا کہ اس کو مال و زر عطا فرما رہے ہیں، تو اس کی ذات میں ظلمت دوسرے درجہ یعنی سہو حرام کی ہے۔ اور یہاں ظلمت کے قوی ہونے کا سبب یہ ہے کہ آپ کا فانی چیز عطا فرمانا اور اس پر قبضہ دلانا اس کی ترغیب دینے سے بڑھا ہوا ہے۔ اور جس نے آپ صلعم کو کسی نجس جگہ پر دیکھا تو اس کی ظلمتِ ذات تیسرے درجہ یعنی عمد مکروہ

کی ہے۔ اور جس نے آپ کو نوجوان بچّہ کی شکل میں دیکھا، اس کی ظلمت چوتھے درجہ یعنی عمدِ حرام کی ہے اور جس نے بڑی عمر والا دیکھا مگر بغیر داڑھی کے، اس کی ظلمت پانچویں درجہ یعنی عقیدہ خفیفہ میں جہل بسیط کی ہے۔ اور جس نے آپ کو سیاہ فام دیکھا، اس کی ظلمت چھٹے درجہ یعنی عقیدۂ خفیفہ میں جہل مرکب کی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ خواب اور اس کے عجائبات کی پوری تحقیق فن تعبیر کی پوری واقفیت پر موقوف ہے۔ اور فن تعبیر ایک مخفی خداداد علم ہے جس کا راز میں رکھنا ضروری ہے۔ اور برسوں یہ قصہ رہا کہ فن تعبیر کے متعلق حضرت ممدوح سے بار بار استفسار کرتا رہا لیکن حضرت یہی جواب دیتے رہے کہ جو بھی تمہارا دل چاہے۔ مجھ سے دریافت کرو مگر فن تعبیر کی بابت کچھ نہ دریافت کرنا کہ رازہائے مخفیہ میں سے ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ علم تعبیر سیکھنے اور پڑھنے سے نہیں آتا کیونکہ اس میں ضرورت ہے خواب دیکھنے والے کے بیرونی حالات سے واقف ہونے کی کہ وہ شہر میں رہتا ہے یا گاؤں میں اور اہل علم میں سے ہے یا عوام میں سے اور اس کا پیشہ کیا ہے مثلاً کاشتکار ہے یا سوداگر ہے یا کاریگر اور تونگر و خوش حال ہے یا مسکین و مفلوک الحال وغیرہ وغیرہ۔ پھر اُس کے باطنی حالات سے بھی آگاہ ہونے کی ضرورت ہے کہ روح نے اس کی ذات کو اپنے تمامی اجزاء عطا کر دیئے جن کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہے یا بعض اجزا دیئے اور بعض نہیں دیئے۔ اور اگر بعض دیئے ہیں تو آیا وہ اقل ہیں یا اکثر۔ اور یہ کہ خواب دیکھنے والے کے افکار و تخیلات کس امر میں دوڑتے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ فرض کرو فن تعبیر کے عالم ماہر کے پاس اگر سَو آدمی آویں اور ہر ایک یہی کہے کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو شہد پیتے دیکھا ہے، تو (باوجودیکہ سب کی خواب ایک ہے مگر) ہر ایک کی جدا تعبیر دے گا کہ ایک تعبیر دوسرے سے میل نہ کھائے گی۔ اور اس کی وجہ وہی ہے کہ تعبیر موقوف ہے ظاہری و باطنی حالات پر اور ان میں دو شخص بھی بالکل یکساں اور متفق الحال نہ نکلیں گے۔

احسان (۷) میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرے گویا اس کو دیکھ رہا ہے"۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا۔ فرض کرو ایک شخص کسی میدان میں آکر جہاں کوئی بھی نظر نہ آتا ہو کسی سخی کا جو وہاں موجود نہیں نام لے کر پکارے کہ اے میرے سردار فلاں مجھے روٹی دے دے،

مجھے کپڑے دے دے، میری مصیبت دور کر دے، مجھے ضرورت ہے ٹوپی کی، مجھے حاجت ہے رہنے کے لئے گھر کی، تو ظاہر ہے اس کو سائل اور درخواست کرنے والا نہیں بلکہ کھیل اور مذاق کرنے والا کہا جائے گا۔ اور جو بھی اس کو دیکھے گا وہ ہنسے گا اور اس کو احمق بتائے گا۔ اور اگر اس کا یہ خیال ہو کہ بس یہ کھیل کر لینا ہی درخواست کرنا ہے تو یہ دوسری حماقت اور گمراہی ہے۔ ہاں اگر اس کا یہ رنگ ہو کہ اس سخی کے سامنے آ کھڑا ہو گا اور اب زبان سے سوال کریگا تو ظاہر ہے کہ اس کا بدن اس کے سامنے جھک جائے گا اس کے اعضاء میں تذلل کی شان ہو گی۔ اس کے حضور جہاں تک بھی ہو سکے گا خشوع و خضوع کرتا ہوا زمین پر پہونچ جائے گا اور عاجزی کی کوئی بات ایسی نہ ہو گی جس کو ظاہر نہ کر دے۔ اس وقت بے شک سخی کی نگاہِ کرم اس کی طرف جھکے گی اور اس کو اس کے حال پر ترس آئے گا اور جو کچھ بھی اس کی درخواست ہے منظور فرما کر منہ مانگا اس کو عطا فرمائے گا۔ دیکھنے والا تو سمجھے گا کہ اس کو جو کچھ بھی ملا وہ اس کے زبانی سوال کرنے پر ملا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے باطنی خشوع و خضوع پر ملا ہے جو اس کے عضو عضو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ غرض محال ہے کہ اس وقت اس سائل کے دل میں اس سخی کے سوا کسی دوسرے کا دھیان برائے نام بھی باقی رہے بس ان دونوں حالتوں کے فرق کی طرف جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا کہ جس نے حضوری کی شان پر اللہ کی عبادت کی اس نے احسان کیا۔ یعنی اپنی عبادت کو حسین بنایا۔ اور جس نے ایسا نہ کیا یعنی اپنی عبادت کو غفلت و بے توجہی سے پورا کیا تو اس کی عبادت میں مطلق حسن نہ آیا۔ اور حضور و تعظیم کی علامت یہ ہے کہ عبادت کرنے والے کے باطن پر نظر ڈالی جائے۔ اگر وہ عبادت کے وقت دینوی معاملات میں مشغول اور امور فانیہ سے معمور ہے تب تو پہلے شخص کی طرح ہے، اور اگر وہ غیر اللہ سے خالی ہے اور صرف اللہ کی طرف متوجہ ہے تو دوسرے شخص کی مثل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بخاری نے تو اول ایمان بیان کیا ہے۔ اور پھر اسلام اور پھر صفت احسان۔ اور مسلم نے پہلے اسلام بیان کیا ہے اور پھر ایمان اور بعدہ احسان۔ فرمایا میرے نزدیک بخاری کا فعل مستحسن ہے۔ کیونکہ اسلام گویا ایمان کے کپڑے ہیں لہذا ایمان پہلے ہے اسلام سے (کہ بدن کا وجود پہلے ہوتا ہے کپڑوں کی تیاری سے) میں نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ

فِیْ قُلُوْبِکُمْ۔ اہل بستی کہتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے۔ کیونکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام مقدم ہے ایمان سے۔ فرمایا ہماری گفتگو حقیقی اسلام کے بارہ میں ہے جو حضرت جبرئیل والی حدیث میں مذکور ہوا کہ وہ گویا ایمان کا لباس ہے۔ اور بخاری و مسلم کا اختلاف تقدیم وتاخیر بھی اسی میں ہے۔ رہا محض زبان سے اقرار کرنا اور اسلام لسانی (جس کا آیت میں تذکرہ ہے) سو وہ تو ساقط اور بے کار محض ہے کہ اس سے اس کو کچھ بھی حاصل نہیں۔ اُس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک شخص فوجی سپاہیوں کو دیکھے کہ بندوقیں چلا رہے اور گولیاں برسا رہے ہیں۔ نشانہ کی طرف نال تانے ہوئے کھڑے اور آنکھ بھینچ کر تاک لگا رہے کہ کہیں نشانہ چوک نہ جائے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ شخص بھی ان کی نقل اُتارنے لگے کہ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر گویا اس کو بندوق قرار دے اور دوسرے کو سمیٹ کر اس کی جڑ میں لے آئے (گویا گھوڑا داب کر گولی چلا رہا ہے) اور آنکھ کو کمان کی طرح بنا لے۔ (جیسا شست باندھتے وقت بندوقچی کیا کرتا ہے) اور پھر دیکھنے لگے کہ نشانہ پر لگتا ہے یا نہیں۔ بھلا اس نقالی سے کیا نفع جب کہ اس کے پاس بندوق ہی نہیں۔ یہی مثال ہے اس شخص کی جو صرف زبان سے اسلام لایا کہ نماز پڑھتا ہے۔ مگر اس کا اندرون کہتا ہے کہ تیری نماز کچھ نہیں اور روزہ رکھتا ہے مگر اس کا باطن کہتا ہے کہ روزہ کوئی چیز نہیں۔ غرض زکوٰۃ و حج و جہاد سب کچھ کرتا ہے مگر اس کا دل اندر سے شہادت دے رہا ہے کہ محض صورۃً کیا ہے۔ اس کا ظاہر ایک میدان میں ہے اور باطن دوسرے میدان میں۔ جیسے وہ نقال خوب سمجھتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بندوق نہیں بلکہ محض ایک مذاق اور مخول کر رہا ہوں۔ اسی طرح منافقین بھی خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام کی کوئی بات بھی ان کے ہاتھ میں نہیں"۔ کیسی سچی مثال بیان فرمائی۔ حضرت ممدوح نے کہ حق تعالیٰ نے منافقین کا یہی حال ظاہر فرمایا۔ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ۔ کہ جب یہ لوگ اپنے شیطانوں (اور مشرک و کافر دوستوں) سے خلوت کرتے ہیں تو کہتے ہیں تو تمہارے ہی ساتھ ہیں (رہا نماز روزہ سو) اس میں تو ہم صرف مذاق اور مخول کر رہے ہیں"۔ اس تمثیل میں (کہ ان کے نماز روزہ کو مخول سے

تشبیہ دی) حق تعالیٰ نے خبث باطن واضح فرما دیا اور اندرونی گندگی کھول دی۔ شیخ کی اس تقریر سے پہلے میرا خیال ہوا کرتا تھا کہ منافقوں کا نماز روزہ حج زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ ہے تو قلب اور باطن سے مگر اس کا قبول نہ ہونا ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس مثال سے کھل گیا کہ درحقیقت ان کا نماز روزہ ایک مذاق و مخول ہے (جو مستقل خباثت اور گندگی طبیعت ہے۔) اور یہی وجہ ہے کہ وہ کفار سے بھی زیادہ نجس اور خبیث ہیں (کہ کفار نے اسلام اگر قبول نہیں کیا تو اس کا مذاق بھی نہیں اڑایا)۔ واللہ اعلم۔

قرآن بھولنا

(۸) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا جس کو ترمذی و بخاری اور امام احمد بن حنبل نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنی امت کے گناہوں پر نظر ڈالی تو اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں پایا کہ کسی شخص کو (قرآن مجید کی) کوئی آیت دی گئی اور وہ اس کو بھلا بیٹھا"۔ آپ نے فرمایا کہ یہ حدیث تو صحیح اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس میں موجود ہے مگر یہ اس کے بارہ میں نہیں جس نے کوئی آیت یاد کی اور پھر اس کے الفاظ کو بھول گیا اگرچہ اس کے مضمون پر عمل کرتا رہا۔ بلکہ اس کے بارہ میں ہے جس کو قرآن پہونچا مگر اس نے بے رُخی برتی اور اس کے نور سے اپنے آپ کو محروم رکھا اور نور کے بدلہ اس کی ضد یعنی ظلمت کو اختیار کیا۔ کہ جو امر حق آیت قرآنی میں مضمر تھا اس سے منہ پھیر کر ظلمت کا اتباع کیا جو کہ دُنیا و آخرت میں اللہ سے دور کرنے والی چیز ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کا حال تھا۔ پس یہ حدیث انہیں کے بارہ میں وارد ہوئی اور انہیں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ کیونکہ ظاہری اعتبار سے وہ بھی آنحضرتؐ کی خاص اُمت اجابت میں داخل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُمتِ اجابت میں نفاق اور کفر باطنی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ نور قرآن کیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا (کہ منافقین اس سے محروم رہے)۔ فرمایا قرآن میں تین نور ہیں۔ ایک اللہ کی طرف رہبری کا نور۔ دوم تعمیل احکام کا نور۔ اور تیسرا ممنوعات سے پرہیز کرنے کا نور پس جو شخص قرآن مجید سُنے اور ان تینوں انوار سے اپنے آپ کو محروم رکھے، وہ حدیث سے مراد ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ آیتً صادق

آتی ہے الفاظ پر بھی جن کے ساتھ حفظ اور تلاوت کا تعلق ہے، اور معنے پر بھی صادق آتی ہے۔ جس کے ساتھ عمل اور امتثال کا تعلق ہے۔ اور یہ دوسرا مصداق عین انوارِ ثلاثہ ہیں اور یہی حدیث میں مُراد ہیں۔ نیز فرمایا کہ آیت قرآن مومن کے پاس اللہ کی طرف سے گویا چیک (اور سرکاری نوٹ) ہے جس میں اس کا حق درج ہے۔ اور حقدار اپنے چیک کو کھویا نہیں کرتا۔ اگر اس کو کھودیا اور کوتاہی کی تو اس کا حق ضائع ہوگیا۔ اسی طرح آیت میں مومن کا حق ہے۔ اگر اس کو محفوظ رکھا اور آیت کے حکم پر عمل کیا تو عنداللہ اس کا حق ثابت ہوا اور دخول جنت کا مستحق بنا۔ اور اگر اس میں کوتاہی کی اور استہزا و تحقیر کی صورت میں اس سے بے رُخی برتی تو وہ اس بڑے گناہ کا مرتکب ہوا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

جنت و دوزخ

(۹) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کی بابت سوال کیا کہ جنت اور دوزخ میں باہم مناظرہ ہوا تو دوزخ کہنے لگی میں مامور ہوں متکبر لوگوں پر (کہ فرعون و شداد جیسے سلاطین و صاحبان سطوت کی میزبانی کروں گی) جنت بولی کہ میرا کیا پوچھنا ہے میرے اندر تو بجز ضعفا اور مساکین کے کوئی بھی داخل نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ جنت نے تو (اپنی تقریر میں گویا) خود اقرار کرلیا کہ غلبہ دوزخ کو ہے کہ وہ مخصوص ہے بڑے لوگوں کے لئے۔ اور یہ صرف ضعیف الحال لوگوں کے لئے ہے۔ فرمایا آخرت میں مسکن کا حال اس کے ساکنین کے احوال کا تابع ہوگا کہ اگر مکان کے مکین کبر و نخوت اور خودپسندی والے ہوں گے تو مکین کے کچھ اوصاف اس مکان میں بھی سرایت کریں گے۔ اور اگر ساکنین اہل تواضع اور منکسر المزاج فقرا رہوں گے تو ان کے کچھ اوصاف اس مسکن میں بھی سرایت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جہنم میں جانے والے اہل تکبر و جبارین اور جنت میں جانے والے اہل تواضع و انکسار ہیں۔ لہذا جہنم پر اس میں رہنے والوں کے اوصاف ظاہر ہوئے۔ اور جنت پر اس میں رہنے والوں کے اوصاف نمودار ہوئے۔ پس ظاہری الفاظ میں تو مناظرہ ہے دوزخ اور جنت کا۔ مگر مقصود ہے اظہار دونوں کے باشندوں کی حالت کا۔ لہذا دوزخ نے اپنی دلیل وہ بیان کی جس میں شیخی و انانیت اور ڈینگ مارنا تھا۔ اور جنت نے اپنی وہ دلیل پیش کی جس میں عجز و انکسار و تواضع ہے۔ اگر بغور دیکھو تو دوزخ کے

مقابلہ پر غلبہ درحقیقت جنت ہی کی دلیل کو ہوا کہ مناظرہ کا حاصل یہ ہے گویا جنت نے کہا میرے اندر کوئی نہ آسکے گا۔ بجز ان کے جو اللہ کے مخلص بندے ہیں، صاحب ان تواضع ہیں، خشوع وخضوع والے ہیں، اور اپنے رب کے عارف ہیں۔ اور گویا دوزخ نے کہا میرے اندر کوئی نہ آسکے گا بجز اُن کے جو متکبر ہیں، جابر وظالم ہیں، اپنے رب سے ناواقف وجاہل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے گویا جنت نے کہا کہ میرے اندر صرف محبوبین الٰہی داخل ہوں گے۔ اور گویا دوزخ نے کہا کہ میرے اندر صرف دشمنان خدا داخل ہوں گے۔" ماشاء اللہ کتنا پیارا جواب ہے کہ یہ اشکال (یعنی دوزخ کی جیت کا) بھی دفع ہوگیا اور ساتھ ہی ایک اشکال رفع ہوگیا کہ کوئی کہہ سکتا ہے جنت نے (مناظرہ میں دلیل پیش کرتے وقت) یہ کیوں نہ کہا کہ میرے اندر اللہ کے انبیاء ورسل اور ملائکہ ومومنین داخل ہوں گے کہ اس طرح کہنے سے اس کی جیت ہوتی دوزخ پر۔ اور کمزوری کے گرے ہوئے الفاظ کیوں برتے کہ میرا کیا پوچھتے ہو میرے اندر تو ضعفا اور نیچے درجہ والے ہی جائیں گے، جس سے غلبہ مترشح ہوا جہنم کا جنت کو چاہیے تھا کہ بہترین مخلوق وافضل ترین حضرات یعنی انبیاء ورسل کا ذکر کرتی کہ میرے اندر اشراف الناس داخل ہوں گے۔ یہ اشکال رفع اس طرح ہوا کہ جنت کا مقصود تو یہی تھا اور گویا اس نے یہی کہا بھی۔ مگر عاجزانہ و خاشعانہ کہا (کہ بہترین حضرات کا ذکر کرنے میں پھر وہی تفاخر وبڑائی کا اظہار تھا)۔ اور یہ محض بغرض اظہار مسکنت کیا کہ اس مکان کا ہر مکین تمامی مخلوقات میں اپنے سے زیادہ کسی کو محتاج دیکھتا ہی نہیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو ضعیف ترین اور سب سے زیادہ اپنے رب کا فقیر ومحتاج سمجھے ہوئے ہے۔

ابتداء وحی

(۱۰) بزمانہ ابتداء وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے آنے میں تاخیر ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ آپ لقاء رب کے شوق میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو نیچے گرانے کا ارادہ فرمایا کرتے تھے۔ فوراً حضرت جبریلؑ نظر آتے اور عرض کیا کرتے کہ آپ تو پیغمبر ہیں پروردگار عالم کے (اور فرائض رسالت انجام دینے کے لئے بقاء حیات کی ضرورت ہے)۔ یہ سن کر آپ رُک جایا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا خودکشی ہے جو کہ کبیرہ گناہ ہے

اور اس فعل کا قصد اور ٹیکا ارادہ معصیت ہے اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل اور بعد ہر زمانہ میں تمامی معصیتوں سے معصوم ہوا کرتے ہیں۔ فرمایا ایک شخص کا یہ واقعہ میرے علم میں ہے کہ اُس نے بزمانہ ابتدا رسلوک ایک دن کے اندر اپنے آپ کو دروازہ مکان کے کڑے سے نوے مرتبہ زمین پر پھینکا اور اس کا کچھ نہ بگڑا۔ ایسا رہا جیسے انسان بچھونے پر لیٹ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی حالتوں میں روح کو ذات پر غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اور روح کے لئے ساری کائنات بدرجہ مساوی ہے کہ وہ ہوا میں چارزانو بیٹھتا ہے جیسا زمین پر بیٹھتا ہے۔ اور ہوا میں چت لیٹ کر سوتا ہے جیسے آدمی اپنے بستر پر سوتا ہے۔ بے ضرر ہونے میں اُس کے لئے پتھر اور ریشم اور پانی و اون سب برابر ہیں۔ لہذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا بھی دیتے تو اس میں ذرہ برابر تکلیف و مضرت نہ ہوتی۔ چہ جائیکہ ہلاکت۔ لہذا اس کے عزم میں آپ پر کوئی بھی گرفت نہیں۔ شیخ نے بالکل صحیح فرمایا اہل حال کو ہم دیکھتے ہیں کہ جب اُن پر غلبہ شوق میں وجد طاری ہوتا ہے تو دیوار پر اپنا سر کے دے مارتے ہیں اور اُن کے سر میں گھرونٹ بھی نہیں آتی۔ وہ شخص جنہوں نے نوّے مرتبہ اپنے آپ کو گرادیا وہ خود حضرت ممدوح ہی تھے۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ یہ حضرات خوب جانتے ہیں کہ اپنے آپ کو گرانے میں کوئی مضرت بھی نہیں۔ نیز جو اضطراب اس کا محرک ہوتا ہے وہ بھی رفع نہیں ہوتا۔ صرف ایک طبعی اقتضاء ہوتا ہے جو ایسا کراتا ہے۔ جیسے وہ شخص کہ کھونٹا گاڑتے وقت چوٹ مارے تو کچھ مدد لینے کی خاطر حلق سے ایک آواز نکالا کرتا ہے جو قریب قریب آہ کے ہوتی ہے حالانکہ جانتا ہے کہ اس سے کوئی نفع نہیں مگر وہ اس کا طبعی اقتضا ہوا کرتا ہے۔

(۱۱) حدیث میں آیا ہے کہ محشر میں حق تعالیٰ مومنین کے سامنے ایسی صورت میں آئیگا کہ وہ اس کو پہچانیں گے نہیں پس اس سے پناہ چاہیں گے اور کہیں گے ہم تو اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک ہمارا رب نہ آئے اور وہ جب آئے گا تو ہم اُسے پہچان لیں گے اس کے بعد حق تعالیٰ ایسی صورت میں آئے گا کہ وہ اس کو پہچان لیں گے اور فوراً سجدہ میں گر جائیں گے۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ

پہلی اور دوسری صورت سے کیا مُراد ہے۔ کیونکہ ابن العربی حاتمی نے امام فخرالدین کو خط لکھا تو اس میں ذکر کیا ہے کہ اس کی حقیقت بجز اولیاء اللہ کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ صورت سے مُراد حالت ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی دُو حالتیں ہوں گی۔ پہلی حالت میں مومنین اس کو نہ پہچانیں گے اور دوسری حالت میں اس کو پہچان لیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوست جب اپنے دوست سے باتیں کرتا ہے تو اس کے منہ سے نرمی دیگانگت اور شفقت وتعلقات باہمی کے انوار نکلا کرتے ہیں۔ اور جب کوئی اپنے دشمن سے باتیں کرتا ہے تو ان انوار میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔ بلکہ ہر لفظ روکھا اور بے تعلقی کا نکلتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کی عادت ہے کہ دوست سے گفت گو کرنے میں لہجہ نرم ہوگا پیار کا طرز ہوگا۔ انبساط وبشاشت سے لفظ لفظ لبریز ہوگا۔ اور دشمن سے بات کرنے میں انقباض ہوگا ترش روئی ہوگی۔ اور گرفتگی ورکھاوٹ لفظ لفظ میں بھری ہوگی جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ پہلی حالت میں تو حق تعالیٰ نے خطاب فرمایا تمامی امت کو کہ ان میں اس کے دوست یعنی مومنین اور دشمن یعنی منافقین سب شامل تھے، اس لئے وہ انوار برآمد نہوئے جن کو مومنین اپنے رب کے کلام میں پایا کرتے تھے۔ اور ان انوار سے ان کو واقفیت اس لئے تھی کہ ان کی ذات اور روح میں وہ انوار موجود تھے اور حق تعالیٰ نے عالم دُنیا میں ان کو نصیب فرمار کھے تھے۔ لہذا جب انہوں نے وہ خطاب سُنا (جو انوارِ محبت سے خالی تھا) تو اَعُوذ پڑھی اور کہا کہ تو ہمارا رب نہیں ہے کہ ہمارے اور رب کے درمیان تو ایک خاص علامت ہے (جو کہ اس کی شناخت کا ذریعہ ہے)۔ یعنی وہی انوار جو اُس کے خطاب میں ہوا کرتے ہیں۔ تب حق تعالیٰ نے خطاب کا مقصود صرف مومنین کو بنایا اور وہ انوار جاری فرمادیئے۔ لہذا وہ ان کو محسوس کرتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ یہ تھی وہ دوسری حالت کہ کلام الہٰی میں انوار محبّت پاکر اس کو پہچان لیا۔ پہلی حالت میں انوار محبت اس لئے جاری نہیں فرمائے کہ مخاطبت میں دشمن یعنی منافقین بھی شامل تھے۔ اور دوسری حالت میں دشمنوں پر پردہ ڈال کر خطاب کو دوستوں کے ساتھ مخصوص فرمادیا۔ لہذا کلام کے ساتھ وہ انوار نکلے جن کا وہ اپنے ظاہر و باطن میں مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ جن مومنین نے پہلی حالت میں رب کو نہیں پہچانا اس سے مُراد تمامی مومنین ہیں یا صرف عوام، فرمایا صرف عوام کہ عارفین

توکسی حالت میں بھی ناواقف نہیں رہ سکتے۔ میں نے کہا اور پہلی حالت میں جو خطاب تھا وہ سب کو تھا یا صرف عوام کو؟ فرمایا وہ بھی صرف عوام کو تھا۔ قیامت کے دن ساری باتیں خرق عادت ہوں گی کہ ایک شخص سے حق تعالیٰ کلام فرمائے گا تو صرف اسی کو سنائی دے گا۔ دوسرا شخص کتنا ہی قریب بلکہ اپنی گود میں اس کا سر رکھے کیوں نہ بیٹھا ہو بالکل نہ سنے گا۔ غرض جس سے کلام کرنا مقصود ہوگا بس وہی سنے گا۔ اور دوسروں پر پردہ ڈال دیا جائے گا کتنا ہی اس سننے والے کے پاس کیوں نہ کھڑا ہو۔" ماشاء اللہ شیخ کی تقریر سے یہ شبہ کہ حق تعالیٰ کے لئے آنا اور جانا اور صورت وغیرہ کا ثبوت ہوا جن سے وہ منزہ ہے بالکل رفع ہوگیا۔ اور عقل کے موافق تفسیر صاف ہوگئی۔ علامہ ابن العربی نے بھی یہی لکھا ہے کہ عارفین پہلی حالت میں بھی انجان نہ رہیں گے۔ یہ ناواقفیت صرف عوام محجوبین کی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

قلب

(۱۲) میں نے اس حدیث کی بابت دریافت کیا کہ بندہ کا قلب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے، فرمایا کہ معنوی انگلی مراد ہے یعنی تصرف جو انگلی کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بندہ کا قلب تصرفات خداوندی میں سے دو تصرف کے درمیان ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ دو تصرف سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ایک ذات کا مقتضا اور دوسرا روح کا مقتضا کہ ذات بنی ہے مٹی سے لہذا شہوات کی طرف مائل ہوتی ہے اور روح پیدا کی گئی ہے نور سے۔ لہذا معارف اور حقائق کی طرف جھکتی ہے۔ اس لئے دونوں میں ہمیشہ تصادم و تخالف رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں میں غالب کون ہے؟ فرمایا کہ حرکات میں تو تصرف چلتا ہے روح کا اور اسرار میں تصرف چلتا ہے ذات کا۔ لہذا حرکت کے لحاظ سے روح غالب رہتی ہے اور اپنے سرخبیثت کے اعتبار سے ذات غالب رہتی ہے۔ اور اسی لئے بندوں میں شکرگزار کم ہیں۔ دونوں کی مثال چکی کے دو پاٹوں کی سی ہے کہ روح بمنزلہ اوپر کے پاٹ کے ہے، کیونکہ حرکت وہی کرتا ہے اور ذات بمنزلہ نیچے کے پاٹ کے ہے کہ اندرونی سوزش اسی کا کام ہے۔ اوپر کے پاٹ کی ایسی مثال ہے جیسے دیگچی کے اوپر کی سینی کہ ظاہری طور پر سینی اثر کرتی ہے دیگچی میں (کہ بھاپ روک کر کھانا پکاتی ہے) اور باطنی درجہ میں دیگچی اثر کرتی ہے سینی پر (کہ اندر ہی اندر اس کو تپاتی اور جھلساتی ہے) میں نے عرض کیا کہ علماء نے اس

تفسیر فرشتہ کی تحریک اور شیطان کی تحریک کی ہے۔ فرمایا یہ دونوں تو عارضی اور تابع ہیں، اور اصل وہی ہے جو ہم نے تفسیر کی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ذات کے لئے خواہ پاک ہو یا ناپاک خواطر ضروری ہیں (کہ اچھے یا بُرے خیالات کا قلب پر ورود ہوتا ہے) اور یہی خواطر نجات اور ہلاکت کا سبب ہیں۔ اور فرشتہ وشیطان دونوں تابع ہیں انہیں خواطر کے۔ کہ اگر وہ مستحسن ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے فرشتہ چلتا ہے اور پسندیدہ فعل کراتا ہے۔ اور اگر خواطر بُرے ہوتے ہیں تو شیطان اُس کے پیچھے لگتا اور اپنی خواہش کے موافق کام کراتا ہے۔ کیونکہ ہر خطرہ کا تعلق ذات سے ہے کہ ذات اگر پاک و صاف ہوتی ہے تو اُس کے خطرات بھی پاک صاف ہوتے ہیں۔ اور اگر ذات ناپاک (اور خباثت پسند) ہوتی ہے تو خطرات بھی گندے آتے ہیں۔ محسوسات میں اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے سیر بھر جو لے لو اور سیر بھر چنا اور سیر بھر باقلا۔ اور علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو پیس کر ایک ایک روٹی پکا لو اور پھر کڑھائی میں رکھ کر ان کو جلاؤ۔ اب غور سے دیکھو گے تو ہر روٹی کی بھاپ دوسرے سے جدا ہوگی اور ہر ایک کا دھواں پتہ دے گا کہ میں فلاں غلہ ہوں پس خواطر کی شان ذات کے ساتھ وہی ہے جو بھاپ کی شان اس روٹی کے ساتھ ہے (کہ ہر خطرہ پتہ دے گا کہ خطرہ والی ذات خبیث ہے یا طاہر) پس خواطر کا معاملہ بڑا مہتم بالشان ہے کہ (شقاوت وسعادت کا) سارا مدار انہیں پر ہے اور فرشتہ وشیطان انہیں کے تابع ہیں۔ بہتیرے خواطر ہیں جو انسان کو اسفل السافلین میں پہونچا دیتے ہیں اور اچھے خواطر مقتضاء روح ہیں کہ روح طاہر چیز ہے، اور گندگی خواطر ذات انسانی اور خواہشات نفسانی کے مقتضاء طبعی ہیں۔

حجر اسود

(۱۳) میں نے اس حدیث کے متعلق سوال کیا کہ حجر اسود حق تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے زمین میں" فرمایا یہ تشبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ جو شخص شاہی دربار اور سلطانی بارگاہ میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ جلدی کرتا ہے اور سب سے پہلے بادشاہ کا داہنا ہاتھ چومتا ہے۔ اسی طرح جو شخص رحمت الہیہ اور حفاظت وظل خداوندی میں داخل ہونا چاہے اس کو لازم ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دے کہ اس کا درجہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو داہنے ہاتھ کا درجہ ہے بادشاہ کے نزدیک۔ (امام غزالی نے بھی حرفاً حرفاً یہی لکھا ہے جس کا دل چاہے کتاب التفرقہ میں دیکھ لے)۔

(۱۴) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ (قیامت کے دن) موت کو لایا جائے گا مینڈھے کی صورت میں اور پھر اس کو ذبح کر دیا جائے گا۔" فرمایا یہ حدیث صحیح ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلی ہے، اور مراد فرشتہ ہے مینڈھے کی شکل میں کہ اس کو اہلِ جنت کی لذت اور اہلِ دوزخ کی تکلیف وعذاب کے اضافہ کی خاطر ذبح کر دیا جائے گا۔ اور فرشتوں کی سب میں بڑی مراد یہی چیز ہے اور سجدہ میں بڑھ کر دعائیں مانگتے ہیں کہ الٰہی ہمیں اپنے مومن بندوں کے لیے نعمت اور اُن پر نزول رحمت کا سبب بنا۔ اور مومن کا مرتبہ فرشتہ ہی خوب پہچانتا ہے۔ اور حدیث مذکور کی یہ تاویل ہم نے اس لئے کی کہ موت نام ہے دوست سے دوست کے بچھڑ جانے کا کہ بدن مٹی میں جا ملا اور روح چلی گئی اپنے عالم کی طرف۔ پس دونوں میں جو اتصال واجتماع تھا وہ معدوم ہو گیا۔ اور مینڈھے کی صورت میں فرشتہ کا ذبح ہونا چونکہ بصیرت سے نظر آ رہا ہے لہذا عدم اتصال کو اسی پر حمل کیا جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جنتی جب جنت میں داخل ہوں گے تو عالم دنیا میں جو تکلیفیں ان کو پہونچی تھیں خصوصاً مرنے کی تکلیف کا آپس میں تذکرہ کریں گے۔ لہذا ان پر انعام فرمانے اور ان کو خوش کرنے کے لئے حق تعالیٰ اس کو مینڈھے کی صورت میں لا کر ذبح کر دے گا۔ (کہ لو تمہاری تکالیف کا خاتمہ کر دیا گیا اور اب کوئی کلفت پیش آنے کا احتمال بھی نہ رہا) اور حقیقت میں جس کو ذبح کیا گیا وہ فرشتہ تھا کہ عدمی شئی کو معدوم کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں)۔ واللہ اعلم۔

معجزات

(۱۵) جن حدیثوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات مثلاً کنکریوں کا (دست مبارک میں آ کر) سبحان اللہ پڑھنا۔ تنہ کھجور کا آہ کرنا اور سسکیاں لینا۔ درخت کا سلام کرنا وغیرہ آئے ہیں۔ ان کے متعلق حضرت ممدوح نے فرمایا کہ یہ ان چیزوں کی وہی تسبیح اور گویائی ہے جو دائمی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست اپنے پروردگار سے صرف یہ تھی کہ حاضرین سے پردہ اٹھا دیجئے کہ یہ بھی اس تسبیح کو اُن سے سن لیں (نہ یہ کہ گونگی چیز کو گویائی بخش دیجیئے۔ چنانچہ درخواست منظور ہوئی اور خلاف عادت پردہ اٹھ جانے کی بناء پر معجزہ کہلایا)۔ میں نے کہا کیا ان چیزوں میں بھی حیات اور روح ہے؟ فرمایا حیات و روح تو نہیں ہے لیکن

تمامی مخلوقات خواہ بولنے والی ہو یا خاموش جس وقت بھی اس سے خالق کی بابت سوال کیا جائے گا تو فصیح زبان سے کہے گی کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پس مخلوقات میں یہ تفریق کہ کوئی ناطق ہے (جیسے انسان) اور کوئی صامت ہے (جیسے درخت) اور کوئی حیوان ہے (جیسے بکری و بیل)، اور کوئی جماد ہے (جیسے پتھر اور دیوار) محض باعتبار مخلوقات ہے یا باہمی شناخت کے درجہ میں۔ ورنہ بالنسبۃ الی الخالق سب اللہ سے واقف، اس کے عبادت گزار، اس کے سامنے خشوع و خضوع کرنے والے ہیں، کہ جمادات کے لئے دو پہلو ہیں ایک رُخ لبوئے خالق، اور اس میں وہ اللہ سے واقف، اللہ کے مطیع، اور اس کے عبادت گزار ہیں اور دوسرا رُخ لبوئے مخلوق ہے اور اس میں وہ نہ کچھ جانتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ اور یہی جہت تھی جس کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ حاضرین سے اس کو دور کر دیجئے تاکہ دوسرا رُخ جو لبوئے خالق ہے ان پر ظاہر ہو جائے اور جہت لبوئے خالق کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں یہ فرمایا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔" یہی جواب حضرت ممدوح نے سیدنا داؤد علیہ السلام کے قصہ کا دیا جو مینڈک کے ساتھ پیش آیا تھا کہ حضرت داؤد کو جب خیال ہوا کہ میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہوں تو ایک مینڈک کو دیکھا جس نے عمر بھر اللہ کی تسبیح پڑھی اور ایک لمحہ بھی چپ نہ ہوتا تھا۔ اس وقت آپ کو اپنا ذکر اللہ جس کو کثیر سمجھ رہے تھے بہت ہی تھوڑا معلوم ہوا۔ حضرت کا جواب یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو مینڈک کی حالت کے اس رُخ کا مشاہدہ ہوا جو بجانب خالق تھا اور وہی باطنی حالت ہے جس میں ہر شے کی تسبیح دوامی ہے کہ کسی حال بھی اس میں ضعف و کسل نہیں آتا۔ اور اسی قبیل سے ہے حضرت محمد لہواج کا وہ قصہ جس کو خود حضرت نے ذکر فرمایا۔ اول حسب عادت تقریر کی ایک تمہید اٹھائی اور فرمایا کہ زمین کو بھی علم نصیب ہوا ہے جس سے وہ آگاہ ہے اور اس کو اٹھائے ہوتے ہے۔ جیسے ایک انسان قرآن مجید کو اٹھاتا اور اس سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی ہر جماد کو علم حاصل ہے اور وہ اس کو اٹھائے ہوئے ہے۔

تمام مخلوقات کو معرفت خدا وندی اور اللہ کی تسبیح

میں نے کہا اس سے معلوم ہوا کہ اس میں عقل اور علم ہے۔ پھر اس کو جماد کیسے کہا؟ فرمایا کہ جماد تو ہماری نظروں میں ہے، مگر بالنسبۃ الی الخالق تو عارف ہے۔ اور مخلوق کا کوئی فرد بھی یہ کہنے سے خالی نہیں کہ اللہ میرا رب ہے۔ یہ مضمون ہر مخلوق میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اسی طرح مخلوق کا کوئی فرد بھی اپنے خالق سبحانہ کے سامنے جھکنے اور اس کے خوف وخشیت اور اس کی سطوت سے لرزنے اور کانپنے سے خالی نہیں مگر لوگ چونکہ زمین اور جمادات کی اصل حالت سے ناواقف ہیں۔ اس لئے سمجھتے ہیں کہ ہم بے حس پتھروں پر چل رہے ہیں اور بے جان زمین پر آجا رہے ہیں اور اسی نے ان کو تباہ وہلاک کیا ورنہ زمین جس حالت پر ہے اگر ان کو معلوم ہو جاوے تو ناممکن تھا کہ کوئی شخص بھی اس پر کبھی اللہ کی نافرمانی کرے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں فتح نصیب ہونے سے قبل ایک مرتبہ خولان کے اس نخلستان کی جانب جو علی بن حرز کے روضہ پر وقف تھا خام کھجوریں توڑنے کی نیت سے اپنے شیخ حضرت محمد لہواج کے ساتھ چلا اور ان کو فتح نصیب ہو چکی تھی۔ جب باب الفتوح کے باہر ابن عمر کے گھر پر گزر ہوا اور وہاں ایک چہال واقع تھی تو میں نے کانٹا لے کر اس میں روٹی کا ٹکڑا لگایا اور مچھلی کا شکار کرنا چاہا کہ چہال میں مچھلیاں بکثرت تھیں۔ شیخ نے منع بھی فرمایا مگر میں نے قسم کھائی کہ شکار ضرور کروں گا۔ چنانچہ شیخ میرے ساتھ پانی پر آئے۔ اور میں نے اس میں کانٹا ڈالا۔ اصل پانی کے قریب ایک کنڈ تھا جس میں سے مجھے اللہ اللہ کی آواز آئی۔ میری آنکھ نہ کھلنے پائی تھی کہ جتنے پتھر وہاں پڑے تھے ہر ایک نے باواز بلند کہا اللہ اللہ۔ اور پھر ہر مچھلی نے کچھ الفاظ کہے بجز اس مچھلی کے جس نے کانٹے میں لگا ہوا ٹکڑا کھا رکھا (اور کانٹا اس کے حلق میں پھنسا ہوا) تھا۔ اور اس صدا کا مطلب یہ تھا کہ اللہ سے ڈر، اللہ سے ڈر، اے شکار میں مشغول ہونے والے کیا تجھے خوف خدا نہیں آتا۔ اس وقت مجھے اتنا ڈر لگا کہ اگر کسی کو رسّی میں باندھ کر بہت اونچا اٹھایا جاوے اور نیچے آنکڑے میں سولی قائم کردی جائے کہ وہ (مقعد کے راستہ) بدن کے پار ہو جائے گی تو اس کا خوف بھی اس سے نیچے کے درجے پر ہوتا۔ میں نے کہا کہ اس درجہ آپ کو شدید خوف کیوں ہوا؟ فرمایا جس شخص نے نہ کبھی بیل کو دیکھا ہو اور نہ سنا ہو اور وہ آنکھیں مل کر دفعتۃً کھولے اور دیکھے کہ بے شمار بیلوں کے سامنے کھڑا ہوں تو بھلا اس کا کیا حال ہوگا۔ میں نے

عرض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خلاف عادت ایک امر کے دیکھنے سے یہ خوف لاحق ہوا۔ فرمایا ہاں اس خرق عادت معاملہ کے مشاہدہ سے یہ خوف لاحق ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ان کا یہ خارق عادت کلام آپ نے عربی زبان میں سنا تھا یا جماد کی زبان میں؟ فرمایا کہ جماد کی زبان میں کیونکہ ان کے جماد ہونے کے لحاظ سے اُن کے مناسب لغات اور زبانیں اُن کو دی گئی ہیں۔ اور ان کی سماعت بھی تمام جسم سے ہوتی ہے نہ کہ فقط کانوں سے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ منظر ولی کو صرف ابتدائی حالت میں پیش آیا کرتا ہے۔ ورنہ بعد میں تو صرف فعل الٰہی کا مشاہدہ رہ جاتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے حق تعالیٰ نے اس جماد میں گویائی اور کلام تسبیح وغیرہ پیدا فرمادی ہے، اور یہ خود بمنزلہ خالی برتنوں اور محض تصویروں کے ہیں۔ میں نے کہا کہ جماد ہی کی کیا خصوصیت ہے یہ مشاہدہ تو انسان وغیرہ ذی العقول میں بھی ہوتا ہوگا۔ فرمایا ہاں بلا امتیاز سب ہی چیزوں میں ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ جمادات میں اپنے خالق کی معرفت کا جو حال ہم نے بیان کیا ہے اس کو صرف وہ شخص سمجھتا ہے جو عالم زمین و آسمان سے باہر نکل گیا اور اتنا دور چلا گیا ہو کہ آسمان و زمین اس کو اپنے سامنے ایک کرہ رکھا ہوا نظر آوے۔ ایسا شخص جب اپنی قوی نگاہ سے جو ہر چیز کو پھاڑتی چلی جاوے کسی شے کو دیکھے گا تو اس کو صاف نظر آئے گا اور وہ جمادات کی تمامی مخلوق کو دیکھے گا کہ کوئی اللہ کو سجدہ کر رہی ہے اور کوئی بصورت رکوع اس کے خوف سے سر جھکائے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اور سب سے پہلے خود زمین بھی اس کو رکوع کی صورت میں کھڑی دکھائی دے گی۔ نیز فرمایا کہ ایک روز میں باب الفتوح سے باہر حضرت احمد یمنی کے مزار کے قریب درخت زیتون کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں سارے پتھر کیا چھوٹا اور کیا بڑا اور تمامی درخت اور انکی ٹہنیاں اپنی زبان میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ اس کے سننے سے قریب تھا کہ میں ڈر کے مارے) بھاگ جاؤں۔ پھر میں نے ایک پتھر کی طرف غور سے کان لگائے تو مجھے چند مختلف آوازیں سنائی دیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ پتھر تو ایک، مگر آوازیں کئی۔ اس کا کیا سبب۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کئی پتھروں سے ترکیب کھا کر ایک ہوگیا تھا (اور ہر پتھر سے جدا آواز آرہی تھی) اس لئے متعدد آوازیں ہوگئی تھیں۔" یہ واقعات حضرت ممدوح کو فتح ہونے کے شروع زمانہ میں پیش آئے تھے۔ اور اُسی کے

قریب وہ تذکرہ ہے جو آپ نے جانوروں کے بارہ میں فرمایا کہ ایک بیل جب دوسرے بیل کو دیکھتا ہے تو دن بھر میں اُسے جو کچھ پیش آیا ہے وہ اس سے ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں گھاس کھائی، اور فلاں فلاں پانی پیا، اور فلاں فلاں خیال مجھے آیا وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرا بیل بھی اسی طرح اس کو جواب دیتا ہے۔ اور دونوں اس طرح باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ہماری گفتگو میں حروف اور مخارج ہوتے ہیں اُن کی گفتگو میں (حروف کا) مقدور مخدوف ہونا اور لفظوں کا جُدا جدا ہونا پایا جاتا ہے۔ مگر وہ ہم سے مخفی کر دیا گیا ہے اور بجز آواز اور ان کی چیخ یا ڈروک کے اور کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ یہی حال تمامی جانوروں اور درختوں اور پتھروں کے کلام کا ہے (کہ ہم اس کو سمجھتے نہیں) جیسا کہ ان سے ہمارے کلام کی سماعت جو مخارج اور حروف تہجی سے مرکب ہوتا ہے۔ پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ مگر جس کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی ہے وہ اُن کی ساری باتیں سنتا اور ان کا مطلب سمجھتا اور جُدا جُدا فقرہ کو محسوس کرتا ہے کہ یہ سمجھنا روح سے ہوتا ہے اور روح مقاصد و اغراض کو اس سے پہلے سمجھ لیتی ہے کہ ان کو زبان سے ظاہر کیا جائے۔ تم دیکھو گے کہ ایک صاحب فتح ملک عرب کا ہے اور دوسرا صاحب فتح ملک عجم کا اور تمام دن دونوں باتیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ بات کرتا رہتا ہے اپنی عجمی زبان میں اور دوسرا اس کو جواب دیتا رہتا ہے اپنی عربی زبان میں۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے بھی سُنا کہ بسا اوقات قضاء حاجت کی غرض سے میں بیت الخلاء میں جاتا اور پانی کو ذکر کرتے اور اللہ جل جلالہٗ کا نام لیتے ہوئے سنتا تو حاجت رفع کئے بغیر باہر نکل آیا کرتا تھا۔ (یہ راز ہے جمادات کے ذکر اللہ اور باطنی تسبیح کو مخلوق کی سماعت سے محجوب رکھنے کا کہ نام خدا کی قصداً ہتک حرمت کر کے روحانی امراض میں مبتلا ہوں گے۔ یا ذاکر و شاغل بحق کو نجاست میں آمیز کرنے سے وحشت کھا کر قضاء حاجت نہ کر سکیں گے تو جسمانی امراض کا شکار بنیں گے)۔ واللہ اعلم۔

حضرت موسیٰ سے سوال (۱۶) بزار میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ رب العزت کے کلام کی کیفیت ہم سے بیان فرمائیے اور یہ کہ آپ نے اس کو کیسے سُنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شدید ترین کڑک

اور گرج کی آواز کہ فوراً (کلیجہ شق کرکے) دم نکال دے، اعلیٰ درجہ کی حلاوت میں اگر سنی جائے تو وہ تمثیل ہے اللہ جل جلالہ کے کلام کی۔ نیز موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے رب العزت کیا آپ نے تمامی کلام سے میرے ساتھ کلام فرمایا تھا؟ ارشاد ہوا کہ تمہارے ساتھ صرف دس ہزار زبان کی قوت سے کلام کیا تھا۔ اور اگر تمامی کلام سے بات کرتا تو اسی وقت تم (رانگ کی طرح) پگھل جاتے (اور برداشت نہ کرسکتے) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ گرج اور کڑک کی آواز سے مراد حقیقت نہیں کہ وہ اللہ کے حق میں محال ہے (کیونکہ تجدّد و حدوث کو چاہتی ہے جس سے ذات باری منزہ ہے) بلکہ اس کا لازم یعنی خوف مراد ہے کہ یک دم روح نکال لینے والی کڑک اور گرج کی آواز سنتے وقت جو ناقابل بیان خوف انسان کو لاحق ہوتا ہے، اتنا ہی خوف اور ہیبت تمامی اجزاء بدن میں اس کو لاحق ہوتی ہے جو اللہ کا کلام سنتا ہے۔ حتیٰ کہ ذات انسانی کے ہر جوہر کو تنہا تنہا اتنا خوف لاحق ہوتا ہے جتنا پورے انسان کو لاحق ہوتا ہے کہ ہر رگ اور اس کا ہر جز لرزتا ہے اگر حق تعالےٰ کا لطف وکرم شامل حال نہ ہو تو عجب نہیں پگھل جائے۔ اور اعلیٰ حلاوت سے مراد وہ الطاف وسیعہ اور رحمات کاملہ اور انعامات جلیلہ ہیں جو اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئے۔ نیز وہ لذت مراد ہے جو اس کلام ازلی کے سننے والے کی ہر ہر رگ کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ اور یہ ارشاد کہ میں نے دس ہزار زبان کی قوت سے کلام کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے حجاب (جو زیادہ قوت والے کلام کی سماعت سے مانع تھا) اٹھایا۔ کہ کلام باری تعالیٰ کے اتنے مدلولات انہوں نے سن لئے جن کو اگر ہزار زبانیں ایک لمحہ کے اندر ادا کریں تو ان کی مقدار ان مدلولات کلام الٰہی کے برابر ہوتی۔ اس کی نظیر وہ ہے جو صاحب فتح ولی کے بارہ میں آئے گی کہ نہ مختلف آوازیں اس پر مخلوط ہوتی ہیں اور نہ ایک آواز کی سماعت دوسری آواز کے سننے سے مانع ہوتی ہے (بلکہ سب جدا جدا سنائی دیتی ہیں) لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ فرض کرو دس ہزار زبانیں موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوں اور موسیٰ علیہ السلام ان کی طرف کان لگائیں اور ایک لحظہ میں سب کو سمجھ لیں (کہ ایک کو پہلے سمجھنا اور دوسرے کو بعد میں یہ ترتیب اس میں کچھ نہ ہو) تو یہ شان تھی اس کلام جس کی

طرف حدیث مذکور میں اشارہ ہوا ہے - مگر یہ سماعت روح کی تھی نہ کہ ذات کی۔ اس لیئے کہ روح ہی کے علوم ہیں جن میں ترتیب نہیں ہوتی - جب وہ کسی علم مثلاً نحو یا فقہ کی طرف توجہ کرے گی تو اس کے تمامی مسائل ایک لحظہ کے اندر حاضر ہو جائیں گے اور یہی حال روح کی قرارت کا ہے کہ مثلاً جس وقت ارادہ کرے گی قرآن مجید کی تلاوت کا اس کو تمامی حروف کے ساتھ ان کے صحیح مخارج اور دیگر ساری خوبیوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ایک لحظہ کے اندر پڑھ جائے گی۔" یہ جواب میں نے حضرت ممدوح سے آپ کے شروع زمانہ میں سنا تھا کہ میں دُرِ منثور لیئے ہوئے مسجد علوین میں بیٹھا ہوا تھا اچانک اس حدیث پر نظر گئی اور میں نے اپنے دل میں کہا کاش حضرت شیخ موجود ہوتے تو اس حدیث کا مطلب دریافت کرتا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت تشریف لائے اور میرے سامنے بیٹھ گئے - میں نے کتاب کھولی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو تمنا ہی کر رہا تھا کہ آپ سے اس کتاب کی ایک حدیث کا مطلب دریافت کروں - فرمایا ہاں پوچھو میں تو جواب ہی کی غرض سے آیا ہوں - چنانچہ میں نے حدیث پڑھی اور حضرت نے یہ جواب دیا۔

حدیث جبریل

(۷) مسلم میں جبریلؑ والی حدیث ہے کہ انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان اور اسلام اور احسان کی بابت دریافت کیا آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب وہ چلے گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس شخص کو جو سوالات کر رہا تھا واپس لاؤ - چنانچہ صحابہ نے تلاش کیا مگر ان کا پتہ نہ لگا۔ تب حضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جبریلؑ تھے (اور وہ مجھ سے کبھی نہیں چھپ سکے بجز اس مرتبہ کے (کہ اس وقت میں نے اُن کو بالکل نہ پہچانا)۔ اس کے متعلق حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرت جبریل کے چھپے رہنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کمال عظمت و رفع مرتبت کا اظہار ہے جس کی حقیقت ناقابل بیان ہے - اور صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس پر حق تعالیٰ کرم فرمائے اور یہ اس لیئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض وقت حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں اتنا استغراق ہوتا تھا کہ ذات مطہر مع اپنے تمامی تعلقات اور اجزاء و عروق کے اس عالم سے بے تعلق ہو جاتی تھی اور نور ذات محمدی نور حق سبحانہٗ میں محو ہو جاتا تھا کہ ماسوا سے انقطاع کلی ہوتا تھا۔ مگر اس

بے تعلقی میں بھی ذات مطہرہ (غلطی و خطا سے) محفوظ رہتی تھی کہ حق کے سوا کوئی فعل صادر نہ ہوتا تھا اور بجز صدقِ کے کوئی لفظ زبانِ مُبارک سے نکلتا نہ تھا۔ فرشتے جب دیکھتے تھے کہ یہ حالت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوئی اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی مخلوقات

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا اس کی طاقت نہیں رکھتا نیز یہ کہ اس حالت میں حضرت کو ہمارا ادراک وشعور نہ ہو سکے گا تو وقت کو غنیمت سمجھ کر جلدی کرتے اور حاضر خدمت ہو کر آپ سے ایمان کی حقیقت معلوم کیا کرتے اور آپ کو اپنا شیخ بنا کر ایمان اخذ کیا کرتے۔ چنانچہ بدوی شکل میں فرشتہ آتا اور عرض کرتا تھا کہ یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کے سچے رسول ہونے کا اقرار کرنے کے لئے آیا ہوں لہذا مجھے تعلیم فرمائیے کہ اللہ ورسول پر کس طریق سے ایمان لاؤں۔ چنانچہ حضرت اس کو تبلاتے (اور انوار سے مالامال فرمایا کرتے) تھے۔ میں نے عرض کیا کہ فرشتوں کو ایمان سیکھنے اور حضرت سے اخذ کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور مقرب فرشتے ہیں؟ فرمایا ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی شان بہت ہی بڑی ہے اور جس نے بھی حضرت سے ایمان اخذ کیا اور پھر اس کو بدلا نہیں (بلکہ بجنسہٖ محفوظ رکھا ہے) نہ اس کو پُل صراط دیکھنی پڑی ہے اور نہ دوزخ۔ لہذا فرشتے اس وقت کو غنیمت سمجھتے تھے۔ میں نے کہا کہ کسی دوسرے وقت دریافت کیوں نہیں کرتے تھے؟ فرمایا جب (استغراق کی حالت ختم ہو جاتی اور) آپ اپنے حس وادراک کی طرف لوٹ آتے اور فرشتے اس حالت شعور کو معلوم کر لیتے اور سمجھتے تھے کہ اب حضرت ہم کو پہچان لیں گے تو وہ بدوی شکل نہ بنا سکتے تھے (کہ چھپا رہنا ناممکن ہے) اور اس صورت میں ذات محمدی سے خاص نور اور مدد لئے ہوئے جواب نہ نکلے گا۔ بخلاف حالت انقطاع لیسوئے خالق کے جبکہ ذاتِ محمدی کو بات کرنے والے کی صرف آواز اور بول چال مسموع ہوتی ہو (اور بوجہ استغراقِ تام کے اس کا ادراک نہ ہوتا ہو کہ بات کرنے والا کون ہے) تو اس حالت میں آپ کا جواب اُن کی حسب خواہش وحسب مُراد نکلے گا۔ میں نے پوچھا کیا فرشتے پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہ حالت ہے جس میں حضرت اپنے حس کی طرف لوٹ آئے اور یہ وہ حالت ہے جس میں اللہ کی طرف انقطاع تام ہے؟ فرمایا یہ نہ فرشتوں پر چھپا

رہ سکتا ہے، نہ اُن (اولیاء امت) پر جنھیں حق تعالیٰ نے بصیرت عطا فرمائی اور قلب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضور کا خاص معجزہ

(۱۸) حدیث میں ہے کوئی نبی ایسا نہیں جسے ایسا (معجزہ) نہ دیا گیا ہو جو بشر کے ایمان لانے کو کافی ہے اور مجھے جو چیز عطا کی گئی ہے وہ خالص وحی ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے، اس کا مطلب حضرت ممدوح نے بیان فرمایا کہ تمامی انبیاء علیہم السلام کے معجزات اُن کی ذات ترابی ہی کی جنس اور اسی کے متعلقات میں سے تھے جن میں سے بعض کی قوت کبر سنی میں عطا کی جاتی تھی۔ اور بعض کی قوت صغر سنی ہی میں ذات کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کا ظہور بڑی عمر ہو جانے پر ہوا کرتا تھا۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ خالص حق تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے نور اور مشاہدہ اور ہمکلامی کی نوع ہی سے ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ حضرتؐ میں ذات اور عقل اور نفس اور روح اور سِرّ غرض ہر اعتبار سے قوت اتنی زیادہ تھی کہ جو مشاہدہ آپ تنہا کو عطا ہوا تھا اگر تمامی انبیاء علیہم السلام پر تقسیم کیا جاتا تو وہ متحمل نہ ہو سکتے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ خالص وحی ہے جس کی تلاوت کیجاتی ہے۔ یعنی میرا معجزہ دیگر انبیاء کے معجزات کا ہم جنس نہیں (بلکہ محض شاہی صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی کلام) اگرچہ اُن حضرات کے معجزات بھی اتنے جلیل القدر اور عظیم الشان تھے کہ تمامی بشر کو مومن بنا دینے کے لئے کافی و وافی ہیں۔ الحاصل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ (یعنی قرآن مجید) سب کے معجزات سے بالاو مافوق ہے کہ آپ کی ذات سے نہیں بلکہ ذات حق سبحانہٗ سے ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک تمثیل بیان فرمائی کہ ایک بادشاہ ہے اور جب اُس کے گھر میں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو اُس نے کسی مقام پر اس کو بھیج دیا کہ تربیت پاوے اور پھلے پھولے مگر ہر ایک کے ساتھ نشانی کے طور پر ایک قیمتی لعل یا یاقوت بھی بھیجتا رہا جس سے رعایا کو علم ہو کہ یہ شاہزادہ ہے اور ہمارے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ آخر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کو بادشاہ نے اپنے پاس رکھ لیا اور خود ہی اس کی تربیت اور تمامی معاملات کی نگہداشت فرمائی۔ دیکھو اس شاہزادہ کو باپ کی معرفت (اور اس کے مرتبہ وشان کی واقفیت) جتنی کامل نصیب ہوگی اور باپ کے اسرار جتنے اس میں سرائیت

کریں گے۔ بھلا دوسرے بھائیوں کی معرفت وتبر بدری سے اس کا کیا مقابلہ ہوسکتا ہے بعض صحابہ خواہش کیا کرتے تھے کہ آپ سے بھی کوئی معجزہ دیگر انبیا علیہم السلام کے معجزات کی قسم میں سے ظاہر ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ادھر تو اُن کی خواہش پر جاتی اور اُدھر اُس مخصوص عنایت الہٰی پر جو خاص آپ کی ذات پر مبذول ہوئی تھی، اس لئے آپ کو بڑی شرم آتی اور اس کی مثال ایسی ہو جاتی تھی جیسے کسی کو بادشاہ نے اپنا سارا ملک سپرد کر دیا اور اختیار دے دیا کہ جو چاہے تصرف کرے اور اس کا کوئی رفیق اس سے خواہش کرے کہ فلاں گاؤں میں کچھ تصرف اور عزل ونصب کر کے دکھائیں نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ جو انوار اسرار قرآن مجید میں رکھے ہوئے ہیں اور جن مقالات عالیہ واحوال صافیہ پر مشتمل ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے کپڑا تراش کر کرتا پاجامہ، ٹوپی، عمامہ غرض جو کپڑے بھی پہنے جاتے ہیں سب ہی سلوائے اور تیار کر کے سامنے رکھ دیئے۔ اب اِک نگاہ ڈالو ان کپڑوں پر اور ایک نگاہ ڈالو تمام مخلوقات پر، تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان سب کے پہننے اور متحمل ہونے کی طاقت بجز سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی میں بھی نہیں ہے اور اس کی وجہ وہی قوت ہے جو خصوصیت سے آپ کی ذات مقدسہ کو دی گئی ہے۔ نیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کا دوسروں کے لیے ناقابل برداشت ہونا بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مشاہدہ بقدر معرفت ہوا کرتا ہے۔ اور معرفت الہیہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (آفرینش عالم سے بھی قبل) اُس وقت حاصل ہوئی جب کہ صرف محبوب اپنے حبیب کے پاس تھا اور تیسرا کوئی نہ تھا۔ چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول المخلوقات ہیں اور اسی وقت آپ کی روح شریفہ کو انوار قدسیہ اور معارف ربانیہ سے اس درجہ سیراب کیا گیا تھا کہ ہر طالب نور کے لئے اصل اور ہر مستمند ضیاء کے لئے مادہ بن گئی تھی (جو شرح ہے اس حدیث کی کہ میں نبی بن چکا تھا اور حضرت آدمؑ ابھی مٹی اور پانی میں تھے یعنی پتلہ ہی بنے ہوئے تھے)۔ پھر جب دنیا میں آپ کے ظہور اور ولادت کا وقت آیا اور آپ کی روح مطہرہ آپ کی ذات مقدسہ میں داخل ہوئی تو چونکہ کمال محبت اور رضا کے ساتھ اس کی رہائش ہوئی اس لئے روح اپنے معارف و اسرار اس کو عطا کرتی رہی اور ذات مقدسہ بچپن ہی سے تدریجی طور پر معارف ومعارج

اہلیت

میں ترقی کرتی اور عروج پاتی رہی۔ حتیٰ کہ عمر شریف چالیس سال کی ہوئی تو وہ پردہ جو ذات اور روح کے درمیان تھا اٹھ گیا اور دونوں کا باہمی حجاب بالکل محو ہوگیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مشاہدہ حاصل ہوا جو دوسرے کے لیے) ناقابل برداشت ہے۔ حتیٰ کہ آپ آنکھوں سے دیکھنے کی طرح اس کا مشاہدہ فرماتے تھے کہ تمامی مخلوق کو حرکت دینے والا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والا صرف وہی حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے کہ ساری مخلوق ایسی ہے جیسے خالی ظروف اور آوے میں پکائے مٹی کے برتن، جو نہ اپنے آپ کو کوئی نفع پہونچا سکتے ہیں نہ کسی قسم کا کوئی نقصان۔ اُس وقت حق تعالیٰ نے آپ کو پیغمبر بنایا (اور غار حرا میں خلعت نبوت پہنا کر اصلاح خلق کے لیے مبعوث فرمایا) کہ آپ اس مشاہدہ میں تھے اور تمامی مخلوقات آپ کی نظروں میں خالی اجسام اور محض تصویریں بنی ہوئی تھیں تاکہ آپ ان کے لئے مجسم رحمت بنیں اور (ایذا رسانی وسب وشتم کا) کوئی فعل ان کی طرف سے نہ سمجھیں کہ سبب ہو بددعا دینے کا اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ جیسا کہ آپ سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کا اپنی امتوں کے ساتھ برتاؤ ہوا۔ اور اسی لئے حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ دیگر انبیاء نے اپنی دعاؤں کو دنیا میں پورا کر لیا (کہ قوم کے ہلاک ہوجانے کی بددعا فرمائی) اور میں نے اپنی اس دُعا کو قیامت کے دن شفاعت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ کہ آپ کی وہ دُعا بھی (جو بصورت شاہی پروانہ ہر نبی کو عطا ہوئی ہے) رحمت بنی اور ارشاد خداوندی وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کا مصداق اور ارشاد رسالت مآب اِنَّمَآ اَنَا رَحۡمَۃٌ مُّهۡدَاۃٌ لِّلۡخَلۡقِ کا مصداق ظاہر ہو۔ اور یہ تو اس مشاہدہ کے ابتدائی زمانہ کا حال تھا، چہ جائیکہ ہر لحظہ آپ کو ترقی ہوتی رہی اور ہر لمحہ آپ بے کیف مقامات میں اوپر چڑھتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ اب اوپر کوئی درجہ بھی باقی ہے؟ فرمایا ہمارے حق تعالیٰ سبحانہ کے کمالات کی تو کوئی انتہا نہیں۔ اگر آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے اس زمانہ تک بھی زندہ رہتے تو رکتے نہیں بلکہ ہر لحظہ ترقی ہی کرتے رہتے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مشاہدہ تو تمامی انبیا علیہم السلام کو حاصل ہوگا اور کسی وقت بھی نہ ہٹتا ہوگا ورنہ اگر ان کا ایمان کہ اللہ ہی خالق ہے ہمارا اور ہمارے افعال کا محض ایمان بالغیب ہوتا تو بمنزلہ عام

مومنین ہی کے نہ بن جاتے۔ فرمایا بے شک مشاہدہ ان حضرات کو بھی تھا مگر پردہ بالکلیہ دور نہ ہوا تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بالکلیہ اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ممدوح نے کشفی حقائق بیان فرمائے جو عقل سے بالا ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ قرآن مجید میں انوار قدسیہ اور معارف ربانیہ اور اسرار ازلیہ اس درجہ بالا از طاقت ہیں کہ سیدنا موسیٰ صاحب تورات اور سیدنا عیسیٰ صاحب انجیل اور سیدنا داؤد صاحب زبور علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر زندہ رہتے اور نزول قرآن کا زمانہ پاتے اور اس کو سنتے تو قرآن کا اتباع اور تمامی اقوال و افعال میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتداء کئے بغیر نہ رہتے۔ بلکہ سب سے پہلے دعوت محمدیہ پر لبیک کہتے اور آپ پر ایمان لاتے اور جہاد کے لئے تلوار لے کر آپ کے آگے آگے ہوتے" ابن حجر نے بھی متعدد طرق سے اس مضمون کی حدیث نقل کی ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو ضرور میرا اتباع کرتے۔

(۱۹) قبیلہ اشعریین کی ایک جماعت نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سواری کے لئے چند اونٹوں کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا واللہ میں نہ تم کو سواری کے اونٹ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں کہ تم کو دے دوں۔ اس کے بعد آپ نے ان کو اونٹ عطا فرما دیئے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق سے حق کے خلاف اور صدق کے سوا کوئی کلام نکل ہی نہیں سکتا (پھر اختیاری شے کا انکار فرمانا اور قسم کھا کر کہنا کہ نہ میں دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں، کیونکر صحیح ہو سکتا ہے)
فرمایا بے شک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول حق ہے
اور ہر کلام سچا مگر آپ کا کلام حسب مشاہدہ اور حسب باطن نکلا کرتا تھا اور مشاہدہ کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی تو آپ ذات الٰہی کے مشاہدہ میں ہوا کرتے تھے اور اس کی لذت و کیفیت ناقابل بیان ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی اس کے مماثل نہیں۔ یہ وہ لذت ہے جو اہل جنت کو (دیدار خدا کے وقت) جنت میں نصیب ہوگی۔ اور کبھی ذات باری اور اس کی طاقت اور غلبہ و اقتدار کے مشاہدہ میں ہوتے تھے۔ اور اس حالت میں مشاہدۂ قوت و غلبۂ سطوت کے سبب ایک خوف اور قلق و اضطراب ہوتا تھا ان دونوں مشاہدوں میں آپ مخلوق سے غافل ہو جاتے اور کسی کو بھی نہ دیکھتے

سکتے اور اس کی کچھ تفصیل حضرت جبریلؑ کو نہ پہچان سکنے کی حدیث میں گزر چکی ہے۔
اور کبھی آپ ممکنات کے اندر قوت الہیہ کے مشاہدہ میں ہوتے اور قدرت کو تمامی ممکنات
میں ساری و جاری دیکھتے تھے۔ اس حالت میں آپ کی ذات مطہرہ باطن سے غافل
ہو جاتی اور ذات کے افعال باقی رہ جاتے تھے۔ اس تیسرے مشاہدہ میں احکام شرعیہ
کی تعمیل اور مخلوق کی تربیت و تعلیم اور ان کو اللہ تک پہونچانے کی خدمت انجام پاتی تھی۔
پس جو کچھ بھی زبان مبارک سے نکلتا تھا ان تین مشاہدوں سے باہر نہ ہوتا تھا۔
کہ کلام فرماتے وقت کبھی آپ پہلے مشاہدہ میں ہوتے اور کبھی دوسرے مشاہدہ میں
اور کبھی تیسرے مشاہدہ میں۔ اور یہ حدیث دوسرے مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے کہ
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ذات باری اور اس کی قوت و قدرت کے مشاہدہ
میں اپنی ذات سے بھی غافل تھے چہ جائیکہ دوسرے کا خیال۔ اشعریین کی درخواست
کہ ہمیں سواری کے لئے اونٹ دیدیجئے اتفاق سے اس مشاہدہ کی حالت میں واقع
ہوئی۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ نہ میں اونٹ دوں گا اور نہ میرے پاس ہیں۔ اور
بات بالکل سچی فرمائی۔ مگر جب آپ مشاہدہ کائنات کی طرف آئے اور اتفاق سے
اسی وقت آپ کے پاس اونٹ آگئے تو آپ اس مشاہدہ کے حکم پر چلے اور اس کا مقتضا
تھا کہ اتباع ہو احکام الہٰی کا اور ادا ہوں حقوق خلق اللہ کے، وہ جاری ہوا، چنانچہ
آپ نے پوچھا کہ اشعریون کہاں گئے۔ اس پر وہ بلائے گئے اور حضرت نے ان کو اونٹ
عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا بھی کہ یا رسول اللہؐ آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ ہمیں عطا
نہ فرمائیں گے اور پھر عطا فرما دیئے۔ مگر حضرت نے وہ جواب دیا جو بتا رہا ہے کہ
اول قسم کا کھانا اس حالت کے موافق تھا جس کو اس وقت کا مشاہدہ مقتضی ہو رہا
تھا کہ آپ اپنے ہی نفس پر اختیار نہ رکھتے تھے چہ جائیکہ اونٹوں کا دینا) فرمایا
کہ میں نے تم کو سواری کے لئے اونٹ نہیں دیئے بلکہ اللہ نے دیئے ہیں۔ یعنی میں
نے قسم یہی تو کھائی تھی کہ میں نہ دوں گا اور نہ میرے پاس اونٹ ہیں جن پر تم کو
سوار کر دوں اور یہ واقعہ ہے کہ تم کو سواری کے اونٹ دینے والا حق تعالیٰ ہے نہ کہ
میں۔ یہ تو اسی کی اطلاع ہے کہ دہن مبارک سے جو نکلا تھا وہ حق اور سچا تھا بعض
نے عرض کیا کہ پھر آپ نے قسم کا کفارہ کیوں دیا جیسا کہ اس حدیث کے آخر میں ہے

کہ آپ نے فرمایا میں نے کبھی ایسی قسم نہیں کھائی کہ اس کے خلاف کو بہتر سمجھوں اور اس کا کفارہ نہ دوں، اور اس کو اختیار نہ کروں جو بہتر ہے، حضرت ممدوح نے فرمایا اس قصہ میں حضرت نے کفارۂ قسم نہیں دیا۔ اور حدیث میں آن کا ذکر ایک مستقل کلام اور مسئلہ کا اظہار اور قاعدۂ شرعیہ کی تعلیم ہے۔ باقی آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اس واقعہ میں قسم کا کفارہ دینا قطعاً صحیح نہیں ہے (حضرت حسن بصریؒ وغیرہ اکابر علماء کی بھی یہی تحقیق ہے)۔ اس کے بعد حضرت ممدوح نے فرمایا کہ پہلے مشاہدہ کی مثال جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اس کی لذت اہل جنت کی سی لذت ہے، ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ آوے جس کی سطوت وجلال مشہور ہتھیار اور ہر قسم کے آلاتِ قتل موجود ہوں مگر بادشاہ اپنے ہتھیار علیحدہ کردے، اور آلات قتل کو پرے رکھ دے، اور گھوڑے سے اتر آوے، اور اپنی رعایا میں سے ایک شخص کو بلا دے اور اس کے ساتھ انبساط وخوش طبعی کرنے لگے، اور فرح وسرور کے تمامی سامان انتہائی درجہ پر پہونچا دے حتیٰ کے اس کو اپنے ساتھ لے کر ایک کپڑے میں سو جاوے۔ بھلا کس زبان سے اس شخص کی خوشی اور لذت کا واقعہ ادا کیا جائے۔ اس کی قدر ومنزلت کا اندازہ کون کر سکتا ہے، اور کون سے لفظ ہیں جن سے اس کی اصل حقیقت ظاہر کی جا سکے۔ اس مثال سے اس مشاہدہ کی لذت کا برائے نام کچھ اشارہ نکلے گا۔ ورنہ حقیقت میں وہ کہاں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس مشاہدہ والے کو ایک سکون و فرح اور خوش دلی وانشراح صدر کے علاوہ ایسی عجیب لذت حاصل ہو گی جو اس کی رگوں میں، گوشت میں، خون میں، ہڈی میں، اور بال بال اور روئیں روئیں میں غرض تمامی جواہر ذات میں سرایت کئے ہوئے ہو گی۔ حتی کہ اگر اس کا ایک بال لے کر اس لذت پر نظر ڈالیں جو اس میں موجود ہے تو وہ مساوی ہو گی اس لذت کے جو اس کی عقل اور اس کے قلب میں موجود ہے۔ کچھ بھی کم نہ ہو گی۔ پھر سب سے بڑی لذت مثلاً مجامعت کو اس لذت مشاہدہ کے لاکھویں حصہ بھی بنائیں، اور پھر اس مجموعہ کا ستر کروڑ کا ایک جزو قرار دیں، اور یوں کہیں کہ مشاہدہ کی لذت اس کا عشر ہے تب بھی اس لذت کے قریب قریب تک نہ پہونچیں گے۔ اور دوسرے مشاہدہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا مگر اس وقت جب کہ وہ اپنے اسلحہ اور

قہر وسطوت میں تھا تو گو پہلی لذت کا کچھ اثر اس مشاہدہ میں بھی موجود ہوگا (کہ آخر مشاہدہ ہے سلطان ذی شان کا) مگر اس کے ساتھ ہی ایک ناقابل برداشت ہیبت وخوف اور دہشت بھی ہوگی کہ جو شخص بادشاہ کو گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لیئے ہوئے، اس کو حرکت دیتے، اور ڈراتے، دھمکاتے ہوئے دیکھتا ہے تو جو ڈر اور دہشت اس پر طاری ہوتی ہے اس کا حال کچھ نہ پوچھو، پہلے مشاہدہ میں کچھ نمونہ ہے خواب کا اور دوسرے مشاہدہ میں مشابہت ہے بیداری سے۔ کہ اس میں مشاہدہ جلال وسطوت کی وجہ سے قلق واضطراب ہوتا ہے۔ (مگر اغیار سے بے خبری دونوں میں ہوتی ہے) اور تیسرے مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں کہ میرے قلب پر ...... ایک بادل سا چھایا کرتا ہے (یعنی مشاہدۂ ذات مستور ہو کر مشاہدۂ قدرت در کائنات کی طرف آنا ہوتا ہے) پس میں استغفار کیا کرتا ہوں، چونکہ ساری مخلوق کو بھی جمع کر لیا جائے تو ان میں طاقت نہیں کہ پہلے اور دوسرے مشاہدہ میں دائماً رہ سکیں اور ضروری ہے کہ راحت پانے کے ...... لیئے تیسرے مشاہدہ کی طرف نزول کریں لہذا جب آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس مشاہدہ کی طرف اُترتے تھے تو اُس کو گناہ قرار دیتے اور استغفار کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

(۲۰) جب میں نے حضرت ممدوح سے ہر سہ مشاہدہ کی تقریر سُنی اور یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی کلام ان سے باہر نہیں نکلتا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اشکال اُسی کو پیش آتا ہے جو اس کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ حضرتؐ کا ہر قول سچا اور ہر کلام کسی بارہ میں بھی ہو بہر حال حق ہوتا ہے تو میں نے تابیر نخل والی حدیث پیش کی جس میں مجھے اشکال رہتا تھا کہ صحیح مسلم میں ہے حضرات صحابہؓ درختہائے کھجور کی تابیر کر رہے ہے (یعنی نر درخت کے پھول مادین درخت پر ڈال رہے) تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر گزر ہوا تو دریافت فرمایا یہ کیا کر رہے ہے؟ عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس سے پھل اچھا آتا ہے۔ فرمایا اگر یہ نہ کرو تب بھی پھل اچھا آوے۔ چنانچہ صحابہؓ نے تابیر نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھجور اچھی نہ آئی بلکہ ردی آئی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کھجوروں کو

تابیر نخلہ

دیکھا تو فرمایا کھجور کو کیا ہوگیا کہ ایسی آئی صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے
ایسا ایسا فرمایا تھا تب آپ نے فرمایا تم اپنی دنیا (کی تدبیروں) سے زیادہ واقف ہو۔
حضرت ممدوح نے فرمایا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد" اگر تابیر نہ کرو
تب بھی پھل اچھا آوے۔" بالکل احق اور سچا کلام ہے۔ مگر دہن مبارک سے اُس
کے لئے نکلا ہے جس کو پختہ یقین ہو کہ حق تعالیٰ ہی فاعل مطلق ہے۔ اور پختگی
یقین اس پر مبنی ہے کہ فعل الٰہی کا تمامی ممکنات میں بذات خود بلا واسطہ و بلا سبب
ساری ہونا مشاہدہ کرے کہ نہ کسی ذرہ کو سکون ہوتا ہے نہ بادل کو حرکت، نہ قلب کو
اضطراب ہوتا ہے نہ رگ میں پھڑک، نہ پلک کی کوئی جھپک، اور نہ ابرو کا اشارہ مگر یہ
کہ فاعل بلا واسطہ حق تعالیٰ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ایسا مشاہدہ
فرماتے تھے جیسے عام لوگ امور محسوسہ کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں۔ کہ یہ مضمون
آپ کی نظر سے نہ بیداری میں غائب ہوتا تھا نہ بحالتِ خواب۔ اس لئے کہ آپ کا
قلب جس میں یہ مشاہدہ تھا کبھی سوتا نہیں تھا۔

اور ظاہر ہے کہ اس مشاہدے والے کی نظر سے اسباب گر جائیں گے
اور ایمان بالغیب سے ترقی کر کے شہود و عیان تک پہونچے گا لہذا اس کو وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ
وَمَا تَعْمَلُوْنَ ہ میں مشاہدۂ دائمی ہوگا جو نظر سے اوجھل نہ ہوگا۔ اور وہ
یقین نصیب ہوگا جو اس مشاہدہ کے مناسب ہے۔ یعنی آیت شریفہ کے معنی پر (کہ
بیشک اللہ ہی نے ہمیں پیدا کیا ہے اور وہی ہمارے تمامی اعمال و افعال کا خالق ہے)
ایسا پختہ یقین ہوگا کہ غیر اللہ کی طرف کسی فعل کے منسوب ہونے کا قلب پہ چیونٹی
کے سر کی برابر بھی وسوسہ نہ گزرے گا۔ پھر کوئی شک نہیں کہ اس کیفیت کا صدور
اشیاء کے لئے خارق للعادۃ بن جاتا ہے اور تمامی اشیاء از خود ظہور میں
آنے لگتی ہیں۔ کہ یہ ایک سر الٰہی ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے نہ سبب باقی رہتا
ہے نہ واسطہ۔ پس اس مقام والا شخص اگر اسباب کے ساقط اور فعل کے ارباب
کی طرف منسوب ہونے کا کوئی اشارہ فرمائے تو لامحالہ اس کا قول بالکل حق اور
اس کا کلام مجسم صدق ہوگا۔ البتہ جس کو محض ایمان بالغیب حاصل ہوا اس کے
نزدیک وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ میں مشاہدہ نہیں۔ بلکہ اس کا

ظہور ہوا۔ اس کو آیت شریفہ کے معنی اور فعل کو خدا کی طرف منسوب کرنے کی جانب صرف اس کا وہ ایمان کھینچتا ہے جو حق تعالٰے نے اُسے بخشا ہے پس اس کے لیے دو جاذب ہیں۔ ایک منجانب اللہ یعنی اس کا ایمان کہ اس کو کھینچتا ہے حق کی طرف اور دوسرا منجانب الطبیعت یعنی آنکھوں کا مشاہدہ (اور فعل کا غیر کی طرف سے ظہور) اس کو کھینچتا ہے باطل کی طرف۔ پس وہ ہر وقت ان دو باتوں میں الجھا رہتا ہے کہ کبھی جاذب ایمانی قوی ہو جاتا ہے تو گھڑی دو گھڑی کے لیے آیت مذکورہ کا مفہوم مستحضر ہو جاتا ہے اور کبھی جاذب طبعی قوت پکڑتا ہے تو ایک دن دو دن کے کے لیے آیت کے معنی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس غفلت کے زمانہ میں وہ یقین جو خارق عادت تھا جاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ (اگر تابیرنہ کرو تب بھی کھجور اچھی آئے گی) وقوع میں نہ آیا کیونکہ وہ یقین خارق للعادۃ جس پر قلب محمدی مشتمل تھا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل نہ تھا اور جب حضرتؐ کو علم ہوا کہ عمدہ کھجور پیدا ہونے کا سبب یہ ہے اور اس کا ازالہ صحابہ کی طاقت سے باہر ہے تو اُن کو حالت پر چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تم اپنی دُنیا کے معاملات سے زیادہ واقف ہو لہذا جس پابندیٔ اسباب کے عادی ہو وہ کئے جاؤ۔ بھلا ایسا پیارا جواب تم نے کبھی کسی سے سُنا یا کسی کتاب میں دیکھا بھی ہے۔ حالانکہ حدیث وہ ہے جو جمال الدینؒ بن الحاجب۔ سیف الدینؒ آمدی اور صفی الدینؒ اور ابو حامد غزالیؒ جیسے اکابر علماء اصول کو مشکل نظر آئی ف ایک شخص نے بجلی کی روشنی کبھی نہیں دیکھی مگر صدہا لوگوں نے اس سے بیان کیا کہ تیل بتی اور دیا سلائی کے بغیر ہزاروں قمقمے یک دم روشن ہو جایا کرتے ہیں۔ اور ایک شخص لفاق سے دہلی گیا اور آنکھوں سے دیکھ آیا کہ سارے شہر کے گھر گھر میں برقی روشنی ہو رہی ہے ان دونوں صورتوں کے یقین میں جو فرق ہے وہی عقائد مذہب کے ایمان بالغیب اور مشاہدہ کے یقین میں فرق ہے کہ ایمان بالغیب کا یقین لوگوں کے اعتراضات سے متزلزل ہو جاتا اور محض کسی مصلحت کے لحاظ سے اوپری اور مارے باندھے کا رہ جاتا ہے۔ اور جو یقین آنکھوں سے دیکھنے پر حاصل ہوا ہے اگر ساری دُنیا بھی اس کے خلاف کہے تو یہ ہنستا اور جواب دیتا ہے

کہ میں کیسے مان لوں) جبکہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ پھر اس مشاہدہ کے یقین میں بھی درجات ہیں کہ ایک یقین ہے نو وارد کا جس نے برقی روشنی کو دیکھ پایا، اور ایک یقین ہے اس انجنیئر کا جو بجلی کے فن میں ماہر اور اس کے جز جز کی خاصیت و اثر و کیفیت سے آگاہ و اقف ہے کہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ دونوں کے درمیان بلحاظ کمی و بیشی یقین کے صدہا مراتب نکلیں گے جن کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ تمامی مغیبات کا جن کی اطلاع اللہ و رسول نے دی ہے باوجودیکہ نظروں سے اوجھل ہیں ایسا یقین کرنا کہ دنیا بھر بھی ان کی منکر ہو جائے تو تزلزل نہ آوے ایمان کہلاتا ہے اور اسی کا نام اصطلاح شریعت میں عقیدہ ہے جس کا ماننا اللہ و رسول کی تصدیق اور ان کو سچا ماننا ہے۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ اللہ ہی نے ہمیں پیدا کیا اور اسی نے ہمارے افعال کو پیدا کیا ہے کہ زید نے مثلاً عمر کو قتل کیا۔ یا مثلاً اس کو اشرفیاں دے کر مالا مال بنا دیا تو بظاہر فعل قتل اور فعل عطا کا خالق زید نظر آ رہا ہے مگر درحقیقت اس کے اندر ایک بڑی طاقت کام کر رہی جس کو مشیت الہیہ کہتے ہیں کہ اللہ نہ چاہتا تو قتل وجود میں آتا نہ عطا۔ کیونکہ عدم سے وجود میں لانا اور نیست کو ہست کرنا ہی تو تخلیق ہے۔ اگر یہ کام خود قاتل اور معطی کا ہے تو یہ خالق ہوا اپنے فعل کا اور صفت خلق میں عیاذاً باللہ شریک خدا قرار پایا۔ جب تک اس عقیدہ کا محض ایمان بالغیب ہوگا تو قسم قسم کے شبہات پیدا ہوں گے۔ مثلاً یہی کہ پھر اس کو جزا و سزا کیوں دی جائے گی؟ اگرچہ اس کا جواب دیا جائے گا کہ زید اپنے فعل کا خالق بیشک نہیں مگر سبب ضروری ہے۔ مثلاً چھری سے گائے کو ذبح کیا تو بظاہر یہ فعل چھری کا ہے مگر درحقیقت کار فرما ذابح کی وہ قوت بازو ہے جو نظر نہیں آتی۔ ورنہ یہی چھری اگر افیونی یا طفل شیر خوار کے ہاتھ میں ہوتی تو کھال بلکہ بال بھی نہ کاٹ سکتی۔ بایں ہمہ چھری کی جانب کسب منسوب ہے اور اس لئے اگر خون آلود ہوگی تو یہی ہوگی اور ٹوٹے گی تو یہی ٹوٹے گی، اور پھر قابل مرمت ہوگی تو ٹوٹنے کے لئے اسی کو آگ میں تپایا جائے گا، اور ناقابل مرمت ہو جائے گی تو کوڑی پر بھی اسی کو پھینکا جائے گا کہ بول و براز میں پڑی سڑتی رہے۔ اور انسان میں تو بہرحال حس و ارادہ بھی رکھا ہوا ہے جو لوہے کی چھری میں نہ تھا۔ بہرحال کسب اور مصدر فعل ہونا خود ایسی چیز ہے جس سے فعل کا اثر بصورت خاصیت ہر چیز پر پڑتا ہے۔ اس کا مدار ارادہ پر بھی نہیں ہے سنکھیا کوئی بارادہ خود کھائے یا کوئی اس کو

جبراً قہراً کھلادے۔ بہرحال اس کے پیٹ میں جاتے ہی اپنا اثر دکھائے گا۔ یہ تو فضل ہے مولائے کریم کا کہ جس معصیت میں عاصی کے ارادہ کا دخل نہ ہو اس کی خاصیت بد کو سلب فرما کر سزا کو اُٹھا لیا، چہ جائیکہ جن افعال میں واسطہ پڑ گیا اس کے قصد و ارادہ بلکہ عزم و جزم کا تم چاہتے ہو کہ وہاں بھی زہر اُس کے لئے مہلک نہ رہے۔ بایں ہمہ یہ جواب بھی چونکہ اسی کا ہے جس کو مشاہدہ نہیں صرف ایمان بالغیب ہے اس لئے ممکن ہے کہ دو عقلوں کی کشتی میں یہ اُس کو پچھاڑ دے یا وہ اس کو چت کر دے۔ مگر اس وقت مقابلہ ہے مشاہدہ کا کہ سوالاکھ انبیاء اور ان گنت صلحا و اولیاء اس حقیقت کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ کیا صورت ہے بندہ کے فاعل و کاسب ہونے کی اور کیا صورت ہے حق تعالیٰ کے متصرف و خالق ہونے کی جس سے نہ افعال کی تخلیق سے خالق پر عیب آتا ہے اور نہ بندہ کاسب کے اوپر سے سزا و جزا کا استحقاق اٹھتا ہے۔ ان حضرات کا یقین چونکہ علمی نہیں بلکہ عینی ہے اس لئے یہ اعتراضات و شبہات ذرہ برابر بھی خلجان میں نہیں ڈال سکتے، اور دُنیا بھر بھی اس عقیدہ کا انکار کرے تو اُن کے نور یقین پر بال برابر بھی غبار نہیں پڑ سکتا۔ بس یا تو حق تعالیٰ ہم سیہ کاروں کو بھی مشاہدۂ مغیبات نصیب فرمائے تاکہ عین الیقین حاصل ہو، ورنہ ہماری پختگی یقین کے لئے اتنا کافی ہے کہ جب ہم نے باوجود آنکھوں سے نہ دیکھنے کے لندن کا یقین کر لیا کہ واقعی وہ ایک شہر ہے، کیونکہ اس کے وجود کا اقرار کرنے والے گو عوام الناس ہیں جن کے سچے ہونے کی کوئی دلیل نہیں مگر اتنے کثیر ہیں جن کے ایک غلط بات پر متفقہ کمیٹی بنا لینے کو عقل تسلیم نہیں کرتی، تو اللہ کے خالق افعال ہونے کو جس کا مخبر خود حق تعالیٰ اور جس کے راوی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک سوالاکھ انبیاء اور ہر قرن کے ہزاراں ہزار صلحاء و اولیاء ہیں، جن کے مجسمۂ صدق ہونے کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے، کیسے یقین نہ کریں۔ خصوصاً جب کہ اس کے ناقل بالعموم اہل مشاہدہ ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی کہہ رہے ہیں۔

اب اتنا اور سمجھ لو کہ مشاہدہ سے یقین حاصل ہونے کا اثر یہ ہے کہ اسباب و وسائط سے نظر اٹھ جاتی اور ساری مخلوق بمنزلہ ظروف خالیہ کے نظر آتی ہے کہ حقیقتاً کوئی بھی کچھ نہیں کر رہا۔ سب میں کارفرما صرف مشیت الٰہیہ اور ارادۂ خداوندی ہے لہٰذا مدح و ذم اُن کے نزدیک مساوی ہو جاتی ہے اور ذاتی ایذاؤں کا داعیہ

انتقام سلب ہو جاتا ہے۔ مگر پھر اس میں دو قسمیں ہیں کہ اکثر حضرات تو باوجود اس یقین کے کہ اسباب ہیچ اور غیر موثر بالذات ہیں اسباب کا پابند رہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اللہ کی عادت کا توڑنا ادب کے خلاف ہے۔ مگر بعض پر غیر اختیاری غلبہ ہوتا ہے اور وہ تارک اسباب بن جاتے اور فرع کو چھوڑ کر بالکلیہ اصل کی طرف یکسو ہو جاتے ہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ کی بمقتضاء اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ عادت ہے کہ جیسا بندہ کا برتاؤ اس کے ساتھ ہوتا ہے ایسا ہی اُس کا برتاؤ بندہ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے پہلی جماعت کے لئے یہ قانون ہے کہ اسباب اختیار کریں گے تو نتیجہ مرتب ہوگا ورنہ نہیں۔ اور دوسرے فریق کے لئے خارق عادت برتاؤ ہوگا کہ جب انہوں نے بشری عادت کو توڑ کر اسباب کو چھوڑ دیا تو مشیت بھی اپنی عادتِ جاریہ کو چھوڑ کر ان کے لئے ترکِ اسباب ہی پر نتیجہ مرتب فرمائے گی۔ اسی کا نام معجزہ اور کرامت ہے ۔ مگر ترک اسباب کا درجہ اگر کوئی بتکلف و تصنع اختیار کرے گا تو یہ ثمرہ ہرگز مرتب نہ ہوگا۔ کہ بناوٹ بناوٹ ہے اور حقیقت حقیقت۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ترکِ اسباب کا امر طبعی بن جانا جو مصدر کرامت بناتا ہے انسان کا کسبی و اختیاری فعل نہیں بلکہ منجانب اللہ وہبی و اضطراری ہے۔ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کرامت یا معجزہ ولی و نبی کا اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ من اللہ ہے۔ لہٰذا کسی کو اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناقص اور کمزور ہے اور نہ یہ کہ اس کو پختہ یقین حاصل نہیں۔ اور اسی لئے اس کی تحصیل مامور نہیں حضرات صحابہ کی طبیعت نے چونکہ تابیر کو عمر بھر کے تجربہ کی وجہ سے خورد و نوش کا درجہ دے رکھا تھا کہ کھانا اور پانی اگرچہ سیری و سیرابی میں مؤثر حقیقی نہیں مگر عادت اللہ کی بنا پر نتیجہ کا ترتب ان کے استعمال ہی پر موقوف ہے۔ اس لئے باشارۂ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم جب اس کو انہوں نے بتکلف چھوڑا تو مسبب کا ترتب نہ ہوا اور کھجور ناقص پیدا ہوئی۔ لیکن اگر طبیعت ان کی دوسرے رنگ پر چلنے والی ہوتی اور اختیار اسباب سے گریز کرنے سے اُنس ہوتا جو کہ مقتضا تھا اس وقت طبیعت محمدیہ کا تو لامحالہ خرق عادت کا ظہور ہوتا اور جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک غذا کے وقت بھی تغذیۂ انوار سے شکم سیری ہو جاتی تھی، اسی طرح ان کو بھی تابیر کے بغیر عمدہ کھجور ضرور عطا ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قوتِ یقین کی صرف دو قسموں کا فرق تھا

کہ اگر غیر اختیاری داعیۂ ترکِ اسباب پیدا ہو جاتا تو مصدرِ کرامات بن جاتے۔ مگر ان کا حصول ان کی طاقت سے باہر تھا اور اس کی ہوس بھی ان کو نہ تھی کہ تربیتِ رسولؐ عبدیت ہی کے سبق زیادہ دیئے تھے اس لئے ان کی قوتِ یقین کا درجہ یہ رہا کہ قلب سے اسباب کا کلی انقطاع تھا اور اعضاء بدن سے ان کا پورا اخذ و اکتساب اور اس لئے بجائے مصدرِ کرامات بننے کے جامع ہر دو صفات اور مخزنِ کمالات بنے۔ ورنہ عرف میں جس کا نام ضعفِ یقین ہے اوّل تو صحبتِ محمدیہ میں قائم نہیں رہ سکتا تھا اور اگر برائے نام ہوتا بھی تو آنحضرت ان کو ان کی حالت پر کبھی نہ چھوڑتے بلکہ قولاً بھی فوراً اصلاح فرماتے اور عملاً و حالاً بھی وہ نور اُن کے قلوب میں ضرور ڈالتے جس سے یہ کمزوری کافور ہو جاتی۔ واللہ اعلم۔

اذان اور شیطان

(۲۱) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ جب مؤذن اذان دیتا ہے۔ تو شیطان بھاگتا ہے اور اس کے مقعد سے آواز کے ساتھ ریح نکلتی جاتی ہے"۔

فرمایا شیطان بھاگتا اس لئے ہے کہ کلمات اذان جب صاف ستھری ذات سے نکلتے ہیں تو جہاں تک آواز پہونچتی ہے تمامی فضا اُن کے نور سے لبریز ہو جاتی ہے۔ چونکہ نور میں خنکی ہے اور شیطان پیدا ہوا ہے شعلہ آگ سے اور خنکی و آگ میں ضد ہے (اس لئے اس کا بھاگنا ایسا ہے جیسا تاریکی کا بھاگنا روشنی سے) اس کے قریب وہ مضمون ہے جو ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جنات کو دوزخ میں آگ کا عذاب نہ دیا جائیگا۔ کیونکہ وہ تو ان کی طبیعت ہے (کہ پیدائش ہی ان کی آگ سے ہے) اور طبعی چیز سے تکلیف نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا ان کو سردی اور زمہریر کا عذاب دیا جائے گا۔ (بس نار کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک نار حارّہ کہ جھلس کر کوئلہ بنادے۔ دوئم نار باردہ کہ ٹھٹر کر ہلاک کردے اور جنات دنیا میں بھی خنکی سے بہت ڈرتے ہیں۔ حتیٰ کہ

موسم گرما میں بھی ٹھنڈی ہوا ان کے لئے اندیشہ ناک ہے۔ اور جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے۔ اور پانی میں تو جنات اور شیطان کبھی داخل ہی نہیں ہو سکتے۔ اور اگر کسی کو پکڑ کر پانی میں ڈال دیا جاوے تو سمجھ کر الیا

پارہ پارہ ہو جائے گا جیسے ہم میں سے کوئی آگ میں گھس کر پگھل جاتا ہے۔ اور اگر تم سمجھنا چاہو کہ جن کیسا ہوتا ہے تو ایک گاڑھی ظلمت والی آگ پر تم نظر ڈالو جس میں دھواں بہت زیادہ ہو جیسے کمہار کے آوے میں ہوتا ہے۔ پھر جس شکل پر حق تعالیٰ نے جنات کو پیدا کیا ہے وہ اپنے متخیلہ میں لاکر اس دھویں والی آگ میں کھڑا کر دو۔ یہ کچھ شبیہ ہوگی جنات کی۔

(۲۲) میں نے حضرت سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کو صوم وصال رکھتے ہوئے دیکھ کر صحابہ نے بھی روزہ پر روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ آپ) نے فرمایا کہ روزوں کے درمیان کچھ کھالیا کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے۔ (میری طرح حرص نہ کرو کہ) میں تو اپنے رب کے پاس اس حالت میں شب گزارتا ہوں کہ وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔"

فرمایا رب کے پاس سے مراد اس کی معیت ہے (کہ ذات باری جگہ سے منزہ ہے)۔ اور کھلانے پلانے سے مراد حق تعالیٰ کا اپنے نبی کو قوت عطا فرمانا ہے۔ (مطلب یہ ہوا کہ مجھے اللہ کی معیت نصیب ہے اور وہ مجھے بغیر کھائے وہ قوت بخشتا ہے جو تم کو غذا کے واسطہ سے عطا ہوتی ہے۔ (لہذا مجھے صوم وصال سے ضعف لاحق نہیں ہوتا) میں نے عرض کیا کہ ذات تعالیٰ کے لئے کیا انوار و تجلیات کا ذوق کافی ہو جاتا ہے اور غذا کی ضرورت نہیں رہتی؟ فرمایا کافی نہیں ہوتا۔ فرض کرو نبی کو کوئی شخص پکڑ لے اور کھانا پانی بند کر دے تو نبی کا ضرور انتقال ہو جائے گا۔ کیونکہ مٹی کے پتلے کو مٹی سے پیدا ہونے والی غذاؤں کے بغیر چارہ نہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تم حضرات انبیاء کو دیکھتے ہو کہ کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں، اور ان کو بھوک بھی لگتی ہے، (باقی صوم وصال میں حضرت پر ضعف کا اثر نہ ہونا اور غذائے روحانی کا کسی وقت غذائے جسمانی کے قائم مقام بن جانا یا ثمرہ ہے محبت کا کہ

لہ اسی سے یہ نکل آیا کہ شیطان کا گوز مارنا بھی بوجہ خوف ہوتا ہے جیسے گدھا جب شیر سے کھاتا ہے تو بے اختیار گوز نکلتے جاتے ہیں۔ اسی لئے اذان کے لئے بلند آواز مستحب ہے کہ اس کی آواز جتنی دور تک جائے گی خلا دور تک منور ہو گا۔ مترجم۔

کہ محبوب کے پاس رہتے ہوئے محب کو اکثر بھوک نہیں لگتی اور نہ فاقہ کی کمزوری محسوس ہوتی ہے یا اس کی نوعیت معجزہ کی ہے) واللہ اعلم۔

وقت ولادت

(۲۳) میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شب میں ہوئی جیسا کہ ایک جماعتِ علماء کی رائے ہے اور ان کی دلیل بیہقی کی یہ روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاص اپنی والدہ فاطمہ بنت عبداللہ ثقفیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے ذکر فرمایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت موجود تھی تو آپ کی ولادت کے وقت میں نے دیکھا کہ سارا گھر نور سے بھر گیا اور تاروں کو دیکھا کہ (آسمان سے اتر کر) اتنے قریب آ گئے ہیں کہ مجھے گمان ہوا میرے سر پر آ پڑیں گے۔" اور تارے صرف رات ہی میں نظر آیا کرتے ہیں۔ یا ولادت شریفہ دن میں ہوئی کہ علماء نے اسی کو صحیح بتایا اور مسلم وغیرہ کی حدیث کو دلیل بنایا ہے۔ وہاں یہ ضرور کہا ہے کہ صبح صادق نمودار ہونے سے کچھ ہی بعد ولادت ہوئی جیسا کہ ایک حدیث میں منقول بھی ہے۔ اور اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل و مناقب میں ضعیف بھی قابل عمل ہے۔ اور پہلی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ تارے تو پو پھٹنے کے بعد بھی نظر آتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس سے قبل از فجر یعنی شب میں ولادت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ واقعہ اور نفس الامر یہ ہے کہ ولادت شریفہ تو اخیر شب میں طلوع صبح صادق سے کافی وقت پہلے ہوئی، مگر ماں سے چھوٹنا طلوع فجر پر ہوا۔ اور وہ زمانہ جو آپ کے بطن مادر سے باہر آنے اور (آنول نال خارج ہونے پر) ماں سے علیحدہ ہونے کے درمیان (قریب دو گھنٹہ یعنی سدس اللیل) کا تھا۔ وہی ساعتِ قبولیتِ دعا ہے جس کی فضیلت بکثرت حدیثوں میں آئی اور اس کی عظمت و فخامت ظاہر کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ قیامت تک کے لئے اس کا حکم ممتد کر دیا گیا (کہ تا قیامت جو کوئی بھی اس مبارک وقت میں دعا مانگے گا وہ قبول ہوگی)۔ اور وہ وہی ساعت ہے جس میں اطراف عالم کے اہل دیوان اولیاء اللہ یعنی غوث اور ساتوں قطب اور اہل دائرہ و عدد رحمۃ اللہ علیہم اجمعین مکہ سے باہر غار حراء میں جمع اور نور اسلام کا ستون ہاتھوں میں اٹھائے ہوتے ہیں کہ تمامی امت انہیں سے

استفادہ کرتی ہے۔ اور اس ساعت میں جس شخص کی دعا اہل دیوان کی دعا سے اور جس کا تہجد اُن کے تہجد سے موافقت کھا جاتا ہے حق تعالیٰ اُس کی دُعا قبول اور اُس کی حاجت پوری فرماتا ہے۔ حضرت ممدوح اکثر ہمیں اُس ساعت سے عین وقت پر (کہ دیکھو یہ ہے وہ ساعت مبارکہ) آگاہ کیا کرتے تھے اور ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ فاس میں صبح صادق مکہ کی صبح صادق سے کچھ بعد طلوع کرتی ہے (کہ کئی سو میل غرب میں) لہٰذا اپنے قیام شب میں مکہ کے طلوع فجر کا لحاظ رکھا کرو اور اسی کو اپنا معمول بناؤ۔ میں نے دریافت کیا کہ شہر فاس کے طلوع فجر سے کتنی مدت پہلے مکہ میں فجر طلوع کر آتی ہے۔ فرمایا مسجد قروین کا مؤذن ابن جمر جس وقت اذان دیتا ہے مکہ میں اس سے کچھ پہلے صبح صادق ہو جاتی ہے میں نے کہا تو ساعت قبولیت کا صحیح وقت وہ ہوا جس میں وردی اُٹھتا ہے اور اُس کے ذرا دیر بعد سلادی۔ فرمایا ہاں"۔ چنانچہ حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری سے قبل تقریباً سولہ برس میرا یہ معمول رہا کہ سورہ کہف کی اخیر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے اَحَدًا تک اس نیت سے پڑھ کر سویا کرتا تھا کہ ساعت قبولیت میں آنکھ کھل جائے تو اکثر میری آنکھ وردی کے وقت میں کھلا کرتی تھی اور کبھی کچھ دیر بعد سلادی کے وقت میں۔ بلکہ دیگر بلاد کے ان حضرات سے بھی جن کو ساعت قبولیت کا اہتمام تھا۔ میں نے یہی سُنا کہ وہ اس عمل کو پڑھ کر سوتے ہیں تو ان کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جتنا اُن کے مطلع سے مکہ کا مطلع مقدم ہے۔ (یہ ایک مجرب عمل ہے کہ جو بھی اس کو سوتے وقت پڑھے گا وہ جس وقت اُٹھنے کا ارادہ کرے گا اسوقت آنکھ کھلے گی)۔

ماہ ولادت

(۲۴) پھر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کا مہینہ دریافت کیا کہ اس میں بھی علماء کا بہت اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے صفر کا مہینہ تھا کوئی کہتا ہے ربیع الثانی، کوئی ماہ رجب بتاتا ہے کوئی ماہ رمضان اور کوئی روز عاشوراء (۱۰ر محرم) اور کوئی کہتا ہے کہ صحیح مہینہ کسی کو معلوم نہیں۔ حضرت نے فرمایا ماہ ربیع الاول تھا پھر میں نے تاریخ دریافت کی اُس میں بھی اختلاف ہے کوئی کہتا ہے دوسری تاریخ تھی۔ کوئی کہتا ہے ساتویں تھی اور

اسی کو اکثر علماء نے ترجیح دی ہے اور کوئی کہتا ہے نویں تھی اور کوئی کہتا ہے بارھویں تاریخ تھی۔

شب ولادت ۷ ربیع الاول

فرمایا ساتویں ربیع الاول تھی اور یہی واقعہ نفس الامری ہے کہ ساتویں ربیع الاول کی شب میں ولادت شریفہ ہوئی۔ پھر میں نے سنہ ولادت دریافت کیا کہ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے عام الفیل میں (یعنی جس سال ابرہہ یمنی نے ہاتھیوں سے مکہ پر چڑھائی کی تھی) اس واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت شریفہ ہوئی۔ اور کوئی کہتا ہے واقعہ فیل سے پچپن مہینہ بعد اور کوئی کہتا ہے چالیس مہینہ بعد کوئی کہتا ہے دس برس بعد اور کوئی کہتا ہے واقعہ فیل سے پندرہ سال بعد۔ حضرت نے فرمایا عام الفیل ہی میں ولادت ہوئی مگر ہاتھیوں کی چڑھائی سے پہلے۔ اور آپ ہی کے وجود باجود کی برکت سے حق تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کا حملہ دور فرمادیا اور اہل مکہ کو نجات بخشی۔ پھر میں نے حضرت سے یہ نہ پوچھا کہ واقعہ فیل سے کتنے دن پہلے ولادت شریفہ ہوئی۔ اگر یہ دریافت کرتا تو آپ اس کا بھی تعین فرمادیتے۔

بغل کے بال

پھر میں نے دریافت کیا کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حمل (اور بطن مادر میں رہنے) کی مدت کتنی تھی؟ فرمایا دس مہینہ۔ پھر میں نے پوچھا کہ بغل شریف میں بال تھے یا نہیں کہ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ فرمایا اتنے بال نہ تھے جن کو نوچا جا سکے بہت قلیل تھے اور اسی کا نام ہے عُفرت (جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے) یعنی سپیدی جس میں قلیل سیاہی مخلوط ہو۔ اور اس میں بال کم ہونے کا سبب یہ تھا کہ آپ کے سینہ مبارک پر اور دونوں مونڈھوں پر بال زیادہ تھے۔ اس لئے دونوں بغلوں میں بال بہت کم ہوئے" بعض روایات میں دیکھا کہ حضرت کے ہر دو شانہ مبارکہ پر بال تھے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا حتیٰ کہ حضرت ممدوح سے سنا (اور وجہ معلوم ہوئی کہ بغل کی جگہ شانہ پر بال نمودار ہوئے) تب انشراح ہوا۔

ابرو شریف

پھر میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابروئے مبارک دونوں ملی ہوئی تھیں یا دونوں میں فصل تھا؟ فرمایا کہ ملی ہوئی تھیں۔

رفتار مبارک

پھر میں نے حضرت کی رفتار کا سوال کیا کہ داہنے اور بائیں مائل ہو کر چلتے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے۔ یا جس طرح اوپر سے نیچے اترتے ہوئے آگے کو جھکتے ہیں جیسا کہ دوسری روایتوں میں آیا ہے۔ فرمایا کہ دائیں جانب اور بائیں جانب جھکاؤ لے کر چلتے تھے۔ اور چونکہ اس وقت ہمارے ساتھ کوئی تیسرا شخص نہ تھا اس لئے آپ نے فرمایا آؤ میں تم کو دکھاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے اندر حیات شریفہ میں کس طرح چلا کرتے

تھے۔ اس کے بعد تقریباً ساٹھ قدم آپ تیز چلے کہ دائیں اور بائیں جانب جھکاؤ ایسا پایہ اتھا کہ عقل اُڑی جاتی تھی اور اُس کے حسن و جمال پر دل ٹوٹا جاتا تھا۔ پھر میں نے سوال کیا ریش مُبارک کے متعلق کہ اُس کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ فرمایا آپ کی داڑھی ذقن میں بھری ہوئی گنجان تھی متوسط درجہ کا طول لئے ہوئے، اور جہاں رُخسارہ ذقن ملتے ہیں وہاں کے بال زیادہ گنجان نہ تھے۔ پھر میں نے موئے مبارک کے متعلق اور خضاب کرنے کی بابت دریافت کیا اور بالوں کی سپیدی کے متعلق اور خضاب کرنے کی بابت اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جسم کے بال اڑانے کے متعلق) کیا کبھی چونہ کا استعمال فرمایا تھا؟ فرمایا سرِ مبارک کے بال ایک حالت پر نہیں رہتے تھے۔ کبھی بڑھ جاتے اور لمبے ہو جاتے تھے اور کبھی (کتروا لیتے تو) بالائے کان تک چھوٹے ہو جاتے تھے۔ مگر پیشانی سے ملے ہوئے بال آپ نہ چھوڑتے بلکہ کتر دیا کرتے تھے۔ اور سَر کا حلق بجز حج کے آپ نے کبھی نہیں کرایا۔ اور سفید بال صرف لب زیریں اور ذقن کے درمیان ریش بچہ میں تھے تقریباً پانچ بال اور چند بال دو کنپٹی میں، البتہ ذقن شریف میں کچھ زیادہ تھے اور اور خضاب آپ نے مہندی کا کیا ہے مگر بہت کم۔ ایک مرتبہ جب کہ آپ (فاتح بن کر) مکہ میں داخل ہوئے اور صرف چند بار مدینہ میں۔ اور نورہ کا استعمال درمیان میں فرمایا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ لگایا کرتی تھیں۔ پھر میں نے شق صدر کے متعلق دریافت کیا کہ کتنی مرتبہ ہوا۔ کیونکہ اس میں احادیث مختلف آئی ہیں۔ فرمایا تین مرتبہ۔ اوّل حضرت حلیمہ کے ہاں، اور اسمیں وہ (مضغہ) نکالا گیا جو شیطان کا حصہ ہے کہ ذات ترابی جس مخالفت حکم الٰہی اور اتباع خواہش نفسانی کو چاہتی ہے اس کا تعلق اسی سے ہے۔ دوبارہ دس سال کی عمر میں، اور اس وقت خطرات رویہ کی جڑ نکال دی گئی (کہ جوانی کے زمانہ میں کسی خطرۂ بد کے آنے کا خطرہ ہی نہ رہا) تیسری مرتبہ نبوت کے وقت ہوا۔ مگر میں نے یہ نہ پوچھا کہ اُس وقت کیا چیز نکالی گئی۔ میں نے کہا کہ اکثر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شب معراج میں بھی شق صدر ہوا۔ فرمایا یہ صحیح نہیں۔ اور فرمایا کہ شق صدر میں نہ کوئی آلہ استعمال کیا گیا، نہ خون نکلا، اور نہ شق کا بھر جانا بذریعہ ٹانکے لگانے کے ہوا، نہ سوئی وغیرہ سے کام لیا گیا اور نہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف ہوئی کہ یہ خاص فعل ربانی تھا۔ پھر میں نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ آں

ریش مبارک

شق صدر

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت شہادت بیچ کی انگلی سے بڑی تھی۔ فرمایا آپ کے پاؤں کی انگشت شہادت بڑی تھی بیچ کی انگلی سے اور ہر دو دست مبارک کی انگشت شہادت تو برابر تھی بیچ کی انگلی کے ۔ پھر میں نے حضرت جبریلؑ کے آنحضرت کو تین مرتبہ بھینچنے کے متعلق دریافت کیا کہ جب اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ لے کر آئے تو حضرت نے فرمایا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تب حضرت جبریل نے آپ کو (بغل گیر ہو کر اتنا) بھینچا کہ حد کر دی۔ حضرت ممدوح نے فرمایا حضرت جبریل کا پہلا بغل گیر ہونا تو اس لئے تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الٰہی میں وسیلہ بنائیں کہ اللہ کی وہ دائمی خوشنودی حاصل ہو سکے جس کے بعد ناراضی کا وجود ہی نہ ہو۔ اور دوبارہ بغل گیر ہونا اس غرض سے تھا کہ جاہ محمدی میں داخل اور آپ کے جمال مبارک کی پناہ میں آجاویں۔ اور سہ بارہ اس لئے تھا کہ آپ کی امت مرحومہ میں شمار ہو جاویں۔ اور روح الامین کا یہ کہنا کہ پڑھئے، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کلام قدیم کو (امت تک) پہونچایئے بذریعہ حادث (یعنی زبان جسمانی) کے، کہ سارا قرآن آنحضرت صلے علیہ وسلم پر اسی جگہ نازل ہوا تھا اور یہی مراد ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ سے۔ حضرت جبریل علیہ السلام چاہتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (قرآن مجید کے) معانی قدیمہ اور اس مکالمہ ازلیہ کی جو اس وقت آپ کو حاصل ہوئی تبلیغ فرما دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں قاری نہیں ہوں۔ یعنی مجھ میں طاقت نہیں کہ کلام قدیم اور قول ازلی کو اپنی حادث زبان سے دوسروں تک پہنچا سکوں۔ تب حضرت جبریلؑ نے آپ کو بتایا کہ حادث زبان سے تبلیغ کس طرح ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ سے بہت محبت تھی (کہ وہ طریق تبلیغ کی تعلیم کا واسطہ بنے تھے۔ واللہ اعلم۔

جبرائیل کا تین بار معانقہ

(۲۵) میں نے حضرت ممدوح سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا اَعْمَارُ اُمَّتِیْ ... جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ یہ قرن پورے سو برس پر ختم ہو جائے گا! فرمایا اس حدیث کا تکلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ ہی قبل فرمایا ہے۔ اور یہ روح شریفہ کا کلام ہے کہ ذات کریمہ کی تعزیت کر رہی اور اس کو تسلی دے رہی ہے (کہ تم ہی کیا سارا قرن زیر زمین جانے والا ہے) چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب وفات کا علم ہو گیا تھا اس لئے روح نے ذات ترابی سے کلمات تعزیت کہے تاکہ ذات

وفات کا علم

مطہرہ کو تسلی حاصل ہو (اور مفارقت کا صدمہ ہلکا ہو جائے) ۔حضرت ممدوح نے صحیح فرمایا۔امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ یہ ارشاد وفات شریفہ سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔پھر میں نے عرض کیا اور حدیث کے سوال سے اصل مقصود بھی یہی سوال تھا کہ اس قرن (یعنی پوری صدی) کے گزر جانے کے بعد جنہوں نے صحابی ہونے کا دعوی کیا تو اس حدیث سے کیا ان کی غلط بیانی پر استدلال ہو سکتا ہے۔جیساکہ دو صدی گزر جانے پر جس نے صحابی ہونے دعوی کیا اس کو علماء نے جھوٹا قرار دیا ہے۔علیٰ ہذا جس نے چھ سو برس بعد اس کا دعوی کیا۔ چنانچہ عکراش اور معمر مغربی اور تین ہندیوں کے قصے مشہور ہیں۔اور اصابہ میں ان کے متعلق علامہ ابن حجر نے لمبی بحث بھی کی ہے' اور پھر ان کے شاگرد شمس الدین سخاوی شرح الفیہ میں اور امام سیوطی الحاوی فی الفتاوی میں اس بحث کو لائے ہیں۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری شمار کوئی نہیں کر سکتا۔خصوصاً جب کہ آں حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری شمار کوئی نہیں کر سکتا۔خصوصاً جب کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دفات سے پہلے اور بعد میں بہتیرے حضرات اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ایک جماعت تو اطرافِ زمین میں دورہ کرتی دور چلی گئی (پھر کیسے پتہ چلے کہ کس نے کس سنہ میں وفات پائی اور ۱۰۰ سنہ میں کوئی بچا یا نہیں) اور حدیث مذکور کے لفظ اگرچہ عام ہیں

مگر مراد وہ خاص صحابہ ہیں جن کا صحابی ہونا مشہور اور عام لوگوں کو معلوم ہے مکاشفہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔پھر میں نے حضرت رجراحہ کے متعلق تذکرہ کیا کہ لوگوں کا گمان ہے وہ صحابی تھے اور حضرتؐ کی حیات شریفہ میں حاضر خدمت ہوئے تھے اور حضرتؐ نے ان سے بربری زبان میں گفتگو فرمائی تھی۔چنانچہ ان کا قصہ علامہ شہاب نے شرح شفا میں لکھا ہے مگر کوئی سند نہیں بیان کی۔اور دیگر ائمہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔فرمایا وہ صحابی نہ تھے اور صحابی کا نور اہل بصیرت پر ہرگز چھپ نہیں سکتا۔بلکہ تمام ملک مغرب میں کوئی صحابی نہیں ہے۔واللہ اعلم۔

دوسرا باب

آیاتِ قرآنیہ اور سُریانی زبان

اور الٓمٓ یٰسٓ صٓ قٓ وغیرہ فواتحِ سُور کے متعلق استفسارات

(۱) حق تعالیٰ نے حضرت آدم اور حوّا علیہما السلام کے قصہ میں فرمایا فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

(جب حق تعالیٰ نے ان کو صالح لڑکا عطا فرمایا تو انہوں نے اللہ کے دیئے ہوئے میں اس کے شریک بنالیئے۔ اللہ کی ذات بلند تر ہے لوگوں کے تجویز کردہ شریک سے) میں نے عرض کیا کہ سیدنا آدم علیہ السلام تو اللہ کے نبی اور پیارے ہیں وہ اللہ کے لئے شریک کیسے تجویز کر سکتے ہیں۔ (اگرچہ بعض علماء نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ شیطان کے کہنے میں آ کر آپ نے اپنے نوزائیدہ بچہ کا نام عبدالحارث رکھ لیا کہ عبدیت بجائے اللہ کے حارث کی طرف منسوب کی اور یہ شرک فی التسمیہ کہ گو شرکِ فی العبادات کی طرح اس پر خلودِ جہنم نہیں ہے مگر شانِ نبوت اور عصمت کے منافی ضرور ہے)۔ فرمایا کبھی اولاد کے کرتوت پر باپ سے گرفت ہوا کرتی ہے۔ جیسے کسی کے باغ میں پھل پھول لگے ہوئے ہوں اور زید کے بچے اس میں گھس کر نقصان کریں کہ پھل توڑ کر پھینکیں اور شاخیں توڑ دیں تو باغ کا مالک زید کے پاس آئے اور اس پر عتاب و غصہ کرے کہ تو نے میرے باغ کا ناس کر دیا میرے درخت اجاڑ دیئے وغیرہ وغیرہ۔ اسی اسلوب پر یہ قصہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ شرک کیا بنو آدم نے اور عتاب کا رخ ہوا ابوالبشر کی طرف تاکہ اولاد اگر غیرت مند ہو

تو شرمائے کہ ہم ایسے کرتوت نہ کرتے تو ہمارے بے خطا باپ کو دھمکیاں کیوں سننا پڑتیں حبر الامۃ حضرت عبد اللہ بن عباس کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ امام سیوطی نے درمنثور میں نقل کیا ہے اور اسی قول کو سید جرجانی نے شرح مواقف میں لیا ہے۔ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ آیت کا اسلوب بتا رہا ہے کہ اس کا تعلق کفار کے ساتھ ہے (کیونکہ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ بصیغہ جمع ہے) اور خود لفظ شرکاء بصیغہ جمع بھی کفار ہی کے بارہ میں صحیح ہو سکتا ہے (کہ سیدنا آدم علیہ السلام کا تو قصہ ہی ایک تھا اس میں بہت سے شریک بنا لینا کیسے کھپ سکتا ہے)۔ واللہ اعلم۔

(۲) حق تعالیٰ نے فرشتوں کا قول نقل فرمایا ہے کہ (جب آدم کو زمین میں خلیفہ بنانے کا حق تعالیٰ نے اظہار فرمایا تو فرشتوں نے کہا) کیا آپ ایسے کو (خلیفہ) بناتے ہیں جو زمین میں فساد برپا اور خونریزی کرے گا حالانکہ ہم آپ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس کرتے رہتے ہیں" میں نے کہا اس میں ایک قسم کی غیبت ہو رہی ہے (کہ حضرت آدمؑ کی عدم موجودگی میں ان کے عیوب ظاہر کر رہے ہیں) حالانکہ حضرات ملائکہ معصوم ہیں (اور گناہ کا صدور ان سے ناممکن ہے) فرمایا یہ غیبت نہیں اور نہ غیبت کا ارتکاب فرشتوں سے ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ان کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ آپ دنیا میں ایسی مخلوق کو آباد کرنا چاہتے ہیں جو صاحب حجاب (اور آپ کے مشاہدہ سے محروم) ہے حالانکہ دنیا آباد کرنے کے قابل آپ کے پاس وہ بندے موجود ہیں جن پر حجاب مطلق نہیں یعنی ہم کہ ہر وقت آپ کا مشاہدہ کرتے اور آپ کا مرتبہ پہچانتے ہیں اور اس لئے آپ کے حکم کا خلاف نہیں کر سکتے۔ اور جسے مشاہدہ نصیب نہ ہو وہ چونکہ آپ کی شان نہ پہچان سکے گا لہذا آپ کے حکم کے خلاف کرے گا۔ گویا یوں عرض کر رہے تھے کہ ان کو آپ کی معرفت حاصل نہیں اور ہمیں آپ کی معرفت حاصل ہے (پس غیر عارف کو غیر عارف بتانا ایسا ہے جیسے کوئی ولی کسی عامی شخص کو کہے کہ یہ ولی نہیں)۔ اور یہ ان کی طرف سے محض اظہار تھا کہ اپنے عندیہ کا اپنے منتہائے علم کے موافق۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے جواب دیا اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾ (مجھے وہ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں) یعنی یہ جو تمہارا خیال ہے کہ اہل حجاب میرے رتبہ کو نہ پہچان سکے گا اور میرا مرتبہ شناس صرف وہی ہو سکتا ہے جو مجھے دیکھ بھی رہا ہو

یہ تمہارا منتہاء علم ہے اور میرا علم اس سے مافوق ہے کہ حجاب والے کو قوت بخش دوں گا اور میرے اس کے درمیان جو پردہ ہے اس کو دُور کردوں گا (جس کی وجہ سے دار دنیا میں رہتے ہوئے) اس کو میری معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اور وہ صرف علم کے ذریعہ میرے قرب کے اس درجہ پر فائز ہوگا جس کی تم طاقت نہیں رکھتے۔ اور اسی لئے (علم عطا فرمانے کا اظہار کیا) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کہ اللہ نے آدمؑ کو تمامی اسماء کا علم دیا میں نے کہا اس آیت میں خطاب تمامی ملائکہ کو ہے یا صرف زمین کے فرشتوں کو؟ فرمایا صرف زمین کے فرشتوں کو۔ حبرالامۃ حضرت عبداللہ بن عباس و دیگر مفسرین رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ تفسیر ثعلبی وغیرہ دیکھ لو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ملائکہ نے یہ امر کہ بنو آدم اپنے رب سے غافل اور خودرائے ہوں گے اور اپنے کو خودمختار سمجھیں گے۔ لفظ خلیفہ سے سمجھا کہ جانشین کی شان استقلال و استبداد اور دوسروں سے استغناء و انفراد کی ہوا کرتی ہے لہذا فرشتوں نے نتیجہ نکالا کہ انسان تدبیر اور انجام بینی اور مصلحتوں پر نظر رکھنے کو اپنی طرف منسوب کرے گا اور اپنے رب سے تعلق قطع کرلیگا (کہ کوئی فعل بھی اللہ کی طرف منسوب نہ کرے گا اور جب کہے گا یہی کہے گا میں نے ایسا کیا تو یہ نتیجہ نکلا) اور اسی میں اس کی ہلاکت اور موت ہے (کہ پیدا کرنے والا مالک الملک تو کوئی چیز نہ رہا۔ جو کچھ ہوا اس کی تدبیر اور عقل وسعی سے ہوا) غرض لفظ خلافت سے فرشتوں نے اخذ کیا کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل ہوگا۔

(۳) قرآن مجید میں ہے وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ تمہارے رب کی طرف سے جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے۔ اس میں سے بہترین باتوں کا اتباع کرو۔ میں نے عرض کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نازل شدہ کتاب میں ایسے بھی مضامین ہیں جو (اگرچہ اچھے ہیں مگر) بہتر نہیں ہیں، حالانکہ سارا قرآن (اور اس کا ہر مضمون) بہتر ہے۔ پھر علماء نے اس کے جتنے جواب دیئے ہیں وہ بھی میں نے ذکر کئے کہ بعض نے کہا ہے جس پر ظلم کیا جاوے اس کو انتقام لینا جائز ہے چنانچہ ارشاد ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ جتنی اُس نے تم پر زیادتی کی ہے تم بھی اتنی ہی اس پر زیادتی کرلو۔ (لہذا انتقام لینا جائز ہوا)۔

مگر صبر کرنا اس سے بہتر ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ
اور اگر تم صبر کرو (اور انتقام نہ لو) تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے۔ لہذا آیت
کا یہ مفہوم ہوا کہ عفو کا اتباع کرو نہ کہ سزا دینے کا کہ سزا دینا بھی جائز ہے مگر معاف
کرنا بہت اچھا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ناسخ چونکہ احسن ہے منسوخ سے اس لئے
مطلب یہ ہے کہ جس آیت کا حکم منسوخ ہو چکا اگرچہ حسن اس آیت میں بھی موجود ہے
مگر آیت ناسخہ زیادہ اچھی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے جس کام کا حکم
دیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور جس کی ممانعت ہوئی ہے اس کو نہ کرو۔ اور بعض نے
یہ مطلب بتایا ہے کہ عزیمت پر عمل کرو، رخصت پر عمل نہ کرو، (مثلاً سفر میں روزہ
رمضان چھوڑنے کی اجازت اور رخصت ہے۔ مگر ناقابل برداشت نہ ہو تو روزہ
رکھنا عزیمت ہے) اور بعض نے کہا کہ حق تعالیٰ نے (احکامِ قرآن کی نہیں بلکہ)
اپنے بندوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ بعض مطیع ہیں اور بعض نافرمان۔
لہذا حکم ہے کہ مطیع و فرمانبردار بندوں (یعنی انبیاء و صلحاء) کا اتباع کرو کہ وہ بہتر
ہے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ سارے جوابات مخدوش ہیں اور ان کو آیت سے کچھ بھی مناسبت
نہیں۔ پہلا جواب اس لئے کہ آیت کے آخر میں یہ ہے " جو شخص اس بہترین نازل شدہ
کا اتباع نہ کرے گا۔ اس پر اندیشہ ہے کہ اللہ کا ہولناک عذاب نازل ہو جائے اور وہ
کافرین میں سے ہے اور اللہ و رسول کا مذاق اڑانے والا ہے" حالانکہ جو شخص معافی
نہ دے اور انتقام لے اس کا حکم یہ نہیں ہے (پھر عفو اور انتقام اس کی تفسیر کیسے
ہو سکتی ہے) دوسرے جواب پر یہ اعتراض ہے کہ منسوخ کے مستحسن ہونے سے اگر
مراد یہ ہے کہ وہ بلحاظ اتباع مستحسن ہے تب تو غلط ہے کیونکہ حکم منسوخ ہو گیا
تو اس کا اتباع جائز ہی نہ رہا (چہ جائیکہ مستحسن)۔ اور اگر بلحاظ تلاوت مراد ہے (کہ
کہ حکم اس کا اگرچہ منسوخ ہو گیا مگر تلاوت اب بھی مستحسن ہے) تو اس درجہ میں آیت
ناسخہ اور منسوخہ دونوں برابر ہیں (جائز اور بہتر ہونے کا فرق نہیں ہے)۔ تیسرا اور
پانچواں جواب اس لئے غلط ہے کہ نافرمان بندوں کا اور نیز جس امر کی ممانعت کی
گئی ہے ان کا تو اتباع ہی جائز نہیں چہ جائیکہ بہتر ہونا۔ چوتھے جواب پر یہ اشکال
ہے کہ مانا رخصت پر عمل کرنا جائز ہے لیکن جو نتائج اخیر آیت میں مرتب کئے۔

۔ہے کہ ما نا رخصت پر عمل کرنا جائز ہے لیکن جو مسائج اخیر آیت میں مرتب کئے
گئے ہیں (یعنی کفر و عذاب وغیرہ) وہ رخصت پر عمل کرنے والے کے لیے صحیح نہیں۔
اور جو اعتراض جواب اول پر تھا وہی اس پر بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا اور پانچواں
جواب آیت شریفہ کے اخیر جزو سے مناسبت نہیں کھاتا اور باقی جوابات میں حَسَن اور احسن
کا فرق قائم نہیں رہتا (بلکہ غیر مستحسن اور احسن کا مقابلہ ہو جاتا ہے) لہذا اشکال بدستور
قائم رہا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جوابات مذکورہ میں نہ آیت کے انوار آئے ہیں نہ اسرار۔
صحیح مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو کتاب اور رسول کی جنس میں
جو بھی تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس میں بہترین کتاب اور بہترین رسول کا اتباع
کرو۔ یعنی کتابوں میں اتباع کرو قرآن مجید کا کہ وہ بہترین ہے اگرچہ دیگر کتب سماویہ
(توراۃ و انجیل و زبور) بھی بشرطیکہ اصل اور غیر محرف نہ ہوں اچھی ہیں ۔اور رسول
میں اتباع کرو ہمارے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ تمامی انبیاء اچھے ہیں مگر آپ بہترین
پیغمبر ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آیت میں الیکم آیا جس کا خطاب امت محمدیہ کو ہے
کہ جو تم پر نازل کیا گیا ہے اس کے بہترین کا اتباع کرو۔ اور توریت و انجیل ان پر
نازل نہیں کی گئیں بلکہ اُن سے پہلی امتوں یعنی یہود اور نصاریٰ پر نازل کی گئی تھیں۔
فرمایا سید محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو تمامی دنیا کی طرف مبعوث ہوئے ہیں) کیا
عرب اور کیا عجم، کیا یہود اور کیا نصاریٰ۔ پس قرآن مجید نازل کیا گیا تمامی اقوام پر
دیگر کتب سماویہ نازل کی گئی تھیں خاص خاص جماعتوں پر کہ اہل عرب اور کیا عجم
کیا یہود اور کیا نصاریٰ۔ پس قرآن مجید نازل کیا گیا تمامی اقوام پر اور دیگر کتب سماویہ
نازل کی گئی تھیں خاص خاص جماعتوں پر کہ اہل عرب کے لئے مثلاً شریعت اسمٰعیل
تھی، اور یہود کے لئے توریت، اور نصاریٰ کے لئے انجیل۔ گویا دیگر کتابوں کا
نزول بھی فی الجملہ سب پر ہوا۔ اور اس لئے ارشاد ہوا کہ اے بنی آدم کی مختلف قومو
اور جماعتو پہلی کتابیں اور پہلے پیغمبر جو تم پر نازل کئے گئے تھے اگرچہ وہ سب اچھے
اور خوبیوں والے تھے۔ مگر اب جو کتاب اور جو نبی تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ بہترین
اور سب سے افضل ہے لہذا اس کا اتباع کرو (کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول

کی طرف جانا عقل کے بھی خلاف ہے۔) بعض مفسرین کا بھی یہی قول ہے کہ احسن سے مراد قرآن ہے مگر پوری وضاحت حضرت ہی کی تقریر سے ہوئی اور اخیر آیت کے ثمرات یعنی کفر و عذاب کا ترتب بھی صحیح ہوگیا (کہ جو اس بہترین کا اتباع نہ کرے گا وہ کافر جہنمی ہے کیونکہ شریعت محمدیہ نے تمامی شرائع منسوخ کردیا ہے)۔ واللہ اعلم

(۴) میں نے دریافت کیا کہ عموماً آیات قرآنیہ میں سماعت کو مقدم کیا گیا ہے بصارت پر۔ مثلاً وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اور اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ وغیر ذلک۔ حالانکہ بصارت کا فائدہ بڑا اور نفع عام ہے کہ دن اور رات کا فائدہ صرف صاحب بصر اٹھا سکتا ہے اور جس کی سماعت اگرچہ صحیح ہو مگر دیکھتا کچھ نہ ہو اس کے لئے دن اور رات دونوں برابر ہیں۔ نور اور ظلمت کا احساس بھی صاحب بصارت ہی کر سکتا ہے۔ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں سے راستہ کا معلوم کرنا صاحب بصارت ہی کا کام ہے، عجائبات مصنوعات کا زیادہ تعلق اشیاء کی صورتوں اور ان کی ہیئت ترکیبیہ ہی کے ساتھ ہے اور ان کا نظارہ صرف آنکھوں والے کو ہو سکتا ہے۔ کہ بنی آدم کی شکل جدا ہے اور حیوانات کی شکلیں جدا، نباتات کی صورتیں بے حد مختلف ہیں اور پھولوں کے رنگ بے شمار متباین۔ اسی طرح آسمان کی آفرینش، اس کا بغیر ستون کے کھڑا ہونا ستاروں سے اس کی سجاوٹ وغیرہ وغیرہ سب آنکھوں ہی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بایں وجہ ہماری نظر میں تو بصارت کو ترجیح ہے (کہ دنیا کے ساتھ دین کی بھی اکثر خوبیوں کا مدار اسی پر ہے) لہٰذا اس کا ذکر مقدم ہونا چاہیئے تھا۔ فرمایا بصارت کے محاسن جو کچھ بھی تم نے گنوائے سب صحیح ہیں (اور اسی لئے اس کی عطا کا حق تعالےٰ نے احسان جتایا ہے) مگر سمع میں ایک فائدہ اتنا بڑا ہے جو ان سب کا قائم مقام ہو سکتا ہے، بلکہ عجب نہیں سب پر غالب آجائے۔ اور وہ یہ ہے کہ بھیجا ہوا رسول، اور بھیجنے والا خدا، اور تمامی امور غیبیہ جن پر ایمان لانا واجب ہے، سب کا ادراک سماعت ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اسی لئے تمامی شریعتیں گویا موقوف ہیں قوت سامعہ پر۔ اس کی شرح یہ ہے کہ فرض کرو نبی آدم میں قوت سامعہ نہ ہو اور وہ کوئی بات سُن نہ سکیں تو جب

اُن کے پاس اللہ کی طرف سے پیغمبر آئے گا اور کہے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں تو یہ اُن کی آواز آنکھوں سے تو نظر نہیں آسکتی اور سننے کا ان میں مادہ نہیں ہے۔ لہذا رسول کا آنا بے کار رہا۔ پھر جب وہ کہے گا کہ میرے سچے ہونے کی علامت فلاں فلاں معجزہ ہے، تو چونکہ وہ سنتے ہی نہیں اس لئے بے سود ہوا۔ پھر جب وہ کہے گا کہ اللہ جل جلالہٗ تم کو حکم دیتا ہے۔ کہ اس کو یگانہ سمجھو اور کسی کو اس کا ساجھی قرار نہ دو تو عدم سماعت کی وجہ سے پیغمبر کا کام معطل رہا۔ پھر وہ کہے گا کہ اللہ کا "تم" کو حکم ہے کہ ایمان لاؤ مجھ پر، اور اس کے تمامی رسولوں پر، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور قیامت کے دن پر، مگر انہوں نے چونکہ کچھ سنا ہی نہیں لہذا رسول معطل رہا۔ پھر وہ کہے گا کہ اللہ کا حکم ہے نماز پڑھو، روزہ رکھو، اور یہ کرو، وہ کرو، فلاں کام اُس نے فرض کیا ہے۔ اور فلاں کام حرام کیا ہے، فلاں شے مباح ہے، اور فلاں مستحب، مگر چونکہ حاضرین سب بہرے ہیں اس لئے رسول کی تعلیم معطل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر قوت سامعہ نہ ہو تو نہ رسول کی معرفت ہو سکتی ہے نہ مرسل کی، نہ غیب پر ایمان کا وقوع ہو سکتا ہے۔ نہ شہادت پر ایمان کا صدور، نہ اتباع شریعت کی کوئی صورت ہے نہ امتثال و طاعت الٰہی کا کوئی طریق اور اس سے لازم آتا ہے کہ نہ ثواب ہے نہ عذاب، اور اس لئے جنت بھی اٹھ گئی دوزخ بھی، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ ہم جب تک رسول نہ بھیج لیں کسی کو عذاب نہیں دیتے (اور جب رسول ہی کا آنا نہ آنا برابر ہو گیا تو عذاب کیسا اور جہنم کس کے لئے) خلاصہ یہ ہوا کہ نبی آدم کے لئے سمع نہ ہو تو تکلیف شریعت ہی ساقط ہو جائے اور سب بمنزلہ جانوروں، چوپایوں اور ڈنگروں کے بن جاویں۔ پس انسان اگر درجاتِ عالیہ کا مستحق ہوا اور ملاءِ اعلیٰ میں جا شامل ہوا ہے تو صرف سماعت کی بدولت۔ معلوم ہوا کہ سمع کا مادہ زیادہ اور اس کا نفع عام ہے کہ اسرار ربوبیت اور تخلیق عوالم کے مصالح سب اسی پر موقوف ہیں اور اسی لئے آیاتِ سابقہ میں کہ احسانات جتانے کا موقع ہے سمع کو مقدم کیا ہے بصر پر کہ سماعت کی عطا کا احسان زیادہ قوی ہے بہ نسبت عطاءِ بصارت کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوْبِهِمْ ۔ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب کوئی بُرا کام کر بیٹھتے یا اپنے نفسوں پر ظلم کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ نیز فرماتا ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ جو شخص بُرے عمل کرے گا اور اپنے نفس پر ظلم کرے گا اور اس کے بعد اللہ سے معافی چاہے گا تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ بدعملی اور نفس پر ظلم تو ایک ہی چیز ہے۔ پھر آیت شریفہ میں دو چیزیں بتائی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہیں کہ نفس پر ظلم کرنا عام ہے (کہ ہر گناہ ظلم بر نفس ہے) اور بدعملی خاص ہے مگر عام کا عطف لفظ یا کے ساتھ نہیں آیا کرتا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بدعملی اور فاحشہ سے مُراد گناہ کبیرہ ہے اور ظلم بر نفس سے مُراد گناہ صغیرہ۔ اور میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ عمل بد اور فاحشہ سے مراد مطلق معصیت ہے۔ (خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ) اور ظلم بر نفس سے مُرادِ معصیت پر اڑ اور اصرار ہے کہ اصرار بر معصیت صورۃً کوئی عمل نہیں بلکہ عزم ہے (کہ اس بدعملی اور فاحشہ کو چھوڑوں گا نہیں) لہذا اس اڑ اور اصرار کی وجہ سے اُس نے اپنی جان کو سزا کے لئے پیش کر دیا۔ غرض دیر تک اس مبحث میں حضرت سے گفتگو ہوتی اور حضرت نے بھی تین جواب اس کے دیئے۔ مگر جب خوب بحث ہو چکی تو حضرت نے ذرا دیر سکوت کیا اور پھر فرمایا سیدی محمد بن عبدالکریم بصری یوں فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ کا سبب نزول زمانہ جاہلیت کا طریق اور وہ روش ہے جس پر اُس وقت اہل عرب چل رہے تھے۔ کہ ان کا ہم قوم اگر کوئی خطا کرتا تو دوسرے اس کی حمایت لیتے اور اس کی صفائی و براءت پر زور دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی نے چوری کی تو باوجودیکہ جانتے تھے واقعی اُس نے چوری کی ہے، مگر اس کی طرفداری کرتے، اس کو بے قصور بتاتے، شد و مد کے ساتھ چوری کا انکار کرتے، اور جو اس کو سارق کہتا اس سے لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ پس سرقہ تو عمل بد اور فاحشہ ہے کہ سارق اس کا مرتکب ہوا اور اس کی بے جا حمایت اور غلط بیانی و حلف دروغی ظلم بر نفس ہے کہ اس نے اپنی جان مفت برباد کی (اور دوسرے کے کارن

اپنی ناک کٹائی)۔ یہ تفسیر مجھے بہت پسند آئی کہ آیت کے سیاق وسباق سے بھی مناسب ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ الآیہ اے مخاطب جو لوگ (محرمات کا ارتکاب کر کے) اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں ان کی طرف داری نہ کر آج دنیوی زندگی میں اگر تم ان کے حمایتی بن کر لڑ جھگڑ بھی لئے (اور اس کو سزا سے بچا بھی لیا) تو کل بروز قیامت (خدا سے بچانے کے لئے) ان کی طرف داری و وکالت کون کرے گا۔ جس وقت حضرت ممدوح سے اس آیت میں گفتگو ہو رہی تھی ہم اس وقت فاس کے دروازہ شہر یعنی باب الحدید کے باہر تھے اور سیدی محمد بن عبدالکریم مذکور بصرہ میں تشریف رکھتے تھے مگر (باوجود اس بُعد مکانی کے) انہوں نے ہماری باتوں کو سن لیا اور وہیں بیٹھے ہوئے جواب بھی دے دیا۔

(۶) میں نے حضرت ممدوح سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا اور حق تعالیٰ نے تقوے کی بات (یعنی اسلام اور حق گوئی) کو ان کا جزو لازم بنا دیا اور تھے ہی وہ اس کے مستحق اور اہل"۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ (جن کا یہ حال ذکر فرمایا ہے) ظاہر ہے کہ قبل اسلام کفر و جہالت میں تھے اس وقت ان میں حق کی اہلیت اور احقیت کہاں تھی۔ فرمایا کہ اہلیت اور احقیت بلحاظِ قضائے سابق اور روز الست کے تھی جب کہ مخلوقات پیدا بھی نہیں ہوئی ہوئی تھی۔ اور عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اس وقت علم الٰہی میں تھا)۔ واللہ اعلم

(۷) میں نے وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ کے متعلق پوچھا کہ اللہ نے ہلاک کیا پہلی قوم عاد کو، تو کیا پچھلی قوم عاد کوئی دوسری تھی؟ مفسرین کے کلام میں اس جگہ بہت اضطراب ہے۔ قوم عاد کی طرف جو پیغمبر مبعوث ہوئے وہ حضرت ہود علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت ہود کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے تھا۔ پھر اسی قوم عاد کی ہلاکت کے قصہ میں لکھتے ہیں کہ (امساک باراں سے پریشان ہو کر) ان کا ایک وفد بارش کی دعا مانگنے کے لئے حرم الٰہی یعنی مکہ میں آیا، اور ظاہر ہے کہ مکہ کی بنا حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی

دکہ آپ سے قبل محض لق دق بیابان تھا۔ پھر کہاں زمانۂ ہودؑ اور کہاں مکّہ کا وجود،
اور اس میں ان کے نمائندہ کا ورود) اسی اشکال کو دیکھ کر بعض علماء اس طرف گئے
کہ عاد دو قوموں کا نام ہے۔ پہلی قوم عاد وہ ہے جن کی طرف حضرت ہود بھیجے گئے اور
وہ ہوا کے عذاب سے ہلاک کی گئی۔ اور دوسری قوم عاد اور ہے جس کی طرف کوئی اور پیغمبر
بھیجے گئے اور ان پر کوئی دوسرا عذاب آیا اور اسی عاد کا وفد مکہ میں آیا تھا مگر نہ نبی کا
تعین کیا کہ کون آئے تھے اور نہ عذاب کا۔ ان پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ یہ قصہ سورۂ
احقاف میں ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وفد اسی قوم عاد کا تھا جس کے پیغمبر
حضرت ہود تھے اور جو ہوا کے عذاب سے ہلاک ہوئے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاذْكُرْ أَخَا
عَادٍ اور دوسری آیت میں ہے وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ط ہم نے عاد کی جانب
ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اور آگے چل کر تذکرہ ہے ان پر ہوا کے عذاب نازل ہونے کا۔
اور نمائندوں کی جماعت جو کہ آئی تھی وہ اسی قوم عاد کی تھی۔ اس کا ثبوت وہ حدیث
ہے جو ترمذی و نسائی اور ابن ماجہ میں آئی ہے۔ جس کو ابن جریر نے سورۂ احقاف
میں بیان بھی کیا ہے کہ حضرت حارثؓ بن حسان بکری فرماتے ہیں۔ میں اور علاءؓ بن الحضرمی
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طویل حدیث میں یہ
قصہ بھی مذکور ہے۔ میں نے کہا اللہ اور رسول کی پناہ کہ میں عاد کے نمائندہ کی
طرح بنوں (اور دربار محمدی سے بجائے کامیابی کے ناکامی لے کر جاؤں)۔ حضرتؐ
نے باوجودیکہ آپ زیادہ واقف تھے مگر لذت لینے کے لئے ان سے دریافت کیا کہ
عاد کے نمائندہ کا کیا قصہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ قوم عاد قحط شدید میں مبتلا
ہوئی تو انہوں نے (نمائندہ بناکر) قیل عنبر کو معاویہ بن بکر کے پاس بھیجا (کہ حرم
الٰہی میں بارش کی دعا مانگے) اور ایک روایت میں ہے کہ قیل بن عنبر اور مرثد بن
سعد منجملہ ستر سرداران قوم کے مکہ آئے اور مکہ میں اس وقت حکومت عمالقہ کی تھی جن کا
سردار معاویہ ابن بکر تھا۔ یہ لوگ ایک مہینہ معاویہ کے مہمان رہے۔ مرثد نے اپنے رفقاء
سے کہا بھی تھا کہ صاحبو! بارش نہ برسے گی جب تک کہ ہود پر ایمان نہ لے آؤ مگر
قیل نے یہ سن کر معاویہ سے کہا اس کو قید کر دیجئے کہ ہمارے ساتھ (دعائے باراں کیلئے)
بیرون شہر نہ جائے کیونکہ یہ ہود پر ایمان لے آیا اور اس کو سچا سمجھنے لگا ہے۔ غرض

مہینہ بھر بعد شہر سے باہر جاکر بارش کی دعا مانگی تو دو بادل نمودار ہوئے ایک سیاہ ایک سپید، اور اس کو اختیار دیا گیا کہ جس بادل کو چاہے انتخاب کرلے۔ قیل نے یہ سمجھ کر کہ پانی سے خوب لبریز ہے سیاہ کو انتخاب کیا۔ تب ایک ندا آئی کہ اچھا اسی کو لے کر راکھ بنا دے گی اور عاد میں کسی ایک کو بھی باقی نہ چھوڑے گی" (معلوم ہوا کہ نمائندہ کے مکہ میں آنے کا واقعہ اور ہوا کے عذاب سے ہلاک ہونے کا سانحہ اسی قوم عاد کا ہے جس کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے نہ کہ دوسری قوم عاد کا جس کے نہ نبی کا نام معلوم نہ صورت عذاب کا تعین) حضرت ممدوح نے فرمایا ہاں عاد دو قوموں کا نام ہے۔ یہ قوم عاد عاد ثانیہ کہلاتی ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ بھیجے گئے مجدد بنا کر کہ شریعت سابقہ کو (بدعات سے صاف کریں اور اس کو) رواج دیں۔)
اسی قوم عاد کا یہ قصہ ہے جو سورۂ احقاف میں آیا ہے، اور اسی کا نمائندہ مکہ میں آیا تھا اور اسی کو ہوا کا عذاب دیا گیا تھا۔ اور یہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھے۔ اور نسب نامہ اس طرح ہے۔ ہودؑ بن عابر بن شباع الحرث بن الکلاب بن قیدار بن اسمٰعیلؑ۔ مگر عاد ثانیہ ساری حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں نہ تھی۔ بلکہ صرف ہود علیہ السلام اور ان کا کنبہ تھا (ورنہ قوم عاد کا جد امجد کوئی اور تھا)۔ اور اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ میں قوم کو ان کی برادری تغلیباً کہہ دیا گیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام مع اپنے کنبہ کے انہیں کے ساتھ رہتے بستے اور انہیں کے ساتھ سفر کرتے اور آتے جاتے تھے۔ اسی قوم عاد میں شداد بن عاد تھا جس کے پاس ایک بڑا خیمہ ذات العماد (اونچے کھمبوں والا) تھا۔ علماء کا خیال یہ ہے کہ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ ایک شہر تھا جو جنت کی شکل پر سونے سے تعمیر کیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ صحیح نہیں ارم نام ہے قبیلہ کا اور کلمۂ ذات العماد قبیلہ ہی کی صفت ہے، یعنی کھمبوں والی قوم ارم۔ خواہ رئیس قوم کے اعتبار سے کہ اس کے خیمہ کے کھمبے عالیشان تھے۔ یا ذاتی لحاظ سے کہ ساری قوم کے خیمے کھمبوں والے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا مقام سکونت دیکھا ہے اور وہ قریب قریب اسی نکے ہے۔
جو علماء نے احقاف کی صورت حال بیان کی ہے۔ وہ جگہ اتنی طویل عریض ہے کہ نو دن میں طے ہوسکے۔ ان کا بادشاہ بیچ شہر میں رہتا تھا کہ چاروں کنارہ سے کوئی شخص اس تک جانا چاہتا تو ساڑھے چار دن برہنہ سر اور پا خیموں ہی میں چلتا تھا۔ کیونکہ عمارتیں بھی بکثرت تھیں۔ مگر آبادی اتنی زیادہ تھی کہ شہر میں سمانہ سکتی

تھی (اس لیے خیموں میں رہائش تھی۔ اور چونکہ چلنے والے کو خیموں کے سایہ میں اور بچھے ہوئے فرش پر چلنا پڑتا تھا اس لیے جوتا اور ٹوپی کی ضرورت نہ تھی) حق تعالیٰ نے اُن کے لیے سطح زمین پر پانی کے دریا اور چشمے بہا دیئے تھے جن سے زراعت اور آب پاشی کرتے تھے۔ اور یہ دریا ندی نالے ان کے شہر سے بہت دور مقامات سے آئے تھے۔ ان کے بادشاہ کے خیمہ نے زمین کی اتنی جگہ گھیری تھی جتنی دور تیر انداز کا تیر چلتا ہے اس کے کھونٹے (جن سے رسیاں باندھی جاتی تھیں) اور کھمبے (جن پر خیمہ کھڑا کیا جاتا) خالص سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ اور خیموں کی رسیاں خالص ریشم کی تھیں۔ میں نے ان کا بچا ہوا سونا دیکھا جو اب تک ان کی زمین میں کہیں کہیں مدفون ہے۔ اور عام طور پر ساری قوم کے خیمے طلائی اور زرین تھے۔ غرض اسی قوم کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے جن کا نسب مذکور ہوا اور اسی کو عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ رہی عاد اولیٰ سو وہ نوح علیہ السلام کی قوم ہے جس کی طرف حق تعالیٰ نے ایک نبی کو بھیجا تھا جن کا نام ھُــویــں تھا اور وہ رسول تھے اور مستقل شریعت لائے تھے۔ برخلاف حضرت ہودؑ کے کہ وہ شریعت سابقہ کے مجدد تھے نیز حضرت نے فرمایا کہ ہر رسول مستقل کے لیے کتاب لازمی ہے۔ اور مجھے تمامی مرسلین کی کتابیں یاد ہیں۔ اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی کتاب کا بھی حافظ ہوں۔ میں نے کہا کیا حضرت والا کتب مرسلین کے نام گنوا سکتے ہیں؟ فرمایا بھلا کتابیں حفظ ہوں اور گنوا نہ سکوں اس کے کیا معنی، لو سنو۔ اس کے بعد آپ نے ایک ایک کتاب گنوائی اور فرمایا ولی تو ولی ہی نہیں بنتا جب تک تمامی کتابوں پر تفصیلاً ایمان نہ لا دے کہ اس کو (عوام کی طرح) اجمالی ایمان لانا کافی نہیں۔ میں نے کہا کیا تمامی اولیاء جن کو فتح نصیب ہوتی ہے ایسے ہی ہوتے ہیں؟ فرمایا نہیں صرف ایک یعنی غوث۔ اس وقت مجھے پورا علم ہوا کہ حضرت ممدوح غوث ہیں۔ اور آپ کے علوم خود بھی اس کا پتہ دے رہے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عاد اولیٰ یعنی قوم ہویںؑ کو حق تعالیٰ نے پتھر اور آگ کے عذاب سے ہلاک کیا کہ اول آسمان سے پتھر برسے اور جب وہ بھاگنے لگے تو چار طرف سے آگ نے گھیر لیا۔ نیز آپ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نوح سے پہلے سات سو پیغمبر ہو چکے ہیں اور ان کے واقعات میں بکثرت عجیب و غریب

باتیں ہیں۔ مگر حق تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ان کا کوئی قصہ ہمیں اس لئے نہیں سنایا کہ مابعد کے زمانہ ہائے وحی میں ان قوموں کی شہرت نہ رہی تھی (اور کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ کون تھے اس لئے ان کے تذکرہ سے چنداں نفع نہ تھا)۔ میں نے کہا کہ شفاعت والی حدیث میں تو حضرت نوحؑ کے متعلق آیا ہے کہ وہ اول المرسلین تھے پھر اُن سے قبل سات سو رسولوں کے آنے کا کیا مطلب ہوا۔ فرمایا جو پیغمبر کفار کی طرف بھیجے گئے اُن سب میں حضرت نوحؑ اول تھے۔ اور ان سے پہلے جو رسول آئے وہ ایسی قوموں کی طرف آئے کے عقائد صحیح تھے (مگر بدعملی پھیل گئی تھی جس کی اصلاح مقصود تھی) میں نے کہا پھر حضرت ہود علیہ السلام کی قوم پر آگ اور پتھر کا عذاب کیوں نازل ہوا جب کہ وہ مومن تھے! فرمایا حضرت نوحؑ سے پہلے کی اقوام کے متعلق عادت اللہ یوں ہی جاری تھی کہ گو یا عقائد اُن کے صحیح ہوں لیکن قواعد احکام میں اگر اکثر حصہ چھوڑ بیٹھیں تو سزا دے دی جاتی تھی۔

(۸) آیت شریفہ وداؤد و سلیمٰن اذ یحکمان فی الحرث الاٰیۃ کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس قصہ کو ان علماء نے اپنی دلیل قرار دیا ہے جن کا مذہب یہ ہے کہ دو مجتہدوں میں جن کے اجتہادی حکم متضاد ہوں مصیب ایک ہی ہوگا اور دوسرے کو غلطی پر کہیں گے۔ اگرچہ معذور سمجھا جائے گا بلکہ ماجور قرار پائے گا جب کہ حق کی تلاش میں اپنی انتہائی کوشش پوری کر گزرے۔ قصہ یہ تھا کہ ایک شخص کی بکریاں دوسرے کے کھیت میں گھس گئیں اور کچھ کھایا کچھ برباد کیا۔ کھیت والا بکریاں پکڑ کر سیدنا داؤد علیہ السلام کی عدالت میں لایا کہ آپ اس وقت کے نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ آپ نے فریقین کی روداد سن کر معاملہ کی باضابطہ تحقیق فرمانے کے بعد فیصلہ دیا کہ جتنا نقصان کھیتی کا ہوا ہے اس رقم کی بکریاں کھیت والے کو دے دی جاویں۔ اس فیصلہ کے بعد دونوں فریق حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے کو گزرے تو آپ نے بلایا اور واقعہ کو سن کر فیصلہ اس طرح دیا کہ بکریوں پر کھیت والے کو قبضہ دلایا جائے کہ اُن کے دودھ وغیرہ سے نفع اٹھادے اور کھیت بکری والے کے حوالہ کیا جائے کہ اُس کی خدمت کرے، حتٰی کہ ادھر کھیت والے کا نقصان بکریوں کے منافع سے پورا ہو جائے اور اُدھر کھیت اپنی سابق حالت پر آجائے تو بکریوں والے کو اس کی بکریاں

واپس دے دی جاویں اور کھیت والے کو اس کا کھیت حوالہ کر دیا جائے اس قصہ کا حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں ذکر فرمایا ہے کہ غور کرو اس واقعہ میں جب کہ داؤد و سلیمان سلیمان دونوں باپ بیٹے کھیتی کے بارہ میں فیصلہ دے رہے تھے۔ کیونکہ دوسروں کی بکریاں اس میں گھس گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے۔ پس ہم نے (معاملہ کی اصلیت) سلیمان کو سمجھا دی۔ اور یوں تو ہم نے دونوں کو علم و دانش عطا فرمائی تھی"۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ دونوں کے فیصلے اجتہادی تھے مگر حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے فیصلہ کو صائب اور صحیح قرار دیا۔ (لہٰذا معلوم ہوا کہ مصیب صرف ایک ہے اور دوسرا خاطی۔ مگر گرفت اس پر بھی نہیں کہ اجتہادی غلطی میں معذور بلکہ ماجور ہے) نیز انہیں حضرات کا دوسرا واقعہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ دو عورتیں تھیں اور دونوں کے بچے تھے۔ اتفاق سے بڑی کے بچے کو بھیڑیا لے گیا، اس نے چھوٹی کے بچے پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ بھیڑیا تیرے بچہ کو لے گیا ہے اور یہ بچہ میرا ہے۔ دونوں عورتیں عدالت داؤدی میں پہونچیں تو حضرت داؤد نے بچہ بڑی کو دلا یا کہ قبضہ اسی کا تھا۔ مگر حضرت سلیمانؑ نے یہ فیصلہ دیا کہ (جب دونوں کا دعویٰ بلا دلیل ہے تو) بچہ کو نصفا نصف دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چھوٹی نے تقسیم کو سنا تو کہنے لگی اچھا یہ بچہ اس بڑی ہی کا ہے۔ (اس تدبیر سے حضرت سلیمانؑ نے پتہ چلا لیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے کہ اس کے ٹکڑے ہونے کو مادری محبت گوارا نہیں کرتی اور دست برداری کو ترجیح دیتی ہے کہ جیتا تو رہے گو دوسری کا ہو کر جئے) لہٰذا آپ نے بچہ چھوٹی کو دلا دیا اور بڑی سے فرمایا کہ اگر یہ بچہ تیرا ہوتا تو اس کی تقسیم کی خواہش نہ کرتی (کہ ماں اپنے بچہ کو کبھی ذبح نہیں کرا سکتی)۔ اس قصہ میں بھی صائب رائے حضرت سلیمانؑ کی ہوئی۔ تیسرا قصہ اور ہے ایک عورت پر دعویٰ کیا گیا کہ اس نے کتے کو اپنی نفس پر قدرت دی (اور اس سے زنا کرایا ہے) اور گواہوں نے گواہی دی، لہٰذا آپ نے عورت کو سنگساری کا حکم سنایا۔ حضرت سلیمانؑ نو عمر تھے اور بچوں میں کھیل رہے تھے کہ اسی قسم کا قصہ ان کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے فرمایا ایک گواہ کو دوسرے سے علیحدہ رکھو۔ چنانچہ علیحدہ علیحدہ سب کی شہادت لی تو شہادتوں میں اختلاف ہو گیا اور آپ نے دعویٰ خارج کر دیا۔ اس وقت حضرت داؤد نے بھی تفریق گواہان کی طرف رجوع فرمایا۔

چوتھا قصہ اور ہے کہ ایک عورت کی شرم گاہ میں رطوبت سیال پائی گئی اور اس پر دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ مرد کی منی ہے اور عورت نے زنا کیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی سنگساری کا حکم دے دیا۔ مگر حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ اس رطوبت کو پکانا چاہیے اگر منجمد ہو جائے تو انڈے کی سپیدی ہے ورنہ منی ہے۔ چنانچہ اس کو پکایا گیا تو انڈے کی سپیدی ثابت ہوئی اور معلوم ہوا کہ عورت پر بہتان باندھا گیا ہے" حضرت ممدوح نے فرمایا شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ چاروں قصوں میں) حضرت داؤدؑ علیہ السلام نے غلطی کھائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے صحیح حکم دیا۔ کیا حضرات علماء نبیوں کے بارہ میں ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ حضرات انبیاء ساری مخلوق میں اللہ کے انتخاب شدہ اور اللہ کے نزدیک، ملائکہ سے بھی افضل ہیں۔ اگر خطا اُن سے صادر اور غلطی اُن سے سرزد ہو سکتی ہے تو ان پر اعتماد اور وثوق ہی کہاں رہا۔ وہ تو ہم جیسے بن گئے معاذاللہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ ہرگز غلط نہیں ہے (جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ غلط نہیں) پہلے (قصہ کی توجیہ تو یہ ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بالکل قانون الٰہی کے موافق اور خالص حق تھا۔ یعنی نقصانِ زراعت کا تاوان۔ مگر بکریاں اس لئے دلائیں کہ اس زمانہ میں لوگوں کے پاس نقد و زر تھے۔ اور تھے بھی تو بہت کم۔ اس لیے ان کے معاملات اور لین دین سب بکریوں اور مواشی سے ہوا کرتے تھے اور یہی ان کے پاس بکثرت تھے۔ جیسے گاؤں میں ہر چیز کی خرید غلہ سے ہوا کرتی ہے کہ یہ ان کے پاس وافر ہے اور روپیہ پیسہ بہت قلیل) لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام نے بکریاں کھیت والے کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ مصالحت کا درجہ تھا۔ لہٰذا ان کی رائے ہوئی کہ کھیتی کے نقصان کا تاوان (بجائے بکریوں کے) اگر ان کی منفعت یعنی دودھ اور گھی اور اُون سے کر دیا جائے تو بکریاں بچ رہیں گی بکری والے کے لئے۔ اور اس مدت میں بکری والا کھیتی کی خدمت کرے گا جس میں انگور کی کاشت ہو رہی تھی تو کھیت اپنی حالت پر آ کر قبضہ میں آ جائے گا اپنے مالک کے۔ مگر یہ اس پر موقوف ہے کہ دونوں فریق راضی بھی ہوں (ورنہ فیصلہ شرعی وہی ہے کہ تاوان دلایا جائے بقدر نقصان سکہ رائج الوقت سے)۔ پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس نے قانون کے موافق فیصلہ دیا وہ غلط ہے اور جس نے صلح کے درجہ کا فیصلہ دیا وہ صحیح ہے باقی تینوں

فصلوں کی توجیہ یہ ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا فیصلہ مقتضاء ظاہر کے موافق تھا کہ قبضہ یا شہادت یا قرینہ تو یہ دلیل ثبوت ہے۔ چاہے حقیقت اور واقعہ اُس کے خلاف ہو مگر قانون کہتا ہے کہ ظاہری ثبوت کے موافق مقدمہ طے کرو، لہذا یہی واجب ہے اور حاکم کو جائز ہی نہیں کہ اس کے خلاف فیصلہ دے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تدبیر کی کہ چھپی ہوئی حقیقت کھل جائے اور باطن کسی طرح ظاہر بن جائے، اور جب وہ ظاہر بن گیا تو آپ نے فیصلہ اس کے موافق دیا۔ پھر پہلے فیصلہ کو غلط اور دوسرے کو صحیح کیسے کہہ سکتے ہیں (جب کہ دونوں ظاہر پر متفرع اور ضابطۂ قانونی کے موافق ہیں) فیصلے دونوں صحیح ہیں اگرچہ باطن کے ظاہر بن جانے پر پہلا فیصلہ واجب النقض ہو گیا۔ مگر اس وقت اس کے غلط ہو جانے سے یہ کہاں لازم آیا کہ فیصلہ دیتے وقت بھی وہ غلط تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ چند جھوٹے گواہوں نے قاضی کے سامنے کسی معاملہ کی شہادت دی۔ اور قاضی نے ان کی شہادت پر فیصلہ سُنا دیا تو اس فیصلہ کو خطا اور غلط کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ قاضی نے ان کی شہادت پر فیصلہ سُنا دیا تو اس فیصلہ کو خطا اور غلط کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ قاضی پر واجب یہی ہے کہ شہادت پر فیصلہ دے (اس کو غیب کی کیا خبر کہ شاہدوں نے جھوٹ کو سچ کا جامہ پہنا دیا ہے، اور نہ وہ اس کا مکلف کہ ثقہ صورت دیکھ کر بھی بدگمانیاں کرے) لیکن اس کے بعد اگر گواہوں (کو خوفِ آخرت نے لرزا دیا اور انہوں) نے توبہ کی اور قاضی کے سامنے آکر اپنی دروغ بیانی کا اقرار کر کے شہادت سے رجوع کیا تو اب قاضی پر یہ واجب ہے کہ اُن کے رجوع کا مقتضا ہے اس کے موافق فیصلہ دے (بس ایک ہی قاضی کے دو فیصلہ باہم متضاد ہیں مگر) یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلا فیصلہ غلط تھا اور قاضی مخطی ہے۔

اسی شہر فاس کا واقعہ ہے کہ میرا ایک واقف شخص (خود اپنا نفس مُراد تھا) اپنے ایک دینی بھائی کے پاس گیا جو بصرہ کے رہنے والے اور قاضی شہر تھے (حضرت عبدالکریم بصری مُراد ہیں۔ جن کا ذکر اوپر گزرا ہے) ان کے پاس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو شخص آئے اور ایک نے کہا اس شخص نے میرا ایک یاقوت مجھ سے چھین لیا جو نہایت ہی قیمتی تھا اور وہ اس کے پاس موجود ہے۔ دوسرے نے کہا میں سامنے حاضر ہوں اور اس کو اختیار دیتا ہوں کہ سارے کپڑے اور جو کچھ بھی میرے بدن پر ہے سب کی تلاشی لے لے۔

مزید برآں میں اللہ کی قسم بھی کھاتا ہوں کہ یاقوت میرے پاس نہیں ہے۔ قاضی نے ارادہ کیا کہ اس کے حق میں فیصلہ دیدے مگر نو وارد ہم نشین نے کہا کہ ابھی حکم نہ سناؤ اور اس کے بعد دونوں فریق کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ یہ یعنی قاضی صاحب ہمارے دینی بھائی ہیں اور انہوں نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم دونوں بھی شریک ما حضر ہوؤ۔ جب کھانے سے فارغ ہو لیں گے تب قاضی تمہارے معاملہ میں غور کریں گے۔ چنانچہ ہم سب قاضی صاحب کے ساتھ گئے۔ اور جب کھانا سامنے آ گیا تو اس وقت اس ہمنشین اور قاضی صاحب دونوں نے مدعا علیہ کو کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کیا۔ دفعتاً اس کی ناک سنکی اور سنک کو رومال میں لے لیا جو اس کے پاس تھا۔ جلیس نے فوراً رومال اسکے ہاتھ سے چھین لیا۔ دیکھا تو اس میں یاقوت موجود تھا کہ سنک کے ساتھ (ناک سے) نکلا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کو مدعی کے حوالہ کر دیا۔ یہ ایک حیلہ تھا باطن کو ظاہر بنانے کا ورنہ اگر پہلے ہی تلاشی اور حلف کا حکم دے دیا جاتا تو وہ بھی صحیح تھا۔ اگرچہ کشف سے اس کا علم ہو بھی جاتا کہ یاقوت مدعا علیہ کے پاس موجود ہے (تب بھی ظاہر صورت پر حکم دینا غلط نہ ہوتا) کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کا مکلف نہیں بنایا) مگر ہم نشین نے حسن تدبیر پر عمل کیا اور باطن کو ظاہر بنا دیا۔ میں نے کہا کیا قاضی صاحب کو بذریعہ کشف معلوم ہو چکا تھا کہ یاقوت مدعا علیہ کے پاس موجود ہے؟ فرمایا ان کو بھی معلوم تھا اور ان کے ہم نشین کو (یعنی مجھے) بھی معلوم تھا۔ یہی نوعیت تھی ان تینوں قصوں کی جو محترم نبیوں کے درمیان واقع ہوئے تھے کہ پہلے قصہ میں سیدنا داؤد علیہ السلام نے بچہ حوالہ کیا بڑی کے لبسبب قبضہ کے کہ قبضہ دلیل ملک ہے۔ اور دوسرے قصہ میں سنگساری کا حکم فرمایا بوجہ شہادت کے۔ اور تیسرے قصہ میں سنگساری کا حکم دیا بوجہ پائے جانے علامت کے۔ اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تینوں میں تدبیر و حیلہ سے کام لیا حتیٰ کہ باطن کو ظاہر بنا لیا۔" ابن حجر نے بھی ابن منیر کا یہی قول لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کھیتی کے بارہ میں صائب تھا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے راستہ دکھایا صلح کا۔ اور حق تعالیٰ کا فرمانا كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا کہ دونوں کو ہم نے دانش اور علم سے نوازا تھا، یا تو عام ہے (کہ ہر امر میں دونوں کی فہم و علمیت اپنا کام کرتی تھی) یا خاص ہے اسی کھیتی کے واقعہ کے ساتھ (کہ اس مقدمہ زراعت

میں دونوں کا فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی صفت دانش و علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے مدح و ثنا فرمائی ہے۔ لہذا یہ اس قبیل سے نہیں ہو سکتا کہ مجتہد اگر غلط حکم بھی دے تو معذور ہے، کیونکہ غلط حکم کو نہ دانش کہہ سکتے ہیں نہ علم۔ واللہ اعلم۔

(۹) میں نے حضرت سے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ میں سَاق کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ سریانی زبان میں ساق کے معنی واقعیت کے ہیں مخول کی ضد۔ (لہذا ترجمہ یہ ہوا کہ جس دن حقیقت منکشف کردی جائے گی)۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مَسِیخا بھی ہے اس میں صحیح خ ہے یا ح؟ فرمایا خ صحیح ہے اور یہ لفظ سریانی ہے جس کے معنی ہیں بڑا شخص۔ پھر میں نے انجیل کے معنی پوچھے۔ فرمایا سریانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں آنکھ کا نور۔ پھر میں نے تورات کے معنی پوچھے۔ فرمایا یہ عبرانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں شریعت اور کلام حق۔ پھر میں نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مُشَفَّح ہے اس میں ف ہے یا ق کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ فرمایا سریانی لفظ ہے اور شفح سے مشتق ہے بمعنی حمد (لہذا مشفح کا ترجمہ ہوا محمد) پھر میں نے حضرت کے اسم مبارک منحمنا کی بابت دریافت کیا کہ تلفظ کس طرح ہے؟ فرمایا یہ دو کلمے ہیں مَنْ حَمَنّا من کے معنی ہیں سریانی زبان میں وہ نعمت جس کا نفع ظاہری بھی ہو اور باطنی بھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان بھی ہے کہ آپ نعمت الٰہیہ ہیں جس سے تمامی عوالم و مخلوقات سب منتفع و سیراب ہوئے۔ کہ اجسام کو نفع پہونچا عالم اجسام میں اور یہ ظاہری نفع ہے۔ اور ارواح کو نفع پہونچا عالم ارواح میں اور یہ باطنی ہے۔ اور حَمَنّا گویا صفت ہے پہلے کلمہ کی۔ یعنی وہ نعمت ہے جو منتہا پر پہونچی ہوئی ہے کہ اگلا پچھلا کوئی بھی اس درجہ پر نہیں پہونچا۔ میرے ایک دوست شہر تلمسان کے صلحاء میں سے تشریف لائے اور ذکر کیا کہ حاج عبدالرحمان بن ابراہیم نے کہ تلمسان کے بڑے دیندار تاجر ہیں اور حج بیت اللہ کے لئے گئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ میں سیدی ابراہیم دسوقی کے مزار کی زیارت کے لئے گیا تو آپ نے مجھے یہ دعا تعلیم فرمائی۔

دعا
بِسْمِ اللّٰہِ الْخَالِقِ الْاَکْبَرِ وَھُوَ حِرْزٌ مَّانِعٌ مِّمَّا اَخَافُ مِنْہُ وَاَحْذَرُ لَا قُدْرَۃَ لِمَخْلُوْقٍ مَّعَ قُدْرَۃِ الْخَالِقِ یُلْجِمُہٗ بِلِجَامِ قُدْرَتِہٖ اَحْمِیْ حَمِیْثًا اَطْمِیْ طَمِیْثًا وَکَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیْزًا حٰمٓعٓسٓقٓ حِمَایَتُنَا کٓھٰیٰعٓصٓ کِفَایَتُنَا فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ اور یہ ارشاد فرمایا کہ اس دُعا کو پڑھ لو اور پھر کسی چیز کا خوف نہ کرو۔ چونکہ حاج عبدالرحمٰن کو احمی حمیثا اطمی طمیثا کے معنی معلوم نہ تھے اس لئے انہوں نے اس دعا کے پڑھنے میں احتیاط کی ممکن ہے خلاف شرع ہوں اور مجھ سے ان کے معنی دریافت کئے۔ مگر مجھے بھی معلوم نہ تھے کہ کس زبان کے لفظ ہیں اور ان کا ترجمہ کیا ہے۔ تم بتاؤ ان کے معنی کیا ہیں۔ چنانچہ میں نے حضرت ممدوح سے ان کے معنی دریافت کئے۔ فی البدیہ فرمایا۔ آج سطح زمین پر ان لفظوں کا بولنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ تم کو کہاں سے ہاتھ لگ گئے۔ تب میں نے سارا قصہ سُنایا۔ فرمایا ہاں سیدی ابراہیم وسوقی بڑے درجہ کے اولیا میں اور اہل فتح کبیر تھے۔ وہ اور اُن جیسے اکابر اولیاء بیشک اِن دو کلموں کا تکلم فرما سکتے ہیں۔ یہ دونوں کلمے سریانی زبان کے ہیں۔ اور احمی کا ترجمہ ہے یا مالک اور اس کے اسرار میں ہے اے مالک بادشاہ یا عظمت عظیم الشان حی وقیوم۔ اور حمیثا اشارہ ہے اس کی مملکت کی طرف۔ گویا اس کا قائل کہہ رہا ہے' اے مالک اسرار' اے مالک انوار' اے مالک لیل ونہار' اے برسنے والے بادلوں کے مالک' اے چاند اور سورج کے مالک' اے دینے اور نہ دینے کے مالک' اے پستی وبلندی کے مالک' اے ہر ذی حیات کے مالک' اور اے ہر چیز کے مالک' غرض اس میں وہ سر عجیب ہے کہ نہ قلم ادا کر سکتا ہے نہ زبان۔ اور لفظ اطمی حق تعالیٰ کے اوصاف کبریائی وعظمت اور قہر وسطوت اور غلبہ وعزت اور اِن اوصاف میں اُن کا انفراد وتوحد ظاہر کر رہا ہے گویا کہہ رہا ہے۔ اے وہ ذات جس کو علم ہے ہر چیز کا' جس کو قدرت ہے ہر چیز پر' جس کا ارادہ حاوی ہے ہر چیز کو جس کی تدبیر جاری ہے ہر چیز میں' جس کے سامنے مجبور ہے ہر چیز' جس کے عاجز ہونے کا نہ وہم ہو سکتا ہے نہ اس کے تصرفات میں کسی نقص کا احتمال'۔ اور طمیثا اشارہ ہے ممکنات کی جانب جن میں اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ فرماتا ہے حکم دیتا ہے۔ پاک ذات ہے اور عجز

اس کے کوئی قابل پرستش نہیں۔ غرض اس میں بھی وہ سر عجیب ہے جس کو نہ قلم ادا کر سکتا ہے نہ زبان۔

سریانی زبان

حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ سریانی زبان ارواح کی زبان ہے، اور اولیاء اہل دیوان اسی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے الفاظ نہایت مختصر ہوتے ہیں اور معانی اتنے کثیر کہ کسی دوسری زبان کے الفاظ ان کو ادا ہی نہیں کر سکتے میں نے کہا کہ عربی زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی؟

فرمایا ہاں نہیں کر سکتی بجز قرآن مجید کے کہ عربی عبارت میں اگر وہ معانی جمع ہو جائیں جو سریانی میں ہیں تو عربی الفاظ سریانی سے بھی بہت زیادہ شیریں اور پیارے بن جاتے ہیں (اور یہ کمال صرف قرآن مجید کو حاصل ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ تمامی زبانوں کی عبادت سریانی کی بہ نسبت طویل ہوتی ہے کیونکہ وہ کلمات سے مرکب ہوتی ہیں اور سریانی زبان حروف تہجی سے ترکیب کھاتی ہے۔ کہ ہر مفرد حرف (دوسری زبان حروف تہجی سے ترکیب کھاتی ہے۔ کہ ہر مفرد حرف (دوسری زبان کے کلموں کی طرح) مستقل معنی ادا کرتا ہے، اور جب وہ دوسرے حرف مفرد سے ملتا ہے تو پوری عبارت کا فائدہ دیتا ہے۔ جس کو حروف مفردہ کے متعلق واقفیت ہو جائے کہ فلاں حرف کس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے تو اس کو سریانی زبان کا سمجھنا آسان ہو جائے اور اس زبان میں بولنے اور جو مطلب چاہے ادا کرنے لگے۔ پھر ترقی کر کے اسرار حروف کی معرفت تک پہونچ جائے کہ یہ علم بڑا عظیم الشان ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو عقول سے چھپالیا ہے تاکہ اس ظلمت کے ہوتے ہوئے جو ذات میں موجود ہے حکمت و دانش پر مطلع ہو کر ہلاک نہ ہو جاویں۔ نیز فرمایا کہ سریانی لغت تمامی زبانوں کے الفاظ میں ایسا سرایت کئے ہوئے ہے جیسے لکڑی میں پانی۔ اس لئے کہ حروف تہجی ا ب ت ہر زبان کے ہر کلمہ میں موجود ہیں۔ اور یہی حروف تہجی سریانی زبان کے کلمات ہیں جو مستقل معنے دے رہے ہیں۔ مثلاً احمد عربی زبان میں نام ہے اور دلالت کر رہا ہے اس ذات پر جس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ مگر سریانی میں الف مفتوح کے معنی جدا ہیں اور ح کے معنی الگ اور م کے معنی علیحدہ اور د کے معنی جدا۔ اسی طرح محمد بزبان عربی نام ہے ذات مسمیٰ کا

مگر بزبانِ سُریانی تہ مضموم حے مفتوح مشدد اور دال حرف اخیر سب جدا جدا معنی بتا رہے ہیں۔ اسی طرح زید، عمر، مرد، عورت، گدھا، گھوڑا (غرض فارسی، انگریزی، عبرانی، جرمنی، لاطینی، بنگلہ) کسی زبان کا بھی کوئی لفظ کیوں نہ ہو ہر ایک کے حرف ہجائی کے لیے بزبان سریانی مخصوص ترجمہ ہے۔ مثلاً البار قلیط

بزبان عبرانی نام ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اور سریانی میں پہلا الف مفتوح جدا معنے دے رہا ہے اور ل ب ا ر ق ل ی ط ہر حرف مفرد جدا معنی دے گا۔ الحاصل تمامی زبان کی اصل یہی سریانی ہی زبان ہے اور تمامی لغات اسی پر متفرع ہوئے ہیں۔ جس کا سبب وہ جہل جو عام بنی آدم پر چھا گیا کہ سُریانیت کی موضوعیت اور باہمی مخاطبت کا مبنی اُس صاف شفاف معرفت پر ہے جس میں جہل کا نام نہ ہو۔ حتیٰ کہ جو حضرات اِس زبان میں گفتگو کرتے ہیں وہ زبان سے لفظ نکالنے کے پہلے (بذریعہ اشراق روحی و نور قلبی) اس کے مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں، اور اس لئے اپنا مافی الضمیر سامع کے ذہن میں گذارنے کے لئے مختصر اشارہ کر دینا ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لہذا بخیال اختصار حروف مفردہ کا استعمال کرتے اور ایک حرف سے معانی کثیرہ کا اشارہ کر کے پوری عبارت کا کام لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اصل مدلول یعنی معانی سے بحث ہوتی ہے نہ کہ دلالت کنندہ حروف اور الفاظ سے۔ حتیٰ کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا کہ ان حروف کے بغیر ہی مضمون کو دوسرے کے سامنے مستحضر کر دیں تو سریانی لغت بھی وضع نہ ہوتا۔ اور اسی لئے سریانی زبان میں گفتگو صرف اہلِ کشف ہی کر سکتے ہیں (کہ تکلم الفاظ سے پہلے ان کے معانی و مفہوم کا بذریعہ کشف معلوم کرنا صاحبان کشف ہی کا کام ہے) یا ارواح سریانی میں باتیں کر سکتی ہیں کیونکہ فطری طور پر معرفت و ادراک سے نوازی گئی ہیں، اور یا ملائکہ کہ ان کی آفرینش ہی معرفت پر ہوئی ہے۔ لہذا اگر تم ان کو باتیں کرتے ہوئے دیکھو تو دیکھو گے کہ دوسرے لوگ جس مضمون کو ایک جز یا دو جز میں ادا کرتے ہیں وہ اس کو ایک حرف یا دو حرف اور حد ہے کہ ایک کلمہ یا دو کلمہ میں ادا کریں گے، اتنا معلوم کرنے کے بعد سمجھو کہ بنی آدم پر جب جہل کا غلبہ ہوا اور وہ اُن کثیر معانی کو جن کے لئے حروف مفردہ وضع کئے گئے تھے نہ سمجھ سکے اور یہ حروف معطل و بے معنی بن گئے تو ان کو اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے ان حروف کے ساتھ دوسرے حروف ملانے

کی ضرورت ہوئی۔ تاکہ اس مجموعہ سے جس کا نام کلمہ ہے وہ معنی ادا کریں جو سریانی کے حرف واحد سے ادا کرتے تھے۔ غرض حروف ہجائی کے معنی اور اُن کے اسرار و رموز سے جہل اور ناواقفیت کی بدولت ایک بڑا علم ضائع ہو گیا۔ مگر بایں ہمہ جب کسی زبان کا کوئی کلمہ لو گے تو اس میں کوئی حرف ضرور ایسا ملے گا جو اپنی سابق وضع (یعنی سریانیت کے درجہ) میں اس پورے مفہوم کو ادا کرے گا جس پر یہ پورا کلمہ اس دوسری وضع میں دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ کلمہ سریانیت ہی سے منتقل ہوا ہے لہذا کچھ نہ کچھ اس سے اتحاد ضرور لئے ہوئے ہوگا۔ پھر اس کلمہ کے باقی حروف ان کے نزدیک مہمل و بے معنی رہیں گے مگر سریانیوں کے لئے ان میں کا بھی ہر حرف جدا معنی اور مستقل مفہوم ادا کرے گا۔ مثلاً حائط عربی لغت میں گھر یا باغ کو گھیر لینے والی چیز یعنی چار دیواری کو کہتے ہیں۔ مگر سُریانی زبان میں صرف ح جو اس کلمہ کا پہلا حرف ہے اس معنی کو ادا کر رہا ہے۔ اور باقی حروف یعنی ا ئ ط عام لوگوں کے نزدیک مہمل و بمد زائد ہیں۔ لیکن سریانیوں کے نزدیک یہ بھی ح کی طرح اپنے معانی جُدا جدا بتا رہے ہیں۔ اسی طرح مثلاً ماء عربی زبان میں پانی کو کہتے ہیں۔ مگر سُریانی میں یہ معنی صرف ہمزہ سے ادا ہو رہے ہیں جو اس کلمہ کا آخری حرف ہے۔ اسی طرح السماء کے معنی ہیں آسمان۔ اور سریانی میں اس معنے کو صرف حرف س ادا کر رہا ہے۔ غرض غور اور تلاش کرو گے تو اکثر لغات اور کلمات کو اسی طرز پر پاؤ گے کہ ایک حرف سے معنی ادا ہو گئے اور باقی حروف بے فائدہ ضائع ہو گئے

نیز آپ نے فرمایا کہ سیدنا آدم علیہ السلام جب (جنت سے نیچے) زمین میں اتارے گئے تو اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ سریانی لغت میں باتیں کیا کرتے تھے (جنت کی سکونت کا) زمانہ قریب تھا لہٰذا معانی کی معرفت ان کو نور و صفائی کے ساتھ حاصل تھی۔ چنانچہ سُریانیت ان کی اولاد میں بلا تبدل و تغیّر اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ حتیٰ کہ سیّدنا ادریس علیہ السلام گزر لئے تو اس میں تغیّر و تبدل شروع ہوا اور لوگ اس کو اصل سے منتقل کرنے اور نئے نئے لغات تراشنے لگے۔ سب سے پہلا لغت جو مستخرج ہوا وہ ہندی زبان ہے اور اسی لئے سُریانی لغت کے قریب ترین ہے (غالباً سنسکرت مراد ہے) اور اسی لئے اس کو قدیم زبان بتایا جاتا ہے۔ چونکہ ابو البشر کی سکونت بعد ہبوط جنوبی ہند میں رہی اس لئے سُریانی زبان سب سے پہلی تبدیل میں سنسکرت بنی تھی)۔ اور حضرت

آدم علیہ السلام کا سُریانی زبان میں باتیں کرنا اس لئے تھا کہ اہلِ جنت کی زبان یہی ہے اور آپ جنت میں چونکہ اسی زبان میں کلام کیا کرتے تھے لہذا زمین پر آئے تو اس کو ساتھ لے کر آئے۔
میں نے عرض کیا کہ مفسرین نے تو خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ٥ کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ انسان سے مُراد حضرت آدمؑ ہیں اور بیان سے مُراد سات سو زبانوں میں کلام کرنا ہے جن میں افضل ترین لغت قرآنی ہے۔ فرمایا یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ نے سات سو زبانیں حضرت آدمؑ کو تعلیم فرمائیں اور وہ تمامی لغات جانتے اور سمجھتے تھے بلکہ آپ سے نیچے والے یعنی اولیاء امت محمدیہ (اغواث واقطاب) بھی ان سب زبانوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ مگر گفت گو حضرت آدم علیہ السلام صرف سریانی میں فرماتے تھے جس پر پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی تھی کہ آپ ہمیشہ رہے تھے جنت میں اور اہل جنت کی زبان سُریانی تھی (جیسے ایک ہندوستانی شخص انگریزی فارسی عربی جرمنی لاطینی وغیرہ سے واقف اور ہفت زبان ہو مگر بال بچوں سے گفت گو اپنی مادری اردو زبان میں کرے) میں نے کہا اس پر حضرت ابن عباسؓ کی حدیث مرفوع سے اعتراض وارد کیا جا سکے گا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عرب کے ساتھ محبّت رکھو تین وجہ سے کہ میں عربی ہوں، اور قرآن بھی عربی ہے۔ اور اہلِ جنت کی گفتگو بھی عربی میں ہوگی، فرمایا یہ حدیث نہیں ہے اور نہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (چنانچہ علامہ عقیلی نے بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث بے اصل ہے۔ اور ابن الجوزی نے بھی اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے)۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ بچوں کے کلام میں غور کرو گے تو اس میں بہت کچھ سریانیت پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نقش کالحجر ہو جاتی ہے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے بچوں سے باتیں کیا کرتے، (اگر وہ روتے تو) اُن کو چپ کیا کرتے، اور ان سے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے نام لیا کرتے، (اور یہ سب سُریانی زبان میں ہوا کرتا تھا) لہذا اسی پر ان کا نشو و نما ہوا۔ پھر بچوں کو اسی کی تعلیم دی۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا (کہ سب مادری زبان سیکھتے اور وہی بولتے چلے جاتے تھے) لیکن جب زبان میں (بعد زمانۂ ادریس علیہ السلام) تبدیلی واقع ہوئی تو وہ زبان بھولی بسری ہو گئی۔ اور بڑوں کے پاس تو اس کا کچھ بھی نہ رہا

البتہ بچوں کے پاس کچھ باقی رہ گئی۔ دوسری وجہ بھی ہے کہ جب تک بچہ دودھ پیتا رہتا ہے اس کی روح کو ملأ الاعلیٰ کے ساتھ تعلق رہتا ہے۔ اور بحالت رضاعت بچہ کو جو خوابیں نظر آتی ہیں اگر بڑے کو نظر آویں تو خوف کے مارے مرجائے۔ کیونکہ بچپن میں غلبہ روح کا رہتا ہے (اور وہ نورانی ہونے کے سبب فرشتوں کا نظارہ کرسکتی ہے) اور بڑے ہو جانے پر غلبہ ذات کا ہو جاتا ہے (لہذا وہ خواب میں بھی فرشتوں کی ڈراؤنی صورتوں کے نظارہ کو برداشت نہیں کرسکتا) اور پہلے معلوم ہو چکا کہ ارواح کی زبان سُریانی ہے۔ لہذا جس طرح بچہ عالم بیداری میں بزبانِ سُریانی جو بات کرتا ہے وہ بحکم غلبۂ روح کرتا ہے۔ چنانچہ طفل شیر خوار کی زبان سے نکلتا ہے عُ عُ ۔ یہ نام ہے حق تعالیٰ شانہ کا سُریانی لغت میں دلالت کرتا ہے۔ رفعت وعلو اور لطف وشفقت پر۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا یا علی یا رفیع یا لطیف یا حنان۔ اِسی طرح تم نے دیکھا ہوگا کہ بچہ کو دودھ چھڑتے کے بعد جب کوئی چنے یا باقلا کا دانہ دیتے ہیں تو اس کا نام تجویز کرتے ہیں۔ بُولُو کہ سُریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے کھانے کی میٹھی چیز کے لئے' اور یہی وجہ ہے کہ ماں کی پستان پر بھی جس سے دودھ پیا جاتا ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے (اور بقیہ اسی سریانی لغت کا ہے لہذا بچہ اس کو سمجھتا ہے اور پستان مادر کی طرح ماکول سمجھ کر کھانے کی رغبت کرتا ہے) اسی طرح جب بچہ کو پاخانہ پھرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ماں کو کہتی ہے عُ عُ جو سریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے ذات کی نجاست خارج کرنے کے لئے (گویا اسی کی سُریانی زبان میں ماں اس کو پڑھاتی ہے کہ نجاست ذات یعنی پاخانہ کو خارج کردے)۔ اسی طرح بچہ کے پاس جب اس سے چھوٹا بچہ کوئی لایا جاتا ہے تو اُس کا نام رکھتے ہیں مُومُو جس کے معنی سُریانی زبان میں قلیل الجسم چھوٹی اور پیاری چیز کے ہیں (گویا بچہ سے سُریانی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ ننھا عزیز آگیا اس سے دِل بہلا)۔ اور اسی لئے آنکھ کی پتلی کو عربی میں مُومُو کہتے ہیں۔ (کہ دانۂ مسور کی برابر عزیز الوجود ہے) مگر عین یعنی آنکھ کی طرف مضاف بنا کر بولتے ہیں یعنی مُومُوُ العین۔ غرض تلاش کروگے تو بچوں کے کلام میں تم کو بکثرت الفاظ سُریانی زبان کے ملیں گے۔

نیز حضرت نے فرمایا اس وقت (کہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ کا دن تھا) ملک مغرب میں کوئی

ایک بھی سُریانی زبان میں بات کرنے والا مجھے نظر نہیں آتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت منصور (جن کا انتقال ہو چکا تھا) سریانی میں کلام کیا کرتے تھے یا نہیں۔ فرمایا ہاں کیا کرتے تھے۔ مگر ہمارے حضرت عبداللہ برناوی سُریانی زبان میں ان سے بہت زیادہ اچھی گفتگو کرتے تھے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا حضرت برناوی کو اہل دیوان (صاحبان خدمت) سے ملنے جلنے کا اتفاق زیادہ ہوتا تھا (کہ غوث زمانہ تھے) اور اہل دیوان کی ساری گفت گو سُریانی زبان میں ہوتی ہے بوجہ قلت الفاظ اور کثرت معانی کے۔ ان کی گفتگو عربی زبان میں نہیں ہوتی۔ ہاں جس وقت آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف لاتے تو براہ ادب وتوقیر کہ حیات دنیویہ میں آپ کی زبان عربی تھی تمامی اہل مجلس عربی میں گفت گو کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا حضرت عمر ہواری اور حضرت محمد لہواج بھی (کہ آپ کے شیوخ ہیں) سُریانی زبان جانتے تھے۔ فرمایا ہاں پھر میں نے دریافت کیا کہ قبر میں منکر ونکیر کا سوال بلغت سُریانی ہو گا یا کسی دوسری زبان میں؟ کیوں کہ امام سیوطی اپنی نظم میں لاتے ہیں ؎

وَمِنْ غَرِیْبِ مَاتَرٰی الْعَیْنَانِ ؛ اِنَّ سُؤَالَ الْقَبْرِ بِالسُّرْیَانِیْ

عجیب بات جو آنکھوں سے نظر آئے گی کہ قبر میں سوال بزبان سُریانی ہو گا مگر اس کو شیخ الاسلام علم الدین بلقینی کے فتاوٰی سے نقل کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مجھے اس کی سند کہیں نہ ملی۔ اور علامہ ابن حجر سے بھی کسی نے اس کا سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا ہے کہ ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوالِ قبر عربی زبان میں ہو گا۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص سے اسی کی زبان میں سوال ہو۔ حضرت ممدوح نے فرمایا ہاں سوالِ قبر خاص سُریانی میں ہو گا۔ کیونکہ ملائکہ اور ارواح کی زبان وہی ہے۔ اور ملائکہ سوال (منکر نکیر) گروہِ ملائکہ ہی میں اور جواب دینے والی بھی روح ہی ہے۔ اور تمامی ارواح کی طرح اس کی زبان سُریانی ہے۔ جب ذات کا پردہ (موت کے سبب) درمیان سے اُٹھ گیا تو وہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آئی۔ اور جس ولی کو حق تعالیٰ شانہ فتح کبیر عطا فرماتا (یعنی غوث کے درجہ پر پہنچاتا ہے جب وہ کسی سے سیکھے بغیر سُریانی میں باتیں کرتا ہے کہ اس پر حکم روح غالب ہے پھر مردہ کا تو کیا پوچھنا۔ لہٰذا اس کو بھی (خواہ زندگی میں مادری زبان کچھ ہی ہو) سُریانی میں

باتیں کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت والا قبر کے سوال وجواب کی کیفیت بیان فرماکر ہمیں مرہونِ احسان بنائیں۔

فرمایا سنو۔ مَرَاز ھُو۔ اس کے اعراب ضبط کرو۔ اوّل میم مفتوح اور اس پر ہلکا سا تشدید۔ پھر رَا مفتوح اور آگے الف۔ پھر زا ساکن اور آخر میں ہا مضمومہ کے ساتھ و خفیف سکون لیے ہوئے۔ اور دل چاہے ہ پر وقف کردو۔ اور اس کے بعد ذرا کھینچو (کہ ہلکی سی واو پیدا ہوجائے)۔ اب اس کا مطلب سمجھو کہ ہر حرف مفرد کی وضع سُریانی میں خاص معنی کے لیے ہے۔ پہلا حرف یعنی میم مفتوح بڑے وضع دلالت کرتی ہے تمامی کائنات اور ساری مخلوقات پر۔ اور دوسرا حرف یعنی رَا وضع ہوا ہے تمامی خوبیوں کے لیے جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ زَ وضع ہوئی ہے برائیوں کے لیے جو اس کائنات میں ہیں۔ اور ہَا جس کے بعد کشش ہے وضع ہوئی ہے تاکہ دلالت کرے اس ذاتِ مقدسہ پر جس نے تمامی عوالم کو پیدا فرمایا ہے۔ پس حرف اول سے اشارہ ہوا تمامی خوبیوں کی طرف جو کائنات میں موجود ہیں۔ اور ان میں سیدالوجود صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات انبیاء، فرشتے، آسمانی کتابیں، جنّت، لوح، قلم تمامی انوار جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، اور جو کچھ عرش میں، اور اس کے اوپر، اور اس کے نیچے، ہیں سب داخل ہوجائیں گے۔ اور حرف سوم سے اشارہ ہوا تمامی شرور کی طرف کہ اس میں جہنم، اور ہر ذات خبیثہ، مثلاً شیطان، اور ہر وہ چیز جس میں شر اور گندگی ہو سب داخل ہوجائے گی۔ اور حرف چہارم یعنی ہ پہو بخارہی ہے حق تعالیٰ سبحانہٗ کی طرف۔ اور سُریانی لغت کی عادت ہے کہ بعض معانی کے صرف ارادہ پر اکتفا کرتی ہے اور اس پر دلالت کرنے والے حرف کی محتاج نہیں رہتی۔ جیسے (دیگر زبانوں میں بھی) استفہام اور قسم اور تمنی وغیرہ کے لیے لفظ نہیں لاتے بلکہ لہجہ کے طرز یا سیاق عبارت سے اس کو ادا کردیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں قرینہ سے کہ وہ سوال کرنے آئے ہیں استفہام مُراد ہوگا۔ گویا پوچھتے ہیں کہ تمامی کائنات، اور انبیاء، ملائکہ، کتب سماویہ جنّت اور تمامی خوبیوں کا، اور شیاطین، اور تمامی برائیوں، کا خالق وہ اللہ سبحانہٗ ہے یا کوئی اور؟ پس اگر مردہ مومن ہوتا ہے تو جواب مَرادا ازیو ھو۔ اول میم مفتوح اور اس پر ہلکا سا تشدید پھر رَ مفتوح اور آگے الف۔

پھر دَ ساکن اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ اور پھر نہ مکسورہ اور پھر ہ اور اس پہ ہلکا سا سکون پھر سَ ساکن اور اس کے آگے حسب سابق کا مضموم اور وَ ہلکے سے سکون والی اس کے مطلب کی توضیح یہ ہے کہ میم مفتوح حسب سابق اشارہ کررہی ہے تمامی کائنات کی طرف، اور حرف دوم یعنی سہ سے اشارہ ہے نور محمدی اور تمامی انوار کی طرف جو آپ سے مستخرج ہوئے۔ مثلاً انوار ملائکہ، انوار انبیاء و مرسلین، انوار لوح وقلم، نور برزخ اور ہر وہ چیز جس میں نور پایا جاتا ہے۔ اور یہ فرق کہ یہاں سہ سے مراد ہم نے نور محمدی وغیرہ لئے، اور سوال میں اسی حروف سے مراد تمامی خوبیاں لی تھیں، اس بناء پر ہے کہ جواب دینے والا چونکہ امت محمدیہ میں سے ہے لہذا چاہتا ہے کہ سلک محمدی میں داخل اور تحت لواء محمدی شامل ہو جاوے، اس لئے خاص نورِ محمدی مراد ہوا۔ تاہم یہ تفسیر سابق کے مخالف بھی نہیں ہے کہ ہر خوبی اور خیر یعنی جنت و عرش اور زمین و آسمان وغیرہ سب اسی اصل یعنی نور محمدی کی شاخیں ہیں۔ (اگر فرق ہوا تو صرف عموم و خصوص کا ہوا)۔ اور حرف سوم یعنی د سے اشارہ ہے تمام ان چیزوں کے برحق ہونے کی جانب جو پہلے حرف میں داخل تھیں۔ گویا جواب دیتا ہے کہ ہاں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں، تمامی انبیاء برحق ہیں، تمامی فرشتے برحق ہیں، اور تمامی کتب سماویہ برحق ہیں، ان میں اور جو کچھ بھی حرف سابق میں داخل ہے سب حق ہے، اس میں کوئی شک اور کسی قسم کا بھی شبہ نہیں ہے۔ پھر حرف چہارم یعنی ہمزہ مفتوحہ اشارہ کررہا ہے اپنے مابعد کے مدلول کی طرف کیونکہ مفتوحہ سریانی زبان میں منجملہ حروف اشارہ کے ہے جیسے ھٰذا اور ھٰذہ عربی زبان میں (اور یہ اور وہ اردو زبان میں)۔ اور حرف پنجم یعنی نہ حسب سابق شر اور برائی پر دلالت کررہی ہے کہ دوزخ اور ہر وہ چیز جس میں ظلمت وشر ہے اس کے تحت میں داخل ہو جائے گی۔ اور حرف ششم یعنی ہ ساکنہ سے اشارہ ہے ہر اس چیز کے حق ہونے کا جو حرف سابق یعنی نہ میں داخل ہے جس کو ی کے ساتھ اشباع دیا ہے۔ (یعنی زیر کو کھینچ کر بصورت یا پڑھا) گیا ہے۔ اور ہ جس میں ضمہ کے کھینچنے سے ہلکی واد پیدا ہوگئی ہے حسب سابق اشارہ ہے ذات علیہ کی طرف، بایں لحاظ کہ وہ خالق ہے مالک ہے متصرف ہے قاہر ہے۔ بس حاصل جواب یہ ہوا کہ کہتا ہے تمامی

کائنات کا، اور ہمارے نبی برحق کا، اور تمامی انبیاء کا جو کہ برحق ہیں، اور تمامی فرشتوں کا جو کہ برحق ہیں، اور تمامی انوار کا جو کہ برحق ہیں، اور عذاب جہنم کا جو کہ برحق ہے۔ اور ہر قسم کے شر کا جو کہ برحق ہے، سب کا پیدا کرنے والا، سب کا مالک اور سب کا با اختیار حاکم متصرف وہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے جس کا نہ کوئی سہیم ہے نہ شریک، اور نہ کوئی اس کے حکم کا ٹالنے والا ہے نہ اس کی مشیت کو روکنے والا۔ جب مردہ یہ صحیح اور حق جواب دیتا ہے، تو فرشتے کہتے ہیں نَاصِ یعنی نون مفتوحہ جس کے بعد الف ہے (اور زبر کے کھینچنے سے پیدا ہوا ہے) دلالت کر رہا ہے نور پر جو ذات میں دمک رہا ہے۔ اور صاد مکسورہ اشارہ کر رہا ہے مٹی کی طرف۔ اور رائے ساکنہ دلالت کر رہی ہے ماسبق کے حق ہونے کی طرف۔ مطلب یہ ہوا کہ ہاں تیرا نور ایمان جو تیری ذات ترابی میں جس کی اصل مٹی ہے قائم اور دمک رہا ہے وہ حق اور صحیح ہے، واقع کے مطابق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ گویا یہ اس حدیث کا مفہوم ہے جس میں مذکور ہے کہ مومن کا جواب سن کر فرشتے کہتے ہیں اصحاب آرام سے سو جاؤ ہمیں علم ہو چکا تھا کہ تم اہل یقین اور صاحب ایمان ہو۔ پھر میں نے قرآن مجید کے چند الفاظ کی بابت دریافت کیا جن کے متعلق علماء کا اختلاف ہے کہ وہ سریانی ہیں یا اور کسی زبان کے مثلاً اَسْفَارًا کہ علامہ واسطی نے رسالہ ارشاد میں لکھا ہے کہ سریانی لفظ ہے بمعنی کتب، اور ابن ابی حاتم نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ قبطی زبان کا لفظ ہے بمعنی کتب۔ فرمایا واسطی کا قول ہے کہ سریانی لفظ ہے بمعنی کتب۔ اور تفصیلی معنی یہ ہیں کہ ہمزہ مفتوحہ حسب سابق اشارہ ہے مابعد کی طرف اور س ساکن ہوا ہے محاسن اشیاء کے لئے اور ف مفتوح اس چیز کا نام ہے جو طاقت بشری سے خارج ہو اور ر مفتوح دوسرا اشارہ ہے محاسن کی طرف۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ کتابیں جن میں یہ یہ خوبیاں ہیں جو بشری طاقت سے باہر ہیں۔ یا مثلاً رَبَّانِیُّوْنَ کہ جو الیقی کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں یہ سریانی ہے یا عبرانی۔ فرمایا سریانی لفظ ہے۔ اور اس کا ترجمہ ہے وہ حضرات جن کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی علم کے متعلق بغیر سیکھے۔ اور یہ مرکب ہے تین کلموں سے یعنی رَبَّا اور نی اور یوت۔ رَا سے اشارہ ہے خیر کثیر کی طرف جس پر باء مشددہ دلالت کر رہی ہے پھر نْ مکسورہ اشارہ ہے قرب کے لئے اور ی مضموم کی وضع اس شے کے لئے ہے

جیسے سکون و قرار نہ ہو۔ مثلاً تجلی اور نور۔ ن مفتوحہ اشارہ ہے اس خوبی کی طرف جو ذات میں قائم اور مشتعل ہو۔ ترجمہ یہ ہوا کہ یہ خوبی جو میرے قریب ہے اور اہل فتح کی ذات میں ہوا کرتی ہے وہ ایک نور ہے انوار الٰہیہ میں سے اور سِر ہے اسرار الٰہیہ میں سے اور وہ ان کی ذات میں قائم و مشتعل رہا کرتا ہے۔ یا مثلاً ھیت لک کہ ابن ابی حاتم نے قبطی زبان کا لفظ کہا ہے۔ اور حسن نے سُریانی، اور عکرمہ نے حورانی، اور ابو زید انصاری نے عبرانی، بمعنے آؤ۔ فرمایا سُریانی نہیں ہے۔ یا مثلاً شہر کہ جو الیقی نے اس کو سُریانی لغت بتایا ہے۔ فرمایا سُریانی نہیں ہے۔ اور سُریانی زبان میں تو شہر کے معنی پانی کے ہیں۔ یا مثلاً عدن کہ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضرت کعب احبار سے دریافت کیا جنات عدن کا کیا ترجمہ ہے، کعب نے فرمایا کہ سریانی زبان کا لفظ ہے یعنی انگوروں کے باغات۔ اور ابن جریر نے اس کو رومی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ فرمایا سُریانی لفظ ہے اور پھر اس کی تفسیر میں اونچے درجہ کی بات کہی (جس کا اظہار مناسب نہیں) یا مثلاً سَاھُوْا کہ واسطی نے سُریانی لفظ بتایا ہے بمعنی ساکن۔ اور ابو القاسم نے قبطی لفظ کہا ہے بمعنی سہل فرمایا سُریانی لفظ ہے اور دلالت کر رہا ہے قوت ما لا یطاق پر کہ مثلاً ہم کہیں گے فلاں شخص رہو ہے۔ یعنی اتنا قوی ہے کہ دوسروں میں یہ قوت نہیں۔ اور مثلاً ہم کہیں گے جو شخص رہو قوم کا ہے۔ یعنی ایسی جماعت کا ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ غرض اسی قسم کے بہت سے لفظ میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیے جن کو بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔ نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ سُریانی زبان سے واقفیت صرف غوث کو ہوتی ہے یا اس کے ماتحت سات قطبوں کو۔ اور مجھے یہ زبان ۱۱۲۵ھ میں حضرت احمد بن عبد اللہ نے سکھائی تھی تقریباً ایک مہینہ میں۔ پھر حضرت ممدوح نے حروف تہجی کا ہر حرف جس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے ۸ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ میں مجھے تعلیم فرمایا۔ بحمد اللہ میں ایک دن میں سب سمجھ گیا تو فرمایا کہ میں نے تو ایک مہینہ میں سیکھی تھی اور تم نے ایک دن میں ہی سیکھ لی۔ میں نے آپ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا کہ یہ حضرت ہی کی برکت اور پڑھانے و سمجھانے کا سلیقہ ہے۔

(۱۰) قرآن مجید کی بابت میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ وہ لوح محفوظ میں

بلغت عبرانی مکتوب ہے؟ فرمایا اور بعض حصہ بلغت سریانی۔ میں نے پوچھا وہ بعض حصہ کونسا ہے؟
فرمایا بعض سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات ہیں۔ چونکہ برسوں سے جس چیز کی مجھے تلاش
تھی وہ آج ہاتھ آئی۔ میں بہت خوش ہوا۔ اور استفسار کیا ص ق القرآن ذی الذکر کے
کیا معنی ہیں؟ فرمایا اگر لوگوں کو ص کے معنی اور اس کی حقیقت کا علم ہو جائے تو کسی کو بھی
اللہ کے حکم کی مخالفت پر کبھی جرأت نہ ہو۔ مگر اس کی تفسیر بیان نہ فرمائی۔ پھر میں نے کھٰیٰعٓصٓ
کے معنی دریافت کئے۔ فرمایا اس میں بڑا عجیب راز ہے اور جو کچھ بھی سورہ مریم میں
(جس کے شروع کا یہ کلمہ ہے) مذکور ہے۔ مثلاً حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت
مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ،
حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ، علیہم وعلیٰ
نبینا السلام کے قصے۔ نیز ہر قصہ جس کا اس کے بعد سورۃ میں تذکرہ ہے۔ وہ سب
کھٰیٰعٓصٓ کے معنی میں داخل ہے۔ اور اس سے زیادہ حصہ اس کے معنی کا ابھی باقی
رہ گیا ہے۔ اور یہ رموز (یعنی حروف تہجی مثلاً ک ہ ی ع ص) لوح محفوظ میں
اس طرح لکھے ہوئے ہیں کہ ہر ایک کی تفسیر اس کے ساتھ مکتوب ہے۔ رموز کی شکل
بہت بڑی ہے اور اس کی تفسیر کہیں اس کے اوپر لکھی ہوئی ہے اور کہیں اس کے نیچے
اور کہیں اس کے پیٹ میں۔ اس کی مثال کچھ ہو سکتی ہے تو یہ کہ دستاویز کی تحریر میں
جب کوئی بات آتی ہے تو اسی جگہ لکیر کھینچ کر وہ متروکہ مضمون لکھ دیتے ہیں اور کاغذ
مکمل کر لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ شروع حروف بمنزلہ نشان کے ہیں اور ساری صورت
میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس کی شرح اور تفسیر ہے۔ اور لوح محفوظ کا قاعدہ یہی ہے
کہ اول رمز آئے گا اور پھر اس کی تفسیر۔ کہ جب تفسیر ختم ہو جائے گی تو پھر رمز آئے گا
اور اس کے بعد اس کی تفسیر۔ اسی طرح اخیر تک سلسلہ چلے گا۔ پس اگر حروف (دائرہ
اور کشش والا) ہوگا جیسے ص تو اس کی تفسیر اس کے اندر لکھی جائے گی۔ اور یہی وجہ ہے
کہ ص کی شکل لوح محفوظ میں اتنی لمبی نظر آتی ہے کہ کوئی چلے تو کم و بیش ایک دن
میں اس کی مسافت کو طے کرے۔ شروع سورتوں کے ان رموز کا علم صرف دو شخصوں
کو ہوتا ہے۔ ایک وہ جو لوح محفوظ کو دیکھتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اہل تصرف اولیاء کی
مجلس میں آمد و رفت رکھتا ہے۔ ان دو کے علاوہ کسی کو ان کے علم و معرفت کی طمع رکھنا

بالکل فضول ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ الـمٓ جو سورۂ بقرہ کے شروع ہے، اور وہ الـمٓ جو سورۂ آلِ عمران کے شروع میں ہے، دونوں کا اشارہ ایک ہی شے کی طرف ہے یا دونوں کے معنی جدا جدا ہیں؟ فرمایا دونوں کے معنی جُدا جدا ہیں۔ اور ہر ایک کی شرح وہی مضامین ہیں۔

جن کا اس سورۃ میں تذکرہ ہے۔ یہ تقریر میں نے آپ سے ابتدائی ملاقات کے وقت سُنی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ آپ اکابر اولیاء میں سے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ اکابر صوفیہ نے جہاں بھی سورتوں کے حروف مقطعات کی بحث چھیڑی ہے وہاں اس کی تصریح کی ہے کہ ان حروف مقطعات کے معانی سے کوئی واقف نہیں بجز اقطاب و اوتادِ ارض کے ۔ یہ میرے لئے بڑی شہادت تھی حضرت ممدوح کے ولی کامل (اور قطب وقت) ہونے کی۔ خصوصاً جب کہ آیات قرآنیہ کی عجیب عجیب تفسیریں آپ سے سنتا اور غور کرتا تھا کہ کہ آپ نے اس علم کو نہ بچپن میں سیکھا نہ بڑے ہو کر۔ بلکہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھا اور نہ حفظ کیا۔ بجز (نماز کے مقابل) چند سورتوں کے۔ چنانچہ امام ترمذی نے نوادرالاصول لکھا ہے کہ سورتوں کے مقطعات میں اشارہ ہے تمامی ان مضامین کی طرف جو اس سورۃ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان کا علم بجز اوتاد کے کسی کو نہیں کہ وہ حکماء خداوندی ہیں اور اللہ ہی سے انہوں نے اس حکمت و دانش کو (بلا تعلیم و تعلّم ظاہری کے) حاصل کیا ہے۔ اس کا نام علم الحروف ہے اور ان ہی حروف سے تمامی علوم کی تعبیر ہوتی ہے، اور ان ہی سے اسماء الٰہیہ کا ظہور ہوا کہ مخلوق اپنی زبانوں سے ان کو ادا کر سکی۔ اور غوث زمانہ حضرت ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کی حزب کبیر کے تحشیہ میں ولی کامل حضرت ابو زید عبدالرحمٰن فاسی نے بیان کیا ہے کہ حروف اور اسماء کی معرفت خصوصیاتِ علوم انبیاء میں سے ہے بلحاظ اولیاء ہونے کے (نبی میں شانِ نبوت جُدا ہے اور شانِ ولایت جُدا) اور یہی وجہ ہے کہ اس علم میں انبیاء اور اولیاء میں مشارکت ہو جاتی ہے (کہ اولیاء کو بھی حسب مراتب ان علوم کا حصہ مل جاتا ہے) کیونکہ یہ کشفی علوم میں سے ہے۔ لہٰذا عقل کی پونجی کا اس بازار میں لانا بے سود ہے۔ جس کو علم نصیب ہو گیا وہ ناواقف نہیں رہ سکتا، اور جو ناواقف رہا اس کا دماغ اس میں چل نہیں سکتا۔ نیز امام درتجی تحریر فرماتے ہیں کہ ان رموز کے معانی بجز علماء ربانیین کے کوئی نہیں جانتا۔ الحاصل ۱۳۲۹ھ کا یوم ترویہ

(۸رذی الحجہ) تھا جب میں نے آپ سے یہ مضمون سُنا کہ قرآن کا کچھ حصہ لوح محفوظ میں بزبان سُریانی مکتوب ہے' اور وہ یہی حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں تو میں نے فرداً فرداً تمامی حروف مقطعات کی تفسیر اور ان رموز کی شرح کا حضرت ممدوح سے سوال کیا اور الحمدللہ کہ میری پوری درخواست منظور ہو گئی۔ مگر سب کو تحریر میں لانے کے لیئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اس لئے کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

صٓ کی تفسیر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اس سورت میں صٓ سے مُراد وہ خلا ہے جس میں بروز حشر انسان اور تمامی مخلوق کا اجتماع ہو گا' اور آیت میں اسکا ذکر بصورت وعدو وعید لایا گیا ہے گویا ارشاد ہے (قسم ہے نصیحت سے بھرے ہوئے قرآن کی کہ) وہ صٓ ہے یعنی وہ (ہولناک منظر) جس سے میں تم کو ڈراتا ہوں اور وہ (پُرفضا منظر) جس کی میں تم کو بشارت سُناتا ہوں' وہ صٓ (یعنی محشر کا خلا اور میدان وسیع) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص کے اعمال وافعال جس حالت کو مقتضی ہوں گے وہ خلا اسی رنگ کو قبول کرے گا۔ مثلاً ایک کافر پر (بمقتضاء کفر) ایک عذاب تم کو نظر آئے گا' اور اُسی کے پہلو میں ایک مومن کھڑا ہو گا اس پر (بمقتضاء ایمان) ایک رحمت ہو گی۔ پھر اس کی بغل میں ایک کافر کھڑا ہو گا اُس پر دوسری قسم کا عذاب ہو گا' کہ کفر کے مراتب بھی جُدا ہیں اسی لیئے ہر کافر پر اس کے کفر کے موافق عذاب بھی جُدا ہو گا) پھر اس کے قریب ایک مومن کھڑا ہو گا اور اس پر رحمت ہو گی مگر دوسری قسم کی (کہ ایمان کے بھی درجات مختلف ہیں اس لئے ہر مومن پر رحمت کی نوعیت بھی جُدا ہو گی)۔ اسی طرح ہر بشر پر جتنے بھی محشر میں جمع ہوں گے جُدا قسم کی رحمت ہو گی اور جُدا قسم کا عذاب۔ کہ باوجودیکہ دیکھنے میں خلا ایک ہے اور دنیا کی طبیعت جس کو مقتضی ہے کہ (گرمی ہے تو سب پر اثر ہے اور بارش ہے تو سب پر برس رہی ہے' وہاں ایسا نہ ہو گا۔ بلکہ ہر شخص کی باوجود پہلو بہ پہلو ہونے کے راحت یا تکلیف مستقل ہو گی اور) ایک کی جگہ دوسرے کی جگہ کے کچھ بھی مشابہ نہ ہو گی۔ اور اہل فتح ثواب بھی اس کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زید اپنی تقدیر کی لکھت کے موافق اپنے مقام میں نظر آرہا ہے' اور عمر حسب نوشتۂ تقدیر اپنے خلا میں۔ گویا سب اللہ جل جلالہٗ کے سامنے (اپنے اپنے اعمال نیک وبد کے موافق عذاب یا رحمت کے جو میں) کھڑے ہیں اور اسی لئے ہم نے کہا کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ صٓ سے کیا مُراد ہے

اور یہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو کسی ایک کو بھی اللہ پاک کے حکم کی مخالفت پر کبھی جرأت نہ ہو کیونکہ اگر اُن کی نظروں سے پردہ اٹھا دیا جائے اور محشر کے خلا میں ان کو اپنا اپنا مقام و مرتبہ نظر آ جائے تو مطیع کو رشک ہو (کہ کاش بڑے مرتبہ پر پہونچتا) اور عاصی براہ تاسف مرے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اُس خلا میں کفار بھی ہوں گے اور مومنین بھی۔ انبیاء بھی ہوں گے اور ملائکہ بھی۔ جنات بھی ہوں گے اور شیاطین بھی۔ لہذا شروع سورت میں حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کفار کی طرف کہ ان کی چند جماعتوں کا تذکرہ فرمایا۔ اور پھر اشارہ فرمایا انبیاء کی طرف کہ ان میں چند حضرات کا تذکرہ فرمایا۔ نیز اشارہ فرمایا مومنین کی طرف کہ انبیاء ہی کے اثنار تذکرہ میں ان کا حال بیان فرمایا۔ اور سورت کے اخیر میں ملائکہ کا تذکرہ فرمایا، اور نیز جنات و شیاطین کا کہ دنیا میں ان کی جو حالتیں ہیں ان کو ظاہر فرمایا۔ اور چونکہ ان کے یہی دینوی حالات بروز حشر اس خلا میں تغیر احوال کا سبب ہیں۔ اس لئے ان کے کفر و تمرد کا تذکرہ گویا اُس خلا ہی کے انواع عذاب کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ کے متعلق اس میں اور بہت اسرار باقی رہ گئے جن کا اظہار مناسب نہیں ہے اب تفسیر سنو کھیٰعص کی کہ ہر حرف کے معنی بلحاظ وضع جدا ہیں۔ چنانچہ ایک حرف ہے مگر اس کے تلفظ میں الف کا اشباع ہے اور دو حروف مستقل ہیں ک اور ف کاف مفتوح کے معنی ہیں بندہ۔ اور فا ساکن فا مفتوح کے معنی کو محقق کرنے کے لئے آیا کرتا ہے، اور فا مفتوحہ کے معنی ہیں لایطاق۔ پس فا ساکن نے جب اس کو محقق کیا تو اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ اس کا بیرون از طاقت ہونا محقق ہے جس میں کسی قسم کا بھی شک و شبہ نہیں۔ اور لا بروئے وضع دلالت کرتی ہے رحمت طاہرہ صافیہ پر جس میں نام کو بھی کدورت وغیرہ نہ ہو۔ اور یا ندا کے لئے ہے۔ اور (عین بلحاظ تلفظ مرکب ہے تین حروف سے کہ) ع مفتوحہ دلالت کرتا ہے کوچ کرنے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے پر۔ اور ی ساکن دلالت کرتی ہے۔ تداخل اور اختلاط پر اور ن ساکن نون مفتوحہ کے معنی کو محقق کرتا ہے، اور نون مفتوحہ کے معنی ہیں خیر و خوبی جو ذات میں قائم و شامل ہو، اور نون ساکن نے اس کو محقق کیا کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور (ص میں بھی بلحاظ تلفظ دو حرف ہیں پس) ص مفتوحہ دلالت کر رہا ہے خلا محشر پر۔ اور د ساکن صاد کے معنی محقق کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ حروف اشارہ میں سے ہے اور

حروفِ اشارہ اپنے ماقبل کو محقق کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا تلخیص اعلان ہے حق تعالیٰ کی طرف سے تمامی مخلوقات کے لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے، اور اس کا احسان ہے تمامی مخلوق پر کہ انہوں نے اس نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے انوار کا استفادہ کیا۔ اس کی شرح یہ ہے۔ کاف نے دلالت کی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بندہ ہیں۔ نار ساکن نے دلالت کی کہ آپ بیرون از طاقت ہیں نیز اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ اور بیرون از طاقت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے مرتبہ کو نہ کوئی پہلا پا سکا اور نہ کوئی پچھلا پا سکے۔ اُس درجہ تک رسائی سب کی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے کہ آپ سید الوجود صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور ۸ مفتوحہ نے دلالت کی کہ آپ رحمت صافیہ ہیں۔ یعنی خود بھی طاہر و پاک اور دوسروں کے لئے بھی مطہر اور طہارت بخش۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ لِّلْخَلْقِ۔ اور یا اسی بندۂ مذکور کو ندا ہے اور جس غرض کے لئے پکارا گیا ہے وہ رحلت وانتقال مکانی ہے جس پر ع نے دلالت کی اور یام ساکنہ نے کہ حرف اشارہ ہے اس کو محقق کیا۔ نیز یہ بتایا کہ کوچ کرنا اور اختلاط وتداخل لازم وضروری ہے۔ اور جس غرض کے لئے اختلاط ضروری ہے اس پر دلالت کر رہا ہے نون ساکن یعنی وجود باجود کا نور جس سے تمامی موجودات کا بقاء ہے۔ اور کس کی طرف کوچ کرنا ہے اس پر دلالت کر رہا ہے ص لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اسے میرے ذی عزت واحترام بندے تم کو ضرور جانا پڑے گا ان سب کی جانب جن کو خلا رمحشر میں جمع ہونا ہے، وہ انوار لے کر جن کی بدولت ان کے وجود کا قیام ہے، تاکہ وہ تم سے مستفیض ہوں کہ سب کی اصل تم ہی سے ہے۔ اب معانی حروف کی ایک اچھی ترتیب قائم ہوگئی اور کلام منظم بن گیا کہ جس طرح ہر زبان کی عبارت چند کلمات سے مرکب ہوتی۔ اور ان کو باہم ایک خاص ترتیب دینے سے عبارت درست ہوا کرتی ہے اسی طرح سُریانی زبان حروف سے مرکب ہوتی ہے اور ان کو باہم ترتیب دینے سے اپنا صحیح مفہوم ادا کرتی ہے۔ اور جس طرح ہر زبان اپنے کلمات کے معانی کی ترتیب میں اس کی محتاج ہوتی ہے کہ کسی کلمہ کو مقدم کرو اور کسی کو موخر اور

کہیں ایک کلمہ دوسرے سے متصل ہوتا ہے مگر دونوں کے بیچ میں ایک اجنبی کا فصل لانے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام مقدر ماننا ہے کہ اس کے بغیر معنی درست نہیں ہوتے۔ اسی طرح سُریانی کلام جب حروف سے ترکیب کھاتا ہے تو صحیح معنے نکالنے کے لئے اس کو بھی تقدیم وتاخیر اور حذف واضمار کی ضرورت ہوتی ہے۔ الحاصل یہ ہے تفسیر ان رموز کی جو اہلِ کشف کو آنکھوں سے نظر آتی ہے کہ وہ سیّد الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کا اور جو کمالات اور بیرون از قدرت خوبیاں حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہیں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور دیگر مخلوقات یعنی حضرات انبیاء و ملائکہ کا۔ اور جو بزرگیاں حق تعالیٰ نے اُن کو عطا فرمائی ہیں ان کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ (بقاء وجود کا) مادہ ساری مخلوق کی طرف ذات محمدی سے چلا ہے نور کے ڈوروں میں کہ نور محمدی سے نکل کر (دھاری بن کر) انبیاء و ملائکہ اور دیگر مخلوقات تک جا پہونچا ہے۔ اور اہلِ کشف کو اس استفاضۂ نور کے عجائب و غرائب کا نظارہ ہوتا ہے۔ ایک صالح شخص نے کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا اٹھایا اور اس میں غور کیا تو روٹی میں نور کا ایک ڈورا نظر آیا: اس پر نگاہ دوڑاتا چلا گیا تو وہ اس نور کے ڈورے سے ملا ہوا تھا جو نور محمدی سے جا ملا تھا۔ اس نے دیکھا کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نور مکرم سے ملا ہوا ایک ڈورا ہے کہ کچھ دور تک۔ (تنہ درخت کی طرح) اکیلا چلا گیا ہے اور پھر اس میں سے نور کی شاخیں نکلنی شروع ہوئی ہیں اور ہر شاخ ایک نعمت سے جو ذوات مخلوق کو منجملہ نعمتوں کے عطا ہوئی ہے جا ملی ہے (یہ صالح شخص خود حضرت شیخ تھے)۔ ایک بدنصیب کا واقعہ ہے کہ وہ کہنے لگا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صرف ایمان کی رہبری ہوئی ہے (کہ حق کا راستہ بتا دیا) باقی رہا ایمان سو وہ اللہ کی طرف سے ہے (ذاتِ محمدی کو اس سے کوئی تعلق نہیں)۔ صلحاء نے اس سے کہا اچھا اگر وہ تعلق جو تمہارے نور ایمان اور نور محمدی میں قائم ہے، اگر ہم اس کو قطع کر دیں اور محض راستہ دکھانا جو تم کہہ رہے ہو باقی رہنے دیں تو کیا اس پر راضی ہو؟ اُس نے کہا ہاں راضی ہوں۔ بات ختم نہ کرنے پایا تھا کہ صلیب کو سجدہ کیا اور اللہ و رسول کا انکار اور اسی پر دم نکل گیا۔ (کمبخت یہ نہ سمجھا کہ عطا تو سب اللہ ہی کی طرف سے ہے حتیٰ کہ ہدایت جس کا رسول کی طرف سے ہونا تسلیم کیا ہے وہ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں مگر مسبب الاسباب نے جس طرح ہر نتیجہ کا تعلق سبب کے ساتھ رکھا ہے کہ کھائے گا تو پیٹ بھرے گا ورنہ نہیں اسی طرح نور ایمان بلکہ ہر نعمت کے نور کو وابستہ کیا ہے نور محمدی کے ساتھ (کہ جہاں یہ تعلق عیاذاً باللہ قطع ہوا فوراً ہی نور ایمان سلب ہوا) - الحاصل اولیاء اللہ ان تمام واقعات مذکورہ کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں جس طرح دُنیا کی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ کہ نظر بصیرت زیادہ قوی ہے بہ نسبت نظر بصارت کے - چنانچہ وہ دیکھتے ہیں سیدنا زکریا علیہ السلام اور ان کے احوال و مقامات کو اللہ کی طرف سے ہیں اور ممتد ہوتے ہیں ذات محمدی سے لبسوئے زکریا علیہ السلام۔ اور اسی طرح جو حالات و مقامات اس سورۃ میں سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے مذکور ہوئے اور جو حالات و مقامات حضرت مریم کے مذکور ہوئے اور جو حالات و مقامات حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت ہارون، حضرت ادریس، حضرت آدم، حضرت نوح، علیہم السلام کے مذکور ہوئے۔ اور نیز ہر نبی جس پر حق تعالیٰ نے انعام فرمایا سب کا یہی حال ہے (کہ ان کے انوار کا سلسلہ جا ملا ہے نور محمدی سے اور منبع و مصدر تمامی احوال و مقامات کا وہی ذات مطہرہ ہے) - یہ کچھ حصہ ہے معانی رموز کا ورنہ جو مضامین ابھی ان میں باقی رہ گئے ہیں وہ بے شمار ہیں کہ تمامی موجودات خواہ ناطقہ ہوں یا صامتہ، اور ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول، اور ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، سب ہی ان رموز میں داخل ہیں (کیونکہ محشر میں جتنی بھی مخلوق حاضر ہوگی وہ سب اس میں شامل ہے کہ ہر ایک وجود اور ازل اول تا آخر ہر نعمت کا نور ممتد ہوا ہے نور محمدی سے مگر ان کا جدا جدا تذکرہ سورۃ مذکور میں نہیں ہے) اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ سورۃ میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ بعض البعض (اور بہت قلیل حصہ) ہے اُس کا جو رموز مذکورہ میں موجود ہے"۔ حضرت ممدوح سے جب میں نے یہ پیاری تفسیر سنی تو حضرت محمد بن سلطانؒ کی کہ امام شاذلی قدس سرہٗ کے خواص میں سے ہیں بیان کردہ تفسیر کا تذکرہ کیا کہ وہ فرماتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا چند علماء سے کٰھیٰعص حمعسق کی تفسیر کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ یہ اسرار ہیں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان (جن سے بجز خواص کے کوئی واقف نہیں) دفعتہً حق تعالیٰ نے میری زبان پہ جاری کیا۔ گویا حق تعالیٰ فرماتا ہے (کٓ) اے محمد تم کہف الوجود اور مخلوق کی وہ

جائے پناہ ہو جس میں ہر موجود کو ٹھکانہ ملتا ہے (ی) ہم نے تم کو ملک ہبہ کیا اور تمہارے لئے ملکوت مہیا کیا (ی ع) اے عین العیون اور سب کی آنکھوں کی پتلی (ص) تم میری صفات میں سے ہو کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی (ح) ہم تمہارے حامی و محافظ ہیں۔ (م) ہم نے تمہیں ملک بخشا (ع) ہم نے تمہیں علوم نصیب فرمائے (س) ہم نے تم پر اسرار کھول دیئے (ق) ہم نے تم کو مقرب خاص بنایا۔ اس پر علمائے مناظرہ شروع کر دیا۔ میں نے کہا اچھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلو حضرت فیصلہ فرما دیں گے۔ چنانچہ حاضر خدمت بارگاہ ہوئے تو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محمد بن سلطان کا قول صحیح ہے' حضرت ممدوح نے فرمایا بے شک مقامات محمدیہ کے اعتبار سے محمد بن سلطان کا قول بالکل صحیح ہے۔ باقی وضعیت الفاظ کے اعتبار سے ان رموز حروف مقطعات کی جس کو تفسیر کہنا چاہئے وہ وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے"۔ درحقیقت حضرت ممدوح کی بیان کردہ تفسیر بہت عالی ہے کہ ملک کا ہبہ وغیرہ موہوب اور موہوب لہ میں مغائرت کو چاہتا ہے کہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ اور حضرت کی تفسیر کے موافق ملک و ملکوت اور تمامی مخلوقات ص میں داخل ہو چکی ہے' اور سب پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ ہر ایک کی اصل اور مادہ چلا ہے سید الوجود صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ سے جیسا کہ مقتضا ہے حرف ن اور یہی مطلب ہے کہف الوجود ہونے کا کہ ہر وجود کا منبع و مصدر ذات محمدی ہے (پس اس کو اور ملک بخشنے کو کہ غیر ذات محمدی ہے کیا مناسبت)۔ پس حضرت محمد بن سلطان نے جو کچھ فرمایا تھا وہ حسب تفسیر شیخ صرف ن اور ع اور ص میں مندرج ہے۔ غرض میں نے تمامی حروف مقطعات کو فرداً حضرت سے دریافت کیا اور حضرت نے ان کی تفسیر بیان فرمائی جن کا تذکرہ بہت طویل ہے۔ لہذا صرف دو جواب کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں۔ جن کو حضرت ممدوح نے بعض علماء سے استفسار پر لکھوایا تھا۔ پہلا سوال جو ایک عالم نے محض حضرت کا امتحان لینے کے لئے کہ علوم لدنیہ کے متعلق آپ کی شہرت کہاں تک صحیح ہے علامہ جامی وغیرہ کی کتابوں سے اقتباس کر کے لکھا تھا اور خیال تھا کہ حضرت ممدوح اس کا جواب کبھی نہ دے سکیں گے وہ یہ تھا کہ " مولانا ہمیں بتلائیے حروف مقطعات میں ق کے اندر رکھا ہوا وہ سر الٰہی کیا ہے جس کے متعلق عارفین کا قول ہے کہ اس میں دائرہ حضرت قدیمہ اور دائرہ حضرت حادثہ دونوں جمع ہیں؟ حضرت ممدوح نے باوجود

امیؐ ہونے کے اس کا جواب دیا کہ حضرت قدیمہ سے مُراد ان انوار حادثہ کا زمانہ و منظر ہے جو ارواح و اجسام اور آسمانوں اور زمینوں کی آفرینش سے قبل پیدا کیئے جا چکے تھے۔ وہ قدم حقیقی مُراد نہیں کہ بس اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے نہ تھی۔ اور حضرت حادثہ سے اس کا مابعد یعنی ارواح و اجسام کا شہود مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ارواح مع الاجسام ہیں ایک قسم (مومنین کی) ہے جن سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے' اور دوسری قسم (کافرین کی) ہے جن سے اللہ نے جہنم کی وعید فرمائی ہے۔ پھر جس نوع سے حق تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی ایک فرع ہے انوار حضرت الانوار کی جیسا کہ وہ نوع جن سے وعید فرمائی ہے جہنم کی وہ فرع ہے انوار حضرت الانوار کی۔ لہٰذا دوسری قسم حضرت الانوار (یعنی انوار عالم ارواح و اجسام) فرع ہوئی پہلی حضرت الانوار (یعنی انوار ماقبل تخلیق عالم) کی اور ہر دو حضرت میں ہر معاملہ کی دوٗ قسمیں ہوگیٔں پسندیدہ و محل رضا یا ناپسندیدہ و محل ناراضی۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب حروف مقطعات کی مراد میں غور کرو کہ تلفظ کے لحاظ سے ق میں تین حرف ہیں۔ قاف مفتوح اور الف اور فاء ساکن۔ پس قاف جس میں الف ملا ہوا ہے سُریانی زبان میں وضع کیا گیا ہے ہر دوٗ شہود میں تصرفات باری تعالیٰ کے لیئے۔ چاہے خیر ہو یا شَر اور فضل ہو یا عدل۔ اور فاء ساکن کی وضع سُریانی زبان میں ماقبل سے قبیح کو علیحدہ کرنے کے لیئے ہے۔ اور ہر دو نوع مذکور میں قبیح ہے وہ نوع جس سے شر کی وعید فرمائی گئی ہے۔ (اور جب یہ نوع بمقتضاء فاء ساکن علیحدہ کر دی گئی۔ اور یہ حرف مقطع (یعنی ق) ان ہی خاصان خدا اور اُن انعامات و افضال کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن سے حق تعالیٰ نے اُن کو نوازا اور جو اُن پر مبذول فرمائے ہیں۔ اور یہی ہے سِرّ حصر تین درجہ اس حروف میں رکھا ہوا ہے) کہ وہ اسماء الٰہیہ میں کا ایک اسم ہے جس کی اضافت اُس نوع کی طرف کی گئی ہے جو عند اللہ معزز و محترم ہے۔ جیسے عربی زبان میں سلطان (اور اُردو میں بادشاہ) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے ملک اور رعیت کی طرف خواہ رعیت دیندار ہو جیسے مسلمین۔ یا بددین ہو جیسے اہل ذمہ کفار۔ لیکن جب بادشاہ کی کوئی مدح کرے گا تو سلطان المسلمین کے لفظ سے کرے گا کہ (مضاف یعنی) لفظ مسلمین سے بر اہ ادب و تعظیم اہلِ ذمہ کفار کو نکال دے گا۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی داخل ہیں (کہ بادشاہ و حاکم تو دونوں ہی فریق کا ہے)۔ لہٰذا ق کی یہ شان ہوئی گویا بندہ عرض کرتا ہے کہ اے رب

محمدؐ اور اے انبیاء و ملائکہ اور تمامی اہل سعادت کے پروردگار کہ اہلِ سعادت فریق ہیں کی ایک ایک نوع گنتے جاؤ اور ان کے ساتھ رب کا لفظ لگاتے جاؤ۔ نیز سب کے مقامات اور احوال مع اللہ شمار کرتے جاؤ حتیٰ کہ اہلِ جنت پر آؤ۔ اور ان کے تمامی منازل و درجات جنت کا جُدا جُدا نام لو اور اس کو رب کی طرف مضاف کرو (کہ اے اس نعمت کے پروردگار اور اے اس منعم علیہ کے پروردگار) جب ایک ایک کا اس طرح ذکر کر چکو کہ بال برابر بھی (کوئی نعمت یا منعم علیہ) نہ چھوٹے تو سمجھو کہ یہ ۔ ہے ق کا ترجمہ۔

پس ظاہر ہے کہ اس میں تمامی اسرار رسالت موجود ہیں، تمامی اسرار نبوت موجود ہیں، تمامی اسرار ولایت موجود ہیں، تمامی اسرار سعادت موجود ہیں، تمامی اسرارِ جنت موجود ہیں، اور ان تمامی انوار و انعامات کے اسرار موجود ہیں، جن سے مخلوقات نوازی گئی ہے۔ اور جن کی شمار بجز اللہ جل جلالہٗ کے کوئی نہیں جانتا۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۔ (تیرے رب کا لشکر بس اسی کو معلوم ہے)

سُریانی زبان کا قاعدہ ہے کہ قاف ساکن چونکہ علیحدہ کرنے کے لیئے آتی ہے اس لئے کتابت میں خود بھی علیحدہ کر دی جاتی ہے (اور لکھت میں نہیں آتی) تاکہ کتابت اور معنی دونوں ہم شکل و موافق بن جاویں۔ واللہ اعلم۔ اور دوسرا سوال وہی اشکال تھا، جس کی طرف حزب شاذلیہ کے محشی حضرت عبدالرحمٰن فاسیؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ متعدد سورتوں کے شروع میں ایک ہی حرف مقطعات لانے کا کیا مطلب ہے۔ جب یہ حروف ان ہی تمام مضامین کی طرف اشارہ کیا کرتے ہیں جو اس سورت میں مذکور ہیں تو اس کا اقتضاء یہ تھا کہ دو سورتوں کے حروف مقطعات متحد نہ ہوتے (کیونکہ مضامین ہر دو سورت کے جُدا ہیں۔ چہ جائیکہ وہی الم ہے جو سورۂ بقر کے اول میں آیا ہے، اور وہی الم سورۂ آل عمران کے شروع میں ہے اور اسی الم سے سورہ عنکبوت کا افتتاح ہوا ہے)۔ حضرت ممدوح نے اس کا جواب دیا کہ آیات قرآنیہ کے انوار تین قسم کے ہیں۔ سفید۔ اور یہ رنگ ان کلمات کا ہے جس کے قائل بندے ہوتے ہیں اور جن کا اپنے رب سے سوال کرتے ہیں (مثلاً رب زدنی علما کہ الٰہی میرے علم میں ترقی بخش) سبز کہ جس کا قائل خود حق تعالیٰ ہو (مثلاً اقیموا الصلوٰۃ۔ نماز پڑھو)۔ اور زرد کہ جس کو تعلق ہو اس جماعت سے جن پر حق تعالیٰ کا غصہ ہے۔

مثلاً سورہ فاتحہ میں سبز رنگ صرف الحمد للہ کا ہے یہ قول ہے حق تعالیٰ سبحانہ کا۔ اور سفید رنگ رب العلمین سے لے کر غیر المغضوب تک کا ہے کہ (اگرچہ یہ بھی کلامِ حق تعالیٰ کا ہے مگر) قول ہے بندوں کا (اور درخواست ہے ان کی کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھایئے) اور زرد رنگ غیر المغضوب علیہم سے آخر سورۃ تک کا ہے (کہ تذکرہ ہے گمراہوں کا اور اس گروہ کا جن پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا)۔ اور یہ تینوں انوار ہر سورۃ میں ہوں گے۔ البتہ کسی میں کوئی نور کم ہوگا اور کسی میں کوئی نور زیادہ۔ جیساکہ سورۂ فاتحہ میں تم نے دیکھا (کہ سبز رنگ زیادہ ہے، اور اس سے کم زرد رنگ ہے، اور اس سے کم سفید رنگ) اور ہر سہ انوار کے رنگ مختلف ہونے کا سبب لوحِ محفوظ کا تین مختلف جہتوں کی طرف رخ ہونا ہے۔ کہ ایک رُخ اس کا دُنیا کی طرف ہے، یعنی اس کو تعلق ہے دُنیا اور اہلِ دُنیا کے حالات سے۔ اور اس میں وہی مکتوب ہے جو دنیا اور اہلِ دُنیا سے متعلق ہے۔ اور دوسرا رُخ اس کا جنت کی طرف ہے اور اس میں جنت اور اہلِ جنت کے حالات وکیفیات لکھے ہیں۔ اور تیسرا رُخ اس کا جہنم کی طرف ہے اور اس میں دوزخ کے حالات اور دوزخیوں کے مصائب وتکالیف کا اندراج ہے۔ پس وہ رُخ جو دُنیا کی طرف ہے سفید رنگ کا ہے اور جو رُخ جنت کی طرف ہے وہ سبز رنگ کا ہے اور جو رخ جہنم کی طرف ہے وہ زرد رنگ کا ہے۔ کہ حقیقت میں تو وہ سیاہ ہے مگر مومن کی نگاہ میں زرد رنگ آتا ہے۔ کیونکہ مومن کا نورِ بصیرت جب کسی سیاہ چیز پر پڑتا ہے تو اس کی نظر میں اس کو زرد بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مومن جب محشر میں کھڑا ہوگا اور اس کو حسبِ نوشتۂ تقدیر اس کا نورِ علم (جو دُوربین کی طرح مسافت بعیدہ کو عبور کرتا چلا جائے) ملا ہوا ہوگا، اور اس سے دور کوئی کافر کھڑا ہوگا جس کو چار طرف سے سیاہی نے گھیرا اور ظلمت نے ڈھانپ رکھا ہوگا تو یہ مومن جس وقت اس کو دیکھے گا تو زرد نظر آئے گا۔ اور اسی لئے پہچان جائے گا کہ یہ کسی کافر کا بدن ہے۔ مگر کافر (محشر میں) کسی چیز کو بھی نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ ظلمت وتاریکی نے چاروں طرف سے اس کو ڈھانپ رکھا ہے اور وہ سیاہی بمنزلہ پردہ اور آڑ کے بن گئی ہے۔ لہٰذا اس کو ہر طرف تیرہ وتار سیاہ ہی نظر آئے گا اللھم احفظنا منہ

میں نے عرض کیا کہ جب اُسے سارے میدان حشر میں اپنے ہی جیسے مظلم نظر آئیں گے اور کسی مومن یا اُس کے نور کو دیکھنے ہی کا نہیں تو مومن کی حالت کا اپنے سے بہتر ہونا اور تمنا کرنا

کہ کاش میں بھی دُنیا میں اسلام لے آیا ہوتا کیسے ہوگا؟ فرمایا حق تعالیٰ جنت اور اہلِ جنت کے حالات کا علم ضروری اس کے قلب میں ڈال دے گا (جیسے بچّہ کے قلب میں اس کا علم ڈال دیا ہے کہ ماں کی چھاتی کو چوسنے اور دودھ کو نکل لینے سے زندگی قائم رہے گی، اس کے لئے مشاہدہ کی یا تعلیم کی ضرورت نہیں) غرض جب اس کو تم سمجھ چکے تو اصل بحث کو لو کہ آیت شریفہ کو جب اس رُخ سے لوگے جو جنّت کی طرف ہے تو آیت کا نور سبز ہوگا۔ اور جب اس رُخ سے لوگے جو دُنیا کی طرف ہے تو اس کا نور سفید ہوگا۔ پھر ہر رُخ میں اتنی تفصیلات ہیں کہ ان کا احاطہ بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ اور یہ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں لوحِ محفوظ میں بھی اسی طرح لکھے ہوئے ہیں۔ البتہ وہاں ہر حرف کی شرح بھی بزبانِ سُریانی لکھی ہوئی ہے۔ لہٰذا جب شرح پر نظر ڈالو گے تو (گو تلفظ میں ایک ہیں مگر) ان کا جُدا جدا ہونا صاف معلوم ہو جائے گا۔ اس کی شرح یہ ہے کہ الٓمٓ رموز ہیں (اللہ و رسول کے درمیان) جس سے اشارہ کیا گیا ہے نورِ محمدی کی طرف جس سے تمامی مخلوقات استفادہ کرتی ہے۔ پس اگر اس نور پر نظر ڈالو بایں لحاظ کہ مخلوقات میں وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور وہ بھی ہیں۔ جنہوں نے کفر کیا، اور ایمان لانے والوں کے حالات کیا ہیں اور کفر کرنے والوں کے حالات کیا۔ اگر کلام کا سیاق ان امور اور ان کے متعلقات کے لئے ہے تب تو (وہ سفید رنگ والا اور) وہ الٓمٓ ہے جو سورۂ بقر کے شروع میں ہے اور وہ اسی مقصود کے لئے نازل بھی ہوئی ہے (چنانچہ دیکھ لو ساری سورۃ میں یہی مضامین بھرے ہوئے ہیں)۔ اور اگر نورِ محمدی پر نظر ڈالی جائے باعتبار ان نعمتوں کے جو مخلوق کو آپ سے حاصل ہوئیں اور ان کے حصول کی کیفیت اور طریقہ کے تو (اس کا رنگ سبز ہے اور) وہ الٓمٓ ہے جس سے سورۂ آلِ عمران شروع ہوئی ہے اور وہ اسی غرض کے لئے نازل بھی ہوئی ہے۔ اور اگر نورِ محمدی پر نظر ڈالی جائے باعتبار ان مصائب و آلام کے جو عالمِ دُنیا میں نا اہل لوگوں پر نازل ہوئے (تو وہ زرد رنگ والا) الٓمٓ ہے جو سورۂ عنکبوت کے شروع میں آیا ہے۔ اور جس سورت کے بھی شروع میں یہ رمز آئے گا وہاں یہی تقریر جاری ہوگی کہ جس کو لوحِ محفوظ کا علمی مشاہدہ نصیب ہے وہ ہمارے اس قول کو خوب سمجھے گا۔ اس پر میں نے ایک اعتراض وارد کیا اور حضرت والا نے اس کا جواب دیا۔ مگر چونکہ عقول

عامہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں لہذا ہم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تمامی حروف تہجی کے متعلق یہ بیان کر دوں کہ سُریانی زبان میں وہ کس معنی کے لیئے وضع لیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کی کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے (اور بقیہ حروف مقطعات کی شرح بھی ان کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے) لہذا غور سے سنو۔ ہمزہ اگر مفتوح ہے تو اس کا مطلب جمیع اشیار خواہ قلیل ہوں یا کثیر۔ اور کبھی اشارہ ہے نفس متکلم کی طرف۔ مگر اس اشارہ میں قبض مطلق نہیں۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو قریب ہو اور قلیل مقدار میں ہو اور اگر ملسور ہے تو وہ چیز جو قلیل بدرجہ مناسب ہو۔ بٙ اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو نہایت درجہ باعزت ہو یا نہایت درجہ ذلیل اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جو ذات پر داخل ہو یا داخل ہونے والی ہو' اور اگر مضموم ہے تو اشارہ ہے مگر اس کے ساتھ قبض ہے۔ تٙ اگر مفتوح ہے تو ترجمہ ہے خیر کثیر وعظیم۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ مصنوع جو ظاہر ہو' اور اگر مضموم ہے تو قلیل چیز جو ظاہر ہو۔ اور کبھی اجتماع ضدین کے لیئے بھی آتا ہے۔ ثٙ اگر مفتوح ہے تو نور یا ظلمت۔ اور اگر مضموم ہے تو اشارہ ہے کسی شے سے کچھ زائل ہو جانے کا۔ اور اگر مکسور ہے تو اشارہ ہے ایک شے کا دوسری شے پر تقرر۔ جٙ اگر مفتوح ہے تو نبوت یا ولایت بشرطیکہ اس کے قبل یا بعد حروف ہو جو اس پر دلالت کرے ورنہ خیر دائم جیسے زوال نہ ہو اور اگر مضموم ہے تو بہترین چیز جو کھانے میں آوے یا جس سے لوگ نفع اٹھاویں۔ اور اگر مکسور ہے تو قلیل وضعیف نور ایمان۔ حٙ اگر مفتوح ہے تو وہ اشیا کے احاطہ اور تمام چیزوں کے شمول پر دلالت کرے گا۔ اور اگر مضموم ہے تو تعداد کثیر نبی آدم کے سوا مثلاً ستارے۔ اور اگر مکسور ہے تو ذات پر داخل ہونے والی چیزیں یا جن پر ذات کا تسلط ہو۔ مثلاً غلام اور درہم دینار۔ اگر مفتوح ہے تو حد درجہ کا طول جس کے ساتھ رقت بھی ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ کمال جو حیوانات میں ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ کمال جو جمادات میں ہو۔ دٙ اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو ذات سے خارج ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جو ذات میں داخل ہو' یا ذات سے قریب' یا ذات پر داخل ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو قلیل یا قبیح چیز جس میں غصہ ساتھ ہو۔ ذٙ اگر مفتوح ہے تو شے اندرون ذات اور ساتھ ہی اس شے کی عظمت کا اظہار جس پر ذات کا قبضہ ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جس میں بالذات خشونت ہو' یا شے باعظمت'

یا قبیح - اور اگر مکسور ہے تو ایسی قبیح چیز جس پر بالذات غصہ ہیں۔ ش اگر مفتوح ہے تو تمامی خوبیاں ظاہری اور باطنی اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو اکیلی ہو اور ظاہر ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو روح یا ذی روح غیر بنی آدم۔ ص اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو ذات پر داخل ہو تو مضرت پہونچائے' یا قابل احتراز۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ قبیح جس میں مضرت ہو مثلاً کبیرہ گناہ۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ قبیح (جس میں (عیب ضرور ہے مگر) مضرت نہیں' جیسے صغیرہ گناہ اور شبہات۔ س۔ اگر مفتوح ہے تو ملیح شے جو طبعاً رتیق ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو قبیح اور کھری شے یا سیاہ چیز ظاہراً و باطناً۔ اور اگر مکسور ہے تو طبعی کمال مثلاً عقل کامل یا حلم و عفو۔ ش اگر مفتوح ہے تو رحمت جس کے پیچھے عذاب نہ ہو یا وہ شخص جس سے عذاب دور ہو اور رحمت نے داخل ہو کر اس کو پاک صاف بنا دیا ہو اور اگر مضموم ہے تو اس شخص کی اظہار عظمت کے لیئے ہے جو بالذات بلند مرتبہ ہو۔ یا جس میں عقل متحیر ہو' یا آنکھ کو تکلیف تو ہے مثلاً کنگ۔ اور اگر مکسور ہے تو قلب میں چھپی ہوئی چیز' یا جس شے کو پاؤں وغیرہ نے کچلا ہو اور وہ ظاہر نہ ہو۔

ص اگر مرقق ہے (کہ حسب قواعد تجوید باریک پڑھنے کا مقام ہے تب) تو مفتوح ہونے کی صورت میں زمین کے تمامی ذرات جو محشر میں بحضور حق جل شانہ' حاضر ہوں گے (مٹی سے پیدا ہوئی ہر چیز اس میں داخل ہے) -اور اگر مکسور ہے تو ساتوں زمین۔ اور اگر مضموم ہے تو تمامی پیداوار زمین۔ اور اگر مفخم ہو (کہ پُر پڑھنے کا مقام ہے) تو مفتوح ہونے کی صورت میں وہ شے جس پر غضب الٰہی ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو زمین جس میں نبات نہ ہو' یا وہ ذات جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ ضرر جو ہر دو مذکورہ چیزوں سے ہمیں پہونچے۔ ض اگر مفتوح ہے تو صحت اور عدم بلا۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جس میں مطلق نور یا مطلق ظلمت نہ ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو خشوع و خضوع۔ ط اگر مفتوح ہے تو نہایت پاک صاف چیز۔ اور اگر مضموم ہے تو اس کی ضد یعنی نہایت خبیث و گندی شے۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جس کا اثر طبعی ہو سکون' یا جس کو سکون کا حکم دیا جائے۔ ظ اگر مفتوح ہے تو وہ شے جو فی نفسہٖ بڑی ہو اور اس کی ضد کا وجود نہ ہو سکے۔ مثلاً شرفا میں جود و سخا (کہ بڑی خوبی ہے اور بتقاضائے شرافت بخل و تنگدلی کا وجود نہیں ہو سکتا)

یا مثلاً قوم یہود میں دھوکا دہی (کہ بڑا عیب اور گویا خاصہ یہودیت ہے کہ صفائی ان میں آ ہی نہیں سکتی)۔ اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو تحریک نفسانی کا اتباع کرے اور اس کی تباہی میں ساعی ہو اور اگر مکسور ہے تو وہ شے جس سے بندہ کو مضرت پہونچے اور ضرر رسانی اس کا امر طبعی ہو۔ ۱۸ع اگر مفتوح ہے تو مسافر کا آنا یا مُقیم کا سفر کرنا اور اگر مضموم ہے تو وہ شے جو ذات میں قائم ہو اور اسی سے ذات کا قوام و بقاء ہو۔ اور اگر مکسور ہے تو ذاتی خبث یا عبودیت کی گندگی۔ ۱۹غ اگر مفتوح ہے تو وہ نگاہ جو شے کی حقیقت کو پہونچ جائے۔ اور اگر مضموم ہے تو اللہ کا نام ہے (جیسا بچّے غُوغُو کہتے ہیں) اور اس میں شفقت پر دلالت ہے۔ اور اگر مکسور ہے تو سوال ہے نامعلوم کا تاکہ دوسرا جواب دے اپنی معلومات سے۔ ۲۰ف اگر مفتوح ہے تو خبث کی نفی ہے جب کہ معلوم ہو کہ اس کی جنس میں خبث ہے۔ یعنی اظہار ہے کہ یہ خود ظاہر ہے مگر اس کی جنس خبیث ہے اور خبیث سے مُراد معاصی وغیرہ ہیں۔ اور اگر مکسو ہے تو اشارہ ہے ذات کی طرف اور جس پر ذات مشتمل ہو اور کبھی اس کے ساتھ اظہار قلت بھی شامل ہوتا ہے۔ اور اگر مضموم ہے تو خبث زائل کرنے کے لیے ہے۔ ق۲۱ اگر مفتوح ہے تو تمامی خوبیاں یا تمامی انوار۔ اور اگر مضموم تو اصل آفرینش یا علم قدیم۔ اور اگر مکسور ہے تو اشارہ ہے ذلت کی طرف۔ ک۲۲ اگر مفتوح ہے تو حقیقت عبودیت کاملہ اور اگر مضموم ہے تو سیاہ فام غلام یا قبیح۔ اور اگر مکسور ہے تو عبودیت کے تمہاری طرف منسوب ہونے کا اشارہ ہے ل۲۳ اگر مفتوح ہے تو متکلم کو کسی بڑی چیز کا حصول اور اشارہ کسی باعظمت چیز کی طرف اور اگر مضموم ہے تو ایسی چیز جس کی انتہا نہیں۔ اور اگر مکسور ہے تو متکلم کی طرف اشارہ ہے اپنی ذات کی طرف۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ لام کو باریک پڑھا جائے۔ اور اگر لام کو پُر پڑھا جائے تو اس میں تلق یا قبح بھی شامل ہوگا۔ م۲۴ اگر مفتوح ہو تو تمام کائنات مراد ہے۔ اور اگر مکسور ہو تو ذات کا ظاہری نور جیسے آنکھ کی روشنی اور باطنی نور جیسے قلب کی بصیرت۔ اور اگر مضموم ہے تو پیاری چیز اور قلیل جیسے آنکھ کا پانی (جس پر بینائی کا مدار ہے) اور اسی سے ہے مُومُو (جو شیر خوار بچوں سے کسی چھوٹے بچہ کو پاس بٹھا کر کہا کرتے ہیں) ن۲۵ اگر مفتوح ہے تو خیر و خوبی جو ذات میں مستقر اور مشتعل ہے۔ اور اگر مضموم ہے تو خیر کامل یا پھیلا ہوا نور۔ اور اگر مکسور ہے تو وہ

جو متکلم کو ملے گی یا ملی ہوئی ہے۔ وؔ اگر مفتوح ہے تو وہ چیزیں جن کا انسان میں پھیلا ہوا ہے، جیسے رگیں وغیرہ اور اگر مضموم ہے تو وہ چیزیں جو بنی آدم سے مبائن ہیں جیسے آسمان اور پہاڑ وغیرہ۔ اور اگر مکسور ہے تو پھیلی ہوئی چیزیں گھناؤنی جیسے آنتیں وغیرہ (کہ محل براز ہیں) لؔا اگر مفتوح ہے تو رحمت پاک صاف بے انتہا۔ اور اگر مضموم ہے تو نام ہے اللہ پاک کا اور اگر مکسور ہے تو وہ نور جو مخلوق سے نکلتا یا خاص مومنین سے خارج ہوتا ہے یؔا اگر مفتوح ہے تو ندا کے کے لئے ہے اور کبھی خبر کے لئے بھی آتا ہے جس میں ضمناً ندا ہو۔ مثلاً لَمْ یَلِدْ کہ جملہ خبریہ ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اے وہ ذات جو دلالت سے منزہ ہے اور اگر مضموم ہے تو وہ چیز جسے قرار نہ ہو جیسے بجلی وغیرہ اور اگر مکسور ہے تو وہ چیز جس سے حیا آوے مثلاً شرمگاہ۔ یہ ہیں اسرار حروف اور پھر ہر حرف کے سات اسرار ہیں جو معانی مذکورہ کی مناسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز سات اسرار اور بھی ہیں جن سے مناسبت ہے عربی زبان کو۔ اور اگر کلام عجمی ہو تو اس کے مناسب دیگر سات اسرار ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرت ممدوح کی خدمت میں میری حاضری کا پہلا مہینہ تھا کہ آپ نے فرمایا لو ان کلمات کو خوب سمجھ لو اور کبھونا مت میکز سیذ ع مَاذرُ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون سی زبان ہے۔ فرمایا سُریانی۔ اور چند لوگوں کے سوا اس زبان سے کوئی واقف نہیں کہ اس میں باتیں کر سکے۔ میں نے پوچھا بھی کہ اس فقرہ کا مطلب کیا ہے، مگر آپ نے بیان نہ فرمایا۔ اب سریانی حروف کی وضع معلوم ہونے کے بعد سمجھ میں آیا کہ آپ مجھ سے یہ اشارہ فرماتے تھے دیکھو اس نور کو جو میری ذات میں قائم اور چمک رہا ہے میرے ظاہر میں بھی اور میرے باطن میں بھی۔ دیکھو اس بڑی خیر و خوبی کو جس پر میری ذات نے قبضہ پایا اور اسی سے اس کا قوام ہے کہ تمامی کائنات کا شر در سے محفوظ رہنا اسی کی بدولت ہے۔ اور آسمان و زمین میں جتنی بھی ظاہری و باطنی خوبیاں ہیں وہ اسی نور سے مستفید ہوتی ہیں جو میری ذات میں موجود ہے۔ گویا حضرت ممدوح (اپنی غوثیت کا) اظہار فرمارہے تھے کہ حق تعالیٰ نے تصرفات عالم کا آپ کو واسطہ بنایا۔ واللہ اعلم۔

(۱۱) حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۵ تاکہ اللہ معلوم کرلے (حقیقی) ایمان والوں کو، اور تاکہ تم میں بعض کو درجۂ شہادت بخشے۔ اور فرماتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۵ ہم تم کو آزمائیں گے تاکہ جان لیں کہ کون کون تم میں مجاہد اور صابر ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے پھر اس کا کیا مطلب ہے، تاکہ جان لیں اور معلوم کرلیں ؟ فرمایا جس طرح لوگوں کی عادت ہے اپنے کلام میں اُسی کے موافق قرآن مجید کا نزول ہوا ہے۔ کہ فرض کرو کسی بادشاہ کا کوئی مقرب ہو جس سے زیادہ کوئی مقرب نہ ہو اور بادشاہ نے اپنی رعایا کے سارے معاملات اور ملک کے تمامی انتظامات اُس مقرب کے سپرد کر دیئے ہوں، اور رعایا پر اس مقرب کی اطاعت کو واجب بنا دیا ہو، اور خود لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو، اور داخلہ کی اجازت صرف اسی مقرب کے لئے مخصوص کر دی ہو کہ بجز اُس کے حرم سرا میں کوئی نہ جاسکتا اور بادشاہ تک نہ پہونچ سکتا ہو، تو ظاہر ہے کہ رعایا پر بادشاہ کی اطاعت و خدمت کے متعلق جتنے بھی احکام ہوں گے یہی مقرب اُن کو لے کر آئے گا۔ اور جب اُن کو جاری کرے گا تو اس طرح کہے گا کہ بادشاہ سلامت تم کو یہ حکم فرماتے ہیں، اور تم سے فلاں خدمت لینا چاہتے ہیں، اور اُن کی خواہش ہے کہ تم یہ کرو اور یہ کرو۔ اس مقرب کی تمام خطابات میں یہی عادت ہوگی حتیٰ کہ جن امور کا تعلق اس کی ذات سے ہوگا اور وہ بادشاہ کی طرف سے نہ ہوں گے۔ ان میں بھی اس کا یہی طرز ہوگا کہ کہے گا بادشاہ کے ساتھ چلو، فلاں مقام پر بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کرو، اور اس سے مراد اپنا نفس ہوگا کہ میرے ساتھ چلو، اور میرے ساتھ برتاؤ کرو۔ اور اس کا سبب وہ یگانگت ہے جو بادشاہ اور اس مقرب کے درمیان ہے (کہ اس کے ساتھ کوئی برتاؤ کرنا بعینہٖ بادشاہ کے ساتھ کرنا ہے)۔ یہی شان اس آیت میں مفہوم کی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ مُراد ہے نسبت الی الرسول یعنی تاکہ پیغمبر جان لے تم میں کون کون مجاہد اور صابر ہے اور تاکہ رسول کو معلوم ہو جائے پختہ ایمان والا۔ اس کے بعد آپ نے ایک عالی مضمون بیان فرمایا جس میں حق تعالیٰ کے ارشاد

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ
کے مطلب کی طرف اشارہ تھا (مگر یہ موقع اس کے اظہار کا نہیں)۔

(۱۲) میں نے حضرت ممدوح سے مسئلہ غرانیق کے متعلق استفسار کیا کہ اس میں حضرت عیاض حق پر ہیں جو اس قصہ کا انکار فرماتے ہیں، یا علامہ ابن حجر جو اس کو صحیح واقعہ قرار دیتے اور لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم اور طبری اور ابن المنذر (ائمہ محدثین) نے متعدد طرق سے بروایت شعبہ از ابو بشر حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اَفَرَاَیْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی ۔ کہ دیکھو تو سہی لات اور مناۃ اور تمہارا تیسرا عزی ۔ اس کے آگے شیطان نے آپ کی زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری کرا دیئے۔ تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتھن لترتجٰی یہ بڑے پایہ کے لوگ تھے اور ان کی شفاعت کی ضرور توقع رکھنی چاہیئے، اس کو سن کر مشرکین مکہ نے کہا کہ آج سے پہلے محمد نے ہمارے معبودوں کو بھلائی کے ساتھ کبھی یاد نہ کیا تھا مگر اس وقت ان کی مدح وثنا کی ہے) لہذا (آنحضرت نے سجدہ کیا - اور مشرکین نے بھی (خوش ہو کر موافقت میں سجدہ کیا)۔ اس ثبوت کے ہوتے ہوئے عیاض کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس حدیث کی روایت نہ کسی ثقہ سے ثابت ہے اور نہ اس کی سند متصل یا صحیح ہے، اور جن طریقوں سے یہ مروی ہے ان میں اکثر ضعیف اور ناقابل اعتماد ہیں - پھر بروئے درایت بھی اعتراض کیا ہے کہ ایسا واقعہ اگر پیش آتا تو بہتیرے مسلمان بھی مرتد ہو جاتے (اور ارشاد نبوی کے موافق لات و مناۃ اور عزی کا کہ مشرکین مکہ کے بت تھے احترام کرنے لگتے۔ اور جب ثابت نہیں کہ کوئی مسلمان اس عقیدہ پر آیا ہو تو ثابت ہوا کہ قصہ بالکل بے اصل ہے)۔ یہ لکھ کر علامہ ابن حجر نے منکرین قصہ کے دلائل کو رد کیا ہے، کہ یہ قصہ چونکہ مختلف طریقوں سے منقول ہوا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اس کی اصل ضرور ہے مگر جن کے نزدیک مرسل قابل حجت ہے ان کو تسلیم کرنے میں دریغ ہی نہ ہوگا۔ لیکن جن کے نزدیک مرسل حدیث قابل حجت نہیں ہے - چونکہ طرق روایت اس کے متعدد ہیں اور کئی ضعیف مل کر ایک قوی کا حکم لے لیتے ہیں لہذا اب ان بھی تسلیم

کرنا پڑے گا کہ واقعہ من گھڑت نہیں ہے۔ البتہ جتنی بات اس میں باطل اور شرعاً قبیح ہے اس کی تاویل کی جاوے گی۔ اور پھر چھ تاویلیں بھی بیان کی ہیں" میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ آپ کی رائے اس بارہ میں کیا ہے اور آپ کے نزدیک کونسا مسلک صحیح و صائب ہے؟ فرمایا ابن العربی اور حضرت عیاض کی رائے بالکل صحیح ہے:

غرانیق کا مسئلہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً وقوع میں نہیں آیا۔ اور مجھے بعض علماء کے قول پر کبھی بڑا تعجب ہوا کرتا ہے جیسے یہی قول جو علامہ ابن حجر سے صادر ہوا ہے۔ اگر آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس قصہ کا ذرا سا حصہ بھی ثابت ہو تو نہ شریعت پر اعتماد قائم رہے گا، نہ عصمت کا حکم باقی رہے گا، اور رسول کی شان عامی انسان کی سی رہ جائے گی کہ آپ اور آپ کے کلام پر شیطان کا تسلط ہوا۔ اور اتنا تسلط ہوا کہ جس بات کے زبان سے نکالنے کا نہ حضرت نے ارادہ فرمایا اور نہ وہ آپ کو پسند یا گوارا تھی وہ شیطان نے آپ کی زبان سے نکلوادی۔ (اور جبراً و قہراً یا دل ناخواستہ آپ کو اس کا متکلم بنا چھوڑا) اتنی بڑی بات وقوع میں آوے تو پھر رسالت پر وثوق کیسے رہے۔ (کیونکہ اللہ کا جو پیام بھی آپ پہونچائیں گے اس میں احتمال ہوگا کہ ممکن ہے شیطان نے زبان مبارک سے جاری کرایا ہو)۔ اور اس کا یہ جواب دینا کہ اسی آیت میں آگے مذکور ہے۔ پھر حق تعالیٰ اس کو محو فرما دیتا ہے جو شیطان نے ڈالا تھا اور اپنی آیات کو قائم رکھتا ہے اور اس طریق عمل سے جب القاء شیطانی و القاء رحمانی میں خلط نہ ہو سکا تو رسالت پر کوئی حرف نہ آیا، کسی طرح صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی تو وہی احتمال ہے کہ ممکن ہے یہ کلمات آپ کی زبان پر شیطان نے جاری کرائے ہوں۔ اس لئے کہ جب مسئلہ غرانیق میں شیطان کا وحی پر تسلط جائز ہو گیا کہ اس نے ان کلمات کا اضافہ کرا دیا تو یہ بھی جائز ہے کہ اس ساری آیت کا وحی الٰہی پر شیطان نے اضافہ کرا دیا۔ اور اس طرح یہ احتمال تمامی آیات میں دوڑتا چلا جائیگا (اور کسی آیت پر بھی وحی الٰہی ہونے کا اعتماد نہ رہے گا)۔ مومنوں پر واجب ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو دین میں ایسا شبہ پیدا کریں قطعاً منہ پھیر لیں اور ان کو دیوار پر پھینک ماریں۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی معصومیت کا وہ عقیدہ رکھیں جو آپ کو شایاں ہے۔ خصوصاً جب کہ آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس سے بالا کسی مخلوق کا مرتبہ نہیں دپھر کہاں آپ کا زلت وخطا سے معصوم ہونے کا درجۂ علیا اور کہاں شیطان کا بتوں کی مدح وثنا کو آپ کی زبان مبارک سے نکلوانا)۔ علاوہ ازیں ارشاد باری وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ الایۃ کہ اے محمد تم سے پہلے ہم نے کوئی نبی یا رسول ایسا نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہی قصہ نہ پیش آیا ہو، اس کو چاہتا ہے کہ عیاذاً باللہ تمامی گروہ انبیاء میں ہر نبی اور ہر رسول کی وحی پر شیطانی تسلط ہوتا چلا آیا ہے۔ بلکہ قرآن مجید سے زیادہ (کہ خاص کلام اللہ میں جب دست اندازی پر اس کو قدرت ہو گئی تو کلام الرسول یا کلام ملائکہ پر دست اندازی کی قدرت کا کیا پوچھنا)۔ لہذا ان کی تفسیر کے موافق تو آیت کا اقتضا یہ ہوا (کہ شیطان ملعون کی عادت ہی برگزیدۂ خلق خاصان خدا حضرت رسل وانبیاء کے ساتھ ہمیشہ یہ رہی ہے۔ پھر اس کے باطل ہونے میں بھلا کس کو شبہ ہو سکتا ہے"۔ دیکھو حضرت ممدوح کی باوجود امی ہونے کے ماشاء اللہ کتنی دقیق نظر تھی۔ امام بیضاوی نے بھی لکھا ہے کہ بعض علماء کا قول ہے تمنی کے معنی قرآت کے ہیں، اور یہ مطلب ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آیت شریفہ کو پڑھا تو شیطان نے غرانیق کا مضمون القا کیا۔ یعنی خود بآواز بلند اس کلمہ کو پڑھا جس کو سننے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی قرآت کا جزو سمجھا۔ مگر یہ قول بالکل صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے وحی پر وثوق جاتا رہے گا اور فینسخ اللہ الخ سے بھی شیطان ہی کا اضافہ ہو)۔

میں کہتا ہوں کہ اس پر ایک اعتراض یہ بھی وارد ہو گا کہ تمنیٰ کی ضمیر چونکہ راجع ہے نبی اور رسول کی طرف لہذا آیت کا ترجمہ یہ ہو جائے گا کہ اے محمد تم سے پہلے جو بھی نبی اور رسول آیا ہے اس کی قرارت میں شیطان نے یہی مسئلۂ غرانیق شامل اور القا کیا ہے جو تمہاری قرارت میں القا کیا ہے۔ اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ (کہ ہر نبی کے قول میں اسی مسئلہ غرانیق کا اضافہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے)۔ علاوہ ازیں حضرات انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مسئلہ منجملہ عقائد

کے ہے اور عقیدہ نام ہے یقین اور اذعان کا لہٰذا حسب قواعدِ علماء اصول جس خبر واحد سے اس یقین پر اثر پڑتا ہو وہ خود غلط ہے۔ رہا علامہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ حدیث مرسل بعض کے نزدیک قابل حجت ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف امور عملیہ یعنی حلال و حرام کے مسائل میں قابل حجت ہے نہ کہ امور علمیہ اور عقائد کے بارہ میں جہاں دلیل مثبت کا یقینی ہونا ضروری ہے کہ خبر واحد سے تو کوئی عقیدہ ثابت بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ عقیدہ ثابتہ کا ابطال و انہدام۔ پھر اس خبر واحد سے اگر اس کو صحیح بھی ثابت کر دیا جائے تو عقیدہ کو اور عقیدہ بھی عصمت رسول کا کہ مدار اسلام یہی ہے کیسے توڑ سکتے ہیں۔ اور یہ حدیث تو بواسطہ علی بن ابی صالحہ مروی ہے جو لیث کا میر منشی تھا۔ اور محققین نے بالاتفاق اس کو ضعیف کہا ہے۔ غرض اس کے بعد میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کی صحیح تفسیر کیا ہے تو فرمایا۔ سنو۔ حق تعالیٰ نے جو رسول اور جو نبی بھی کسی امت کی طرف مبعوث فرمایا وہ وہ اپنی امت کے ایمان لے آنے کی تمنا کیا کرتا تھا۔ اسی کو ان کے لئے پیارا سمجھتا اسی کی ان کو ہمہ وقت ترغیب دیتا، اسی کا کمال درجہ حریص و متوقع، اور رات دن اسی فکر اور اسی جد و جہد میں لگا رہتا تھا۔ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی جماعت میں تھے (بلکہ سب کے سردار اس لئے آپ کی یہ حرص و تمنا تو اس درجہ بڑھی ہوئی تھی) کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (اے محمدؐ) اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو عجب نہیں تاسف و قلق میں تم اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے'۔ نیز فرمایا (اے محمدؐ) تم کتنی ہی زیادہ حرص کیوں نہ کرو بہتیرے ان میں ایمان نہ لائیں گے۔ نیز فرمایا (اے محمدؐ) کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن بن جاویں' وغیر ذلک (اس سے اندازہ کرو کہ امت کے ایمان لانے کی تمنا اور حرص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کتنی بڑھی ہوئی تھی)۔ پھر ہمیشہ ایسا ہوا کہ نبی کے آنے بعد امت کے دو ٹکڑے ہوئے۔ یعنی ایک فریق ان پر ایمان لایا اور دوسرے فریق نے انکا کفر و انکار کیا۔ کیونکہ (نبی کے آتے ہی راہزن) شیطان نے لوگوں کے قلوب میں طرح طرح کے وسوسے ڈالنے شروع کئے۔ پس جن کے دلوں میں وہ جم گئے ان کے لئے موجب کفر بن گئے۔ اور جن پر حق تعالیٰ نے فضل فرمایا ان کے خطرات کو مٹا دیا اور اپنی وہ نشانیاں جو وحدانیت و رسالت پر دلالت کر رہی تھیں ان کے قلوب میں مستحکم کر دیں (کہ ان کی بدولت اُن کا قدم ایمان سے نہ ڈگا) اس سے معلوم ہوا کہ ابتداءً شیطان کی طرف سے وساوس و خطرات تو

دو نوں فریق کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے ان کے . . . . قلوب پر ان کا بقا نہیں رہتا۔ (ادھر آتے ہیں اور اُدھر نکل جاتے ہیں)۔ اور جن (نااہلوں) پر فضل نہیں ہوتا۔ اُن کے قلوب سے شیطان کے القا کیئے ہوئے وساوس دور نہیں ہوتے (اور لاکھ معجزے کیوں نہ دیکھیں سحر ہی سحر پکارے جاتے ہیں)۔ اب آیت کا مطلب کھل گیا کہ آپ کی آرزو یعنی اُمّت کے ایمان لانے کے بارہ میں شیطان نے (حسب عادت مستمرہ) تمامی اُمّتِ دعوت کے دلوں میں وساوس وخطرات کا القا کیا۔ پھر حق تعالیٰ جس قلب سے چاہتا ہے القاءِ شیطانی منسوخ اور خطرات ووساوس کو محو فرما دیتا ہے (اور یہ جماعت ہے مومنین کی) کہ (دلائل توحید ورسالت کو اُن کے دلوں میں (پہاڑ کی طرح اٹل اور) مستحکم بنا دیا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے القاءِ شیطانی پر قائم رکھتا ہے (اور فضل نہیں فرماتا کہ فضل ایک احسان ہے جس پر جبر کا کسی کو حق نہیں اور اس لئے فضل نہ فرمانا ظلم نہیں) واللہ اعلم۔

پھر میں نے ہاروت وماروت کے قصّہ کی بابت دریافت کیا کہ اس میں بھی حضرت عیاض اور ابن حجر کا یہی اختلاف ہے۔ حضرت عیاض انکار فرماتے ہیں اور ابن حجر واقعہ بتاتے اور ان کے عاشق ہونے اور بہ سزائے معصیت چاہ بابل میں اُلٹے لٹکائے جانے وغیرہ کے ثبوت دیتے ہیں۔ فرمایا اس میں بھی حق حضرت عیاض کے ساتھ ہے اور قصّہ بالکل غلط ہے (کیونکہ حضرات ملائکہ معصوم ہیں اور اُن سے صدور معصیت نہیں ہو سکتا)۔

(۱۳) آیت شریفہ میں وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ کے متعلق میں نے حضرات سے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ اولا برساتا ہے آسمان کے پہاڑوں سے، تو کیا آسمان پر برف کے پہاڑ ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو تمہارے سر سے اونچی ہو (عربی زبان میں) آسمان کہلاتی ہے۔ لہذا مطلب یہ ہے کہ جانب بالا کے سرد پہاڑوں سے ژالہ باری فرماتا ہے۔ میرے استفسار کا سبب یہ ہوا تھا کہ ایک صاحب نے (حضرت ممدوح کا محض امتحان لینے کے لئے) میرے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں اسی قسم کے متعدد سوالات تھے۔ مثلاً برف کی اصل کیا ہے کہ دھوئیں اور پھلوار کی طرح برستا ہے۔ اور اولہ کی اصل کیا ہے کہ پتھر کی طرح جمے ہوئے کنکر برستے ہیں؟ پھر وہ اپنی جگہ سے ایسا ہی جما ہوا چلتا ہے یا در اصل پانی ہے اور ہم پر برستے وقت برف

یا اولہ بن جاتا ہے؟ اور یہ آتا کہاں سے ہے یعنی برسنے والے بادلوں سے یا آسمان میں سے؟ اور کیا آسمان میں برف کے پہاڑ ہیں جیسا کہ آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ صرف ٹھنڈے ملک میں پڑتا ہے گرم ملک میں کیوں نہیں پڑتا (آسمانی پہاڑوں کے لئے ملکی تقسیم کیسی)؟ پھر اونچے پہاڑ ہی اس کے لئے کیوں مخصوص ہیں۔ نشیبی زمین اور کھلے جنگلوں میں برف کیوں نہیں پڑتا؟ اور کبھی پڑتا بھی ہے تو جلد کیوں پگھل جاتا ہے؟ پھر اولہ کبھی بارش کے ساتھ برستا ہے اور کبھی خالص کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سرد اور گرم جگہ میں صرف سولہ سترہ میل کا فصل ہوتا ہے۔ مگر باوجود اتنے تھوڑے فصل کے اُدھر برف پڑتا ہے اِدھر نہیں پڑتا؟ نیز صاعقہ یعنی گرنے والی بجلی بھی صرف ٹھنڈے ملکوں اور پہاڑوں اور ان مقامات کے لئے مخصوص ہے جہاں درخت ہوں کیا وجہ ہے کہ چٹیل بیابانوں میں نہیں گرتی؟ حتیٰ کہ ایسے مقامات والے جانتے بھی نہیں کہ صاعقہ کس چیز کا نام ہے۔ امید کہ صحیح راستہ دکھا کر ہمارے تشکوک و شبہات رفع فرمائیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب لکھوں میں نے تفاسیر و احادیث و علم کلام کی تمام کتابیں جہاں جہاں اس بحث کا مظنہ تھا میں نے چھان ماریں مگر کہیں اس مسئلہ کا پتہ نہ لگا۔ اور تعجب علامہ سیوطی پر ہوا کہ باوجود احادیث و آثار میں اس درجہ وسیع النظر اور متبحر ہونے کے اس مسئلہ کو انہوں نے بھی کہیں بیان نہیں کیا۔ نہ اپنی کتاب الھیئۃ السنیۃ فی الہیئۃ السنیہ میں حالانکہ وہ اسی قسم کے مسائل ہئیت میں انہوں نے لکھی ہے، اور نہ بیضاوی کے حاشیہ پہ اس سے کچھ تعرض کیا۔ حالانکہ علامہ بیضاوی نے بطریق حکماء اس مسئلہ کو آیت مذکورہ کے تحت میں لیا ہے جس کا طرز وہی قادر مطلق جل جلالہ سے اعراض اور فاعل متصرف حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ سے حوادث عالم کی نفی ہے جیسا کہ فلاسفہ کی عادت و مقتضاء طبیعت ہے۔ یعنی سورج وغیرہ کی گرمی سے ہوا اور پانی کے اجزاء جو خلاء کی طرف چڑھتے ہیں وہ دھواں ہے کہ دھواں صرف اسی سیاہ جسم کا نام نہیں جو آگ سے جلی ہوئی چیز سے نکل کر اوپر چڑھا کرتا ہے اور عرف میں اس کو دھواں کہا جاتا ہے پھر ان دونوں چیزوں کا صعود اکثر باہم مخلوط ہو کر ہوتا ہے، اور اسی سے تمامی آثار علویہ

پیدا ہوتے ہیں۔ کہ بخارات اگر قلیل ہوئے اور ہوا میں گرمی شدید ہوئی تو وہ پانی کے اجزار کو تحلیل کرکے ہوائی اجزار بنادے گی اور اس کا نام آندھی ہے۔ اور اگر بخارات زیادہ ہوئے اور ہوا میں اتنی گرمی نہ ہوئی جو ان کو تحلیل کرسکے تو یہ بخارات اوپر چڑھتے چڑھتے طبقۂ زمہریر تک پہونچ جاتے ہیں جو نہایت درجہ ٹھنڈا ہے۔ اور وہاں پہونچ کر انتہائی خشکی کی وجہ سے وہ منجمد ہو جاتے ہیں، اُس کا نام بادل ہے۔ پھر یا تو اس میں سے پانی کے اجزار جمے بغیر ٹپک جاتے ہیں جس کا نام بارش ہے۔ اور اگر برودت شدید ہے تو جم کر نیچے گرنے لگتے ہیں۔ پھر اگر جمود قبل تقاطر ہوا ہے تو اس کا نام برف ہے اور اگر ٹپکنے کے بعد ان قطرات کو برودت نے منجمد کر دیا ہے تو اس کا نام اولہ اور ژالہ ہے کہ بوندوں کے چھوٹے بڑے حسب برودت ڈھیے بندھ گئے اور زمین پر آگرے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا محشی یعنی حافظ جلال الدین کو لازم تھا کہ اسلاف کے کلام سے اس کی تردید کرتے۔ نیز دُر منثور وغیرہ دیگر کتب تفاسیر کو بھی میں نے بغور دیکھا۔ مگر بجلی گرج بارش بادل وغیرہ سب کی بحث اس میں موجود ہے لیکن برف اور ژالہ کی تحقیق سے انہوں نے بھی سکوت کیا اور کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے اوّل میں نے حضرت ممدوح سے سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا اور پھر وہ تحریر سامنے رکھ دی۔ چنانچہ اسی وقت حضرت نے جواب لکھوایا اور میرا نام ڈال کر سائل کے پاس بھیج دیا اور وہ درج ذیل ہے۔

الحمد للہ وحدہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ۔ الجواب وھو الموفق للصواب بمنہ۔ برف در حقیقت پانی ہے جس کو ہوا نے جما دیا ہے۔ اس کی اصل اُس سمندر کا پانی ہے جو زمین کو محیط ہے۔ کہ اس پانی میں تین خصوصیتیں ایسی ہیں جو دوسرے پانی میں نہیں پائی جاتیں۔ اوّل انتہا درجہ کی خنکی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوا اس کے بہت قریب ہے اور حرارت آفتاب سے وہ بہت دور ہے، اور اسی لئے بہت جلد جم جاتا ہے۔ دوم انتہا درجہ کی صفائی۔ کہ اپنی اصل خلقت پر قائم ہے اور اجزا ارضیہ سے بالکل مخلوط نہیں ہوا۔ لہٰذا نہایت سفید اور شفاف ہے۔ سوم انتہائی بُعد۔ کہ ہم سے بہت دور ہے اور ہمارے اور اس کے درمیان بے حد فاصلہ ہے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو سُنو کہ حق تعالیٰ شانہٗ کا جب ہوا کو حکم ہوتا ہے کہ پانی اٹھائے تو وہ فوراً تعمیل کرتی اور پانی کو اس طرح اٹھاتی ہے جس کا کچھ نمونہ طوفان کے وقت سمندر میں نظر

آتا ہے (کہ پہاڑ کے پہاڑ پانی سے اُٹھ کر ہوا کے ہاتھوں میں ایسے کھلونہ بن جاتے ہیں جیسے بلّے کے سامنے گیند) ۔ وہ پانی فرطِ برودت کی وجہ سے فوراً بستہ ہوجاتا (اور برف کا پہاڑ بن جاتا) ہے ۔ پھر ہوائیں اس برف کو (جہاں بھی پہونچانے کا حکم ہوتا ہے) تھپیڑے مارتی اور سیٹی ہوئی لے کر چلتی ہیں ۔ حتّٰی کہ اس طویل مسافت طے کرنے میں جو ہمارے اور بحرِ محیط کے درمیان واقع ہے اس کی بندش بے حد کھل جاتی ہے اور تری کی وجہ سے محض اجزاء کا اتصال باقی رہ جاتا ہے ۔ یہ برف (جو ہمارے اطراف میں بھی موسم سرما کے چلّے میں علی الصباح گرتا ہے) ۔ اور یہی سبب ہے کہ کبھی باریک سوت کی صورت میں گرتا ہے اور کبھی سوت سے بھی زیادہ باریک ۔ برخلاف ژالہ کے (جس کو اولا اور کنکر بھی کہتے ہیں) کہ وہ ان سمندروں کا پانی ہے جو اسی زمین پر واقع ہیں (جیسے بحرِ ہند و بحرِ قلزم وغیرہ) یا اُن بڑے تالابوں اور جھیلوں کا پانی ہے جو مینہ برسنے کی وجہ سے نشیبی حصّوں میں از خود بن جاتے ہیں ۔ چونکہ ان کی مسافت زیادہ طویل نہیں اور اُن کے جمنے اور رحم پر برس جانے میں بہت کم وقفہ ہوتا ہے (اس لئے ہوا کو اُن کے پیسنے کا وقت نہیں ملتا) اور وہ جما جمایا ہم پر برس جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ اولہ کے پیٹ میں سے زمین کے اجزا مٹی و سوت وغیرہ برآمد ہوتے ہیں (کیونکہ وہ اسی زمین کا پانی ہے اور جھیل میں اُٹھ کر ہوا کی برودت سے منجمد ہوا ہے) چنانچہ اولہ توڑ کر جس کا جی چاہے دیکھ لے ۔ نیز چونکہ چار طرف سے اس پر ہواؤں کے تھپیڑے پڑتے رہتے ہیں اس لئے وہ گول اور ایسا بٹاؤ لئے ہوتا ہے جیسے گوندھے ہوئے سخت آٹے کا پیڑا ۔ کہ اس کو عورت برتن میں لت کر ہاتھوں سے گولہ بناتی ہے' اور اولہ کے اجزاء کو ہوا کے جھونکے متحد کر پیڑا بنا دیتے ہیں ۔ چنانچہ اولہ گرتے ہی فوراً اُس کو غور سے دیکھو تو اس کی تصدیق ہوجائے گی ۔ یہی اولہ اگر اس کے گرنے میں دیر لگے (اور ہواؤں کو اُس کے پیسنے کا وقت مل جائے تو جماؤ ڈھیلا ہوکر) برف بن جائیگا ۔ اور یہی سبب ہے اولہ کی جسامت میں فرق ہونے کا (کہ جتنا جلد گرے گا اسی قدر بڑا گرے گا کہ ہوا کو تھپیڑے مار کر اس کے گھلانے کا وقت بہت کم ملا) ۔ رہی یہ بات کہ برف اور اولہ کے لئے سرد مقامات اور پہاڑ کی چوٹیاں کیوں مخصوص ہیں' سو اس کا سبب یہ ہے کہ برف کا انجماد جب تک کوئی مانع پیش نہ آوے اپنی حالت پر قائم رہا کرتا ہے البتہ جس وقت

مانع پیش آتا ہے تو وہ پانی بن جاتا ہے۔ اور مانع اس کے لیئے یہی بخارات ہیں جو زمین سے اوپر کی جانب چڑھتے ہیں۔ اور ان میں چونکہ حرارت ہے اس لیئے جب وہ برف سے جاکر ملتے ہیں تو اُس کی برودت کو توڑتے ہیں اور اس لیئے اسکا جماؤ جاتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ بخارات گرم ملکوں اور نشیبی میدانوں میں زیادہ ہوتے ہیں اس لیئے وہاں برف کا وجود نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو دیرپا نہیں ہوتا۔ (بہت جلد پگھل جاتا ہے) ۔ برخلاف ٹھنڈے ملکوں اور پہاڑی چوٹیوں کے (کہ مقامی خنکی یا بلندی وقرب ہوا کے سبب) وہاں برف کے انجماد کا مانع مفقود ہوتا ہے (لہذا جما جمایا برف نیچے آپڑتا ہے اور دیرپا بھی ہوتا ہے کہ مدت تک نہیں گھلتا) رہا یہ امر کہ کبھی بارش کے ساتھ گرتا ہے اور کبھی خالص سو بارش کے ساتھ گرنے کی دو وجہ ہیں۔ یا یہ کہ منجمد برف ہی کے کچھ اجزا۔ ان بخارات زمین سے پگھل کر پانی بن جاتے ہیں کہ جو حصہ گھل گیا وہ پانی بن کر برس گیا اور جو نہ پگھلا وہ اولہ بنا ہوا اس کے ساتھ آپڑا۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی بارش بہت ہلکی کمزور اور باریک بوندوں والی، لپیٹے ہوئے برف کی شکل میں ہوا کرتی ہے۔ اور یا یہ وجہ ہوتی ہے کہ پانی پورا منجمد ہونے نہیں پاتا اور برسنا شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہوائیں جب پانی کو اٹھاتی ہیں تو وہ جمنے لگتا ہے اور ہوائیں اس کو پیسنا شروع کردیتی ہیں۔ پھر دوسرا پانی اٹھاتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ دونوں پانی زمین پہ آترجائیں۔ لہذا پہلا پانی (چونکہ خنک ہوا میں دیر تک رہا اس لیئے) تو اولہ بنا ہوا گر جاتا ہے اور دوسرا پانی (جو اٹھاتے ہی چھوڑ دیا گیا) وہ پانی کی صورت میں برس جاتا ہے۔ رہا آپ کا یہ سوال سترہ میل کے قلیل فاصلہ میں کونسی دیوار کھڑی ہوگئی کہ اِدھر برف گرتا ہے اور اُدھر نہیں گرتا۔ تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ مدار فرق (قرب و بُعد مسافت نہیں بلکہ) مانع کا وجود وعدم ہے۔ لہذا ٹھنڈے مقام پر چونکہ مانع مفقود تھا اس لیئے برف گرا، اور گرم جگہ یہ مانع موجود تھا اس لیئے برف نہ گرا۔ اسی سے آپ کے اس سوال کا جواب نکل آیا کہ پہاڑ کی چوٹیاں اور اونچے مقامات برف باری کے لیئے کیوں مخصوص ہوئے؟ اِسلیئے کہ آسمان و زمین کے درمیان اس خلا سے جس میں خنکی حد درجہ کی ہے اونچے مقامات کو قرب حاصل ہے (لہذا

خشکی غالب رہتی ہے) اور نیچے مقامات کو اُس سے لگاؤ ہے (لہذا یہاں بخارات زمین کی حرارت غالب رہتی ہے)۔ رہا صاعقہ کے متعلق آپ کا اعتراض کہ گرم ملکوں میں کیوں نہیں گرتی؟ جو خود دعوے بے دلیل بلکہ غلط ہے اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے ہم نے خود اپنے شہر سلجماسہ میں ایک دو دفعہ نہیں بلکہ بار ہا بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے حالانکہ وہ نشیبی جگہ ہے، سطح مستوی ہے، جنگل ہے، اور گرم مقام ہے۔ (شرح مواقف میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ کھلے جنگل میں ایک بچہ پر بجلی گری اور پنڈلی تک اس کی دونوں ٹانگیں جُدا کر دیں کہ مطلق خون نہیں نکلا۔ اور دیگر مفسرین نے بھی آیۃ شریفہ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ کی تفسیر کے تحت صحرا میں بجلی گرنے کا ذکر کیا ہے) واللہ اعلم

ف یہ ہے حوادث عالم کی تحقیق کے متعلق اہل حق کا طریق کہ متصرف و فاعل حقیقی ذات حق سبحانہٗ کو قرار دیتے ہوئے اسباب کو صرف آلات اور اوزاروں کا مرتبہ دیتے ہیں، اور مدِّ نظر رکھتے ہیں کہ یہ بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان کے توسط پر بھی وہ مجبور نہیں ہے۔ برخلاف فلاسفہ کے معتقدین نے ان کا نام حکماء رکھا ہے، اور حقیقت تک رسائی نہ پا سکنے اور پھر اپنی تحقیقات پر یقین و اعتماد رکھنے کی بناء پر عاشقانِ رسول ان کو حمقاء سمجھتے ہیں، ان کی کوتاہ نظری ظاہری اسباب کو متصرف سمجھتی اور خالق کی طرف سے بالکل غافل بلکہ منکر ہوتی ہے، یا کم از کم معطل سمجھتی ہے، کہ اسباب کو پیدا کر کے تصرفات عالم کا ان کو مختار بنا دیا اور خود عیاذاً باللہ خالی و بیکار ہو بیٹھا زیادہ سے زیادہ ان کا مسلک یہ ہے کہ مشین کے پُرزے اپنا اپنا کام کرتے ہیں مگر از خود نہیں بلکہ ڈرائیور کے تحت تصرف اور زیر مشیت، کہ جب چابی کھولے گا تو سلنڈر چلے گا ورنہ بندھا پڑا رہے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈرائیور اور مشین دونوں ایک خدا کی مصنوعات میں ہیں اس لئے وہاں یہ تمثیل بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ مشین کھول

ع میرا خیال ہے کہ کتابت کی غلطی یا مترجم کی زلت سے عبارت معکوس ہو گئی۔ بظاہر یوں ہونا چاہیے کہ پہلا پانی چونکہ جمنے کے بعد ہواؤں نے پیس دیا ہے اس لئے پھر پانی بن گیا اور دوسرا پانی جو ہوا کے اٹھاتے ہی جم گیا اور اسی وقت اُتار دیا گیا ہے وہ منجمد اولہ بنا ہوا گر گیا۔ واللہ اعلم۔

دیئے کے بعد ڈرائیور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا۔ اور جب تک مشین چلتی رہے گی خود معطل رہیگا۔ لیکن ذات باری عز اسمہٗ تعطل سے منزہ ہے۔ کوئی فعل کسی آلہ کا اور کوئی اثر کسی واسطہ کا اُس کی تخلیق اور اُس کی مشیت وارادہ کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اس کی قدرت تمامی مخلوقات سے خواہ وہ آلہ و واسطہ ہوں یا صاحب آلہ و ذوالواسطہ بالا بر بالا ہے۔ اور اُس کی شان لیس کمثلہ شئی ہے ہاں اکثر بواسطہ اسباب نتائج و اثرات کا ظہور اس کی عادت ہے۔ مگر تحت تصرف ہونے سے اس حال میں بھی ہرگز خالی نہیں۔ اور یہی مطلب ہے اس کا کہ عالم میں بجز اس ذات واحد جل جلالہٗ کے متصرف کوئی بھی نہیں ہے۔

(۱۴) میں ایک مرتبہ حضرت ممدوح کے ساتھ سوق رصیف میں چل رہا تھا کہ ہلکا سا زلزلہ آیا جو کسی کو محسوس ہوا اور کسی کو محسوس نہیں ہوا حتیٰ کہ مجھے بھی محسوس نہیں ہوا آگے چل کر ہم جب مخفیہ مقام پر پہونچے تو لوگوں نے ہم سے کہا کہ زلزلہ آیا تھا آپ کو بھی خبر ہوئی ؟ میں نے کہا کہ زلزلہ تو نہیں آیا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ہاں زلزلہ ہی تھا اور اُس وقت آیا تھا جب ہم اور تم فلاں شخص کی دکان پر کھڑے تھے۔ اس وقت میں نے عرض کیا کہ حضرت زلزلہ کا کیا سبب ہوتا ہے ؟ حالانکہ سلف صالحین اور فلاسفہ کے تمامی اقوال جو اس بارہ میں فریقین نے لکھے ہیں مجھے معلوم تھے۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت کا جواب سُنوں۔ لہٰذا میں نے یہ سوال پیش کر دیا۔ فرمایا زلزلہ کا سبب تجلی حق سبحانہٗ ہے بسوئے زمین۔ اور اس کی شرح ایک راز ہے (جس کا افشا مناسب نہیں) پھر فرمایا کہ زمین کی آفرینش کے شروع زمانہ میں پہاڑوں کی آفرینش سے قبل یہ تجلی حق بسوئے زمین زیادہ ہوتی تھی اور اس لئے وہ کانپتی اور تھرتھرایا کرتی تھی۔ تب حق تعالیٰ نے حجاب ڈال دیا اور اس میں پہاڑ پیدا فرمادئے کہ اس کو سکون ہو گیا اور وہ تھم گئی (چنانچہ ارشاد ہے وَ جَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ)۔ اور آخر زمانہ میں (قریب قیامت) پھر وہ تجلی زیادہ ہوگی اور اس لئے زمین میں زلزلے زیادہ آئیں گے۔ کہ وہ تھر تھرائے گی اور اتنا بار بار لرزے گی کہ اس پر بسنے والی تمامی مخلوق ہلاک ہو جائے گی"۔ حضرت ممدوح کے قول کے قریب قریب امام جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی کتاب کشف الصلصلہ عن وصف الزلزلہ میں لکھا ہے کہ طبرانی نے کتاب السنہ میں باب منعقد کیا ہے ما جاء فی تجلی اللہ للارض اور

حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ جب اپنے بندوں کو ڈرانا (اور غفلت سے بیدار کرنا) چاہتا ہے تو زمین کو اپنا کچھ جلوہ دکھاتا ہے جس سے وہ کانپنے لگتی ہے۔ اور جب کسی قوم کو اُلٹ پلٹ کرنا چاہتا ہے تو پورا جلوہ دکھاتا ہے (جس سے زمین تہ و بالا ہو کر سب کو زیر و زبر کر دیتی ہے) نیز امام دیلمی نے مسند الفردوس میں مرفوعاً اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد امام جلال الدین نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے حکماء و فلاسفہ کی رائے کا فساد ظاہر ہو گیا کہ ان کے نزدیک زلزلہ کا سبب اُن بخارات کی زیادتی ہے جو سورج کے اثر سے زمین میں پیدا ہو کر تحت زمین محبوس ہو جاتے ہیں' اور (ہوا کی) برودت ان کو توڑ نہیں سکتی کہ پانی بنا دے۔ اور نہ وہ زیادہ مقدار میں ہونے کے سبب معمولی حرارت سے تحلیل ہو سکتے ہیں۔ اور سطح زمین اس جگہ ہوتی ہے سخت کہ بخارات کو باہر نکلنے کے لیے اس میں کوئی راستہ نہیں ملتا۔ لہٰذا زمین تھرتھرانے لگتی ہے۔ جیسے کسی کو بخار چڑھتا اور حرارت کے بخارات اُس کے بدن میں محبوس ہو جاتے ہیں تو اس کا بدن تھرتھرانے لگتا ہے (جس کو جاڑا چڑھنا بولتے ہیں)

اور بعض دفعہ زمین پھٹ جاتی ہے اور مواد محتبسہ باہر نکل جاتے ہیں۔) اور فساد رائے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ بلکہ اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے (یعنی قول پیغمبر کہ سبب زلزلہ تجلّی حق ہے بسوئے زمین)۔

ف عوام میں مشہور ہے کہ زمین گائے کے سینگ پر قائم ہے اور جب گائے سینگ بدلتی ہے کہ یہ سینگ بوجھ سے تھک گیا ہے تو زمین کو اپنے دوسرے سینگ پر لے لیتی ہے' اس سے زلزلہ آتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اور فلاسفہ کے قول میں کیا فرق ہے۔ اگر اُن کی وہ تجویز عقلی صحیح ہے تو عوام کی یہ تجویز عقلی بھی صحیح ہے۔ اور اگر یہ بے دلیل و ساقط الاعتبار ہے تو وہ بدرجۂ اولیٰ ساقط الاعتبار ہے۔ پھر تعجب یہ ہے کہ کوئٹہ جیسے ٹھنڈے شہر کی زمین میں اتنی حرارت محتبس ہو جائے کہ عبرتناک منظر دکھائے۔ اور دیگر شہروں میں احتباس بخارات اس کا عشر بھی نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر صورۃً یہی اسباب واسطہ بنا لیے گئے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ صرف اسی مقام پر بخارات جمع ہونے کا کیا سبب؟ اسی جگہ کی برودت کمزور ہونے کی کیا وجہ؟ اسی جگہ زمین ایسی سخت کیوں ہے کہ بخارات کو راستہ نہ ملا؟ وغیرہ وغیرہ کیا سبب اور سبب السبب

کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آخر تھکنا پڑے گا اور تم کہو گے کہ اتفاق سے ایسا ہو گیا۔ اور ہم کہیں گے کہ مالک الملک خدا کے حکم سے ایسا ہوا۔ لہٰذا پہلے ہی کیوں نہ تسلیم کر لیں کہ خدا نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے زلزلہ وغیرہ کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہی حق صریح اور صواب و صحیح ہے۔ باقی سب عقلی ڈھکوسلے اور من گھڑت قیاسات ہیں جن کو دوسری عقلیں مقابلہ میں آ کر شکست بھی دے سکتی ہیں۔

پھر میں نے خسف کا سبب دریافت کیا کہ کبھی زمین کا کوئی حصہ پھٹ جاتا ہے اور آدمی و دیگر اشیاء جو زمین پر ہوتی ہیں اس میں دھنس جاتی ہیں، اور یہ صورت آخر زمانہ میں بکثرت ہوگی، اس کا کیا سبب ہے؟

فرمایا زمین پانی (بحر محیط) پر ہے، اور پانی ہوا پر، اور ہوا اس بڑے میدان سے نکلتی ہے جو آسمان اور بحر محیط کے درمیان واقع ہے۔ فرض کرو ایک آدمی برابر چلتا رہے تو چلتے چلتے وہ منتہائے زمین پر پہونچے گا اور اب اُس کو بحر محیط نظر آئے گا۔ فرض کرو اس پر بھی برابر چلتا رہے تو چلتے چلتے آخر وہ بھی ختم ہو جائے گا اور اب اُس کے اور آسمان کے درمیان صرف ایک خلا ہو گا جو بہت ہی بڑا ہے، اور ہوائیں اسی سے نکلتی ہیں۔ اُن ہواؤں کی طاقت اور کیفیت ناقابلِ بیان ہے (کہ بڑی سے بڑی آندھی جو عمر بھر میں کسی نے دیکھی ہو کہ مضبوط سے مضبوط درخت کو جڑ سے اکھیڑ پھینکے وہ ان ہواؤں کا بہت ہی قلیل ترین حصہ ہے)۔ یہی ہوائیں بحکم خداوندی پانی اور زمین کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور یہی آسمان کو تھامے ہوئے ہیں۔ پھر بتصرفِ الٰہی وہ ہر وقت کام میں لگی ہوئی ہیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کو سکون نہیں ہوتا اور آسمان کی طرف چڑھتی رہتی ہیں۔ جب حق تعالیٰ کسی قوم پر بارش برسانا چاہتا ہے تو ان ہواؤں میں سے بہت ہی قلیل حصہ کو حکم فرماتا ہے کہ (بجائے آسمان کی طرف چلنے کے زمین کی طرف آئیں)۔ لہٰذا وہ اپنا رُخ لبوئے زمین پھیرتی ہیں اور بحر محیط کی سطح پر عبور کرتی ہوئی اُتنا پانی اُٹھا کر جتنا حق تعالیٰ کو منظور ہے اُس مقام پر پہونچاتی ہیں جہاں کا اُن کو حکم ہوا ہے (اور پانی کو چھوڑ دیتی ہیں کہ وہ بارش کی صورت اُن پر آبرستا ہے) بارہا ایسا ہوا کہ میں نے بحر محیط کے کنارہ پر نظر ڈالی جو اس خلا سے ملا ہوا ہے جس میں ہوائیں ہیں تو میں نے برف کے اتنے بڑے پہاڑ دیکھے جن کی بڑائی بس خدا ہی کو معلوم ہے۔ ذرا

دیر بعد دیکھتا ہوں کہ وہ پہاڑ منتقل ہو کر بحرِ محیط کے اُس کنارہ پر پہنچ گئے جو کوہ قاف کے متصل ہے۔ یہ کارنامہ اُن ہواؤں ہی کا تھا کہ اتنے بڑے پہاڑوں کو اٹھالیا (اور اتنی جلد اِس کنارہ سے اُس کنارہ پر پہونچا دیا)۔ اور جب حق تعالیٰ کسی قوم کو دھنسانا چاہتا ہے تو یہ ہوائیں زمین کے اُن سوراخوں اور گڑھوں میں گھس جاتی ہیں جو زمین اور بحرِ محیط کے درمیان واقع ہیں۔ اور اس وجہ سے زمین (کے اجزاء میں (جو اتصال ہے وہ کھل جاتا اور) انحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام خسف ہے (کہ زمین پر جو کچھ تھا وہ شگاف میں سما گیا)۔ اور (قربِ قیامت) اخیر زمانہ میں زمین کے سوراخ اور گڑھے زیادہ ہو جائیں گے لہٰذا خسف کا بھی وقوع زیادہ ہوگا۔ حتیٰ کہ زمین کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ہو رہا ہے اور ہوگا۔ الحاصل یہ ہوائیں بسوئے زمین اس کو برباد کرنے کی نیت سے متواتر آتی رہیں گی۔ حتیٰ کہ زمین کی حالت ہواؤں کے ہاتھوں میں ایسی ہو جائے گی جیسے غلّہ میں سے مٹی اور کنکر نکال لینے والے کے ہاتھ میں چھاج کی حالت ہوتی ہے (کہ پے در پے اور جلد جلد اس کو جھٹکتا اور زیر و زبر کرتا رہتا ہے)۔ زمین کے چھاج کا غلّہ بنی آدم کی ریڑھ کی ہڈیاں ہیں جن سے ذات آدمی نے ترکیب پائی ہے (کہ دیگر اجزاء زمین کو پھٹک پھٹک کر ان سے جدا کر دیا جائے گا)۔ اور پھر حق تعالیٰ ان کو زمین کی گہرائیوں، سمندر کی تہوں، اور غاروں کے اندرون، اور پہاڑوں کے نیچے سے غرض جہاں اور جس جگہ بھی یہ ہڈیاں ہوں گی نکال کر ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ وہ دن ہوگا کہ پہاڑوں سے ان کی جگہ چھوٹ جائے گی۔ اور ہوا کی قوت سے کہیں کے کہیں پہونچ جائیں گے۔ اور پھر دُھنی ہوئی روئی کی طرح اڑیں گے۔ اس کے بعد آسمان پھٹ جائے گا۔ اور ریڑھ کی ہڈیوں پر پانی برسے گا جس سے وہ ہڈیاں آہستہ آہستہ پرورش پائیں گی۔ جیسے تربوز و کدو وغیرہ بڑھتا اور (زمین میں چھپا ہوا گمنام دانہ آبپاشی سے پھولتا پھلتا اور بڑا ہو کر) زمین کے اوپر نمودار ہو جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے ہمارے حضرت عبدالوہاب برناوی فرمایا کرتے تھے کہ اُس دن کو یاد کرو جب زمین انڈے دے گی اور پھر ریڑھ کی ہڈی کو سیے گی۔ اس کے بعد جب اس کا نشوونما کامل ہو جائے گا تو پھٹ جائے گی اور بنی آدم اس سے باہر نکل آئیں گے جیسے انڈا پھٹ

جاتا ہے اور پرندہ اُس سے باہر نکل آتا ہے۔ نیز فرمایا کہ نال (نافِ طفل) اس روز پیٹ
کی طرف نہیں بلکہ پیٹھ کی طرف ہو گی۔ پھر حق تعالیٰ روحوں کو حکم فرمائے گا کہ اپنے
اپنے جسم میں داخل ہو جاویں۔ پس جب روحیں اُن میں داخل ہو جائیں گی تو سب
سیدھے کھڑے ہو جائیں گے اور نال کٹ جائے گی۔ پھر جب روحیں اپنے کالبدوں میں داخل
ہو چکیں گی تو حق تعالیٰ اُس نور کو جس نے جہنم کو اہل دنیا کی طرف آنے سے روک
رکھا ہے حکم فرمائے گا کہ لسوئے جنت روانہ ہو جائے۔ اور وہ نور ہے ہمارے آقا سیدنا
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اُس وقت جہنم کا خروج ہو گا اہلِ دُنیا کی طرف کہ ہر جانب
سے ان پر لپکے گی۔ اُس روز بندوں پر جو خوف و دہشت چھائے گی اُس کی مقدار
کا اندازہ بس خدا ہی کر سکتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ اُس روز روحوں کے اجسام
میں داخل ہوتے وقت ارواح میں تجلی کی سی گرج اور تڑپ اور ایسا شور ہو گا کہ
اُن آوازوں کو سن کر دل ہیبت سے لبریز اور کلیجے دہشت سے چاک ہو جائیں گے،
اس کے بعد آپ نے اُس دن کے دیگر واقعات بیان فرمائے جن میں سے چند کا تذکرہ
انشاء اللہ آئندہ آئے گا۔ واللہ اعلم

(۱۵) میں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ
مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ہ اے گروہ انسان وجنات تم پر
چھوڑا جائے گا آگ کا شعلہ اور دھواں پس تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ یہ واقعہ میدان
حشر میں ہو گا اور اس سے مُراد وہی آگ ہے جو اہلِ محشر پر خروج کرے گی اور ہر
طرف سے ان کو گھیر لے گی۔

(۱۶) يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ہ اُس دن ہم آسمان
کو لپیٹ لیں گے جیسے کتاب کا سجل لپیٹ لیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ سجل سے
کیا مُراد ہے؟ امام بخاری کہتے ہیں کتاب کا ورق مُراد ہے جس طرح ورق اپنی تحریر پر
لپٹ جاتا ہے اسی طرح آسمان تہ ہو جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس سے مروی
ہے کہ سجل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام ہے جو وحی و
خطوط وغیرہ لکھا کرتے تھے) اور سہیلی نے لکھا ہے کہ آسمان دوم پر ایک فرشتہ ہے
جس کا نام سجل ہے، اور مخلوق کے اعمالنامے ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو ان کے حوالے

کیے جاتے ہیں، حضرت نے فرمایا رحل (یا لوٹوان میز) مراد ہے جس پر وہ کتاب رکھی جاتی ہے جس سے کاتب نقل کیا کرتا ہے (اور نقل سے فارغ ہو جانے کے بعد اس کو تہ کرکے ایک طرف رکھ دیتا ہے)۔ للکتب بہ قاعدۂ نحو حال واقع ہوا ہے۔ اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ سریانی لفظ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کتاب کی رحل کو تہ کرکے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اسی طرح بروز قیامت آسمانوں کو تہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت مجھے یہ دریافت کرنا یاد نہ رہا کہ رحل اور آسمان میں من وجہ مشابہت کیا ہے، اور آسمانوں کے تہ کیے جانے کی صورت کیا ہوگی اور رحل ہی کے تہ کیے جانے سے تشبیہ کیوں دی گئی، اور کیا کتاب کے سوا رحل کسی اور چیز کے لیے بھی ہوا کرتی ہے؟ یہ سوالات کرتا تو ان کی بھی صحیح معلومات ہو جاتی کہ آپ جو کچھ فرماتے تھے علمی مشاہدہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

(۷) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلٰكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي (موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجیے۔ ارشاد ہوا کہ تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو پس اگر یہ اپنی حالت پر قائم رہا تو ممکن ہے تم بھی مجھے دیکھ سکو)۔ میں نے حضرت سے کہا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام تو عارف باللہ جماعت میں بڑے رتبہ والے ہیں۔ اور عارف جب تک مشاہدہ کے منازل طے نہ کرلے عارف ہی نہیں بن سکتا۔ پھر حضرت کلیم اللہ نے باوجودیکہ دائمی مشاہدہ ان کو حاصل تھا رویت کا سوال کیسے کیا؟ اور کیا رویت کا درجہ مشاہدہ سے بڑھا ہوا ہے؟ فرمایا کہ اہل مشاہدہ کو ذات باری کا مشاہدہ افعال باری سے خالی وصاف ہو کر کبھی نہیں ہو سکتا مگر اس وقت جبکہ حق تعالیٰ اپنے افعال کو اس سے منقطع فرمالے۔ اور اگر کسی ذات سے افعال کا تعلق ایک لحظہ کے لیے بھی منقطع فرمالے تو وہ ذات باقی نہیں رہ سکتی۔ فوراً ہلاک ہو جائے گی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بھی ہستی ہے کہ اس کو وجود ملا ہوا ہے اس میں لامحالہ (ہر وقت وہر لحظہ) حق تعالیٰ شانہ کا فعل (اور کوئی نہ کوئی تصرف) جاری ہے (کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۔) اور یہی فعل الٰہی اس موجود کا مادۂ وجود اور سبب بقا ہے۔ اور یہی حجاب بنا ہوا ہے

ذاتِ فانی اور ذاتِ حق سبحانہٗ کے درمیان (کہ ذاتِ بحت کے مشاہدہ کے لئے گویا آڑ اور پردہ ہے)۔ اور اگر حق تعالیٰ اپنے افعال کو ذاتِ فانی میں حجاب نہ بنائے تو عالم کا ہر حادث و فانی جل جائے۔ (اس کی مثال بلاتشبیہ ایسی ہے جیسے جرم آفتاب کسی وقت بھی ان شعاعوں سے خالی نہیں جو چاروں طرف دنیا کی ہر شے پر پڑتی رہتی ہیں۔ اور یہی مانع بنی ہوئی ہیں کہ جرم شمس پر نظر نہیں جم سکتی اور فوراً تھک کر بند ہو جاتی اور واپس لوٹ آتی ہے۔ اگر یہ شعاعیں مانع نظر نہ ہوتیں اور براہ راست تارِ نگاہ سورج کی ٹکیا پر جا کر پڑتا تو پھر آنکھیں اور آنکھ کی بینائی قائم نہ رہ سکتی۔ فوراً جل کر ایسی معدوم ہو جاتی جیسے کبھی آتشی شیشہ میں سورج کو دیکھا جائے اور اس کی اصل چمک جو بجلی سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے پتلی پر پڑ جائے تو فوراً نگاہ جل کر فنا ہو جاتی ہے پس جب اہل مشاہدہ کا مشاہدہ افعال باری سے صاف اور خالی نہ ہوا اور وہ افعال ایسے بن گئے جیسے آنکھ میں کنک ہوتی ہے (کہ تنکا یا ذرہ پڑ جاتا ہے تو آنکھ پوری کھل نہیں سکتی اور بے حجاب ہو کر کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتی) اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی درخواست حق تعالیٰ سے یہی تھی کہ اپنے فعل کو جو کہ مانع رویت بنا ہوا ہے قطع فرما کر درمیان سے پردہ اٹھا دیجئے کہ ذات بحت کا صاف نظارہ ہو۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ اگر حادث و فانی ذات سے اپنے فعل کو قطع کر (کے یہ درمیانی آڑ اٹھا) دوں گا تو اس کی ذات ہی فنا ہو جائے گی۔ دیکھو یہ پہاڑ جو بروئے ذات تم سے بہت زیادہ قوی اور بروئے جرم تم سے بہت زیادہ سخت ہے اپنا فعل کے بعد اپنی حالت پر قائم و برقرار رہا تو سمجھنا کہ تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اور اپنے فعل کا تعلق جو اس کے لئے سطوت ذات حق سے حجاب بنا ہوا تھا اس سے قطع فرما لیا تو وہ فوراً پارہ پارہ ہو گیا اور اس کے اجزاء (ذرات بن کر ہوا میں) اڑ گئے۔ حتیٰ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہو کر گر پڑے۔ واللہ اعلم۔

(۱۸) حق تعالیٰ فرماتا ہے یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ ۝ - اللہ مٹا دیتا ہے جو چاہتا ہے) اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب" میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آیۃ شریفہ کا کیا مطلب ہے (اور

لوح محفوظ کی لکھت میں کیا مٹانا اور قائم رکھنا یعنی تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے) ؟ کہ علماء میں اس کے متعلق بہت اختلاف ہوا ہے (اور تقدیر معلق و مبرم وغیرہ کی بحثیں ہوتی ہیں) - فرمایا اس کی وہ تفسیر تم کو سناتا ہوں جو کل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنائی ہے - اور وہ یہ ہے کہ واقعات عالم کے متعلق بندوں کے قلوب میں جو خیالات آیا کرتے ہیں - ان کی دو قسمیں ہیں - بعض کا وقوع ہو جاتا ہے خیال کے موافق' اور اُس کی طرف اشارہ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ اور بعض کا وقوع نہیں ہوتا اور اُس کی طرف اشارہ ہے وَیُثْبِتُ اس کی شرح یہ ہے کہ کائنات کے آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق انسان کا خیال جو کچھ بھی قائم ہوتا ہے - مثلاً یہ کہ زید پرسوں اپنے گھر آجائے گا - یا مثلاً جمعہ کے دن بارش ہوگی' یا فلاں فلاں سلطنت میں جنگ ہوگی اور فلاں کا غلبہ ہوگا وغیرہ وغیرہ وغیرہ اس کی دو قسمیں بن جاتی ہیں - ایک وہ ہیں (جن کا وقوع مقدر ہے سو) وہ تو ہو جاتی ہیں (اور اس پر صادق آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو برقرار رکھا اور خیال کو مقدر کے موافق بنایا) - اور دوسری قسم وہ ہے (جن کا وقوع مقدر نہیں سو) ان کا وقوع نہیں ہوتا اور اس پر صادق آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو مٹا دیا اور خیال کو کہ خلاف مقدر تھا غلط بنا دیا) - اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ یا اللہ کا علم قدیم) اللہ کے پاس ہے کہ اس میں کبھی تغیر نہیں آتا - یہ ہے آیت کا مطلب جو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے - لہٰذا اس کو وثوق کے ساتھ لو اور باقی سب تفسیروں کو چھوڑ دو - اور حضرت ممدوح نے یہ اس بنا پر فرمایا کہ اس سے قبل آپ ہی نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان فرمائی اور اس میں چند عرفانی علوم کا تذکرہ فرمایا تھا (اس لئے مطلب یہ تھا کہ وہ قابل اعتماد نہیں)

ف خلاصہ تفسیر یہ ہے کہ خیالات بشریہ میں باوجودیکہ وہ بھی القاء من اللہ ہے محو و اثبات کا تصرف الٰہی جاری رہتا ہے مگر علم قدیم اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکا کوئی حکم محو نہیں ہوتا - اور لوح محفوظ کی اصل بھی وہی علم قدیم ہے کہ اسی سے مستخرج ہے - واللہ اعلم

(۱۹) وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے

تم کو برگزیدہ کیا اور تم کو (معصیت کی گندگیوں سے) پاک صاف بنایا اور تم کو (عورتوں کی جنس میں) منتخب فرمایا (کہ فضیلت بخشی) تمامی جہان کی عورتوں پر۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار بنی رہو اور سجدہ کرتی رہو اور (خدا کے سامنے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکتی رہو۔ میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ اس آیت سے کیا حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر استدلال کر سکتے ہیں؟ اور نیز حضرت موسیٰ کی والدہ اور فرعون کی زوجہ حضرت آسیہ نیز حضرت سارہ و حضرت ہاجرہ اور حضرت حوا علیہن السلام کے نبی ہونے کی بابت جو بعض علماء کی رائے ہے وہ صحیح ہے یا غلط کہ بعض نے تسلیم کیا ہے اور بعض نے انکار کیا ہے۔ اور بعض نے حضرت مریم کی نبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور بعض نے توقف کیا ہے کہ نہ اقرار نہ انکار۔ مثلاً امام اشعری رئیس اہل السنۃ والجماعۃ۔ فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ فرشتہ کا نزول نبی ہی پر ہوا کرتا ہے' اور آیت شریفہ سے حضرت مریم علیہا السلام پر فرشتہ کا نزول ثابت ہوا۔ لہٰذا ان کی نبوت محقق ہوئی۔ اس فریق کے نزدیک نبی اور ولی کے درمیان فرق یہی ہے کہ نبی وہ ہے جس پر فرشتہ نازل ہو' اور ولی وہ ہے جس پر الہام ہو فرشتہ کا' نزول نہ ہو۔ حضرت ممدوح نے فرمایا دوسرے فریق کا قول صحیح ہے کہ حضرت مریم نبی نہ تھیں' صدیقہ اور ولیہ کاملہ تھیں۔ اور عورتوں کی نوع میں مطلق نبوت نہیں ہوئی۔ اور نبوت و ولایت اتنی بات میں اگرچہ مشترک ہیں کہ ہر ایک نور ہے انوار الٰہی میں سے اور سر ہے اسرار الٰہی میں سے۔ مگر دونوں کے نور میں بہت فرق ہے۔ حقیقی فرق تو کشف ہی سے معلوم ہو سکتا ہے مگر (سمجھانے کے لئے اتنا کہا جائے گا کہ) نور نبوت اصلی ہے' ذاتی ہے' حقیقی ہے' اور ذات نبی کے ساتھ اصل خلقت میں پیدا ہوا ہے' اور اسی لئے نبی (قبل از نبوت وبعد از نبوت) معصوم ہوتا ہے۔ اور نور ولایت کی یہ شان نہیں ہوتی۔ چنانچہ صاحب فتح ولی جب کسی ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو آئندہ ولی بننے والا ہے تو تمام لوگوں کی طرح اس کو بھی (نور سے خالی) دیکھتا ہے۔ مگر جب اس ذات پر نگاہ ڈالتا ہے جو آئندہ نبی بننے والی ہے تو اس میں نور نبوت پہلے سے رکھا ہوا نظر آتا ہے' اور ذات نبی کی طبیعت میں وہ ساتوں اجزاء نبوت فطری طور پر موجود پاتا ہے جن کا تذکرہ حدیث انزل القرآن علی سبعۃ احرف میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی حق گوئی اس کی فطری ہوتی ہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو نیز

نیز[۵] صبر جس کی بناء پر الم و کلفت نہ ہو۔ مخلوق[۶] پر رحمت کاملہ۔ اللہ جل جلالہٗ کی معرفت تامہ۔ خوف[۳] تام کہ خوف باطنی کے ساتھ خوف ظاہری بھی آمیز ہو اور دائما بہر حالت موجود رہے۔ باطل[۲] کے ساتھ بغض دائما اور عفو[۶] کامل کہ جو اس سے تعلق کو توڑے یا اس سے جوڑے اور اس کو مضرت پہونچائے یہ اس کو منفعت پہونچائے غرض ساتوں اجزاء نبی کے لئے فطری ہوتے ہیں۔ فتح (اور مشاہدۂ ملک و ملکوت) کہ اس میں کوئی بات زائد نہیں ہوتی البتہ جب اس کو فتح نصیب ہوتی ہے اس وقت اس میں انوار آتے ہیں۔ لہذا اس کے انوار عارضی ہوئے اور اسی لئے ولی قبل از فتح اور بعد از فتح ہر حال میں غیر معصوم ہوتا ہے اور یہ فرق جو بیان کیا جاتا ہے کہ ولی پر فرشتہ کا نزول نہیں ہوتا اور نبی پر فرشتہ کا نزول ہوتا ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جس کو حق تعالیٰ فتح نصیب فرماتا ہے خواہ وہ نبی ہو یا ولی وہ فرشتوں کو ان کی اصل صورت پر دیکھتا ہے۔ وہ ان سے باتیں کرتا ہے اور یہ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ اور جس نے کہا ہے کہ ولی کو فرشتہ نظر نہیں آیا کرتا یہ دلیل ہے اس کی کہ اس شخص کو حق تعالیٰ نے فتح نصیب نہیں فرمائی" اور ولایت کے لئے فتح لازمی نہیں اس لئے انہوں نے ہر ولی کو اپنی ولایت پر قیاس کر لیا)۔

علامہ حاتمی نے بھی فتوحات مکیہ کے باب ۴۳۶ میں لکھا ہے کہ بعض اولیاء سے جن میں ابو حامد محمد امام غزالی بھی شامل ہیں غلطی واقع ہوئی کہ انہوں نے نبی اور ولی میں یہ فرق بیان کیا کہ نبی پر فرشتہ اترتا ہے اور ولی کو الہام ہوا کرتا ہے فرشتہ اس پر نہیں اترتا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ (فرشتہ ولی پر بھی اترتا ہے البتہ) جو حکم لے کر اترتا ہے اس میں فرق ہوتا ہے کہ (نبی پر جدید احکام لاتا ہے کہ وہ صاحب شریعت ہوتا ہے اور) ولی پر حکم لاتا ہے (شریعت نبویہ کے) اتباع کا یا اطلاع دیتا ہے کسی حدیث کے صحیح ہونے کی جس کو علماء نے ضعیف کہہ دیا تھا' یا البشارت من اللہ لے کر آتا ہے کہ تم اہل سعادت و امان ہو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۝ ان کو خوشخبری (سنائی جاتی) ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں (سنائی جائے گی)' اور ان حضرات کی غلطی کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے حق تعالیٰ کے طریق سلوک کو سب کے لئے یکساں سمجھ لیا کہ چونکہ خود

ان پر فرشتہ کا نزول نہیں ہوا اس لئے سمجھے کہ دوسروں پر بھی نہیں ہوا اور اس بنا پر عام حکم لگایا کہ ولی وہ ہے جس پر فرشتہ کا نزول نہ ہو۔) اگر یہ حضرات کسی ثقہ ومعتبر شخص سے سن پاتے کہ ولی پر بھی فرشتہ اُترا کرتا ہے تو ضرور اپنے قول سے رجوع کر لیتے۔ کیونکہ (یہ خود بھی ولی تھے اور) کرامات اولیاء کے قائل ومصدق تھے۔ چنانچہ اکثر انہوں نے (ثبوت مل جانے کے بعد) ایسے قول کی طرف رجوع کیا ہے جس کے خلاف پر پہلے جمے ہوئے تھے"۔ اب ہم اس موقع پر حضرت ممدوح کے علوم میں سے دو باتیں بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اوّل وہ چند چیزیں جن کا اہل فتح کو مشاہدہ ہوا کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مقام اوّل میں جن امور کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ یہ ہیں بندوں کے افعال جن کو خلوتوں کے اندر کرتے ہیں (صاحب فتح کو سب نظر آتے ہیں)

ساتوں زمین اور ساتوں آسمان کا مشاہدہ۔ اس آگ کا مشاہدہ جو کہ پانچویں زمین میں ہے اور یہ نار برزخی ہے کہ عالم برزخ ساتوں آسمان سے لیکر ساتوں زمین تک چلا گیا ہے اور روحیں اپنے اجسام سے نکلنے کے بعد اپنے درجہ کے موافق اسی برزخ میں رہتی ہیں۔ اور اہل شقاوت (کفار ومنافقین) کی روحیں اس آگ میں رہتی ہیں۔ اس کی شکل تنگ مکانات مثلاً کنوؤں، غاروں، گڑھوں اور گھونسلوں کی سی ہے۔ اور اس نار برزخی میں رہنے والے ہر وقت زیر وزبر رہتے ہیں کہ اوپر آکر تم سے ایک بات کہیگا تو پوری نہ کرنے پائے گا کہ نیچے جا پہونچے گا۔ یہ آگ جہنم کی آگ نہیں ہے کہ جہنم تو ساتوں آسمان اور ساتوں آسمان کے کرہ سے باہر ہے اور اسی طرح جنت بھی۔ ساتوں زمینوں کے باہمی اشتباک اور ان میں جو مخلوق آباد ہے ان کا مشاہدہ۔ کہ ایک زمین دوسری زمین سے کیوں کر ملی ہے اور ایک زمین سے دوسری زمین تک جانے کی کیا صورت ہے اور ہر زمین کا مابہ الامتیاز کیا ہے جو دوسری میں نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح ساتوں آسمانوں کے باہمی اشتباک کا مشاہدہ۔ کہ ایک دوسرے سے کس طرح ملا ہے اور اُن کے باہم کیا نسبت ہے اور ان میں ستارے کیوں کر رکھے گئے ہیں شیاطین کا مشاہدہ اور یہ کہ ان کے توالد وتناسل کی کیا صورت ہے۔ جنات کا مشاہدہ اور یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ شمس وقمر اور ستاروں کی سیر ورفتار کا مشاہدہ ہولناک آوازوں مثلاً

گرج اور گرنے والی بجلیوں کی کڑک کا مشاہدہ - کہ وہ ہمیشہ ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں - صاحب فتح ولی پر لازم ہے کہ ان میں سے کسی مشاہدہ کو بھی بڑی چیز نہ سمجھے - بلکہ معمولی چیز سمجھے ورنہ یہیں ٹھہر جائے گا بلکہ حالت برعکس ہونے لگے گی اور گرنا شروع ہو جائے گا - وجہ یہ ہے کہ فتح کے زمانہ میں (جب کہ مشاہدات ہونے لگتے ہیں) طبیعت شفاف یعنی جاذب ہوتی ہے' اور وہ جس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اس کو فوراً چوس لیتی ہے - اور یہ تمام چیزیں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے چونکہ ظلمت و تاریکیاں ہیں لہذا جب کسی ظلمت سے اُنس و قرار پائے گی وہیں ٹھہر جائے گی اور اللہ جل جلالہ سے جدا و بے تعلق بن جائے گی - اسی لئے کہا جاتا ہے کہ غیر مفتوح ولی جس کا سلوک مشاہدات سے خالی ہو) بڑے امن میں ہے' اور جس کو (اثنار سلوک میں) مشاہدات پیش آویں وہ بڑے خطرہ میں ہے کہ خدا ہی حفاظت فرمائے تو محفوظ رہے ورنہ ظاہر ہے کہ جب طبیعت انسانیہ قبل از فتح دراہم ودنانیر اور بیوی بچے تو درکنار بادام وکشمش اور چنے کے دانہ تک کی عاشق وگردیدہ ہے کہ ان میں مشغول ومبتلا ہو جاتی ہے' تو بعد از فتح جب تمامی عالم علوی وسفلی کی چیزیں سامنے آنے لگیں اور پھر ساتھ ہی شیطان بھی اپنی کوشش میں لگا ہوا ہو تو کس کی طاقت ہے کہ بچا رہے بجز اس کے کہ حق تعالیٰ ہی اس کو بچائے - نیز آپ نے فرمایا کہ سالک اگر امور مذکورہ میں سے کسی ایک چیز پر بھی ٹھہر گیا تو شیطان اس کے ہر وقت کے ساتھی بن جاتے ہیں اور وہ اللہ پناہ میں رکھے یا ساحر بن جاتا ہے یا کاہن - اور جس پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا اور اس کے قلب میں اپنا شوق اور دلی خواہش و طلب ڈال دیتا ہے کہ وہ ان مشاہدوں کو عبور کرتا ہوا (اللہ کی طلب میں) آگے بڑھتا چلا جاتا ہے - پھر مقام ثانی میں اس کو انوار باقیہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جس طرح مقام اول میں امور ظلمانیہ فانیہ کا مشاہدہ ہوا تھا کہ مشاہدہ کرتا ہے عام ملائکہ کا اور ان فرشتوں کا جو محافظت خلق پر تعینات ہیں' مجلس اقطاب کا' اس مجلس کے اولیاء کا' سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کا اور اس جماعت کا جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب اور ان سے متعلق ہے - پھر مقام موسیٰ علیہ السلام کا اور اس جماعت کا جو ان کے ساتھ ہے' پھر مقام ادریس علیہ السلام کا اور ان کے ساتھ والی جماعت کا' پھر مقام یوسف

علیہ السلام کا اور ان کی جماعت کا، پھر تین رسولوں کا پیغمبران سابقین میں سے جن میں بعض حضرت ادریس سے قبل ہوئے ہیں اور بعض ان کے بعد۔ مگر ان کے نام لوگوں میں مشہور و معروف نہیں ہیں۔ اور اگر ہم انبیاء مذکورین کے مقامات کی شرح و تفصیل بیان کریں اور بتائیں کہ فرشتوں کو ان کی اصل صورت پر دیکھنے کی کیا صورت ہوتی ہے تو سننے والا حیران ہو جائے اور وہ باتیں اس کے سننے میں آ دیں جن کا خطرہ و خیال بھی اس کے دل پر کبھی نہ گزرا ہوگا۔ ان امور کا مشاہدہ کرنے والے پر بھی ضروری ہے کہ ایک جگہ بھی نہ ٹھیرے۔ اور وجہ وہی ہے کہ اس کی ذات چونکہ شفاف ہے اس لئے جس مقام پر ٹھیر جائے گا وہ اس کے اسرار و انوار فوراً چوس لے گی۔ حتیٰ کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کو پیارا سمجھ کر ذرا بھی اگر ٹھیر گیا تو اسرار عیسوی سے سیراب ہوگا اور فوراً ہی ان کے مذہب پر (یعنی مذہب اسلام چھوڑ کر عیاذاً باللہ عیسائی بن جائے گا غرض صاحب فتح و مشاہدہ ہر وقت ایک بڑے خطرہ میں اور ہلاکت کے نہایت قریب ہوتا ہے جب تک کہ مقام سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ تک نہ پہونچ جائے۔ ہاں جب مقام محمدی کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ہر طرح کا اطمینان و سرور حاصل اور مبارکباد کا مستحق ہوتا ہے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ کے اندر جل جلالہ کی طرف کھینچنے والی ایک ایسی قوت رکھی ہوئی ہے جو تمامی انبیا علیہم السلام میں آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ اعز المخلوقات اور افضل العلمین ہیں۔ لہذا جب صاحب مشاہدہ مقام محمدی میں پہونچتا ہے تو اللہ جل جلالہ کی طرف اس کی کشش اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انقطاع و بے تعلقی سے مامون و بے خطر ہو جاتا ہے۔ اب تیسرا مقام شروع ہوتا ہے اور ان انوار میں جن کا اوپر ذکر ہوا تقدیر کے اسرار درازہائے بے پایاں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور چوتھے مقام میں اس نور کا مشاہدہ ہوتا ہے جس پر فعل الٰہی منبسط اور ایسا گھل مل گیا ہے جیسے پانی میں زہر گھل جاتا ہے۔ کہ فعل بمنزلہ زہر کے ہے اور نور بمنزلہ پانی کے۔ اس مقام میں بھی بہتیروں کو غلطی واقع ہوتی ہے کہ وہ اس نور کو نور الٰہی سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے۔ پھر پانچویں مقام میں فعل الٰہی کی اس نور سے علیحدگی کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ نور نور نظر آتا ہے اور فعل فعل اس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتا اور

سمجھتا ہے کہ پہلا گمان واقعہ کے خلاف تھا۔ ان مقامات کے نام (جو صوفیہ کی اصطلاح میں تجویز ہوئے ہیں)، اور اُن کے معانی کی شرح، اور ان کی تمامی اقسام، اور اُن کی تفصیل سب ہم نے اس لئے چھوڑ دی کہ مقصود صرف صاحب مشاہدہ کو ڈرانا اور متنبہ کرنا ہے (کہ پھونک پھونک کر قدم رکھے اور ایک لحظ بھی استعانت خدا سے غافل نہ ہو)۔ سو وہ بحمد اللہ حاصل ہو چکا۔

دوسری بات جس کا ذکر کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ نبی اور ولی کے درمیان جو فرق ہے وہ تو معلوم ہو گیا۔ اب نبی اور فرشتہ کے درمیان جو فرق ہے وہ سمجھو۔ کہ فرشتہ ایک نورانی ذات ہے جس میں حق تعالیٰ نے عقل اور حواس رکھ دیئے ہیں۔ حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ہر فرشتہ کو حق تعالیٰ نے پانچ سر عطا فرمائے ہیں، اور ہر سر میں سات جوانب ہیں، اور ہر جانب میں نو منہ ہیں، جن کا مجموعہ تر یسٹھ ہوتا ہے لہذا پانچوں سر میں تین سو پندرہ منہ ہوئے۔ اور ہر منہ میں کسی فرشتہ کو تین زبانیں عطا فرمائی ہیں اور کسی کو پانچ اور کسی کو سات لہذا کسی کی نو سو پینتالیس زبانیں ہوئیں، اور کسی کی ایک ہزار پانچ سو پچہتر زبانیں، اور کسی کی دو ہزار دو سو پانچ زبانیں۔ اور جب فرشتہ کلام کرتا ہے تو اُس کی آواز اس کی ساری زبانوں سے نکلتی ہے۔ فسبحان الملک الخلاق العظیم۔ اہل مشاہدہ کو اگر حق تعالیٰ شانہٗ اپنی طرف سے خاص قوت کی مدد نہ پہونچائے تو فرشتہ کی آواز سن کر اس کا قلب پھٹ جائے اور دل پارہ پارہ ہو جائے پھر کیا پوچھنا جب کہ اُس کی شکل بھی اصلی ہو اور جو صورت ان کو اصل خلقت میں عطا فرمائی گئی ہے اس کا بھی مشاہدہ ہو۔ جب یہ سن چکے کہ فرشتہ ایک صاف اور نورانی ذات ہے جس میں عقل اور حواس مرکب ہیں تو اس کی مثال روح کی سی ہوئی۔ کہ وہ بھی ایک نور ہے جس میں عقل رکھی ہوئی ہے جس سے اللہ جل جلالہٗ کی معرفت ہوتی ہے، اور دوسری طاقتیں بھی رکھی ہوئی ہیں، جن کا ذکر روح کے اجزاء سبعہ میں مفصل گزر چکا ہے، اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ساتوں علوم اُس کے فطری ہیں جو اس کی اصل آفرینش میں شامل کیا جا چکا ہے۔ بس یہی حال فرشتہ کا ہے کہ ابتدا ہی سے اس کو فتح و مشاہدہ نصیب ہے اور یہ قوتیں اس کی فطری و خلقی ہیں۔ اور نبی کی ذات

یہاں کچھ عبارت رہ گئی ہے۔ جو طباعت کی غلطی ہے کہ سات جوانب کی وجہ نہیں معلوم ہوئی ۱۲ مترجم

پیدا کی گئی ہے مٹی سے۔ اور روح کو مع اس کے تمام اسرار و قوی کے اس ذات ترابی میں مستور کر دیا گیا ہے۔ اور مٹی کا طبعی اقتضا ہے حجاب (اور ظلمت و کثافت)۔ مگر نبی کو چونکہ حق تعالیٰ نے نوازا ہے اور اس کی اصل آفرینش میں نبوت کا نور رکھا ہے جس کی وجہ سے ظلمت بالکل دور ہو چکی ہے اور حجاب رقیق و باریک بن گیا ہے' اس لئے صاحب نبوت گویا حقانیت کا دائمی جلیس و ہمخواب ہے۔ کہ قریب ترین ہے اللہ سے' قریب ترین ہے حق سے' حرکت کرتا ہے تب امر حق میں' اور سکون کرتا ہے تب امر حق میں۔ بولتا ہے تب حق بات بولتا ہے' اور سکوت کرتا ہے تب بمقتضاء حق کرتا ہے' اس کا ہر فعل اور ہر امر حق ہے' اور وہ مجسم حق ہے' حتیٰ کہ فرض کرو وہ ایسی جگہ اور ایسی قوم میں پیدا ہو جن کی پیدائش ضلال و گمراہی پر ہوئی ہو تب بھی یہ نبی اُن کے تمام افعال اور حرکات و سکنات سے نفرت کھائیگا' ان کا مدمقابل بنے گا' اور اس فطری حق کی وجہ سے جو اس کی ذات میں بھرا ہوا ہے ان کی ضد اور نقیض بن کر رہے گا۔ حالانکہ نہ شریعت اُس کے کان میں پڑی ہے اور نہ اُس نے اللہ کے امر و نہی کا کوئی لفظ سُنا ہے۔ یہ ہے حالت ہر نبی کی اصل آفرینش اور فتح و مشاہدہ سے بھی قبل ابتداء و شروع کی۔ چہ جائیکہ جب اس کو فتح و مشاہدہ نصیب ہو اور اُس کی ذات ترابی اور روح کے درمیان کا پردہ بالکل اُٹھ جائے اور وہ ہمہ وقت حضوری و بارگاہ شہود میں رہنے لگے تب تو اس کے بحر زخار اور دریائے ناپیدا کنار کا حال ہی نہ پوچھو کہ اس کی برداشت تو نہ کوئی فرشتہ کر سکتا ہے نہ تمامی مخلوقات میں کوئی چیز۔

ف اب دو باتیں مجھے بھی عرض کرنا ہیں جو گویا نتیجہ اور ثمرہ ہیں حضرت شیخ ہی کی تقریر کا۔ اول آپکو معلوم ہوا کہ خلاصہ سارے سلوک کا بلکہ مقصود آفرینش عالم اور تخلیق بنی آدم کا قرب من اللہ اور وصول الی اللہ ہے اور اس کا دروازہ صرف ایک یعنی وجود باجُود ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کی ذات مطہرہ میں خصوصیت کے ساتھ قوت جاذبہ الی اللہ ایسی رکھی ہوئی ہے کہ محبت کے ساتھ آپ کا دامن پکڑ لینے والا قرب الٰہی سے محروم و ناکام نہیں رہ سکتا۔ مگر اس کے بڑے راستے دو ہیں۔ ایک کا نام سیر اجمالی ہے اور دوسرے کا نام سیر تفصیلی ہے۔ جیسے ایک ریل کا راستہ دہلی سے لاہور تک کا اور دوسرا راستہ سڑک اعظم کا جو شاہی سڑک کہلاتی ہے۔ باقی اس کی شاخیں بہت ہیں کہ چاروں طرف

سے گھوم پھر کر ان ہی دو راستوں میں کسی جگہ آملی ہیں۔ تفصیلی سیر کی مثال شاہی پختہ سڑک پر چلنا ہے کہ اس کا مسافر گھوڑے پر سوار راستہ کے تمامی مناظر دیکھتا، اور لب سڑک سرائے میں راتوں ٹھیرتا، اور جگہ جگہ کے پانی پیتا ہوا ایک کافی مدت میں منزل مقصود پر یعنی لاہور پہونچے گا۔ اس کو تالاب بھی راستہ میں پڑیں گے اور ندیاں نالے بھی۔ کہیں پہاڑ نظر آئیں گے اور ان پر چڑھنا اترنا ہوگا اور کہیں جنگل بیابان اور لق و دق بیابان نظر آئیں گے۔ اور ان میں گزرنا ہوگا۔ بنوں میں شیر اور چیتے بھی دکھائی دیں گے اور دریاؤں میں مچھلیاں اور ناکے بھی۔ کہیں سبزہ یا غسات اور گنجان درختوں کی ٹھنڈی ہوائیں ہوں گی اور کہیں گرم لو کے طمانچے اور اندھیاؤ کے غبار۔ غرض ہر منظر کی تفصیلی سیر کرتا ہوا جب برسوں میں لاہور پہونچے گا تو حالات سفر بیان کرتے کرتے خود بھی تھک جائے گا اور سننے والے بھی شروع میں ذوق لیں گے کہ ان دیکھے اعجوبہ اور انوکھے واقعات کانوں میں پڑ رہے ہیں مگر آخر میں اکتا جائیں گے۔ بایں ہمہ راستہ کے مناظر سننے کا نتیجہ بھی بجز اس کے کچھ نہ نکلے گا کہ ذرا دیر کے لئے کانوں کو مزہ آگیا ورنہ جہاں بیٹھا ہے خود وہیں بیٹھا ہوا ہے نہ اپنے برابر سر کا اور نہ محلہ بلکہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ اور دوسرا راستہ ریل کا ہے کہ مسافر بعد مغرب گاڑی میں سوار ہو کر کھڑکیاں بند کر کے سو گیا اور صبح کو آنکھ کھلی تو گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ اس کو نہ یہ خبر کہ راستہ میں کتنے دریا آئے، نہ یہ اطلاع کہ کس کس جنگل کو عبور کیا۔ نہ اس کو کوئی درخت نظر آیا نہ جھاڑیاں۔ نہ اس نے سانپ بچھو دیکھے نہ مواشی و درندے۔ اس سے پوچھو کہ راستہ میں کون کون شہر پڑے اور کون کون بستیاں، تو یہ کچھ جواب نہ دے سکے گا۔ دونوں مسافر چلے دہلی سے اور دونوں پہنچے لاہور، مگر تفصیلی سیر اور اجمالی سیر کا جو فرق دونوں میں ہے وہی فرق اہل مشاہدہ اولیاء میں اور اس گروہ اولیاء میں ہے جن کو مطلق مشاہدہ نہیں ہوا۔ پہلے زمانہ میں تو خطرہ اور امن ہی کا فرق تھا کہ تفصیلی سیر میں قدم قدم پر جان و ایمان جانے کا اندیشہ ہے۔ مگر اس زمانہ میں تو چونکہ توجہ الی اللہ ہی کا قحط ہے کہ وصول الی اللہ کا ذوق اور شوق ہی قلوب سے نکل گیا اس لئے برسوں میں طے ہونے والی مسافت بتقاضائے وقت ریل کی سواری میں بدل گئی اور اتنی غالب آگئی کہ سڑک اعظم گویا ویران ہو گئی اور اس راستہ کا

اختیار کرنے والا مسافر خال خال رہ گیا۔ اسی طرح اس زمانہ میں سلوک و وصول الی اللہ کا طریق بھی یہی اجمالی سیر رہ گیا کہ آنکھیں بند کر کے خلوتوں میں ذکر و شغل کریں اور قلب میں اُس داعیۂ محبت کے پیدا ہو جانے کی دُعا مانگیں جو دامان محمدی سے وابستہ کر دے اور پھر ذاتِ محمدی کی قوت جاذبہ الی اللہ کشاں کشاں آستانۂ حق جل جلالہٗ پر ڈالے۔ اس لئے اس وسوسہ کو قلب میں ہرگز جگہ نہ دینا کہ شیخ عبدالعزیزؒ جیسا غوث و مرشد جب اس وقت نظر نہیں آتا تو دروازۂ سلوک و تربیت ہی بند ہو گیا۔ یا جب اپنے پیر میں یہ کمال موجود نہیں تو اس کی پیری اور اپنی مریدی فضول ہے۔ یاد رکھو کہ اولیاء ہی کے بقاء پر دنیا کا بقاء موقوف ہے کہ جس دن یہ ہستیاں سطح زمین سے اٹھ جائیں گی نہ زمین باقی رہے گی نہ آسمان۔ سب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور قیامت آ جائے گی پس جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا ابھی موجود ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کے ستون یعنی اولیاء اللہ بھی موجود ہیں۔ البتہ طریق سلوک بدل گیا ہے کہ جس بزرگ کے واقعات کا تم مطالعہ کر رہے ہو وہ اس جماعت کا فرد تھا جن کی سیر تفصیلی تھی اور اُس زمانہ میں غلبۂ اسلام اور فرط توجہ الی اللہ اور عموم رغبت الی الدین کی وجہ سے تفصیلی سیر میں عمریں صرف کرنا پیارا بھی معلوم ہوتا تھا اس لئے اکثر طبیعتیں اس کو برداشت کر جاتی تھیں مگر اس زمانہ میں اوّل تو اس تجارت اخروی کا مس ہی نہیں رہا، اور اگر برائے نام ہے تو عجلت گویا جزو طبیعت ہے کہ سودا خریدو اور گھر آ بیٹھو۔ راستہ کی سیر و تفریح کی نہ رغبت ہے نہ گنجائش اس لئے بالعموم اس زمانہ کے اولیاء اس دوسری جماعت کے ہیں کہ خود بھی اجمالی سیر کے مسافر بن کر منزل مقصود پر پہونچے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی اجمالی سیر کا مسافر بنا کر منزل مقصود پر پہونچا رہے ہیں۔ لہٰذا نہ بزرگوں سے بدگمان ہو اور نہ اپنا کام چھوڑو۔ بلکہ اللہ کا شکر کرو کہ ہم ضعفاء کے لئے مختصر اور بے خطر راستہ نکال دیا ؎

کارکن کار بگذار از گفتار   کاندریں راہ کار باید کار

دوسری بات یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اہل حق علماء چونکہ نفع متعدی کے لئے تجویز کئے گئے ہیں اس لئے عموماً ان کا طریق وصول الی اللہ یہی سیر اجمالی ہے کہ جو وقت تفصیلی سیر میں خرچ ہوتا وہ ڈرائیور اور گارڈ بن کر دوسروں کو لاہور تک پہونچانے میں

گزرے ۔اس لئے اگر وہ راستہ کے مناظر عجیبہ سے ناواقف ہوں اور باہم اختلاف کریں کہ ایک کہے لاہور کے راستہ میں کوئی دریا نہیں پڑتا، اور دوسرا کہے کہ متعدد دریا پڑتے ہیں، تو نہ ان کے لئے عیب ہے نہ سبب نقص، بلکہ خوبی ہے کہ علامت ہے میرا جمالی کی۔ پس اگر کوئی پیادہ مسافر اپنے مشاہدہ کی رُو سے سب کی تغلیط بھی کر دے تو اصل مقصود یعنی ان کے لاہور پہونچنے بلکہ آرام کے ساتھ اور جلد پہونچنے پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ چنانچہ حکیم الامت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کو اگر مشاہدۂ ملائکہ نہ ہوا اور اس بنا پر انہوں نے اس مشاہدہ کو نبوت کے لئے مخصوص فرمادیا تو اُن کی علمی و عملی شان اور قرب من اللہ میں کوئی فرق نہ آیا خصوصاً جب کہ دُنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ مدت ہوئے عالم برزخ میں پہونچ لئے مگر ان کی تصانیف حقہ کا بحر ذخار لاکھوں پیاسوں کو سیراب کر رہا اور ہزارہا مادہ پرستوں کو خدا پرست بنا رہا ہے ۔ہاں ذات محمدی چونکہ جامع کمالات تھی اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی امت مرحومہ میں اہل مشاہدہ یعنی تفصیلی سیر والے بھی پیدا ہوں ۔ لہذا ہوئے اور بہت ہوئے اور تمامی خطرات سے محفوظ رہ کر منزل مقصود پر پہونچے ہیں ۔اس لئے باغ محمدی کے رنگ برنگ پھولوں میں اگر کسی ایک پر فریفتہ ہو گئے ہو تو دوسرے کو عیب دار بنا کر باغ سے باہر نہ پھینکو۔ اندیشہ ہے کہ تم ہی باغ سے باہر نکال دیئے جاؤ۔

ذرا غور کرو کہ نبوت کا دروازہ بند ہو لیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم عالم بقا میں تشریف لے گئے۔ قیامت تک عالم دُنیا میں جتنے بھی واقعات و جزئیات کا حدوث ہو گا ان پر جواز و عدم جواز کا حکم لگانا اسی جماعت کا ذمہ ہے جو نہ حکم لگانے میں مستقل ہے کہ نبی نہیں ہے۔ اور نہ یہ کہہ سکتی ہے کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ نائب رسول ہے؛ اور نہ عالم برزخ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر سکتی ہے۔ اب اس کے سوا راستہ کونسا رہا کہ خیر القرون کے واقعات کو اصول موضوعہ قرار دے کر جزئیات حادثہ کا حکم اپنی عقل کے ذریعہ ان سے مستخرج کرے اور اصلاح عالم کا وہ کام انجام دے جو گزشتہ زمانہ میں ایک صاحب شریعت پیغمبر کے نائب بن کر انبیاء معصومین نے انجام دیا تھا۔ لہذا باہم اختلاف ہونا بھی ناگزیر ہے، اور ہر اختلافی صورت پر اجر ملنا بھی صحیح۔ انبیاء سابقین کے احکام میں فرشتہ واسطۂ حکم

بنتا تھا۔ اور اس لیے ان کی شریعتوں کا باہمی اختلاف عین اتحاد تھا۔ اور نائبین خاتم الرسل کے احکام میں واسطہ حکم ان کی عقل وذکاوت اور فہم وفراست کو بنایا گیا ہے۔ لہذا ان کے اجتہادیات کا باہمی اختلاف عین اتحاد ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲۰) وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ہ

تذکرہ کرو ذوالنون (یونس علیہ السلام) کا جب کہ وہ چلے غصہ میں بھرے ہوئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پا سکیں گے۔ میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ اپنے اوپر حق تعالیٰ کا قابو نہ پانے اور پروردگار کے احاطۂ قدرت سے باہر نکل جانے کا گمان تو ضعیف ترین مسلمان بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ نبی۔ پھر سیدنا یونس علیہ السلام کے اس خیال کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا مُغَاضِبًا کے معنی ہیں غاضبا علیہم یعنی قوم پر غصہ آیا کہ انہوں نے ایمان اور ان کی اطاعت کو اختیار نہ کیا جس میں ان کی فلاح وبہبودی تھی۔ حتیٰ کہ ان پر اللہ کا عذاب سامنے نمودار ہوا کہ ان کے گھروں کے اوپر آ پہونچا تھا جب سیدنا یونس علیہ السلام نے یہ دیکھا تو ان پر غصہ کرتے ہوئے (کہ اچھا ہوا جیسا کیا ویسا بھرو) کشتی کی طرف چل دیئے۔ اور فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو خیال ہوا کہیں ہم ان کو اسی عذاب سے ہلاک نہ کر دیں جس سے ان کی قوم کو ہلاک کیا۔ یعنی عذاب الٰہی کی علامت دیکھ اس خیال سے بھاگے کہ بچ جائیں گے اور جو آفت قوم پر آنے والی ہے اُن پر نہ آئے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو آگ نظر آوے کہ سامنے سے چلی آ رہی ہے، یا پانی کا سیلاب ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے، اور جو بھی سامنے پڑ جائیگا وہ جلے یا ڈوبے بغیر نہ رہے گا۔ پھر یہ سمجھ کر اس سے بھاگے کہ یہاں سے بھاگ جانا مجھے اس آگ یا سیلاب سے بچا لے گا۔ یہی حالت سیدنا یونس علیہ السلام کی تھی کہ جب قوم پر عذاب کو اترتا ہوا دیکھا تو خیال کیا کہ ان میں موجود رہا تو اسی عذاب سے میں بھی ہلاک ہو جاؤں گا جس سے وہ ہلاک ہوں گے۔ لہذا بھاگنے میں بچاؤ سمجھ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔ پس حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی دوسری صورت دکھائی (کہ دریا میں غرق ہوئے اور مچھلی نے نگل لیا۔ اور اندھیرے میں اپنے رب کا پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں قصوروار ہوں۔ تب حق تعالیٰ

نے ان کو نجات بخشی، اور یہ قصہ کرشمۂ قدرت بنا اہل ذکر کے لئے اور رہبر بنا رجوع کرنے والوں کے لئے، اور سبب تسلی بنا مصیبت زدگان کے لئے اور دروازہ کھلا سائلین کے لئے کہ ارشاد ہوتا ہے فَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذَٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ ۝ ان کو ہم نے نجات دی غم سے اور اسی طرح ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنین کو الحاصل سیدنا یونس علیہ السلام کا فرار قوم پر نازل شدہ عذاب سے بچ جانے کے خیال پر تھا نہ کہ قدرتِ خدا کو عاجز اور اپنے کو آقا کے احاطۂ طاقت سے باہر سمجھنے کی خاطر۔

ف ۔ مطلب یہ ہے کہ اسباب یقینیہ سے متاثر ہونا مثلاً سیلاب یا آگ کا پہاڑ اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بھاگنا کہ ڈوب یا جل نہ جاؤں انسان کا طبعی فعل ہے۔ غلبۂ خوف میں اس پر نظر ہی نہیں جاتی کہ بھاگنا گویا اپنے آپ کو قدرتِ الٰہی سے باہر سمجھنا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اپنے باپ کو غصہ میں قمچی اٹھاتا ہوا دیکھ کر کانپ اٹھے اور بھاگ کر گھر کے کونہ میں جا چھپے، تو بچہ کو اس کا وہم بھی نہیں گزرتا کہ باپ کے قابو سے باہر نکل جاؤں۔ محض خوف و دہشت نے اس کو بھگایا ہے۔ مگر باپ اس کو وہیں جا کر پکڑتا اور کہتا ہے تو نے یہ سمجھا کہ بھاگ کر جان بچالے گا اور میں تجھے پکڑ نہ سکوں گا۔ اسی طرح سیدنا یونس علیہ السلام کا فرار بہ تقاضائے خوف تھا نہ کہ قدرت حق کو عاجز سمجھ کر۔ مگر اصل اشکال یہ ہے کہ اقتضاء طبعی پر عتاب نہ ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ آیت شریفہ سورۂ انبیاء کی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اکثر مشاہیر انبیاء کے مناقب اور کمالات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اول سید الموحدین سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور نار نمرود سے نجات پانے کا مفصل ذکر ہے۔ اور پھر حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت ایوب، حضرت اسمٰعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کے محامد مذکور ہیں۔ ان کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کا یہ قصہ منقول ہے، اور ان کے بعد پھر حضرت زکریا حضرت یحییٰ اور حضرت مریم بتول علیہم السلام کے محاسن بیان کئے گئے ہیں۔ لہٰذا سیاق و سباق چاہتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بھی اس قصہ میں کوئی خاص منقبت ہے۔ حالانکہ صورت واقعہ ایک غلطی کا ارتکاب ظاہر کرتی ہے۔ اور غلطی بھی وہ جس کو فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو

اللہ کے قابو سے باہر سمجھنا ادنیٰ ترین موحد کا کام بھی نہیں۔ سوانح محمدیہ میں حضرات صحابہ کا بھی ایک قصہ اسی قسم کا گزر چکا ہے کہ غزوۂ حنین میں کثیر تعداد دشمنوں کے فوری حملہ سے اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور صرف اسّی مہاجرین و انصار رہ گئے۔ ہر چند کہ نبی نہ تھے مگر ان کی بھی گرفت ہوئی اور اس فرار عن الزحف کو حفاظت جان غلبۂ خوف کا طبعی اثر قرار دے کر عذر نہیں سمجھا گیا۔ ہاں سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے مشاہدۂ قدرت الٰہیہ میں کمال کا بے شک ثبوت دیا کہ تنہا رہ جانے پر بھی گھبرانا یا پیچھے قدم ہٹانا تو درکنار سواری سے بھی نیچے اُتر گئے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب دشمنوں کے نرغہ میں گھسے چلے گئے۔ چونکہ مقصود محض امتحان تھا اور وہ چند لمحات میں پورا ہو لیا کہ دُنیا نے دیکھ لیا نبی کی شان کیا ہونی چاہیئے، اس لئے صحابہ بھی جو تتر بتر ہو گئے تھے اس طرح لوٹ پڑے جیسے پرند اپنے بچوں پر گرا کرتا ہے، اور نتیجۂ جنگ کا وہی نکلا جو قدرت الٰہیہ پر نظر رکھنے کا نکلنا چاہیئے کہ فتح ہوئی اسلام کی اور غلبہ ہوا مسلمانوں کو۔ مانا کہ شان محمدی تمامی انبیاء و رسل سے ارفع و اعلیٰ ہے مگر نفس نبوت کا تقاضا ہے کہ مشاہدۂ قدرت الٰہیہ سے ایک لمحہ بھی کسی حال ذہول نہ ہو جیسا کہ نبوت کے اجزاء سبعہ کی بحث میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ حضرت صحابہ کے فرار مذکور میں بھی اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ کمال شان محمدی کا ظہور اسی پر موقوف تھا۔ اگر یہ فرار پیش نہ آتا اور حضرتؐ کو یہ منظر پیش نہ آتا تو دُنیا کو معلوم کیسے ہوتا کہ اعتماد علی اللہ کیا چیز ہے اور بحالت اضطرار جب کہ موت سامنے آکھڑی ہو قدرت الٰہیہ پر نظر رکھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے۔ گویا امتحان محمدی کا مقدمہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے وہ خطا جو مظہر شانِ محمدی اور سبب ارشاد و ہدایت خلق بنی ہو عجب نہیں عند اللہ صواب اور منجملہ ان سئیات کے قرار پائے جن کو بروز قیامت حسنات بنایا جائیگا۔

الحاصل سیدنا یونس علیہ السلام کا یہ قصہ خصوصاً اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے وہ قصے عموماً جن پر حق تعالیٰ کا عتاب ہوا ہے چوں کہ اکثر موجب خلجان ہوا کرتے ہیں اس لئے دل چاہتا ہے کہ اپنی فہم کے موافق کچھ عرض کر دوں۔ اِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ خَطَاءً فَمِنِّیْ وَاِنِّیْ۔ سب سے مقدم سمجھنے کی بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اُن سے نبوت سے

پہلے بھی ہر قسم کی معصیت کا صدور محال ہے۔ اور بات بھی معقول ہے کہ نافرمانی کا وقوع غفلت پر موقوف ہے اور جس کے لئے مشاہدہ دائمی ہو اور وہ ہر وقت حق تعالیٰ شانہ' کے سامنے حاضر اور دست بستہ کھڑا ہو ممکن ہے کہ ذرّہ برابر بھی نافرمانی کرے۔
مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس مجسّم نور جماعت کی غلطیوں کا اور اُن پر عتاب و گرفت کا تذکرہ ہے۔ پس اگر وہ غلطیاں نہیں تو عتاب کیسا' اور اگر عتاب صحیح ہے تو عصمت کیسی۔ اس لئے حقیقت سمجھ لو کہ معصیت وہ ہے جو ظلمت و تاریکی سے پیدا ہو اگرچہ صورت طاعت کی لئے ہو۔ مثلاً منافقین کی نمازیں اور روزے۔ ان کا منشا چونکہ مسلمانوں کو دھوکا دینا اور اسلام کا مذاق اُڑانا تھا اس لئے صورۃً اگرچہ پیاری عبادتیں ہیں مگر حقیقتاً بدترین معصیتیں ہیں۔ اسی طرح جس کا حدوث کسی نور سے ہوا ہو اگرچہ وہ صورت معصیت لئے ہوئے ہے مگر عین طاعت کے حکم میں ہے۔ جیسے مغلوب الحال اولیاء کی غلطیاں اور چرواہے کا قصہ جس کو مولانا رومی نے مثنوی میں نقل فرمایا ہے۔ مگر اس کی علامت یہ ہے کہ صورت خطا کا علم ہوتے ہی گریہ ندامت کا وہ اثر مرتب ہو جو حقیقی معصیت کے مرتکب پر ہونا چاہیئے۔ اور اوّل الذکر کی شناخت یہ ہے کہ حقیقت خطا کا علم ہونے پر بھی وہی سکون اور جرأت و دیدہ دلیری ہو جو مطیع و صائب الرائے میں ہونی چاہیئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انجام ہر دو فریق کا حقیقت کے موافق ہوتا ہے کہ صورت معصیت پر جس کا منشا نور ہے منجانب اللہ برکات و کامیابیاں مُرتب ہوں گی' اور صورت طاعت پر جس کا منشا ظلمت ہے انجام کار عذاب و خسران اور دُنیا و آخرت کی رسوائی مرتب ہو گی۔ الحاصل حضرات انبیاء علیہم السلام سے حقیقت معصیت کا نہ کبھی صدور ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے قلوب میں ظلمت اور غفلت کا نام ہی نہیں ہے جو سبب بنتا ہے معصیت کا۔ البتہ ان کی اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی صورت بھی حقیقت کے مطابق ہی کی ہوتی ہے' اور بیشتر و عموماً ان کی طاعتیں اسی نوع کی ہیں۔ دوم وہ جو حقیقتاً طاعت ہیں مگر صورت خطا کی لئے ہوئے ہیں' اور وہ نسبتاً بہت کم ہیں۔ مگر ہیں ضرور۔ اور ان کا ہونا ایک درجہ میں ضروری بھی ہے کہ بعض منافع اُخروی ان ہی پر موقوف ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر مخلوق گناہ نہ کرتی تو میں ان کو ہٹا کر دوسری مخلوق پیدا فرماتا جس سے

گناہ صادر ہوں اور میں ان کو بخشوں، یعنی غفور کا مظہر ہونا ضروری ہے کہ مغفرت
کے قابل وہی گناہ ہے جس کی ندامت و بے چینی مرتکب کے قلب میں موجود ہو، اور
یہ داعیہ اُسی نورِ ایمان کا ہے جس نے قلب میں نور ڈال رکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ وہ خطا
جو نورِ معرفت قائم رہتے ہوئے صادر ہو مستحق مغفرت ہے کہ توبہ پر مجبور کرے گی
بلکہ من وجہ مطلوب ہے کہ غفار کی شان مغفرت کا ظہور اسی پر موقوف ہے۔ اور یہی راز
ہے حضرت آدم کے مسجود ملائکہ اور حضرات انبیاء کے فرشتوں سے افضل و بہتر ہونے کا
کہ ملائکہ میں صرف اُن طاعتوں کا وجود ہے جو صورۃً و حقیقتاً دونوں طرح اطاعت ہیں
اور اس لیے وہ اُن طاعتوں کے برکات سے محروم ہیں جن کی صورت معصیت کی ہے اور
حضرات انبیاء علیہم السلام دونوں قسم کی طاعتوں سے مالا مال ہیں۔ اور اس میں عجب
نہیں راز یہ ہے کہ غلام کی غلامی اور محب کی محبت آزمانے کے لئے مار اور پیار دونوں
کی حاجت ہے۔ کیا ضرور ہے کہ کوئی پیار کے وقت خدمت کرتا رہا اور محبت جتا رہا ہو
تو وہ مار کے وقت بھی ایسی ہی خدمت کرتا رہے اور ایسا ہی آستانہ بوس اور دلدادہ
بنا رہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو امتحان کا موقع ہی صرف یہ ہے کہ بے رُخی برت کر بلکہ غصہ
و عتاب کی صورت دکھا کر آزمایا جائے کہ اب مدعیٔ محبت کا کیا رنگ ہے۔ کیونکہ کسوٹی ہی
بتا سکتی ہے کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اذہان نے اس کو پہلے سے
قبول کیا ہوا ہے کہ عتاب الٰہی کسی بڑی خطا کی سزا ہے۔ اور اس لئے جس وقت بھی ہم
حق تعالیٰ کے عتاب کا لفظ سنتے ہیں تو ذہن اس جُرم و خطا کی تلاش میں دوڑنے لگتا
ہے۔ اور پھر عصمت سے اس کا تزاحم ہوتا ہے تو تاویلوں کا دروازہ کھلتا اور پھر
ساتھ ہی ساتھ شبہات و شکوک کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ذرا دیر کے
لئے اس سے خالی الذہن ہو جائیں گے تو انشاء اللہ واضح ہو گا کہ حق تعالےٰ کا برتاؤ
اپنے محبوبین کے ساتھ جُدا ہے اور مبغوضین کے ساتھ جدا۔ عوام کے ساتھ جُدا ہے
اور خواص کے ساتھ جُدا۔ خود عذاب جہنم جو سب سے بڑی سزا ہے کفار کے لئے تعذیب
ہے۔ مگر گناہ گار مؤمنین کے لئے تہذیب و تصفیہ یعنی سونے کا میل کچیل صاف
کرنے کے لئے تپانا ہے کہ دخول جنت کے قابل ہو جاویں۔ گویا دشمنوں کے لئے
جو شے سزا و نقمت ہے وہی دوستوں کے لئے رحمت اور نعمت ہے۔ اسی طرح دنیوی

تکالیف بمقتضاء مَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ ۵ گناہ گاروں کے لئے پاداش ہے بداعمال کی، اور اولیاء کے لئے یہی لطف الٰہی اور سبب ترقی درجات ہے فقر و تنگدستی محجوبین کے لئے سبب کفر ہے اور مقربین کے لئے وہی موجب فخر و سبب تبتل الی اللہ۔ طاعون ایک عذاب دنیوی ہے اللہ کی طرف سے، مگر صرف طلحاء کے لئے اور یہی صلحاء کے لئے شہادت و پروانۂ مغفرت ہے۔ اسی طرح عتاب خداوندی عوام کے لئے بے شک ثمرۂ خطاء معصیت ہے کہ ان کے قلوب میں ظلمت ہے لہذا ان کے افعال میں بھی ظلمت ہے۔ مگر خواص یعنی انبیاء معصومین کے لئے ثمرۂ خطا نہیں بلکہ امتحان ہے اُن کی محبت کا کہ مستجاب الدعا اور مطاع قوم بن کر شان محبوبیت ظاہر کی ہے، تو بے رخی پر تڑپن اور گریہ وزاری دکھا کر محبت کا سماں دکھائیں۔ اور تکمیل ہے تبلیغ کی کہ رجاء و رحمت الٰہیہ کا عملی نمونہ دکھایا ہے، تو خوف اور سخط الٰہی کا بھی عملی نمونہ پیش کریں تاکہ مخلوق کو معلوم ہو کہ اللہ سے اور اُس کے عذاب سے ڈرنے کی حقیقت کیا ہے۔ نیز اصلاح و ہدایت ہے اُمت اجابت کے لئے کہ واضح ہو جائے کہ صاحبان معجزات و ہادیان دنیا خاصان خدا ہیں خود خدا نہیں۔ اور خاص انعام و لطف ہے انبیاء معتوبین کے لئے تاکہ اُن رحمتوں سے مستفیض ہوں جو مخفی ہیں اسی تڑپن اور آہ و زاری میں، کہ بچہ کے بلبلانے پر ماں کی چھاتیوں کے دودھ میں جو اُبال آتا ہے وہ اس کے لاڈ پیار اور تبسم و سرور کے وقت کبھی نہیں آتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ عتاب کے بعد جو ثمرات ہوتے ہیں وہ تقرب و مقبولیت عنداللہ کے بڑھانے والے اور دین و دنیا دونوں میں موجب برکات و ترقیات ہوتے ہیں۔ جنگ بدر میں ستر سرداران قریش قتل ہوئے جن کی لاشیں قلیب بدر میں پھینک دی گئیں۔ اور ستر گرفتار ہوئے جن کو قیدی بنا کر مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا گیا۔ اگلے دن سرور عالم صلی اللہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ان کو مالی فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کیا جائے۔ حضرت صدیقؓ اور اکثر صحابہ کی رائے اس جانب تھی کہ فدیہ قبول کر لیا جائے اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں کو سامانِ حرب کی زیادہ ضرورت ہے۔ مال سے اسلام کو قوت پہونچے گی اور ممکن ہے کہ اسیران جنگ جان بخشی پر از خود مُسلمان ہو جائیں۔ اور اگر پھر بغاوت کریں گے تو جس خدا نے آج ان کو مغلوب بنایا ہے وہی کل کو ہماری مدد فرمائے گا۔

مگر حضرت عمرؓ اس جانب تھے کہ ہمیں ان کے بارے میں نرمی نہ کرنا چاہیئے۔ ہر شخص اپنے عزیز کی گردن اُڑائے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ اسلام پر کس قدر پختہ ہیں۔ ہمیں اللہ و رسول کے مقابلہ میں اپنے عزیزوں کی بھی پرواہ نہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ رحمۃ للعالمین تھے اس لئے آپ کا میلان خاطر صدیقی رائے کی طرف ہوا۔ اور تمام قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ قتل پر مال دنیا کو ترجیح دینا مناسب نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ قیدیوں کا رہا کرنا اور فدیہ لینا اسلام ہی کے مصالح پر مبنی تھا۔ مال کی طرف رغبت بھی ہوئی تو تقویت اسلام کے لئے۔ پھر مسئلہ اجتہادی تھا کہ پہلے کوئی حکم نہ تھا جس کا خلاف ہوا ہو۔ بلکہ مشورہ ہی پر چھوڑا ہوا تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عتاب کا سبب خطا کو قرار دیا جائے اور فدیہ لینے میں نقائص ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز دوسرے پہلو یعنی انجام و نتیجہ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بھی برکات سے لبریز نظر آتا ہے۔ کہ جو رقم فدیہ میں آئی وہ کارہائے خیر اور صدقات جاریہ میں صرف ہوئی۔ اور جتنے قیدی رہا کئے گئے وہ سب مشرف باسلام ہوئے۔ یعنی ایک متنفس بھی اسلام لانے سے محروم نہ رہا اگر یہ فدیہ لینا خطا و جرم تھا تو اللہ کی ناراضی سے حاصل کئے ہوئے مال کا اوّل تو استعمال ہی جائز نہ ہوتا اور اگر چشم پوشی بھی برتی جاتی تو اس میں برکت کبھی نہ ہوتی۔ اسی طرح جن نفوس کی جاں بخشی پر حق تعالیٰ کی ناخوشی ہوئی ہو وہ اول تو چین سے زندگی نہ گزار سکتے۔ اور اگر اس بارہ میں مسامحت بھی ہوتی تو اسلام کی توفیق ہرگز نہ ہوتی۔ بہرحال ابتداء اور انتہا دونوں بتا رہے ہیں کہ عتاب نہ خطا کی سزا میں ہے اور نہ گرفت کسی جرم کے ارتکاب پر، بلکہ انعام کی تکمیل ہے کہ اسی جنگ بدر میں دنیا کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت دکھائی آسمانی فوج کے پانچ ہزار فرشتوں کا لشکر اُتار کر۔ کہ تین سو تیرہ مسلمانوں کو فتح مبین نصیب ہوئی۔ ایک ہزار کافروں پر۔ اب دنیا کو آپ کی محبت دکھائی جائے فدیہ لینے پر گرفت و عتاب کا رنگ دکھا کر اور زار و قطار رلا کر تاکہ دوبارہ ابر رحمت میں جوش آوے اور لئے ہوئے اموال اور چھوڑے ہوئے نفوس کو خیر مجسم اور وسیلہ خیرات بنایا جائے۔ کہ ان کی نسل میں لاکھوں مسلمان اور ان کی تبلیغ و تعلیم سے تاقیامت کروڑہا مومنین

صالحین پیدا ہوں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت عتاب کے نزول پر روئے اور جب حضرت عمر سامنے آئے تو فرمایا اگر آج اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا تو بجز عمر کے کوئی نہ بچتا۔ وہ محبوب پیغمبر جس کے بستی میں ہوتے ہوئے کافروں پر عذاب نازل نہ ہو آج اللہ کی بے نیاز ذات سے خائف ہو کر یوں کہتا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب نازل ہوتا تو میں بھی نہ بچتا۔ یہ ہے وہ کمالِ عبدیت جس پر محبوب کی طرف سے رحمت کی بارشیں ہوا کرتی ہیں۔ تمامی انبیاء علیہم السلام کی کم وبیش یہی شان ہے کہ مختلف صورتوں پر بصورت عتاب ان کا گریہ و اضطراب جانچا گیا ہے اور پھر جدید و مزید نعمتوں سے ان کو نوازا گیا ہے۔ اسی قبیل سے سیدنا یونس علیہ السلام کا یہ قصہ ہے کہ حسب عادت انبیاء آپ نے اپنی قوم کی اصلاح و فلاح میں مدتوں کوشش کی۔ مگر قوم اپنی ضد سے باز نہ آئی تو تنگ آکر آپ نے بددعا فرمائی۔ چنانچہ عذاب نازل ہوا۔ مگر سروں سے کچھ اوپر پہنچ کر تھم گیا کہ اس میں امتحان کے متعدد مصالح مضمر تھے۔ سیدنا یونس علیہ السلام کو طبعی خوف یا موت کا ڈر نہیں کہ یہ تو اولیاء کو بھی کم ہوتا ہے۔ بلکہ عذاب الٰہی سے ڈر لاحق ہوا کہ اللہ کا عذاب واقعی ڈرنے کی چیز ہے۔ خصوصاً عارف کے لئے کہ جتنی معرفت سطوت الٰہیہ زیادہ ہوگی اسی قدر عذاب الٰہی سے دور بھاگے گا۔ ادھر قوم پر غصہ کہ جلد ہلاک ہوں اس کا مقتضی تھا کہ جب تک نبی اپنی قوم میں رہتا ہے اس پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بستی سے خود باہر تشریف لے جاویں تو مانع عذاب ستون علیحدہ ہو۔ چنانچہ روانہ ہو گئے اور فوراً آپ کا وہ امتحان شروع ہو گیا جو ہمیشہ حضرات انبیا کا ہوتا رہا ہے کہ گرفت ہو گئی یہاں سے قدم کیوں ہٹایا؟ اچھا یہ سمجھا کہ بستی سے باہر قابو نہ پا سکیں گے۔ اور لفظی ہی گرفت نہیں بلکہ عملی مواخذہ بھی ہوا کہ آپ کو مچھلی کے پیٹ میں پہونچا یا گیا اور آپ کی قوم کا ایمان قبول فرما کر آیا ہوا عذاب اُن سے اٹھا لیا۔ یہ دنیا میں پہلا موقع تھا کہ نازل شدہ عذاب واپس ہوا۔ اور یہ بھی پہلا ہی واقعہ تھا کہ خطاوار قوم نے رہائی پائی اور جس معصوم کی بددعا سے اُن پر عذاب آیا وہ خود پکڑے گئے۔ مگر چونکہ صورت عتاب و گرفت میں پیار اور رحمتیں مضمر تھیں اس لئے حضرت یونس علیہ السلام پر وہ گریہ و زاری طاری ہوئی کہ حقیقی خطاوار پر اس کا عُشر بھی

طاری ہو جائے تو ولی بن جائے لہذا یہ قصہ اتنا منتج حسنات ہوا کہ قیامت تک ہونے والے مومنین کو بارگاہ احدیت سے وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ کا پروانہ عطا فرمادیا گیا اور تجربہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا ورد سخت مشکلات میں سبب کامیابی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲۱) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ وہی اللہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اُسے تمامی ادیان پر غالب کرے اگرچہ مشرکوں کو بُرا لگے۔ میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ دین اسلام کو تمامی ادیان پر غلبہ بخشنے سے کیا مُراد ہے۔ آیا ناسخ ہونے کے لحاظ سے غلبہ مُراد ہے، یا حجّت ودلیل کے واضح ہونے کی حیثیت سے، یا اور کسی اعتبار سے؟ فرمایا کہ اس دین مقدس کو حق تعالیٰ نے تمامی ادیان پر ہر وجہ سے غلبہ بخشا ہے۔ ناسخ ہونے کے لحاظ سے بھی، اور وضوح حجّت ہونے کے اعتبار سے بھی، اور سطح زمین پر اس کی کثرت کے لحاظ سے بھی، کہ اہل اسلام کی شمار کے سامنے دوسرے اہل مذاہب بمنزلہ نہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے جس کی چشم بصیرت کھول دی ہے اور اُس نے سطح زمین کے آباد اور غیر آباد مقامات کو دیکھا ہے تو اس کو ہر جگہ ایسی جماعت نظر آئی ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ دین محمدی پر ہیں کہ زمین بحمداللہ ان حضرات سے آباد ہے۔ دارالاسلام میں بھی موجود ہیں اور دارالکفر میں بھی۔ غاروں میں، پہاڑوں میں، بنوں میں، بیابانوں، بستیوں میں جنگلوں میں غرض ہر جگہ موجود ہیں۔ ایک خصوصی شان اس دین اسلام کی خدا ہمیں اس میں شامل رکھے یہ ہے کہ اس میں ایک نور ہے جو امت مرحومہ کو ارتداد اور کفر کی طرف جانے سے مانع ہے اور یہ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کی وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ کو آپ کے ساتھ خاص محبّت ہے۔ لہذا آپ کے دین میں بکثرت ایسی خصلتیں جمع فرمادی ہیں کہ ان کا مجموعہ آپ کی اُمّت کے لئے ارتداد سے مانع ومحافظ بن گیا ہے۔ برخلاف دیگر مذاہب کے کہ ان میں ارتداد سے بچانے والی خصلتیں پوری نہیں آئیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جس نے لوح محفوظ کو دیکھا اور اُس میں حضرات انبیاؑ

اور اُن کی شریعتوں پر جو اس میں مکتوب ہیں نظر ڈالی ہے تو اس کو شریعت محمدیہ کا (تا قیامت) بقا اور امت محمدیہ کا عدم ارتداد (کہ ساری امت کفر کی طرف دوسری امتوں کی طرح کبھی نہ لوٹ سکے گی) معلوم ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اوّل پیدا فرمایا نور اور ظلمت کو۔ اس کے بعد پیدا فرمایا بندوں کو اور امتوں کو پھر نور کے بھی متعدد دروازے رکھے کہ اُن کے راستے وہ ظلمت بندوں کی ذات پر داخل ہو۔ اس کے بعد شریعتیں بنائیں اور وہ پیغمبروں کو عطا فرما کر دُنیا میں بھیجیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ نور کے دروازے کھلیں اور ظلمت کے دروازے بند ہوں۔ یعنی اوامر (مثلاً نماز روزہ وغیرہ) کے کرنے سے نور کے دروازے کھلتے ہیں۔ اور نواہی (مثلاً زنا سرقہ کذب وتکبر وغیرہ) سے بچنے پر ظلمت کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ اور یہ اوامر و نواہی جس کثرت اور تفصیل کے ساتھ شریعت محمدیہ میں آئے ہیں کسی دوسری شریعت میں نہیں آئے۔ یہی وجہ ہے شریعت محمدیہ کے تمامی سابقہ شریعتوں سے بالا و بہتر ہونے کی۔ اور یہی وجہ ہے امت محمدیہ کے تمامی گزشتہ امتوں سے افضل و برتر ہونے کی۔ اور اسی کی طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اس ارشاد میں کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہو گی۔ نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اہل مشاہدہ نے جب امم سابقہ پر نظر ڈالی اور جن بستیوں میں وہ اپنے زمانہ میں رہا کرتے تھے ان پر نگاہ کی ہے تو ان کی بستیوں کے اوپر دھوئیں کی طرح ایک سیاہ بادل چھایا ہوا نظر آیا ہے کہ آہستہ آہستہ اترتا ہے اور باشندے اپنا دین چھوڑتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اُن پر آ گرتا ہے اور ان کی ذات اس سے سیراب ہو جاتی ہے اور سب کے سب اپنے دین سے خارج نظر آتے ہیں۔ اور پھر کبھی ان کو ہدایت بھی نہیں ہوتی۔ دین اسلام کے دیگر ادیان پر غالب ہونے کی ایک وجہ منجملہ دیگر وجوہات کے یہ بھی ہے۔

ف۔ دُنیا بھر کے مذاہب میں کسی کو بھی لے لیجئے بجز چند ما مورات اور چند منہیات کی مختصر فہرست کے جن کو پڑھنے والا چند گھنٹوں میں سیکھ لے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر شریعت محمدیہ کے دریائے ناپیدا کنار پر نظر ڈالئے تو علم

علم کلام وعلم فقہ وعلم تصوف تینوں کی ضخیم کتابیں اسی فہرست ماموارت ومنہیات سے بھری ہوئی ہیں کہ آغوش مادر میں آنے کے وقت سے لے کر آغوش لحد میں جانے تک انسانی زندگی کا کوئی فعل کوئی قول کوئی حرکت کوئی سکون ایسا نہیں چھوڑا جس میں یہ ظاہر نہ فرمادیا ہو کہ اس کو کرنا چاہیئے اور اس سے بچنا چاہیئے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں چھوڑا جس میں یہ ظاہر نہ فرمادیا ہو کہ اس کو کرنا چاہیئے اور اس سے بچنا چاہیئے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ماموارت میں فرض، واجب، سنّت، مستحب، چار درجے قائم فرما کر نور کی مقدار بھی بتادی کہ کر لو بہتر ہے، کرو، ضرور کرو، ضرور، بالضرور کرو، اسی طرح منہیات میں حرام، مکروہ تحریمہ، اور خلاف اولی کے تین درجہ قائم فرما کر ظلمت کی مقدار ظاہر کردی کہ اچھا ہے نہ کرو، ہرگز نہ کرو، ہرگز ہرگز پاس نہ پھٹکو۔ اوّل ایمان کے پانچ اجزا کیئے۔ عقائد۔ عبادات۔ معاملات اخلاق، معاشرت، اور ہر ایک کے ماتحت صدہا ابواب وفصول۔ کہ عقائد ذات بحث متعلقہ صفات الٰہیہ متعلقہ رسالت وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر ایک میں ثقیلہ وخفیفہ کے دو درجے ہیں۔ عبادات میں ارکان اربع کی تفصیل اتنی لمبی ہے کہ عمر ختم ہو جاتی ہے مگر فہرست پوری یاد نہیں ہوتی۔ شرائط الگ ہیں ارکان جدا۔ مستحبات الگ ہیں واجبات جُدا۔ مکروہات الگ ہیں اور مفسدات جُدا۔ پھر سَر سے لے کر پاؤں تک بدن کا کوئی عضو کیوں نہ ہو ہر ایک کے لیئے خاص عبادت ہے جس کا وہ مامور ہے اور خاص معصیت ہے جس سے وہ روکا گیا ہے۔ معاملات کی فہرست تو اس سے بھی بیش از بیش ہے کہ بادشاہ سے لے کر بھیک منگے فقیر تک جس طبقہ کا جو شخص بھی اپنی گزران کا کوئی طریق اختیار کیئے ہوئے ہے یا کر سکتا ہے خواہ تجارت ہو یا زراعت، اور حرفت ہو یا صنعت، اور پھر ہر ایک کے ماتحت صدہا اقسام ہیں مگر کوئی ایک معاملہ بھی ایسا نہیں جس پر شریعت نے امر یا نہی مرتب نہ فرمادی ہو۔ پھر اخلاق میں تخیلات وشمائل اور عادات وخصائل کا کوئی پہلو ایسا جس کو اندراج فہرست سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ بلکہ صرف بتادینا ہی ذمیمہ سے بچنے کی تدابیر اور حمیدہ سے آراستہ ہونے کا طریق بھی تعلیم کیا ہے۔ اسی طرح معاشرت میں دنیا کے ہر باشندے بلکہ حیوانات ونباتات اور جمادات غرض تمامی مصنوعات عالم کے ساتھ جس قسم کا بھی برتاؤ انسان کر سکتا ہے ایک بھی ایسا نہیں جس پر امر یا نہی کا حکم لگانے میں فروگزاشت ہوئی ہو۔ اور متحیر العقول

کمال یہ ہے کہ موجودات و واقعات ہی نہیں بلکہ فرضیات تک کی بھی یہی تفصیل ہے کہ انسان کا متخیلہ محال سے محال چیز ذہن سے اختراع کرتا ہے، مگر ناممکن ہے کہ شریعت محمدیہ اس پر جواز یا عدم جواز کا حکم نہ لگائے ۔ درحقیقت شریعت محمدیہ کا یہ دائرۂ فتح الواب نور وسد الواب ظلمت اتنا وسیع ہے کہ امت محمدیہ کے دس بیس افراد نہیں بلکہ اوّل اس کے تین حصّے بنائے ۔ کلام و فقہ و تصوف اور ہر حصّہ کو جُدا گانہ فن قرار دے کر ہزار ہا افراد کی جماعت نے اس کی تفصیل کا بار اپنے سر لیا ہے اور وفات محمدیہ سے اب تک اس کی شرح کرتے چلے آتے ہیں ۔ مگر پورا نہیں کر سکے دنیا بھر کے مذاہب کی تمامی فہرست ہائے امر و نہی کو جمع کر کے اسلامی فہرست سے مقابلہ کرو تو ایک کا کروڑواں حصّہ بھی نہیں بن سکتا ۔ مگر افسوس ہے ہم احسان فراموش امتیوں پر کہ یہی حلال و حرام کی تفصیل جو شریعت محمدیہ کا مایۂ ناز ہے ۔ ہماری نظر میں زنجیریں ہیں اور اس کو مذہبی عسر و سخت گیری سمجھتے ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امتیازی شان کو تفصیل سے دیکھنا چاہو تو میرا رسالہ ماہتاب عرب دیکھو ۔

(۲۲) وَمَا يَكُونُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ط اور ہمیں شایان نہیں کہ اس (طریقہ کفر) میں لوٹ جائیں ۔ البتہ ہمارا پروردگار اللہ ہی اگر چاہے (تو ہم مجبور ہیں) میں نے دریافت کیا کہ سیدنا شعیب علیہ السلام کا یہ استثناء فرمانا کیسا جب کہ یہ شک اور حالت موجودہ استقلال نہ ہونے کو مقتضی ہے ۔ فرمایا یہ (مشیت الٰہیہ پر محمول کرنا) محض رجوع الی اللہ ہے ۔ اور یہی خالص ایمان ہے ۔ کیونکہ اہل مشاہدہ خصوصاً رسل و انبیاء دیکھتے ہیں کہ ان میں اللہ ہی کا فعل کام کر رہا ہے اور اپنے اندر ذاتی طور پر نہ کسی کام کی طاقت سمجھتے ہیں نہ باز رہنے کی قوت ۔ اور جو کچھ بھی ان کی ذات پر ظاہر ہو رہا ہے وہ سب اللہ پاک ہی کی طرف سے ہے ۔ پس ایسی حالت والا شخص جب اللہ کی مشیت پر کوئی فعل محمول کرے تو ظاہر ہے کہ دریائے معرفت میں غرق ہے (اور ایمان ہو یا کفر سب پر اللہ کی قدرت و مشیت کو غالب سمجھتا ہے) ۔

(۲۳) اہل اعراف کے بارہ میں آپ نے فرمایا کہ وہ بڑے مرتبہ والے اہل مشاہدہ حضرات ہیں جیسے فلاں غوث اور فلاں قطب ۔ جنت میں اُن کے لئے اونچے اونچے محل ہونگے جیسے ہمارے شہر فاس میں اونچا منارہ ہے کہ اس پر چڑھ کر جھانکتے ہیں تو نیچے کی آبادی سب

نظر آتی ہے۔ ان کے منازل عالیہ ہی کا نام اعراف ہے۔ (امام جلال الدین نے اہل اعراف کے متعلق بدور سافرہ میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں منجملہ اُن کے یہ قول بھی ہے کہ وہ حضرت حمزہؓ و دیگر شہداء ہیں) واللہ اعلم۔

(۲۴) وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ اور ذکر کرو ایوب کا جب کہ انہوں نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھے آ چھوا تکلیف نے (اسے دور فرما دیجیے) اور آپ سب سے زیادہ مہربان ہیں؛ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ تکلیف کیا تھی جو حضرت ایوب علیہ السلام کو پہونچی۔ اور مفسرین نے حضرت ممدوح کے مرض کی بابت جو کچھ لکھا ہے (کہ فساد خون اور بدن کے ہر حصّہ میں زخم وغیرہ ہو گئے) کیا وہ صحیح ہے؟ اور ایسے ہی آپ کے مرض کا امتداد (کہ مدّت دراز تک رہا) کیا دُرست ہے؟ چنانچہ علامہ ابن حجر نے الفتح فی احادیث الانبیاء میں حالات سیدنا ایوب کی کی بحث میں جو بیان کیا ہے وہ سب میں نے سنا دیا۔ فرمایا وہ تکلیف جو سیدنا ایوب علیہ السّلام کو پہونچی توجہ الی غیر اللہ تھی۔ اور عارفین یعنی انبیاء و مرسلین کے نزدیک سب سے بڑی تکلیف یہی ہے اور اسی کے رفع ہونے کی حضرت ممدوح نے اپنے رب سے دُعا مانگی تھی۔ نہ کہ بدنی تکلیف کی کہ وہ تو بندہ کو اللہ کا مقرب بناتی ہے۔ ہاں التفات الی ماسوی اللہ (کہ خدا کو چھوڑ کر دوسری طرف توجہ و دھیان جائے) اور اللہ سے ایک لحظہ کی بھی بے تعلقی بے شک اللہ سے دور کرنے والی تکلیف ہے۔ رہا وہ مرض جس کا تذکرہ مفسرینؒ مورخین نے کیا ہے آپ کو مطلق نہیں ہوا۔ اور مدت مرض بھی صرف دوؔ مہینہ اور چند روز ہے۔ (پس جسمانی مرض کے رفع ہونے کی آپ نے دعا نہیں مانگی کہ وہ تو سبب قرب خدا ہے۔ البتہ اس تکلیف بدنی میں جب اس کا اندیشہ ہوا کہ خیال بٹے گا اور علاج و تدبیر وغیرہ کی طرف دھیان جائے گا تو اُس کے رفع ہونے کی دُعا ضرور مانگی تھی۔ خواہ وہ اس طرح مانگی جائے کہ جسمانی مرض ہی نہ رہے جو سبب ہے دھیان بٹنے کا۔ یہ مرض بدستور ہے مگر توجہ الی اللہ میں فرق نہ آوے اور دھیان دوسری طرف نہ جائے) واللہ اعلم۔

(۲۵) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ اور جو بے رُخی کرے گا میری یاد سے تو اُس کی معیشت تنگ

ہوگی اور ہم اس کو حشر کے دن اندھا اُٹھائینگے۔ میں نے عرض کیا کہ اس تنگی معیشت سے کیا مُراد ہے؟ اگر تنگ دستی مُراد ہے تو مشاہدہ کے خلاف ہے کہ بہتیرے کفار مالدار ہیں اُن کی معاش فراخ ہے نہ کہ تنگ۔ اور آیت شریفہ چاہتی ہے کہ جو بھی ذکراللہ سے بے رُخی برتے اس کی معاش تنگ ہو۔ فرمایا کہ ذاتِ انسانی کو آخرت میں جو صورت پیش آتی ہے قلب پر اس کا ورود دُنیا ہی میں ہونے لگتا ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے کفار کے لیے ہمیشہ جہنم میں رہنا مقدور فرمایا ہے اس لئے یہاں دُنیا میں اس ایک گھڑی بھی ایسی نہیں گزرتی کہ اس کے قلب پر تکدر اور بوجھ نہ رہتا ہو۔ ہر وقت وسوسے آتے رہیں گے۔ اور ان وساوس اور خطرات سے اس کی طبیعت مکدر و مغموم رہے گی۔ کم سے کم یہ وسوسہ ضرور رہے گا کہ ممکن ہے تیرا مذہب صحیح اور طریق صاف نہ ہو۔ پس یہ ہے وہ بات جو حق تعالیٰ کفار کے دلوں میں ڈال دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے (سکون قلب اور انبساط طبع ایک لحظہ کے لیئے بھی نصیب نہیں ہوتا) اگرچہ کتنے ہی دولتمند بلکہ بادشاہ کیوں نہ بن جاویں۔ غرض تنگی گزران سے مُراد قلوب میں تنگی و ضیق ہے نہ کہ ہاتھ کی تنگی۔ کہ ایک شخص کے ہاتھ میں کتنی ہی دُنیا وسیع کیوں نہ ہو مگر اسے علم ہو کہ انجام کار جہنم میں جانا ہے تو اس کی زندگی مکدر ہے اور وہ ضیق و تنگی میں ہے۔ حضرت ممدوح نے بڑی پیاری بات فرمائی۔ علامہ بیضاوی نے بھی تنگی گزران کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ کفار کا سارا فکر و اہتمام اور مطمح نظر چونکہ دُنیا اور اس کا مال و متاع ہے کہ اُس کے بڑھانے میں بلا پڑتا اور اس کی کمی کے اندیشہ سے مرا جاتا ہے اس لئے ہر وقت اس کی زندگی ایک ضیق اور تنگی میں گزرتی ہے۔ برخلاف مومن کے کہ اس کو آخرت کی طلب ہے۔ اس لئے سکون نصیب ہے۔

ایک عالم سات برس تک عیسائیوں کے ہاتھوں میں قید رہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ طویل مدت میری اُن کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ ہی میں گزری اور میں نے خوب ہی اُن کو جانچا اور اُن کے خیالات کو ٹٹولا۔ مجھے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ ان کے اکثر افراد کو اپنے مذہب کے متعلق شک و شبہ ہے اور اسی قلبی مرض کے سبب ان کی حالت کھجلی کے مریض کی سی ہے کہ کھجانے والے کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ شخص بیمار قلب ہے طالب علم کی تلاش میں رہتا ہے اور جہاں اس کو پالیتا ہے اس سے مباحثہ شروع کر دیتا ہے۔

(کہ وہ اس کی قلبی خارشت کو کھجائے اور اس کو رگڑ کر ذرا آرام پہونچائے) پھر نتیجہ اس سے زائد کچھ نہیں نکلتا کہ ذرا سی تقریر پر جال میں آپھنستے ہیں اور نکل نہیں سکتے۔ یہ تو متوسط درجے کے لوگوں کی حالت ہے۔ رہے وہ لوگ جو اُن میں بڑے سمجھے جاتے اور پادری کہے جاتے ہیں، بہتیرے مناظروں کے بعد مجھے پورا تجربہ ہوا ہے کہ وہ تو یقین اور وثوق کے ساتھ اپنے آپ کو گمراہی اور باطل پر سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی ایمان نہیں لاتے جس سے قدرت ظاہر ہوتی ہے اللہ کی کہ جو کام جس سے چاہتا ہے لیتا ہے اور اس کا حکم سب پر غالب ہے۔ چونکہ مجھے مناظرہ سے دلچسپی تھی اسلئے ایک دفعہ پتہ لگا کہ فلاں مقام پر ان کا بڑا پادری ہے جو کتب سابقہ کا منتہی ہے چنانچہ میں اس کے پاس پہونچا تو واقعی اس کو دریائے ناپیدا کنار پایا کہ توریت انجیل، زبور قرآن مجید اور اکثر احادیث جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب اس کو مستحضر تھیں اور (عرب کے مشہور شاعر) امرا القیس کندی کے اشعار بھی اس کو خوب یاد تھے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ میرا آنا آپ کی خدمت میں ایک بات دریافت کرنے کے لئے ہوا ہے جس نے مجھے نہایت پریشان بنا رکھا ہے کہ نہ رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو قرار ملتا ہر وقت ایک کھٹکن رہتی ہے۔ اس پر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ وہ کون سی بات ہے؟ میں نے کہا کہ جب تک میں اپنے ملک یعنی بلاد اسلام میں رہا تو یہی سنتا رہا کہ مذہب اسلام حق ہے اور نصاریٰ کا مذہب باطل ہے۔ مگر جب سے تمہارے ملک میں آیا ہوں تو معاملہ ہی پلٹ گیا۔ یہاں ہر جگہ یہی سنتا ہوں کہ نصاریٰ کا مذہب حق ہے اور اسلام باطل ہے۔ غرض میں نے اس پر یہ ظاہر کیا واقعی مجھے مذہب کے بارے میں شبہ پڑ گیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ میں نے بڑے بڑے پادریوں سے دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق آپ ہی کا پتہ بتایا اور دو شخصیتوں نے بھی اس بارہ میں اختلاف نہیں کیا کہ آپ سب سے بڑے پادری اور اپنے مذہب کے متجر و محقق عالم ہیں۔ اور اللہ پاک نے جاہل پر فرض کیا ہے کہ عالم سے پوچھے اور عالم پر فرض کیا ہے کہ جاہل کو بتائے اور واقف بنائے۔ اس وقت میں صرف اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے اس مسئلہ کا تسکین بخش جواب دیں اور آپ کے نزدیک جو حق ہو وہ صاف صاف ظاہر فرمائیں۔ تاکہ آپ کے جواب کو بروز قیامت اپنے اور پروردگار کے

درمیان حجت قرار دوں (اور عدالت عالیہ میں پیشی کے وقت آپ کا نام لے کر عرض کر سکوں کہ فلاں شخص نے مجھے حق یہ بتایا۔ لہٰذا میں نے اس کو اختیار کر لیا) کیونکہ میں ناواقف ہوں اور آپ واقف ہیں اور ناواقف پر لازم ہے کہ واقف سے سوال کرے اور واقف پر لازم ہے کہ اللہ واسطے مخلوق کی خیر خواہی کرے اور جو بات اس کے نزدیک واقعی حق ہو اس کو بے رُو رعایت بیان کر دے۔ میری تقریر اُس کے دل میں اُتر گئی اور اچھا خاصا اثر کر گئی۔ اس وقت نصاریٰ کا ایک مجمع اس کے پاس بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیا اور دیر تک بالکل خاموش رہا۔ آخر اُس نے سر اُٹھایا اور چپکے سے میرے کان میں کہا کہ "مذہب تو بس اسلام ہی ہے اور وہی حق ہے کہ اس کے سوا اللہ کے ہاں کوئی مذہب مقبول نہیں۔ مگر تم میرے پاس سے اُٹھ جاؤ اس سے قبل کہ ان نصاریٰ کو اس کا علم ہو جو میں نے تم سے کہا ہے"۔ اس سے حضرت ممدوح کے قول کی تائید ہو رہی ہے اور خود مجھے بھی ایک یہودی بڑے عالم سے مناظرہ کرنے کا اتفاق پیش آیا اور انجام کار کھل گیا کہ واقعی اس کو یقین ہے کہ اس کا مذہب باطل ہے۔ اور بجز عناد اور اپنی جماعت میں اندیشۂ رسوائی کے اور کوئی شے بھی اس کو اسلام لانے سے مانع نہیں ہے۔ اور یہ ایک بڑا مناظرہ تھا جو کئی دن تک رہا اور اس میں ہمارے بھی کثیر علماء و حفاظ موجود تھے اور اُس کی جماعت کے بھی بکثرت یہودی شریک جلسہ تھے۔ اسی طرح عیسائیوں کے ایک بڑے پادری سے میرا مناظرہ ہوا تو واقعی اُن کے پاس (بجز لن ترانی اور بد زبانی کے) ٹھکانے کی بات کچھ بھی نہ پائی۔ اس مبحث کو دیکھنا ہو تو تحفۃ الادیب فی الرد علی اھل الصلیب کا مطالعہ کرو جو عبداللہ میورقی نے لکھی ہے کہ عیسائیوں کے بڑے پادری تھے اور اسلام لے آئے تھے۔ اسی طرح عبدالحق اسلامی کی تالیف دیکھو کہ یہودی مذہب کے زبردست عالم تھے اور مشرف باسلام ہوئے تھے۔ اور رد نصاریٰ میں مولانا ابوالعباس قرطبی کی تالیف دیکھو جس میں عجائبات بھرے ہوئے ہیں اور اس کی ضخامت پچیس جز کے قریب ہے جس نے ان کتابوں کا مطالعہ کر لیا اور پھر اس کو عیسائی یا یہودی سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اُسے علم الیقین حاصل ہو گیا ہے کہ بے شک ان کے قلوب میں شک کا مرض اور اس کا یقین موجود ہے کہ وہ غلطی و گمراہی پر ہیں۔

ف ایک شخص کا اکلوتا بچہ دفعتاً مر گیا اور اس کے سامنے بے حد لذیذ بریانی پکا کر رکھو۔ اور ایک شخص کو مدتوں کی تمناؤں اور دعاؤں کے بعد حق تعالیٰ نے بیٹا دیا ہو اور اس کے سامنے روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھانے کے لئے رکھ دو اور اب دونوں سے پوچھو کہ کیا مزہ آرہا ہے؟ جو فرق ان دونوں میں ہے اس سے بدرجہا زیادہ فرق کافر اور مسلمان کے تمتعات دنیا میں ہے۔ پس اگر لذت کا مدار قلب کے سرور اور دلی فرحت پر ہے تو مومن کی صورۃً "تنگی و عسرت درحقیقت وہ پیاری گزران ہے جس پر غبطہ و رشک ہونا چاہیئے۔ اور کافر کا صورۃً یسر و غنا درحقیقت" تنگ گزران ہے جس پر قلق اور ترس آنا چاہیئے۔ اگر حضرت ابرہیم بلخی کو شاہانہ گزران سے زیادہ مزہ فقیرانہ گزران میں نہ آتا تو کبھی کے بلخ واپس آ لیئے ہوتے۔ اور کفار کے لیئے اس دلی کلفت کا سبب جس طرح ان کے قلبی امراض یعنی شبہات و شکوک ہیں جیسا کہ حضرت شیخ نے فرمایا ہے، یا ان کا دنیا پر مٹنا اور بے حد گرویدگی سے اس پر گرنا اور رکھینا ہے جیسا کہ علامہ بیضاوی نے بیان فرمایا ہے اسی طرح ایک اور سبب بھی ہے جو لامذہب و آزاد محض ملحد اور تارک الدنیا راہبوں اور جوگیوں کو بھی شامل ہے وہ یہ ہے کہ ان کو اپنے دنیا میں آنے کا مقصود اور یہ کہ کہاں جانا اور رہنا ہے معلوم نہیں۔ اس لیئے ان کی طبیعت کا رنگ دنیا کے مزے اڑاتے وقت بھی ڈاکوؤں کا سا ہے کہ آباد شہر میں گھس کر تھوڑی دیر کے لیئے بہت کچھ کھاتے پیتے اور غپاڑہ مچاتے ہیں مگر ان کو خود پتہ نہیں کہ شہر میں انسان کیوں آیا کرتا ہے اور اب یہاں سے نکل کر ان کو جانا اور رہنا کہاں ہے۔ ان کی خانہ بدوش زندگی کے لیئے سیم و زر کے ڈھیر پلّہ داروں کے سر کا ایک وزنی بوجھ ہے جو اٹھائے نہیں اٹھتا۔ اور جو بوجھ سے سبکدوش ہے وہ بھی بے گھر اور بے سہارا ہونے کے سبب متحیر ضرور ہے کہ آخر یہاں آئے کیوں تھے اور اب جائیں گے کہاں یتیم بچہ اور بیوہ عورت جس کا دل مان چکا ہے کہ میرا کوئی سر دھر نہیں کتنا ہی اس کو جواہرات پر بیٹھا دو مگر وہ فقیرنی جو سہاگن ہے اور وہ بھوکا پیاسا بچہ جو اپنے باپ کی آغوش میں کروٹیں بدل رہا ہے اُن سے بدرجہا خوش اور پُر لطف زندگی گزار رہا ہے۔ یہ مومن کتنا ہی تنگ دست اور فاقہ زدہ حتیٰ کہ دشمن اس کو کتّے کے ساتھ بھی تشبیہ دیں تب بھی وہ گویا شکاری کتا ہے جس کے گلے میں پٹّہ ہے اس کے مالک کے ہاتھ میں ہے۔ اور کافر کتنا

خوش حال اور فربہ کیوں نہ ہو مگر چھوٹے ہوئے بجار کی طرح ہے جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث اور نہ گھر ہے نہ در۔ اگر حق تعالیٰ دونوں جانوروں کو گویائی بخشے تو لاغر و نحیف گنا فرحت کے ساتھ کہے گا ایک چوکھٹ پر پڑے رہنے سے جو سکون و اطمینان نصیب ہے اس کا مزہ دکھ اس پر ہزار نعمتیں قربان نہ ہوتیں تو کبھی کا رئیسوں کے ٹکڑوں پر جا پڑا ہوتا) میرے دل سے پوچھو۔ اور بجار کہے گا کہ سارے جنگلوں کی سیر و تفریح اور طرح طرح کی غذائیں سہی کہ جس کھیت یا باغ میں چاہتا ہوں منہ ڈالتا اور بھوک سے زیادہ کھاتا ہوں مگر صرف یہ کہ میرے لئے کوئی کھونٹا نہیں جس سے بندھ جاؤں اور کوئی مالک نہیں جس کے سہارے دن گزاروں ایسی دکھن ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کو ہر امر میں خواہ وہ عبادات ہوں یا عادات اور شادی ہو یا غمی زندگی کے ہر جزئیہ میں اپنے محبوب کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ تاکہ کسی حال بھی ان کی رسی مضبوط و محفوظ کھونٹے سے نہ کھلے اور لاوارث و آزاد بیوہ و یتیم کی سی دل شکستگی لاحق نہ ہونے پائے۔ الحاصل کافر زیادہ سے زیادہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے مزے اڑانے کے لئے آیا ہوں اور ظاہر ہے کہ دُنیا کے مزے بے شمار ہیں اس لئے رات دن ان کے پیچھے پڑا رہے گا اور کسی ایک جگہ بھی اس کو قرار نصیب نہ ہوگا۔ ایک ذائقہ چکھ لے گا تو دوسری رکابی پہ جائے گا اور اس کا مزہ لے لیگا تو تیسری پر۔ غرض اسی چکر میں رہے گا اور جتنے زیادہ مزے چکھے گا اسی قدر حرص اور طلب لذت بڑھے گی حتیٰ کہ مقصود پورا ہوگا نہیں اور طلب ہی طلب میں دم نکل جائے گا بقول ذوق ؎

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے

اور مومن کو دُنیا میں آنے کا مقصود بھی معلوم ہے اور یہ بھی کہ کہاں جانا ہے اور اصل قیام گاہ کیا ہے لہٰذا وہ دُنیا کو آخرت کا مزرعہ سمجھتا اور وثوق کے ساتھ جانتا ہے کہ زمین کی تمامی نعمتیں صرف اس لئے ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لئے تیار کرنے میں ان سے مدد لے لوں۔ نہ یہ بالذات مقصود ہیں اور نہ ان کی لذت کو پائداری نصیب ہے۔ حلق سے اُترا اور مزہ ختم ہوا۔ اس لئے بُرا ہو یا بھلا جہاں اس کو اتنا مل گیا کہ پیٹ میں ڈال کر کھڑے ہونے اور آقا کی خدمت انجام دینے کے قابل بن گیا وہیں سب سے منہ پھیر کر طاعت الٰہی میں مشغول ہو گیا اور ایسا مطمئن ہو گیا جیسے گھوڑے کو دانہ

کھلا کر اور پانی پلا کر سوار مطمئن ہو جاتا اور پاؤں پھیلا کر سرائے میں سو جاتا ہے کہ صبح کو اٹھوں گا تو منزل قطع کرنے کے لئے سواری کو چاق و چوبند پاؤں گا یہی اطمینان قلب جو مقصود صحیح متعین ہو جانے کے سبب قلب میں آیا ہے وہ پُر لطف زندگی ہے جس کو فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہی بے اطمینانی اور بے سہارے ایام گزاری وہ تنگی گزران ہے جو مَعِيْشَةً ضَنْكًا میں کفار کے لئے سزا تجویز کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ایک نور ہے اور اس کی روشنی میں چلنے والے کو راستہ کا ہر نشیب و فراز اور منزل مقصود کا مبداء و منتہا سب نظر آ رہا ہے اس لئے اس کا ہر قدم دلی اطمینان کے ساتھ اٹھتا اور قلبی سکون کے ساتھ پڑتا ہے۔ لہذا اس کا سارا سفر پُر لطف اور بشاشت کا ہے۔ اور کفر ایک ظلمت ہے اور اس کی تاریکی میں چلنے والے کی شان اندھے کی سی ہے کہ نہ اس کو سرائے کا پتہ ہے نہ منزل مقصود کا، نہ اس کو اپنی مقدار غذا معلوم ہے نہ اپنی سواری کی، نہ اسے دریا کا علم ہے نہ جنگل کا۔ باقتضاء حرارت عزیزیہ انجن کے پہیوں کی طرح چلتا ہے کہ بے اختیار چکر کھا رہا ہے اور گھس رہا ہے۔ بصارت کی طرح بصیرت کی بھی دو آنکھیں تھیں کہ ایک سے آخرت نظر آتی جو منزل مقصود اور اصل قیام گاہ ہے۔ اور دوسری سے دنیا نظر آتی کہ راستہ ہے منزل کا اور پل ہے دریا عبور کرنے کا۔ چوں کہ کفر کی تاریکی نے دونوں کو معطل و بے کار کر دیا اس لئے بروز قیامت اندھا بنا کر اٹھایا جائے گا کہ بصیرت کا حرمان اُس دن بصارت کے حرمان کی صورت قبول کر لے گا۔ اسی لئے آگے مذکور ہے۔ وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ اور وجہ بھی ساتھ ہی مذکور ہے۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ٥ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ٥ ہم اس کو بروز قیامت اندھا بنا کر محشر میں لائیں گے۔ وہ دریافت کرے گا کہ اے میرے پروردگار مجھے قبر سے اٹھتے وقت آپ نے اندھا کیوں بنا دیا حالانکہ (مرتے وقت) میری دونوں آنکھیں موجود تھیں۔ جواب ملے گا کہ ایسا ہی (تم نے برتاؤ بھی کیا تھا کہ بصیرت کی دونوں آنکھوں کو چٹ کر لیا تھا اور) ہماری نشانیاں (جن سے دنیا میں جانے کا مقصود اور اصل قیام گاہ اور عصمت انبیاء کے مسئلہ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ عزیز مصر کی بیوی جس کا نام زلیخا بتایا جاتا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو چکی تھی اس لئے اس کا قصد جو کچھ بھی تھا تو ظاہر ہے۔ مگر بحث اس میں ہوئی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس کے ساتھ کیا قصد تھا جس کو حق تعالیٰ شانہ نے وَھَمَّ بِھَا سے ظاہر فرمایا ہے۔ اکثر مفسرین نے وہی قصد مُراد لیا ہے جو زلیخا کا تھا اور صرف ارتکاب معصیت کو عصمت کے خلاف بتایا ہے۔ قصدِ معصیت کو نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فعل کا وقوع نہیں ہوا۔ مگر یہ جواب تو صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو فعل معصیت جس طرح عضو بدن کا جُرم ہے اسی طرح عزم معصیت قلب کا جرم ہے۔ اور جب قلب و بدن دونوں اللہ کے مخلوق اور مکلف ہیں تو جو بھی جرم کرے گا اس کی پاداش بھگتے گا۔ دوّم آیۃ شریفہ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ؕ سے پتہ چل رہا ہے کہ عدل تو اسی کو چاہتا ہے کہ وساوس وخطرات پر بھی مواخذہ ہو کہ ظلمت بہر حال ظلمت ہے۔ یہ بمنزلہ تخم کے ہے اور قلب پر خطرہ و قصد وعزم اس کے درخت کے ابتدائی و درمیانی وانتہائی تین زمانے ہیں' اور صدور معصیت اس کا پھل ہے۔ اور سزا کا مدار اسی ظلمت پر ہے۔ جو تخم معصیت ہے۔ مگر حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُمت محمدیہ کی کمزوری پر نظر فرما کر اس کو معاف کر دیا۔ اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا نازل فرمایا۔ پس فضل کو قانون عدل قرار دینا احسان فراموشی ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ فضل مخصوص اُمتِ محمدیہ کے ساتھ ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ دوسروں کے لئے وہ قانون بدستور ہے کہ قصد معصیت پر مواخذہ ہو گا۔ سوئم تمامی امتوں کے لئے بھی اگر یہ قانون ہوتا ہے کہ قصدِ معصیت پر مواخذہ نہیں تب بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع چاہتی ہے کہ اُن سے قصد پر ضرور گرفت ہو کہ مقربان را بیش بود حیرانی اور حسنات الابرار سیئات المقربین۔ چہارم عزم معصیت پر تو امت محمدیہ سے بھی مواخذہ ہو گا۔ مثلاً ایک شخص کا پختہ ارادہ ہے۔ کہ موقع پائے تو ضرور زنا کرے مگر اس کو موقع ہی نہ مل سکا تو اس عزم کو بحکم صدور سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسرف مالدار کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ مجھے روپیہ ملے تو میں ایسے ہی مزے اُڑاؤں۔ تو قیامت کے دن یہ اور مسرف جس نے حقیقتاً معصیتوں میں روپیہ پیسہ خرچ کیا جہنم کے ایک طبقہ میں ڈالے جائیں گے۔ اِسی طرح وہ نادار جو ایک صالح مالدار کو دیکھ کر

کہا کرتا تھا اگر مجھے حق تعالیٰ روپیہ عطا فرمائے تو میں بھی ایسے ہی کارہائے خیر میں صرف کروں، جنت کے ایک درجے میں رکھے جائیں گے اس سے مُراد وہی عزم اور ارادہ کی پختگی ہے۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ روپیہ نہ ملنا جو مانع ہوا منجانب اللہ ہوا۔ یہ دونوں جتنا اُن کے اختیار میں تھا۔ چونکہ پورا کر گزرے اس لئے گویا مسرف اور سخی بن چکے۔ پھر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصد معصیت کو محض اس لئے کہ صدور معصیت سے کیسے نکال سکتے ہیں۔ اور معصیت منافی ہے عصمت کے۔ یہ دیکھتے ہوئے محققین نے اس مقام کی جو توجیہات فرمائی ہیں ان میں قابل ذکر دو ہیں۔ اول یہ کہ هَمَّ بِهَا پر وقف صحیح نہیں ہے اور لَوْلَا اَنْ رَّاٰ ای شرط مؤخر ہے اور هَمَّ بِهَا جزاء مقدم ہے۔ آیت شریفہ کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی عورت کا قصد کرتے اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی دلیل کو جس کا حاصل یہ ہوا کہ رب کی دلیل چونکہ دیکھ لی تھی لہذا قصد بھی نہ ہوسکا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قصد صرف میلان کے درجہ میں تھا۔ جیسے شدید گرمی کے رمضان میں برف ملا ہوا شربت دیکھ کر روزہ دار کو میلان ہوتا ہے مگر روزہ توڑنے کا وسوسہ بھی نہیں گزرتا۔ اور لولا کی جزاء محذوف ہے۔ یعنی اگر آپ رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو یہ میلان ممکن تھا عزم کے درجے میں پہونچ جاتے۔ مگر چونکہ دلیل دیکھ لی تھی اس لئے میلان ہی میلان رہا جس میں بشر کے لئے خصوصاً جب کہ تمامی مؤیدات فراہم ہوں باقتضاء بشریت عذر قوی ہے۔ ہر دو توجیہہ میں نبی کے لئے عزم معصیت سے بھی عصمت ثابت ہوئی۔ اور میں نے بھی چالیس برس ہوتے قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت اسی توجیہ کو درج حمائل کیا ہے۔ مگر چند سال ہوتے از خود خلجان لاحق ہوا کہ عزم ہو یا میلان دونوں ثمرہ ہیں مادۂ طبیعت کے۔ جب حضرات انبیاء کی طبیعت فطرۃً نورانی ہے تو ناممکن ہے کہ ظلمت کا کوئی اثر پیدا ہو۔ ماں اور بہن کتنی ہی حسین اور کتنی ہی خلوت و تنہائی میں کیوں نہ ہوں بیٹے اور بھائی کی طبیعت اگر سلیم اور نظیف ہے تو ناممکن ہے کہ ان کی طرف میلان پیدا ہو۔ پھر نبی سے تو کیونکر ممکن ہے کہ نامحرم و اجنبیہ کی طرف میلان کر سکے۔ مادۂ رجولیت بے شک تقاضۂ بشریت ہے مگر اس کے ہیجان کے لئے محل اور موقع کی صلاحیت بھی تقاضۂ بشریت ہے۔

پتھر کی مورت یا اپنی متوفیہ بیوی کیسی ہی خوبصورت ہوں شباب میں بھرے ہوئے مرد کے لئے جاذب نہیں۔ ہاں ان ہی میں حق تعالیٰ روح ڈال دے تو اب میلان بلکہ عزم بلکہ صدور فعل سب متوقع ہے۔ اسی طرح نبی جس کی طبیعت و فطرت خالص نور ہی نور ہے اجنبیہ کی طرف میلان کہ مقتضاء ظلمت ہے کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ جس وقت یہ حرمت مبدل بہ حلت ہو جائے گی اور وہ بیوی یا شرعی باندی بن جائے گی تو میلان بلکہ فعل بھی ضرور صادر ہوگا۔ دوسرا شبہ جو اس کتاب ابریز کے مطالعہ سے روشنی میں آکر اس کا مؤید ہوا وہ یہ ہے کہ ولی اور نبی میں فرق یہی ہے کہ ولی کے مطالعہ کے لئے مانع معصیت امر طبعی نہیں ہوتا بلکہ بیرونی و عارضی ہوتا ہے اس لئے وہاں میلان ممکن ہے۔ مگر نبی میں مانع معصیت خود طبیعت اور فطرت ہوتی ہے اور اسی کا نام عصمت ہے کہ نبی کو حاصل ہے ولی کو نہیں۔ اور ہر دو توجیہہ مذکور کا حاصل یہ ہے کہ عزم معصیت ہو یا میلان کا عزم کے درجہ پہ پہونچنا بہر حال دونوں نفس طبیعت نہیں بلکہ رب کی دلیل کا دیکھ لینا ہوا جو امر عارض ہے۔ لہٰذا عصمت کا حق ادا نہ ہوا۔ پھر وہ دلیل ربانی کیا تھی جس کا دیکھنا مانع بنا اس میں بھی مختلف اقوال ہیں مگر زیادہ مشہور دو ہیں۔ اول یہ کہ اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ انگلیاں دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں۔ گویا اشارہ فرما رہے ہیں۔ ہا ہا تم اور ایسا گندہ کام۔ دوسرا یہ کہ زلیخا کے گھر کے کونے میں ایک بت کھڑا تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک کپڑے سے اسے ڈھانپ دیا۔ جب حضرت یوسف نے پوچھا کہ یہ کیا کیا تو زلیخا نے جواب دیا مجھے شرم آتی ہے کہ میرا معبود مجھے اس حالت میں دیکھے۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کو تنبہ ہوا اور فرمایا میں اس کا زیادہ مستحق ہوں کہ اپنے رب سے شرماؤں۔ یہ دونوں قول تو کسی طرح بھی دل کو نہ لگے۔ کیونکہ ان کا صاف یہ مطلب ہے کہ باپ کے متخیلہ کی موجودگی سے سبق لیا۔ مگر اللہ جبار و قہار کی حضوری سے سبق نہ لیا۔ نیز کافرہ کو تو اپنے باطل اور اندھے معبود سے شرم آئی مگر نبی کو اپنے حاضر و ناظر سچے معبود سے از خود شرم نہ آئی۔ اگر آئی تو عورت سے سبق لے کر۔ کوئی شخص ہارون رشید کے سامنے کھڑا ہو اور اسکی بیگم یا شاہزادی سامنے آ بیٹھے تو ممکن ہے کہ شاہی رعب و جلال ادھر نظر بھی اٹھانے دے۔ یا مثلاً شیر کے سامنے کھڑا ہو تو دیکھے کہ ہیجان پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر حسن ذات

کو حق تعالیٰ کا دائمی مشاہدہ حاصل ہو اور وہ ہر وقت غلام بنا ہوا اُس شاہنشاہ کے سامنے کھڑا ہو جس کے سطوت و اقتدار کی کوئی مثال ہی نہیں ہو سکتی تو کس طرح مان لیا جائے کہ وہ نامحرم اجنبیہ کی طرف میلان کر سکے۔ اس خلجان کے بعد طبیعت اس کی حقیقت کی جویاں ہوئی تو منجانب اللہ قلب پر یہی مضمون وارد ہوا جو اب حضرت شیخ کی تقریر میں نظر سے گزرا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصد کو عورت کے قصد سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اگر ہے تو ضد کی ہے۔ یعنی زلیخا کے اس قصد بے حیائی پر سیدنا یوسف علیہ السلام کو غصہ آیا اور آپ نے یہ طے فرما کر کہ ایک طمانچہ سے سارا ہیجان پانی بن جائے گا مارنے کا قصد فرمایا۔ اور یہ عین مقتضائے نورِ نبوت تھا۔ چنانچہ میں نے قصہ سیدنا یوسف نام رسالہ میں جس کو ایک نرالے طرز پر مرتب کیا تھا اس مضمون کو درج بھی کر دیا۔ مگر اب چند باتیں ذہن میں اور گھوم رہی ہیں جن کے ظاہر کرنے کو دل چاہتا ہے کہ نازک مقام زیادہ وضاحت کو چاہتا ہے۔ اور جامع کتاب نے حضرت شیخ سے اور کوئی سوال نہیں کیا ورنہ بہت کچھ حقائق معلوم ہو جاتے۔ مثلاً برہان رب کیا تھی جس نے مارنے سے ہاتھ روک دیا۔ اور جب حضرات انبیاء کا دائمی مشاہدہ اور عصمت ذاتیہ مادۂ رجولیت میں حرکت ہی نہیں لاسکتا تو امتحان ہی کیا ہوا کہ اس موقع پر آپ کے تحفظ کو کمال قرار دیا جا سکے لہذا غور فرمائیں سیدنا یوسف علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اور نبی زادہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو الکریم بن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ سے یاد فرمایا ہے اور حق تعالیٰ نے آپ کی شان میں اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ نازل فرمایا ہے۔ چونکہ آپ کا امتحان عبدیت ہی کے متعلق ایک انوکھی صورت میں لیا گیا تھا۔ آپ بے نظیر حسن کا مجسمہ تھے اور والد بزرگوار کو سب بھائیوں میں زیادہ پیارے تھے جس قدر آپ ناز پروردہ تھے اسی قدر سخت ابتلاء آپ کو پیش آیا کہ بچپن ہی میں آپ سے گھر چھوٹا وطن چھوٹا آغوش پدری چھوٹی، بھائیوں کی نظریں پھریں۔ اندھے کنوئیں میں آپ کو پھینکا گیا۔ چند درہم کے عوض نووارد قافلہ کے ہاتھ آپ کو بیچ دیا گیا۔ اتنا انقلاب عظیم ہوا اور کل دو تین دن کے اندر ہوا۔ غلام بنا کر بازار مصر میں لائے گئے، اور دوبارہ فروخت ہو کر عزیز مصر کے گھر آئے۔ یہاں برسہا برس غلامانہ

خدمتیں انجام دیں اور زبان سے ذکر کرنا تو بڑی بات ہے کبھی افسردگی بھی نہ آئی کہ کنعان میں کیا تھا اور مصر میں کیا بن گیا۔ پھر آپ کا حُسن دل افروز آپ کے ابتلاء کے لیے سونے پہ سہاگہ بن گیا۔ کہ آپ کی مربیہ یعنی عزیز کی بیوی جس کے پاس آپ کا ہر وقت رہنا سہنا تھا آپ پہ فریفتہ ہو گئی اور آپ کی غلامانہ اطاعت کا جوہر دیکھ کر گندی توقعات کو دل میں جگہ دینے لگی۔ آخر ایک دن مضطر ہو کر گھر کے دروازے مقفل کیے اور آپ پہ قابو یافتہ ہونے کی ہر تدبیر عمل میں لا کر صاف لفظوں میں کہا کہ یہاں آؤ اور جلد آؤ۔

عالم خیال یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان اسی میں تھا کہ جوان اور مجرد ہوتے ہوئے خود عورت کی طرف سے طلب اور لجاجت ظاہر ہونے پہ اپنے کو کتنا بچاتے ہیں۔

مگر مجھے جو بات عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ نہ اس میں آپ کا امتحان تھا اور نہ یہ نبی کے لیے کوئی ڈگمگانے کے قابل بات ہے۔ آپ کا امتحان اُس غلامی میں تھا جس کی پہلی کڑی باپ سے جُدائی تھی اور اب یہ اس کی آخری کڑی ہے کہ دیکھیں غلامی کا فریضہ کیونکر انجام دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نبی مجسم نیکی ہوتا ہے اور دوسروں کو نیک بنانا اس کی فطرت ہے۔ فحش اور فحش بھی وہ کہ زلیخا خود ہی اس کی مرتکب نہیں بلکہ نبی کو اس کے ارتکاب کا حکم دیتی ہے طبعاً مقتضی ہے غیظ و غضب کو۔ مگر اپنی غلامی کا اقتضاء ہے رب مجازی کا احترام لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق نے یہ فیصلہ تو عام مسلمانوں کو بھی قطعی دے دیا کہ اولاد کے لیے والدین، بیوی کے لیے شوہر شاگرد کے لیے اُستاد، مرید کے لیے پیر، فوجی سپاہی کے لیے سپہ سالار، اور رعیت کے لیے بادشاہ بے شک واجب الاطاعت ہیں۔ اور اس میں سب سے زیادہ مضبوط کڑی غلام کی ہے کہ مملوک اور زرخرید ہے۔ اپنے آقا کا۔ مگر ان کی اطاعت کا وجوب چونکہ رب حقیقی ہی کے ایجاب کی بنا پر ہے لہذا جب بھی مقابلہ ہوگا انکے حکم کا اللہ کے حکم سے تو اصل بہر حال اصل ہے اور فرع بہر حال فرع۔ لیکن بڑوں کا امتحان بھی بڑی بات میں ہوتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے تو یہ پل صراط تھی کہ مربیہ کی عدم اطاعت کے ساتھ ساتھ اس کے رب مجازی ہونے کی بھی پوری رعایت رہے اور مجازی غلامی کے فریضہ پر بھی دھبہ نہ آنے پائے۔ آپ کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کٹھن منزل کو طے کیا اپنے باپ کا حق

پدری ادا کرتے وقت' کہ باوجود اس کے کافر ہی نہیں بلکہ کافر گر اور بُت تراش ہونے کے اس کو توحید کا سبق دیا تو ابا ہی ابا پکار کر دیا۔ اور جب اس کی طرف سے یہ سخت جواب ملا کہ یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پتھروں سے کچل دوں گا تب بھی آپ کی زبانِ مبارک سے وہی الفاظ نکلے جو احترام پدری کے لئے زیبا تھے یعنی سَلَامٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ۔ بہت اچھا آخری سلام لیجئے جاتا ہوں۔ مگر آپ کے لئے اپنے رب سے استغفار ضرور کروں گا۔ آج اسی سید الموحدین کے پرپوتے کا امتحان اسی نوعیت کے دوسرے رنگ میں لیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھیں ربِ مجازی کا ادب و احترام قائم رکھتے ہوئے تبلیغ اور موعظۂ حسنہ کا حق کس خوبی سے انجام دیتا ہے۔ درحقیقت آپ ہی کا کام تھا کہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک راستہ کو عبور فرما گئے۔ کہ سب وشتم یا زدوکوب تو بڑی چیز ہے غصہ کا لہجہ بھی نہ آنے پایا بلکہ مربیہ کو اس طرح حکم کرنا بھی کہ قصدِ معصیت سے باز آ۔ شانِ غلامی کے خلاف سمجھا۔ جو کچھ نصیحت کی وہ اپنے اوپر رکھ کر کی کہ مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّهٗ رَبِّیْ الآیۃ۔ اللہ پناہ میں رکھے اپنے عذاب سے (کہ معصیت کی لذت تو دو منٹ میں پانی ہو کر بہ جائے گی مگر اس کے عذاب کی کلفت تم ہو یا میں مدت دراز تک جھیلنا پڑے گی') نیز وہ یعنی عزیز میرا آقا ہے (اور آقا کی ناموس میں بٹہ لگانا غلام کا کام نہیں اور ظاہر ہے کہ غلام ہی کی طرح بیوی کا بھی آقا ہے بلکہ زیادہ)۔ خصوصاً جب کہ انہوں نے مجھے رکھا بھی اچھی طرح (کہ میری ہر ضرورت کے پورا کرنے کا خیال رکھا۔ اور تم کو تو اپنے گھر کا مالک ہی بنا کر بٹھایا ہے)۔ نیز زنا ظلم ہے کہ نعمت الٰہی کا بے محل استعمال ہے) اور کوئی شبہ نہیں کہ ظالم فلاح نہیں پایا کرتا (دنیا میں رسوا ہو کر رہتا ہے)۔ غرض ارشاد و ہدایت کا کوئی پہلو نہ چھوڑا۔ اول ربِ حقیقی کی سطوت و شان اور عذابِ اُخروی منظر دکھایا۔ پھر ربِ مجازی کی تربیت کا عقلی اقتضاء پیش کیا۔ پھر تقاضاء مروت و شرافت ظاہر فرمایا اور پھر بروئے تجربہ دنیوی ذلت و رسوائی سے ڈرایا کہ درحقیقت زنا کی خاصیت ہے کہ باوجودیکہ اس میں حد سے زیادہ اخفا ہوتا ہے مگر طشت از بام ہو کر رہتا اور نوکر و رعایا تک کے دلوں سے احترام نکل جاتا ہے۔ یہ ہے اخلاص عبدیت کہ سب کچھ فرمایا مگر کس پیارے اسلوب سے فرمایا۔ ربِ حقیقی کے حکم کا احترام بھی پورا

ادا ہو گیا اور ربِّ مجازی کے ادب واحترام میں بھی ذرہ برابر فرق نہ آنے پایا۔
اس کے آگے حق تعالیٰ شانہ' کا ارشاد ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا جس میں حضرت شیخ نے هَمَّ بِهَا کا ترجمہ فرمایا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مارنے کا قصد فرمایا تھا۔ بندۂ ناچیز کا وجدان یہ کہتا ہے کہ هَمَّتْ بِهٖ میں عورت کے قصد سے بھی یہی سخت گیری کا پہلو مُراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ زلیخا نے جب دیکھا کہ حضرت یوسف ٹس سے مس نہیں ہوتے اور نہ میری لجاجت پر نظر کرتے ہیں نہ اپنی غلامانہ اطاعت پر۔ بلکہ دفتر کھو لتے ہیں نصیحتوں کے، جو ایسے بیتابانہ ہیجان کے وقت تیر کا کام دیا کرتے ہیں تو اُس نے منوانے کا دوسرا پہلو اختیار کیا۔ یعنی گرمی برتی اور تخویف وتہدید سے اپنا کام نکالنا چاہا۔ اس پر سیدنا یوسف علیہ السلام کو بھی اپنی روش بدلنے کی ضرورت ہوئی کہ اب نرمی برتنا گویا معصیت کو ہلکا سمجھنا ہے اور جہاں معصیت سے روکنے میں ہاتھ کی ضرورت ہو وہاں محض زبان سے کام لینا کمزوری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کا ایک طمانچہ عورت کی شہوت نفسانیہ کو فنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر پھر وہی غلامی کا امتحان کہ مربیہ ہے اور میرا منصب نہیں کہ دست درازی کروں مانع آیا اور اب بجز اس کے کہ آپ وہاں سے بھاگ نکلیں اور کوئی صورت دو متضاد پہلو سنبھالنے کی نہ رہی۔ چنانچہ آپ بھاگے اور قدرت الٰہیہ پر نظر رکھ کر بھاگے۔ اس لئے آپ کے عزم کو جس کا محرک محض مشاہدۂ رب تھا قفل کی بندش نہ روک سکی۔ زلیخا نے تعاقب کیا اور آپ کے کرتے کا دامن پکڑ بھی لیا مگر آپ نہ رُک سکے۔ دامن پھٹ گیا۔ مگر آپ آخری دروازہ پر پہونچ لیے۔ ابھی تتمہ امتحان باقی تھا اس لئے باہر پہونچتے ہی دیکھا کہ عزیز مصر کھڑا ہے۔ اس حال میں شوہر کو دیکھتے ہی بدنامی وخوف کے مارے زلیخا کا داعیہ نفسانی ختم ہو لیا اور سارا بوجھ بار اپنی گردن سے اُتار کر اُس بے گناہ کے سر تھوپ دیا جس کو اپنی جان سے زیادہ پیارا سمجھنے کا دعویٰ کیا کرتی تھی۔ یہ ہے حقیقت فانی وظلمانی محبت کی کہ ذرا سے امتحان میں بے نقاب اور منقلب ہو کر محبوب کو مجرم قرار دیتی اور سزا دلانا چاہتی ہے۔ مگر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قدم نے حق غلامی سے اب بھی لغزش نہ کھائی۔ تہمت سے اپنے آپ کو بچانے کا فریضہ ادا کرنے کے لئے اتنا تو فرمایا کہ انہوں نے ہی مجھے پھسلایا تھا۔ مگر زلیخا کی دیدہ دلیری اور سفید جھوٹ پر

غصہ لانے کے آگے کوئی لفظ ایسا نہ نکال سکے جو عزیز مصر کو ان کی مربیہ پر برافروختہ کرے۔ چونکہ امتحان کا ہر پہلو ختم ہو لیا اس لیے اب حق تعالیٰ نے اظہار قدرت فرمایا کہ سات تالوں کی خلوت کے قصہ میں جہاں مدعیہ اور مدعا علیہ کے سوا تیسرے شخص کی ہوا بھی نہ تھی بے زبان بچہ یا بند کو گویائی بخشی اور اس نے ایسا دل لگتا ثبوت پیش کیا جس کے ذریعہ ہر شخص خود جج بن کر صحیح فیصلہ نکال سکتا ہے۔ وہ یہ کہ یوسف کا کرتا دیکھ لو۔ اگر سامنے سے پھٹا ہے تو عورت سچی اور یوسف جھوٹے کیونکہ صاف علامت ہے مرد جبر کر رہا ہے اور عورت اس کو دھکیل رہی ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی اور یوسف سچے کہ کھلی علامت ہے کہ مرد بھاگ رہا ہے اور عورت اس کو پکڑ رہی ہے۔ چنانچہ کرتا دیکھا گیا تو صورت حال بے نقاب ہو گئی اور حضرت یوسف کے بے گناہ ہونے کا عزیز کو یقین آ گیا حتیٰ کہ زبان سے بے اختیار نکلا ان عورتوں کا مکر بھی بڑا غضب کا ہوتا ہے۔ قصہ تو ختم ہو لیا۔ مگر سیدنا یوسف علیہ السلام کا زمانۂ غلامی جس میں آپ کا امتحان تھا ابھی باقی تھا اور آپ کی شان عبدیت جس کا پہلا سبق رضا و تسلیم کا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے اکتائے۔ اس لیے بجائے اس کے آپ غلامی سے رہائی کی دعا مانگتے آپ نے یہ دعا کی کہ اس قصر شاہی سے جہاں معصیت کا خطرہ ہو مجھے وہ جیل خانہ پیارا ہے جہاں امن و یکسوئی ہو۔ چنانچہ آپ کی دعا قبول ہوئی اور کافی مدت آپ نے محبس میں گزاری۔ الحاصل سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان عبدیت میں تھا کہ ایک عورت کی غلامی میں آپ کو مدتوں رکھا گیا۔ نبی کے لئے غیر اللہ کی غلامی ہی صبر و استقلال اور رضا و تسلیم کی آزمائش کے لئے کیا کم تھی، چہ جائیکہ ایسے فحش قصہ میں آپ کو ابتلا پیش آیا جس کا خواب بھی آپ کو نظر نہ آ سکتا تھا کہ نہ مربیہ کی اطاعت اپنی حد سے بڑھے اور بے حیائی کا مرتکب بنائے، اور نہ اپنی حد سے گرے اور سوء ادب کا مرتکب بنائے۔ چنانچہ آپ نے لفضلہ تعالیٰ دونوں پہلو کا حق ادا کر دیا۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے سوء ادب اور صدور فحش دونوں سے یوسف کو محفوظ رکھا اور دونوں کا مانع کوئی امر خارجی و عارضی نہ تھا۔ بلکہ وہی ربوبیت حقہ کا مشاہدہ تھا جو آپ کے لئے دائمی تھا جس کا اظہار لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ میں ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ کو رب حقیقی

سمجھنے سے ذرا ذہول ہوتا تو فحشا کے صدور کا کوئی مانع نہ تھا۔ اور مربیہ کو مظہر ربوبیت سمجھنے میں ذرا غفلت ہوتی تو سوء ادب سے ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ تھا۔ اور امر بالمعروف کے چونکہ دو درجے ہیں۔ ہاتھ سے معصیت کا مقابلہ کرنا، یا زبان سے اس لئے دونوں کی جانچ ہوگئی کہ زلیخا نے جب مجبانہ طرز اختیار کیا تو آپ نے واعظانہ روش اختیار کی مگر اپنی غلامی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور جب اُس نے حاکمانہ روش اختیار کی تو آپ نے دست درازی نہ فرمائی کہ غلامانہ شان پر دھبہ نہ آجائے۔ جس نے بشر کی غلامی کا اتنا حق ادا کر دکھایا اس کی عبدیت کا اپنے محبوب کے ساتھ کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میرے اس خیال کی تائید کہ هَمَّتْ بِهٖ سے بھی عورت کا وہی قصد مراد ہے جو تشدد کا گرم پہلو لئے ہوئے ہو چند وجوہ سے ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں عورت کے قصد کی تصریح ہو چکی کہ اُس نے حضرت یوسف کو بلایا اور صاف الفاظ میں کہا میرے پاس آؤ۔ اب اس آیت میں اسی قصد کو اشارۃً ذکر کرنا تکرار محض اور فصاحت قرآنیہ کے خلاف ہے۔ زلیخا اور حضرت یوسفؑ کا قصد متصلاً مذکور ہے۔ اس لئے چاہتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہو قصد و ارادہ خود عربی الفاظ ہیں۔ ان کو چھوڑ کر هَمَّ کا لانا علامت ہے کہ کوئی خاص قسم کا قصد مراد ہے۔ اور وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ + وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ آیات شریفہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ هَمَّ کا استعمال عموماً ایذا رسانی و سخت گیری کے قصد میں آتا ہے۔ لہذا یہاں بھی یہی مراد لینا چاہئے۔ عقل تسلیم نہیں کرتی کہ جب عورت صراحتہً ارتکاب معصیت کا حکم دے تب تو سیدنا یوسف علیہ السلام نرم جواب کا ناصحانہ پہلو اختیار فرما دیں، اور جب اس کے محض قصد کا اظہار ہو تو آپ جارحانہ پہلو پر اتر آویں۔ اگر عورت کی روش میں فرق نہیں آیا تو پیغمبر کا رنگ بلا وجہ کیسے بدل گیا۔ نیز اس کی تائید میں کہ آپ کا امتحان آداب غلامی میں تھا نہ کہ نفس فحشاء میں خود نتیجۂ امتحان ہے کہ جب اس کے نرم و گرم اور عسر و یسر حتیٰ کہ شاہی محل اور جیل خانہ کی کوٹھڑی کے سب مراحل طے کر چکے تب آپ کو صلہ میں حریت عطا کی گئی اور حریت بھی وہ یکتائے روزگار جس مصر کے بازار بردہ فروشی میں آپ فروخت کئے گئے تھے اس کا عورت و مرد، بچہ اور بوڑھا، شریف و وضیع امیر و فقیر زمیندار و کاشتکار غرض

ہر یاشندہ آپ کا زر خرید غلام بنایا گیا اور عالم غیب سے کما تدین تدان وھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا اقتضاء ظہور میں آیا۔ اور اسی لیئے مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ آپ کی عبدیت خالصہ کا اظہار فرمایا۔ واللہ اعلم۔

(۲۷) وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ اور حق تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام فرمایا۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اللہ جل جلالہ کا مکالمہ کیا مخصوص ہے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یا اولیاء اللہ کو بھی میسر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ابوالحسن شاذلی قدس سرہٗ کا حزب الکبیر میں قول منقول ہے وَهَبْ لَنَا مُشَاهَدَةً تَصْحَبُهَا الْمُكَالَمَةُ۔ الٰہی ہمیں وہ مشاہدہ نصیب فرما جس کے ساتھ مکالمہ بھی ہو۔ فرمایا ہاں شیخ ابوالحسن شاذلی وغیرہ کا قول مکالمۂ خداوندی کے بارہ میں بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں (کہ اولیاء بھی مکالمہ الٰہیہ سے نوازے جاتے ہیں۔ اگرچہ نوعیت میں مشاہدہ کی بہت فرق ہوتا ہے)۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ صاحب مشاہدہ ولی پر جب حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے تو وہ اللہ کا کلام سنتا ہے۔ مگر عادت جاریہ کے خلاف (کہ عادت اللہ نے عام طور پر کان کو آلۂ سماعت بنایا ہے مگر اس کو کلام الٰہی کی سماعت اس طرح ہوتی ہے) کہ نہ حرف ہوتے ہیں نہ آواز، اور نہ کیفیت کا ادراک (کہ کیونکر سماعت ہوئی) نہ کوئی جہت مخصوص ہوتی ہے (کہ فلاں جانب سے آواز آرہی ہے) بلکہ ہر جہت سے سنائی دیتی ہے (اور سننے کے لئے کان مخصوص نہیں ہوتے) بلکہ تمامی اعضاء اور ذات کے تمامی اجزاء سنتے ہیں۔ حتّٰی کہ دانت داڑھ اور بال بال غرض بدن کا ہر جوہر اور ہر حصہ سنتا ہے اور مجسّم تپلہ سُننے والا کان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اہل مشاہدہ کی مقدار سماعت کا فرق و اختلاف بیان فرمایا۔ جس کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔

ف۔ یہ ظاہر ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شان مرتبۂ سماعت کلام الٰہی میں نہایت ارفع و اعلیٰ تھی۔ کہ اسی خصوصیت کی بناء پر آپ کا خطاب ہی کلیم اللہ ہے۔ نفس سماعت میں اشتراک دوسری شے ہے اور خصوصی شان کا امتیاز دوسری ہے۔

(۲۸) وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا

لَّكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝ اور جب تم سفر کو جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر دو (یعنی بجائے چار رکعت کے دو رکعت پڑھو جس کا نام اصطلاح شرع میں قصر ہے) - اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو تکلیف پہونچا ئیں گے۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خوف کی قید لگانے کا کیا مطلب ہے جب کہ امن کی حالت میں بھی قصر جائز ہے۔ (چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں قصر نماز پڑھی حالانکہ ہر طرح امن کا وقت تھا۔ نیز ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مدینہ کے درمیان بحالت امن قصر نماز پڑھی)۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ یہ قید مفہوم مخالف کے خارج کرنے کے لئے نہیں ہے۔ (یعنی یہ نہیں ہے کہ خوف کے سوا دوسری حالت یعنی امن میں قصر کرنا گناہ ہے) بلکہ اس مضمون کی تصریح کے لئے ہے۔ کہ خوف کی حالت میں قصر کرنے کو گناہ نہ سمجھو' اور بحالت خوف نماز میں قصر کرنے کا ایسا ہی اہتمام کرو جیسا سفر کی دوسری حالتوں میں کرتے ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت صحابہ سفر جہاد میں جاتے (اور ان کا سفر اکثر اسی لئے ہوا بھی کرتا تھا) تو اس خیال سے کہ ممکن ہے زندگی کا آخری وقت ہو (اور شہادت کے ذریعہ اللہ سے ملنے کا دن آپہونچا ہو) عبادت کو بڑھا دیا کرتے اور ہر وقت نماز میں مشغولیت کو محبوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض حضرات کی تو یہ حالت تھی کہ تمام دن جہادی خدمت میں گزارتے تھے اور تمام رات اپنے اللہ کے سامنے رکوع و سجدہ کرتے ختم کیا کرتے تھے۔ غرض دشمنوں پر جہاد کے سفر میں (کہ مرنے کا استحضار رہتا تھا) عبادت کے اندر کمی کرنا تیاری آخرت کے خلاف اور ایک قسم کا گناہ و کوتاہی سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں یہ مضمون جم گیا تھا کہ ایسے موقع پر (جب کہ موت سامنے ہو) عبادت میں اضافہ کرنا چاہیئے نہ کہ کمی۔ حق تعالیٰ نے ان کے اس خیال راسخ کو دور کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

ف ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس خاص موقع پر جہاد اور اس کے متعلقات ہی میں مشغول ہونا بہترین عبادت ہے۔ کیونکہ کافر تمہارے دشمن ہیں ان کو مغلوب کر لو تو پھر اطمینان سے ہر وقت نمازیں پڑھو گے۔ لہذا نماز کا قصر کہ دو رکعت کی گنجائش

نکل کر خدمت جہاد میں صرف ہو ہمیں زیادہ پسند ہے اس سے کہ نماز پوری پڑھو اور دو رکعت کا وقت .... جہادی خدمت سے نکل کر نماز میں داخل ہو جائے۔ اور عبادت سے مقصود ہی چونکہ رضا رحق ہے اس لئے صورت عبادت کو نہ دیکھو بلکہ حکم خدا کو دیکھو۔ مثلاً طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے تو یہ عدم صلوۃ کو جبہ اس کے کہ اطاعت ہے حکم خدا کی بالکل اسی درجہ میں ہے جیسے فرض نماز کا پڑھنا اوقات مفروضہ میں۔ پس تم نے خوف جان یعنی جہاد کی حالت میں قصر کو برا سمجھا کہ تقلیل ہے نماز کی۔ اس کو دلوں سے نکال دو۔ اس تقریر سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ قرآن مجید سے صرف نماز کا قصر بحالتِ خوف ثابت ہوتا ہے مگر حدیث سے بحالت امن بھی قصر کرنا ثابت ہوا۔ چونکہ شان نزول نے واضح کر دیا کہ قصر کا حکم مطلق سفر پر مرتب ہے اور خوف کی قید صرف باقتضاء حال ہے لہذا خوف ہو یا امن دونوں حالت میں قصر نماز کا ثبوت کلام اللہ سے ہوا اور کلام الرسول نے صرف اس کی موافقت و توضیح کی ہے، نہ یہ کہ خاص کو عام بنا دیا، اور نہ یہ تقسیم کہ ایک حالت کا حکم اللہ نے دیا اور دوسری حالت کا رسول نے۔ دوسرا شبہ یہ تھا کہ لا جناح سے حالت سفر میں قصر کا جواز ثابت ہوتا ہے کیونکہ مطلب یہ ہے کہ قصر میں کوئی خرابی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری نہیں البتہ مباح ہے۔ حالانکہ حنفیہ وجوب کے قائل ہیں کہ سفر میں پوری نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہو گا۔ اس کا جواب بھی اسی تقریر سے نکل آیا کہ جناح کی نفی صرف اس لئے ہے کہ صحابہ نے اس کو جناح اور کوتاہی سمجھ رکھا تھا رہا قصر نہ کرنے میں گناہ یا عدم گناہ کا حکم اس سے آیت ساکت ہے۔ اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اللہ کی نعمت ہے اس کو قبول کرو۔ یہ بتا رہا ہے کہ قصر نہ کرنے میں انعام الٰہی کا رد کرنا ہے جو شان عبدیت کے خلاف ہے۔ یا مفہوم مخالف معتبر مانو تو یوں کہو کہ آیت ہی سے وجوب قصر ثابت ہے۔ بایں صورت کہ قصر میں گناہ کی نفی کی گئی ہے تو عدم قصر یعنی پوری نماز پڑھنے میں گناہ کا ثبوت ہے۔ اور حدیث کو اس کی شرح اور تفصیل قرار دیا جائے گا جیسا کہ آیت شریفہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا میں صفا و مروہ کی سعی پر لا جناح مرتب ہوا ہے تو سعی نہ کرنے میں گناہ ثابت ہو گا اور اسی بنا پر سعی کو واجب کہا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

(۲۹) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا ط الاٰیۃ جب رات (کی تاریکی ابراہیم پر) چھاگئی تو ان کی ستارہ پر نظر گئی۔ کہنے لگے۔ یہ میرا پروردگار ہے۔ مگر جب وہ غائب ہوا تو کہنے لگے مجھے غائب ہوجانے والے پسند نہیں۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو کہنے لگے اگر میرا رب میری رہبری نہ فرمائے گا تو میں اُن لوگوں میں ہو جاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ یہ جگمگا رہا ہے تو کہا یہ ہے میرا پروردگار یہ سب سے بڑا ہے مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہنے لگے لوگو! جن چیزوں کو تم شریک خدا ٹھیراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں' میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل خود اپنے نفس کے لئے استدلال کی خاطر تھا (کہ رب کی تلاش میں مصنوعات باری تعالیٰ پر نظر ڈالی تاکہ ترقی فرماکر ذاتِ حق رسائی پاویں) ۔ یا قوم کو لاجواب کرنے کے لئے تھا کہ ان کے معبودان باطلہ کی فنائیت وحدوث دکھلا کر ان کا منہ بند کردیں؟ فرمایا اپنے ہی نفس کے لئے استدلال تھا۔ مگر عوام کے استدلال کی طرح نہیں کہ وہ حقیقت سے ناآشنا ہوتے اور پھر دلیل کے ذریعہ حقیقت تک پہونچنا چاہتے ہیں مگر حضرات انبیار کو اللہ کی غایت معرفت اور کمال عبودیت اور انتہائی خوف اور حد درجہ کا خضوع وخشوع نصیب ہوتا ہے کیونکہ حق شناسی اور توجہ الی اللہ ان کا ذاتی وطبعی امر ہے اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا استدلال جو اس آیت میں مذکور ہے یہ تھا کہ آپ جس حق کو اپنے باطن اور بصیرت سے دیکھ رہے تھے اس کو اپنی آنکھوں اور بصارتِ چشم سے دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی حق کی معرفت آپ کو بصرت کے ذریعہ حاصل تھی۔ مگر آپ کا مطلب یہ تھا کہ بصیرت آگے بڑھ کر بصارت تک پہونچ جائے۔ لہذا آپ نے ان نورانی اجرام پر نظر ڈالی کہ شاید بصیرت سے پہچانی ہوئی حقیقت کے مناسب حال کوئی نور آنکھوں سے نظر آجائے مگر آپ نے دیکھا کہ ان میں کوئی نور بھی ذات منزہ ومقدس کے مناسب ومماثل نہیں لہذا سب سے تبری فرماکر اسی بصیرت سے پہچانی ہوئی حقیقت کی طرف گئے۔ کہ وہ ذات پاک ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا محض نمونہ کے درجہ میں اس کی مثال ایسی سمجھو کہ اہل مشاہدہ دلی کو مثلاً کشف وبصیرت کے ذریعہ انتیس تاریخ کو چاند نظر آیا۔ اس کے بعد

اس نے چاہا کہ لاؤ نظر چشم سے بھی اس کو دیکھوں۔ چنانچہ جو لوگ چاند کی تلاش میں آسمان پر نگاہیں دوڑا رہے تھے یہ بھی ان کے پاس آکھڑا ہوا اور اُفق آسمان پر نگاہ دوڑانے لگا۔ تو ناواقف شخص اسے دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ دیگر حاضرین کی طرح اس کو بھی چاند ہونے میں شک ہے اور اس لیے حقیقت کی طلب و جستجو کر رہا ہے۔ مگر جس کو اس کی بصیرت اور باطنی حالت سے واقفیت ہو گی اُسے پورا وثوق ہو گا کہ چاند ہو جانے کا اسے پختہ یقین ہے۔ اور ہمارے ساتھ اس کا آکھڑا ہونا صرف اس غرض سے ہے کہ آنکھوں سے بھی چاند کو دیکھ لے۔ برخلاف عام لوگوں کے کہ ان کو ظاہراً و باطناً چاند کے ہونے میں شک ہے اور وہ آسمان کو اس لیے تک رہے ہیں کہ اُس کے ہونے یا نہ ہونے کا شک زائل ہو جائے۔ پس یہ فرق ہے انبیاء علیہم السلام کے استدلال میں اور اہلِ حجاب عوام کے استدلال میں۔ کہ حضرات انبیاء چونکہ معصوم ہیں اس لیے نہ اُن میں اللہ سے ناواقفیت ہے نہ کسی قسم کا شک و شبہ کہ یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام تو صغیرہ گناہ سے بھی معصوم ہیں چہ جائیکہ کبیرہ گناہ، اور چہ جائیکہ نوع کفر۔" واقعی حضرت نے بڑی پتہ کی بات فرمائی۔ بے شمار مرتبہ مجھے اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت ممدوح اپنے گھر کے اندر یا مسجد میں چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے انتیس ۲۹ تاریخ کو ہم سے فرمادیا کرتے کہ چاند ہو گیا۔ ہم آپ کے پاس ہی بیٹھے رہتے اور کوئی باہر سے آتا تو اطلاع دیا کرتا تھا کہ چاند نظر آ گیا۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ سورج میں زردی باقی ہوتی تھی اور آپ ہمیں چاند ہونے کی خبر دیا کرتے تھے۔ پھر ہماری خواہش پر آپ بھی ہمارے ساتھ آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے کھلی جگہ پر تشریف لایا کرتے اور بڑے غور سے افق پر نگاہ ڈالا کرتے۔ مگر چاند اتنا باریک ہوتا تھا کہ نہ ہمیں نظر آتا تھا نہ آپ کو۔ حتّٰی کہ کچھ دیر بعد تیز نگاہ والا آتا اور کہا کرتا تھا کہ دیکھو وہ رہا چاند۔ اس کے بعد چار طرف سے خبریں آجاتی تھیں کہ چاند ہو گیا اکثر ایسا بھی ہوا کہ لوگوں کے نزدیک شعبان کی آخری تاریخ (۳۰) ہوتی اور کسی کا روزہ نہ ہوتا تھا اور آپ مجھے فرمادیا کرتے کہ آج تو عید کا دن ہے۔ یا فرمایا کرتے کہ آج یوم عرفہ ہے حالانکہ لوگوں کے خیال میں ۸ ذی الحجہ ہوتی تھی مگر اس کے بعد کہیں نہ کہیں سے بلکہ کبھی چار منزل اور پانچ منزل سے بجنسہ حضرت شیخ کی اطلاع کے موافق خبر آیا کرتی تھی۔

(۳۰) وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؁ ان ہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہدو پیمان کیا کہ اگر ہمیں اپنے فضل سے (مالِ دُنیا) عطا فرمائے گا تو ہم ضرور صدقات دیا کریں گے اور بالضرور نیکوکاران میں سے بنیں گے۔ پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا تو بخیل بن گئے اور پشت پھیر کر بے رُخی برتنے لگے۔

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ مفسرین لکھتے ہیں یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارہ میں نازل ہوئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور التجا کے ساتھ درخواست کی کہ یارسول اللہ آپ میرے لئے دُعا فرمائیں حق تعالیٰ مجھے دُنیا کا مال کثیر عطا فرمائے۔ آپ نے فرمایا اے ثعلبہ وہ قلیل جس کا تو شکر ادا کرتا رہے اُس کثیر سے بدرجہا بہتر ہے جس کا شکر ادا نہ کر سکے۔ مگر یہ بار بار اسی کا اصرار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ قسم کھا کر کہا یارسول اللہ بخدا میں مال کثیر پر اللہ کا شکر ادا کروں گا۔ اور اللہ سے عہد کرتا ہوں اگر اُس نے مجھے مال عطا کیا تو ضرور صدقات وخیرات دیا کروں گا۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی اور ثعلبہ کی بکریوں میں اتنی بڑھوتری ہوئی جیسے (برسات میں) کیڑے بڑھا کرتے ہیں۔ ثعلبہ کا معمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ اور پنجگانہ نماز جماعت پڑھنے کا تھا مگر جب بکریوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی (کہ مدینہ میں رکھنے کی گنجائش نہ پائی) تو وہ ان کو لے کر بیرون شہر چلا گیا۔ اور جماعت کی نمازیں فوت ہونے لگیں مگر جمعہ میں پھر بھی شریک ہوتا رہا۔ اس کے بعد جب بکریوں میں اور ترقی ہوئی تو وہ جگہ بھی تنگ ہوگئی اور وہاں سے دُور جاکر قیام کرنا پڑا حتیٰ کہ اُن کے دھندے میں جمعہ کی شرکت بھی جاتی رہی۔ آنحضرت صلے اللہ وسلم نے (ثعلبہ کو جب نہ دیکھا تو صحابہ سے) دریافت فرمایا کہ ثعلبہ کہاں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اُن کی بکریاں بہت زیادہ ہوگئیں اور ان کے دھندے میں پڑ کر جمعہ اور جماعت کی حاضری سے محروم ہو گئے۔ آپ نے فرمایا وائے افسوس ثعلبہ کی حالت پر۔ اس کے بعد آپ نے دو شخصوں کو زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا (اور وہ تحصیل زکوٰۃ کے لئے جگہ جگہ گئے) لوگوں نے ان کا احترام کیا اور اپنی اپنی زکوٰۃ کے اموال پیش کر دئے۔ چنانچہ ثعلبہ کے پاس بھی دونوں حضرات

پہونچے اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا۔ نیز (جب اس نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھاؤ تو) انہوں نے آنحضرت کی عطا کردہ وہ تحریر بھی جس میں زکوٰۃ (کے قواعد اور ہر جنس کی مقدار وغیرہ کی تفصیل) درج تھی پڑھ کر سنادی۔ اس کو سن کر کہنے لگا یہ تو بالکل جزیہ ہے۔ اچھا اب تو جاؤ میں ذرا سوچ لوں۔ پھر کسی وقت آنا۔ (چنانچہ دونوں صاحب چلے گئے اور دوسروں سے اموالِ زکوٰۃ وصول کر کے پھر ثعلبہ کے پاس آئے تو اس نے تحریر مبارک کو مکرر دیکھا اور پھر یہی کہا کہ یہ تو کھلا جزیہ اور صریح ٹیکس ہے۔ اچھا اس وقت تو آپ دونوں جائیں میں سوچ کر جواب دوں گا۔ چنانچہ یہ لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے تو آپ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا وائے افسوس ثعلبہ کی حالت پر اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد (جب ثعلبہ کے کسی رشتہ دار نے جا کر اس کو حضرت کا ارشاد اور نزول آیات کا حال سنایا تو) وہ زکوٰۃ کے اموال لے کر آیا بھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تیرے صدقات قبول کرلے سے حق تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے۔ ثعلبہ لئے رونا اور سر پر خاک ڈالنا شروع کردیا۔ آپ نے فرمایا یہ خود تیرا ہی کیا ہوا کام (اور تیری ضد کا نتیجہ) ہے۔ میں تجھ سے کہتا تھا مگر تو نے میرا کہنا نہ مانا۔ پھر حضرتؐ کی وفات کے بعد ثعلبہ صدقات لے کر حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر آپ نے بھی قبول سے انکار کردیا۔ (کہ جب حضرت ہی نے قبول نہ فرمایا تو میں قبول کرنے والا کون) پھر (بزمانۂ فاروقی) حضرت عمرؓ کے پاس لے کر آیا (اور چند مہاجرینؓ و انصار کو سفارشی بنا کر ساتھ لایا) مگر آپ نے بھی قبول نہ فرمایا۔ حتّٰی کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں مرگیا۔ امام جلال الدین سیوطی نے بیضاوی کے حاشیہ میں اس قصہ کو بیان کیا اور لکھا ہے کہ ابن جریرؒ ابن ابی حاتم ابن مردویہؒ طبرانی بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابوامامہؓ اس کو نقل کیا ہے۔ میں نے حضرت ممدوح سے پوچھا کیا یہ شخص صحابہ میں تھا اور کیا یہ قصہ صحیح ہے؟ فرمایا میں نے خوب غور کیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مجھے کوئی نظر نہ آیا جس سے اس قسم کا گناہ صادر ہوا ہو۔ اور نہ مجھے اس قصہ کا کہیں وجود نظر آیا۔

ف۔ بندہ نے بھی اپنے ترجمہ میں یہی شان نزول بیان کیا ہے اور اپنے بڑوں کو

بھی اس کی نقل کرتے سُنا اور دیکھا ہے۔ بہرحال آیت شریفہ بتا رہی ہے کہ یہ یا اس قسم کا کوئی اور قصہ کہ اللہ سے عہد و پیمان کرنے کے بعد کسی شخص نے مال کثیر پایا اور پھر بخیل بن کر زکوٰۃ و صدقات دینے سے انکار کیا پیش ضرور آیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی منافق کا قصہ ہو جو صورۃً صحابہ میں شامل ہو۔ واللہ اعلم۔

(۳۱) وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے نکالا بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو، اور ان کو گواہ بنایا انہیں کے نفسوں پر (کہ ان سے پوچھا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے کہا بے شک ہے اور ہم گواہ ہیں۔ (یہ اقرار اس لئے لیا کہ) مبادا قیامت کے دن تم کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ یا کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ یا کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے کیا اور ہم ان کی اولاد تھے جو ان کے بعد آئے تھے تو کیا آپ اس فعل میں ہمیں ہلاک کئے دیتے ہیں جو اہل باطل نے کیا؟ (یعنی اللہ نے حضرت آدم سے لے کر قیامت تک مختلف زمانوں میں یکے بعد دیگرے جتنے بھی انسان دُنیا میں آنے والے ہیں ان سب کو اصلاب آباء سے نکال کر یکجا جمع فرمایا اور بلا واسطہ سب سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تاکہ حجت پوری ہو جاوے اور سزا پاتے وقت کسی کو اپنی لاعلمی و بے خبری کا عذر نہ ہو، اور نہ یہ کہہ سکیں کہ سزا بڑوں کو ملنی چاہیئے جنہوں نے بُری ڈگر نکالی نہ کہ بچّوں کو اُن کے قدم بقدم چلنے میں معذور ہیں)۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ یہ واقعہ عالم ارواح میں ہوا تھا حضرت آدم کی پیدائش کے وقت کہ ان کی پشت سے ان کی اولاد کو نکال کر عقل اور گویائی بخشی اور اُن سے اقرار ربوبیت کرایا۔ یا مضمون آیت از قبیل استعارہ ہے کہ انسان کو دلائل کے ذریعہ اپنی وحدانیت کا علم اور عقل عطا فرمانا گویا اقرار لینا ہے، اور انسان کا عقل و فہم سے بہرہ یاب ہونا گویا اقرار لینا ہے، اور انسان کا عقل و فہم سے بہرہ یاب ہونا گویا ربوبیت الٰہیہ کا گواہ بننا ہے؟ فرمایا کہ یہ واقعہ ہے اور عالم ارواح میں پیش آیا تھا جب حق تعالیٰ نے بنی آدم کو خود اُن کے نفوس پر گواہ بنانا چاہا تو حضرت اسرافیل کو نفخ صور کا حکم دیا۔ ان کے صور پھونکتے ہی ارواح میں ایسی ہول اور ہل چل مچی جیسے حشر کے دن

قبروں سے اُٹھتے وقت ہوگی' بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے حجاب دور فرما دیا اور اپنا کلام قدیم سُنایا (کہ ہر ایک نے بلا واسطہ خطاب الٰہی سُن کر جواب دیا) اس وقت انوار کی قوت وضعف کے اعتبار سے ارواح میں کئی فریق بن گئے۔ ایک فریق وہ تھا جس نے (اقرار ربوبیت کا) جواب محبت کے ساتھ دیا۔ اور وہ ارواح مومنین تھیں۔ اور دوسرے فریق نے جواب ناگواری کے ساتھ جبراً دیا۔ اور وہ کفار کی روحیں تھیں۔ پھر محبت کے جواب دینے والوں میں بھی فرق مراتب تھا کہ بعض میں کلام قدیم سُن کر قوت آئی اور بعض میں کمزوری (غالباً یہ قوی الایمان اور ضعیف الایمان روحوں کا حال تھا)۔ اور بعض وہ تھیں جو کلام قدیم کی لذت سے طرب وسرور میں جھومنے لگیں (غالباً یہ مجذوبین اہل وجد عشاق کی روحیں تھیں) اور بعض وہ تھیں جن کو حق تعالیٰ نے مخلوق کے لئے رحمت بنایا۔ کہ وہ دوسری روحوں کو قوی بنانے کے لئے مدد پہونچانے لگیں چنانچہ اس کا ظہور (حسب تقویت و اعانت) مشائخ و مریدین کی صورت میں ہوا۔ اور اسی دن ارواح میں باہم تعارف ہوا (جیسا کہ حدیث میں منقول ہوا کہ جن ارواح میں وہاں محبت والفت ہوئی وہ دُنیا میں بھی ایک دوسرے سے مانوس ہوئے خواہ کسی زمانہ میں ظہور ہوا ہو۔ اور جن روحوں میں وہاں ایک دوسرے سے وحشت ہوئی ان میں یہاں بھی تنافر ہوا اگرچہ یہ کسی صدی میں پیدا ہوا اور وہ کسی صدی میں)۔ اس کے بعد تمامی ارواح پر کلام قدیم کی سطوت وہیبت چھائی اور وہ اپنے برزخی مکانات میں پھڑک کر اُڑنے لگیں۔ اور راحت وسکون کے خیال سے زمین کی طرف اُترنے لگیں۔ لہٰذا اُن کے اُترنے کے اعتبار سے زمین کی بھی تین قسمیں ہوگئیں۔ ایک وہ جہاں یکے بعد دیگرے صرف مومنین کی روحیں اتریں۔ دوم وہ جہاں گروہا گروہ صرف کفار کی روحیں اتریں۔ سوئم وہ مواضع جہاں دونوں قسم کی روحوں کا نزول ہوا۔ اول الذکر وہ بستیاں ہیں جہاں صرف اہل ایمان واہل معرفت کی سکونت رہے گی اور کبھی کوئی کافر وہاں آباد نہ ہوگا۔ ثانی الذکر اس کے برعکس وہ شہر وہ دیہات ہیں جہاں صرف کفار کی آبادی ہوگی اور کبھی کوئی مسلمان وہاں نہ بسے گا۔ تیسری قسم کے مقامات میں دونوں فریق کی بُاش ہوگی (اور اسی ترتیب سے ہوگی جس ترتیب سے ارواح کا نزول ہوا تھا کہ) سب کے

اخیر جس فریق کے روحوں کا نزول ہوا تھا انہیں کی آبادی پر اس کا خاتمہ ہوگا۔ اگر ارواح مومنین کا نزول آخری تھا تو (قیامت کے دن) وہ دارالاسلام ہوگی۔ اور اگر ارواح کفار اخیر میں آئی تھیں تو اُس کا خاتمہ دارالکفر پر ہوگا۔ اور بعض ممالک ایسے ہیں جہاں پہلے ایک گروہ ارواح مومنین کا آیا اور اس کے بعد دوسرا گروہ ارواح کفار کا۔ اور پھر تیسرا گروہ ارواح مومنین کا آیا اور ان کے بعد ارواح کفار کا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ اترنا ختم ہو گیا (تو اسی کے موافق یکے بعد دیگرے وہاں مومنین و کفار کی آبادیاں ہوں گی) چنانچہ اہل بصیرت جب ایسی جگہ پر نظر ڈالتا ہے جہاں اس وقت اہل شرک کا تسلط ہے تو معلوم کر لیتا ہے کہ ان کے بعد یہ جگہ مومنین کے قبضہ میں آئے گی یا نہیں۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ روز الست کے نزول ارواح کی ترتیب پر نظر ڈالے گا کہ موجودہ مشرکین کے بعد یہاں کن روحوں کا نزول ہوا تھا۔ اگر وہ ارواح مومنین تھیں تو سمجھ لے گا کہ عنقریب یہ جگہ دارالاسلام بنے گی اور اگر ان کے بعد اُترنے والی روحیں بھی کفار و مشرکین کی تھیں تو سمجھ لے گا کہ ابھی اس کو دارالکفر بنا رہنا ہے۔ اسی طرح سلسلہ وار نظر ڈالتا چلا جائے گا اور معلوم کر لے گا کہ کس وقت کوئی دارالاسلام دارالکفر بنے گا اور کس قرن میں کوئی دارالکفر دارالاسلام بنے گا نیز خاتمہ اس کا کس حال پر ہوگا یعنی (قیامت کے دن) دارالکفر ہوگا یا دارالاسلام۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ اس کی شناخت کے دو طریق اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ دارالکفر پر اہل بصیرت نظر ڈالتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے کہ اہل مشاہدہ اور اولیاء اس میں دن بدن بڑھ رہے ہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ عنقریب دارالاسلام بننے والا ہے۔ اور اگر دیکھتا ہے کہ ولی کا کہیں وجود نہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ اس بستی پر اللہ کا غضب ہے (اور بدستور دارالکفر بنا رہے گا) میں نے عرض کیا کہ ایسے دارالکفر میں اگر حق تعالیٰ کسی کو فتح نصیب فرما دے تو وہ کیا کرے گا؟

فرمایا مردانِ غیب اس کی مدد کریں گے اور جسم و بدن کے ساتھ خود اس کے پاس جا کر اس کو علم ظاہر (شریعت محمدیہ کے ضروری مسائل) بتائیں اور پڑھائیں گے۔ کیونکہ جیسے علم باطن کے ساتھ علم ظاہر نہ ہو اتفاق ہی سے اس کو فتح نصیب ہوتی ہے ورنہ اہل فتح وہی ہوتا ہے جو دونوں کا جامع ہو) نیز آپ نے فرمایا کہ علم باطن بمنزلہ

آب زر سے لکھی ہوئی ننانویں سطروں کے ہے تو علم ظاہری سیاہی سے لکھی ہوئی آخری سنوّیں سطر کے ہے۔ اگر یہ سیاہ سطر نہ ہو تو زریں سطریں ساری بیکار ہیں۔ اور ان سطروں والے کی نجات دشوار ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ علم ظاہر گویا مشعل ہے جو رات کے وقت روشنی دے گی اور تاریکیٔ شب میں اس کا بڑا فائدہ نظر آئے گا۔ اور علم باطن گویا دوپہر ہے کہ سورج کی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطن کہنے لگتا ہے اس مشعل کا جو میرے ہاتھ میں ہے کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اللہ نے مجھے دن کی روشنی دے کر اس سے مستغنی بنا دیا۔ اس لئے اس کو بجھا دیتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ دن کی روشنی کو زائل فرما دیتا ہے اور اس پر اندھیری چھا جاتی ہے۔ اس وقت سمجھتا ہے کہ دن کی روشنی کا بقا اسی مشعل کے ہاتھ میں لئے رہنے پر موقوف تھا (کہ اس کو نہ بجھاتا تو حق تعالیٰ اس کی احتیاج کا وقت نہ دکھاتا)۔ نیز آپ نے فرمایا کہ اس دھوکہ میں بہتروں کے پاؤں پھسل چکے ہیں اور جب تک مشعل کو دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے کر روشن کرے دن کی روشنی کبھی واپس نہیں آتی۔ مگر کسی کو حق تعالیٰ توفیق بخش دیتا ہے (اور وہ علم ظاہر کی قدر و منزلت معلوم کر کے اس کو حاصل کر لیتا ہے) اور کسی کو توفیق نہیں بخشتا (اور وہ بھٹکتا ہوا ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے)۔ اور دوسرا طریق شناخت یہ ہے کہ اہل بصیرت دار الکفر پر نظر ڈالتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے کہ مردانِ غیب سے مسجدیں آباد ہیں اور جماعت سے نمازیں ادا کی جاتی ہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ عنقریب دار الاسلام بن جائے گا ورنہ معلوم ہو جائے گا کہ اس زمین پر نحوست کا برسنا مقدر ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۲) میرے پاس ایک تحریر آئی۔ جس میں یہ سوالات تھے۔ کیا حضرت انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت معصوم ہیں؟ اور آیا یہ حکم متفق علیہ ہے یا اس میں کسی کا اختلاف بھی ہے؟ اور آیا گناہِ صغیرہ بھی دربارہ عصمت انبیاء مثل کبیرہ کے ہے؟ پھر برادران یوسف علیہم السلام کے متعلق بتائیے کہ وہ نبی تھے یا نہیں؟ اور اگر نبی تھے تو بھائی اور باپ کی ایذاء رسانی کیسے) جو واقعات پیش آئے ان کا تسلی بخش جواب کیا ہے؟ میں نے جواب دینے کے خیال سے اس تحریر کو اپنی بیاض میں درج کر لیا

اور ارادہ تھا کہ عصمت کے متعلق صاحب مواقف وغیرہ علماء کلام کی تحقیق نقل کروں گا
اور واقعات کے متعلق امام سیوطی کے رسالہ دفع التعسف عن اخوۃ یوسف
سے مدد لوں گا جو مجھے دستیاب ہوگئی تھی۔ اتفاق سے حضرت ممدوح کی نظر میری
بیاض میں اس سوال پر گئی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے یہ تحریر فرمایا۔
الجواب واللہ الموفق للصواب:-

انبیاء علیہم السلام نبوت سے قبل اور بعد ہر حال معصوم تھے۔ اور برادران یوسف
علیہم السلام سے جو کچھ ظہور میں آیا۔ باطنی حیثیت سے وہ اس کے مامور تھے۔ اور حکم اللہ کی
طرف سے تھا۔ اور عتاب صرف ظاہر میں ہے۔ کیونکہ غیب ایک راز ہے اللہ کے ساتھ
(صورت عتاب میں اس کو چھپائے رکھنا کہ افشار نہ ہو) والسلام کتبہ احمد بن المبارک السلجاسی۔
میری طرف جواب اس لئے منسوب فرمادیا کہ تحریر میرے ہی نام آئی تھی۔ اس کے
بعد ارشاد فرمایا کہ حضرات انبیاء پر حق تعالیٰ کے عتاب اکثر اسی قبیل سے ہیں کہ باطن
میں ان کو ایک حکم فرمایا۔ اور ظاہر میں جو حکم تھا وہ اس کے خلاف تھا۔ نبی نے اس
کی تعمیل کی تو ظاہر کے لحاظ سے وہ گناہ بن گیا۔ میں نے عرض کیا کہ جب عمل حق تعالیٰ
کے حکم سے ہے تو گناہ کیسے بن گیا اور اس پر عتاب کا کیا مطلب جب کہ اللہ کی اجازت
سے کیا؟ فرمایا ہاں یہ صحیح ہے مگر جب ان کی نظر حکم ظاہری پر گئی اور دیکھا کہ ہم
سے اس کا خلاف صادر ہوا تو اُن کی نگاہ میں وہ گناہ نظر آیا۔ کیونکہ ظاہر کا محض
خلاف ہونا ہی ان کے نزدیک گناہ ہے۔ میں نے کہا یہ اس کے لئے تو بیشک کافی ہے
کہ نبی کو وہ گناہ نظر آیا، مگر عتاب الٰہی کے صحیح ہونے کو تو کافی نہیں اس لئے کہ
جس خدا نے ظاہری حکم دیا تھا اسی نے باطنی بھی دیا ہے پھر عتاب کیسا۔؟
فرمایا؟ نزول وحی تابع ہوا کرتا ہے خواطر انبیاء کے۔ کہ نبی کے قلب پر جو امر
خطور کرے گا اسی کے موافق وحی نازل ہوگی۔ نبی کو جب اپنا فعل گناہ نظر آتا ہے
تو وہ نفس کو نفرین اور اس پر عتاب کرتا ہے (کہ ایسا کیوں ہوا) ۔ لہذا وحی بھی تبعاً
للخاطر عتاب کی نازل ہوتی ہے۔ نیز فرمایا کہ جس کو خواطر انبیاء کا معلوم کرنا مطلوب
ہو وہ ان پر نازل شدہ آسمانی کتاب میں غور کرے کہ ان کا نزول ان کے خواطر
قلب ہی کے موافق ہوا ہے پس جہاں کتاب میں مخلوق کو نصیحت ہے اس کا نزول

اس وقت ہوا ہے جب کہ نبی کے قلب میں مخلوق کو نصیحت کا خیال تھا۔ اور جہاں کتاب میں بشارت و خوش خبری ہے، اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جب کہ نبی کے قلب میں انبساط اور منافع امت کی محبت تھی۔ اور جہاں کتاب میں وعید اور تخویف مذکور ہے، اس کا نزول اس وقت ہوا جب کہ نبی کے قلب میں انقباض و غصہ تھا۔ اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ عصمت انبیاء کا ثمرہ کیا ہے اور یہ کہ اُن کے تمامی خواطر اور وہ خیالات جو اُن کے قلبِ منور پر گزرتے ہیں سب من جانب اللہ ہوتے ہیں۔

ف یہ ایک واقعہ ہے کہ قتل کے ایک سنگین مقدمہ میں کسی شبہ کی بنا پر جج نے قاتلین کو معمولی قید کی سزا دے دی۔ خفیہ پولیس کا ایک بڑا عہدہ دار تفتیش پر مامور ہوا۔ اس کو سُراغ رسانی کے لئے جیل میں جانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے اُس نے چور بن کر ایک گھر میں نقب لگایا۔ جاگ ہوگئی۔ پکڑا گیا۔ آلاتِ نقب ساتھ تھے۔ زدوکوب ہوئی۔ مشکیں کسی گئیں۔ حوالات میں بند ہوا۔ ہتکڑی پہنا کر سرِ بازار کچہری لایا گیا۔ کٹھرے میں کھڑا کیا گیا۔ مجرم کا انکار کیا آخر گواہوں کی شہادت پر جھوٹا قرار پا کر سزائے قید کا حکم سُنا اور جیل خانہ میں داخل کیا گیا۔ وہاں چکیاں پیسیں۔ بیدیں کھائیں اور مہینوں قیدیوں کی سی ساری خدمتیں انجام دیں۔ آخر ان قیدیوں سے ربط ضبط بڑھا کر جو درحقیقت قاتل تھے اور اُن کا رفیق جیل بن کر حقیقت کا پورا پتہ چلا لیا۔ اس وقت اپنے محکمہ کو اطلاع دی اور وہاں سے حکم آیا باعزت و احترام فوراً جیل سے نکال لیا جائے چنانچہ مقدمہ دوبارہ چلا اور قاتلین کے لیے سزائے موت کا وہ نتیجہ برآمد ہوا جو امن عام و بقاء سلطنت کا ضامن ہے۔ یہ ادنیٰ ترین مثال ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر، انگریزی حکومت کے ماتحت، ایک شریف و معزز آفیسر محکمہ قانون تعزیرات کی صریح خلاف ورزی کرتا، اور باطنی حکم کو اتنا پوشیدہ رکھتا ہے کہ کسی سرکاری ملازم کو بھی پتہ نہیں لگنے دیتا کہ میرا مجرم و سزایاب بننا سرکاری حکم کی تعمیل میں ہے۔ کیونکہ نتیجہ کی ساری کامیابی کا مدار اسی اخفاءِ راز پر ہے۔ پھر کیا پوچھنا حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جن کے قلوب مجسم نور اور امتثال امر الٰہی کا پتلہ ہیں سیدنا یعقوب و سیدنا یوسف علیہ السلام کا وہ ممتد ابتلا و امتحان جو ایک سچی اور ملہمی کہانی بنکر احسن القصص کہلایا اسی ترتیب واقعات کو چاہتا تھا جو برادرانِ یوسف سے صادر

ہوئے۔ اور قدرت الٰہی کا یہ کرشمہ کہ ایک نبی زادہ حسن و جمال کا پتلا بچپن میں لاڈلے باپ سے جدا ہوتا ہے۔ چند کھوٹے ٹکوں کے عوض فروخت ہوتا ہے۔ غلام بن کر مصر میں آتا ہے۔ برسوں طرح طرح کے امتحان میں ڈالا جاتا ہے اور آخر اسی مصر کا حاکم با اختیار ہوتا اور مصر کا بچہ بچہ اس کا زر خرید غلام بنتا ہے، دنیا پر کیسے ظاہر ہوتا اگر برادرانِ یوسف اس کے لوازمات و مقدمات کو خفیہ حکم الٰہی کے ماتحت اس رازداری کے ساتھ انجام نہ دیتے کہ غیر تو غیر خود باپ اور بھائی کو خبر نہ ہوئی کہ صریح ظلم و جفا کی صورت کیوں اختیار کی۔ کیا ٹھکانہ ہے اس اخفاء راز کا کہ بجز خال خال اہل مشاہدہ کے عام مسلمان بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ باطنی حکم الٰہی کا امتثال اور احسن القصص مرتب کرنے کی خاطر تھا۔ رہا یہ امر کہ باطنی حکم کی صورت کیا تھی سو ظاہر ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی الٰہی ہے۔ اگر خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے دیکھیں تو حکم خدا ہونے کے سبب بیداری میں اس کے گلے پر چھری رکھنے میں دریغ نہیں ہوتا پھر کیا پوچھنا بیداری میں قلب پر خطرہ و خیال وارد ہونے کا کہ اس کا امر من اللہ اور وحی خدا ہونا تو صریح ہے اور یا لوح محفوظ کا مشاہدہ ہو کہ امر مقدر من اللہ سے مطلع ہونا ہی امر من اللہ ہے۔ نزول وحی کے تابع خواطرِ انبیاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی اور خاطر قلبی دونوں حسب علم الٰہی مشیت الہیہ کے تابع ہیں مگر قلب نبی کو اصل قرار دے کر حق تعالیٰ اپنے تجویز کردہ امر مقدر کو اول نبی کے قلب پر وارد فرماتا ہے اور پھر اسی کو وحی بنا کر اسی نبی پر نازل فرما دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۲) وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۔ اور (اے محمد) تم لوگوں کا اندیشہ کرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس (کی ناراضی) کا اندیشہ کرو"۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو سید العارفین اور امام الانبیاء والمرسلین ہیں پھر آپ پر حق تعالیٰ نے یہ عتاب کیسا فرمایا؟ حضرت ممدوح نے اس کا جواب بھی وہی دیا کہ حضرت زید نے جب حضرت زینب کو طلاق دینے کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا تو حالانکہ آپ کو علم تھا کہ حضرت زینب آپ کی زوجیت میں آئیں گی۔ مگر آپ نے مشورہ دیا کہ اللہ سے ڈرو اور زینب کو بیوی بنائے رکھو۔ اس کے بعد آپ نے خود اپنے نفس پر عتاب فرمایا کہ لوگوں کا

اندیشہ کرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کا اندیشہ کرو۔ چنانچہ باطن محمدی کے موافق وحی کا نزول ہو گیا اور حق تعالیٰ نے اسی عتاب کے طرز میں آپ کا وارد قلبی ظاہر فرما دیا۔

ف قصہ یہ تھا کہ حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی لڑکی یعنی آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اور حضرت زید ابن حارثہ قبیلۂ بنی قضاعہ کے ایک شریف عرب تھے جن کو بچپن میں ڈاکوؤں نے پکڑ کر سوق حباشہ میں کہ مکہ کے قریب سالانہ منڈی لگا کرتی تھی ان کو بیچ دیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما نے ان کو خرید لیا اور انہوں نے حضرتؐ کی نذر کر دیا۔ حضرتؐ نے ان کو آزاد فرما کر اولاد کی طرح پرورش کیا حتیٰ کہ لوگ ان کو آپ کا متبنّٰی اور زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت زینب سے کر دیا کہ اس میں ننگ و عار کی بھی اصلاح تھی کہ اونچے گھرانے کی عورت کا ایسے شخص سے نکاح کرنا جس پر غلامی کا کبھی نام بھی آ جائے عار معلوم ہوتا تھا۔ نکاح تو ہو گیا مگر حضرت زینب آخر عورت تھیں اور عرب کے بہترین قبیلہ بنی ہاشم کے خاندان کی تھیں اس لئے اُن کی نظروں میں حضرت زید کی وہ وقعت نہ آئی جو شوہر کی ہونی چاہئے تھی اور میاں بیوی کی موافقت نہ ہوئی۔ آخر رات دن کی کلفت سے پریشان ہو کر حضرت زید اس پر مجبور ہوئے کہ طلاق دیدیں اور اس کی اجازت لینے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؐ نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ گھر بیٹھے اللہ نے یہ نعمت بخشی ہے کفر ان سے ڈرو اور صبر و تحمل سے کام لو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مفسرین کے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں کہ لوگوں کی طرف سے وہ کیا اندیشہ تھا جس کو حضرتؐ نے دل میں مضمر رکھا اور اس کی رعایت سے طلاق کا مشورہ نہ دیا۔ بعض کی رائے ہے کہ اندیشہ یہ تھا اگر زید نے طلاق دے دی تو لوگ کہیں گے حضرتؐ نے کیسا بے جوڑ رشتہ کرایا۔ جس کا بناہ نہ ہو سکا بعض کی رائے ہے کہ اندیشہ تھا حضرت زینب کے احترام میں کمی آ جانے کا وغیرہ وغیرہ۔ مگر حضرت شیخ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوا تھا امر مقدر تھا اور حکم الٰہی کی تعمیل میں ہوا تھا۔ آئندہ یہ مقدر تھا اور حضرت کو اس کا علم بھی تھا کہ حضرت زینب آپ کی زوجیت میں آئیں گی۔ گویا یہ

امرتکوینی آپ کے لیے حکم باطنی تھا جس کا مقتضاء یہ تھا کہ آپ حضرت زید کو اجازت دیتے طلاق دینے کی کہ اسی پر حضرت زینب کا ام المومنین بننا موقوف تھا مگر اندیشہ آپ کو یہ ہوا کہ لوگ کہیں گے خود نکاح کرنے کے لیے حضرت زید سے طلاق دلائی۔ ممکن ہے یہ اندیشہ ہو کہ لوگ کہیں گے بہو سے نکاح کر لیا۔ بہر حال لوگوں کی چہ می گوئیوں کا جو بھی اندیشہ تھا محض اس لئے تھا کہ لوگوں کے ایمان برباد ہوں گے اور کہیں یہ فتنہ ضعفاء مسلمین کو مرتد نہ بنا دے۔ اور اس اندیشہ کی رعایت کرنا امر ظاہر کا مقتضاء ...... اور عین دین تھا کہ پیغمبر آتے ہی ہیں کفر سے ایمان کی طرف لانے کو، نہ کہ برعکس۔ لہذا آپ نے طلاق دینے سے حضرت زید کو منع فرما دیا۔ مگر اس کے بعد خود ہی خیال آیا کہ تجویز الٰہی کے خلاف ارتکاب ہوا اور مجھے مناسب تھا کہ امر مقدر من اللہ میں کوئی پس و پیش نہ کرتا۔ اس بناء پر آپ نے اپنے دل میں خود اپنے اوپر عتاب فرمایا اور اس کے موافق آیت شریفہ کا نزول ہو گیا۔ چنانچہ حضرت زید نے طلاق دی، اور حضرت زینب اُم المومنین بنیں۔ اور جن مصالحہ دینیہ کے یہ سب مقدمات ولوازم تھے ان کا ظہور ہوا کہ متبنیٰ بنانے کی رسم ٹوٹی، اور لوگوں نے متبنیٰ کو حقیقی بیٹے اور اس کی بیوی کو سگی بہو ہونے کا جو درجہ دے رکھا تھا عملاً اس کا تخم نکال پھینکا گیا۔ لاکھ زبان سے سمجھایا جاتا مگر لوگوں کو اس پر عمل کرنا دشوار تھا۔ جب کوئی کہتا یہی کہ مانا نکاح حلال ہے مگر فرض تو نہیں ہے، اور دنیا میں عورتوں کا قحط تو نہیں پڑ گیا۔ کیا ضرور ہے کہ جس پر بہو ہونے کا نام آ گیا اسی کو بیوی بنایا جائے۔ زبان بھی اقرار کر لیتی مگر مگر دل کا کھوٹ نکلنا کہ طبیعت خالی ہو کر متبنیٰ کی بیوی کو دوسری حلال عورتوں کی طرح مان لے بغیر اس کے ناممکن تھا کہ حضرت قریشی و ہاشمی خاندان میں ہو کر خود اس پر عمل فرما دیں۔ ایک حلال عورت کو دلوں کا حرام کی فہرست میں داخل کرنا ایمان کے لئے بڑا تاریک پہلو تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے یہ سب صورتیں مقدر ہوئیں کہ زید پکڑے گئے۔ مکہ میں لا کر بیچے گئے۔ حضرت نے اُن کو متبنیٰ بنایا۔ حضرت زینب سے رشتہ ہوا۔ انہوں نے منظور کیا۔ نکاح ہوا مگر نباہ نہ ہوا، اور وہ صورتیں جنہوں نے حضرت زید کو طلاق پر مجبور کیا مقدر بن کر سامنے آئیں، حتیٰ کہ طلاق ہوئی۔ اور آخر کار حضرت زینب ام المومنین بن کر خاتم النبیین کی شرف زوجیت سے بہرہ یاب ہوئیں۔ یہ مقدمات جن سے حد بندی

شریعت کا یہ بہترین نتیجہ نکلا۔ عنداللہ کتنے پیارے ہوں گے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اندیشۂ فتنہ سے بھی امت کو یہ سبق ملا کہ دینی مضرتوں کی رعایت کرنا بھی عین دین ہے۔ اور اسی لئے آیت شریفہ میں احق آیا جس کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کے فتنہ میں پڑنے کا وہ اندیشہ بھی جس پر تم نے عمل کیا اگرچہ حق ہے کہ اللہ ہی سے ڈرنے کی فرع ہے۔ مگر تجویز الٰہی کا علم ہو جانے پر دوسرے پہلو کی رعایت زیادہ احق تھی۔۱۲

نیز حضرت نے فرمایا کہ کتب سماویہ میں غور کرو گے تو اُن کی آیات میں کلام قدیم کا بھی نور پاؤ گے اور جس حالت کا بھی اس وقت نبی کی طبیعت پر غلبہ تھا اس کا بھی اُن میں نور پاؤ گے اور جس حالت کا بھی اس وقت نبی کی طبیعت پر غلبہ تھا اس کا بھی اُن میں نور پاؤ گے۔ مثلاً کبھی قبض کی حالت ہوتی تھی تو اس وقت نازل ہونیوالی وحی میں کلام قدیم کا نور بھی ہو گا اور نور قبض بھی ہو گا۔ اور کبھی بسط کی حالت ہوتی تو اس وقت کی نازل شدہ وحی میں نور کلام قدیم کے ساتھ نور بسط بھی ہو گا اور کبھی تواضع کی حالت ہوتی تھی تو اس وقت جو وحی نازل ہو گی اس میں نور کلام قدیم کے ساتھ نور تواضع بھی ہو گا۔ غرض کوئی آیت بھی نور کلام الٰہی اور نور طبیعت محمدیہ سے خالی نہ ہو گی۔ ان میں پہلا نور قدیم ہے اور دوسرا حادث اسی طرح آیۃ وَتَخْشَى النَّاسَ میں نور کلام قدیم بھی ہے اور نور عتاب بھی ہے کہ اس کے نزول کے وقت طبیعت محمدیہ میں عتاب تھا۔ پس کلام قدیم اللہ کی طرف سے ہے آنحضرت کی طرف سے نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ اہل فتح جب کسی آیت میں بحث کرتے ہیں تو ان کا بڑا اہتمام شان نزول میں ہوتا ہے۔ اور شان نزول سے مراد وہ واقعات نہیں جن پر علماء ظواہر کی نظر جاتی ہے۔ بلکہ وہ انوار اور حالات مراد ہیں جو نزول آیت کے وقت طبیعت محمدیہ پر طاری تھے۔ چونکہ وہ حضرات باطن محمدی یعنی آدمیت، بسط، قبض، نبوت، روح، رسالت، اور علم کامل کے سمندروں میں غوطے لگاتے ہیں اس لئے ان کی تفسیر میں وہ عجائبات ہوتے ہیں جن کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔

ف۔ حقیقت کا علم تو خدا کو ہے مگر مثال کا درجہ یہ ہے کہ رنگ برنگ کے شیشوں میں ایک نور اُس کے جرم کا ہے کہ شیشہ ہے صاف شفاف اور یہ نور اس کا ذاتی و اصلی ہے۔ اور دوسرا نور سبز یا سرخ یا زرد رنگ کا ہے کہ گویا جرم میں پیوست ہے مگر عارض

ہے جزو ذات نہیں واللہ اعلم۔

خلاصہ ان تمام تقریروں کا یہ ہے کہ نبی کا قلب چونکہ مجسّم نور ہے اس لئے جس فعل کا بھی ارادہ وخیال اس پہ وارد ہوتا ہے وہ بمنزلہ وحی من اللہ کے ہوتا ہے۔ گویا ان کو باطناً حکم ہوتا ہے کہ ایسا کریں۔ اور جب یہ شان ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا امتثال طاعت میں داخل ہے خصوصاً جبکہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ان کو نظر بھی آچکا ہو کہ علم الٰہی میں ہم سے اس فعل کا صدور مقدر ہوا ہے۔ لہٰذا وہ بامتثال امر باطنی اس کے فاعل وعامل بنتے ہیں۔ مگر جب دیکھتے ہیں کہ امر ظاہر جس کا نام شریعت ہے اس کے خلاف ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے امر الٰہی کی نافرمانی ہوئی۔ اور اس لئے روتے اور اپنے آپ کو خود ہی نفرین کرتے ہیں کہ ایسا کیوں کیا۔ اور یہ بھی چونکہ اسی قلب پر وارد ہوا ہے جو مجسم نور ہے اس لئے اس نے بھی وہی حکم لیا کہ وحی الٰہی ہے لہٰذا وہ وحی بن کر ان پر نازل ہوگیا۔ گویا پہلا وارد اللہ کا باطنی حکم اور باطنی وحی تھی اور یہ دوسرا وارد کہ حکم ظاہری کی مخالفت کا نفس پر عتاب ہے ظاہری حکم اور ظاہری وحی ہے۔ پس ان کا فعل معصیت بھی نہ ہوا کہ عصمت پر غبار آئے اور عتاب حقیقتہً اللہ کی طرف سے گرفت ومواخذہ بھی نہ ہوا۔ ممکن ہے کہ کوئی یہ شبہ کرے کہ اس تقریر کی رو سے حضرات انبیاء کی شان مسلوب الارادہ کی ہوئی۔ لہٰذا جس طرح ان کی خطا خطا نہیں اسی طرح طاعت طاعت بھی نہ ہو کہ دونوں فعل اسی وارد قلبی پر مرتب ہوئے ہیں جس میں ان کے ارادہ کا دخل نہیں۔ جواب یہ ہے کہ واردات و خطراتِ قلب میں تو بے شک کہہ سکتے ہیں کہ ارادہ کا دخل نہیں ہے مگر فعل کے درجہ میں کون عاقل ہے جو اس کو مان لے کہ اس کا صدور رعشہ کی سی حرکت یا مشین کے پرزوں کی طرح اضطراری و بے شعوری کے ساتھ ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی طاعت بھی طاعت بالارادہ ہے اور یہ خطا جو امر باطنی کے درجہ میں طاعت ہے۔ اور محض امر ظاہری کے درجہ میں صورت خطا ہے۔ یہ بھی بالارادہ ہے۔ نیز جو عتاب بر نفس اور گریہ وزاری کا ترتب ہوا ہے اس میں بھی اختیار وارادہ کا پورا دخل ہے انسان ہمیشہ تقدیر کے مسئلہ کو سامنے لا کر جرأت کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ ہم اپنے افعال میں مجبور ہیں کہ تقدیر کے خلاف نہیں کر سکتے۔ انہیں جبر کے خیال کو تو دل سے نکال ہی دینا چاہیے جب کہ وہ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہماری حرکت رعشہ کی سی نہیں ہے۔ اگر ہمارے

یہ افعال جبری و غیر اختیاری ہیں تو بتاؤ آگے چل کر رعشہ کی حرکت کا یا مثلاً کوئی پکڑ کر جبراً ہمیں کنوئیں میں ڈالدے تو اس کا کیا نام رکھو گے۔ اگر جبراً یہیں پورا ہو گیا تو جس کو دُنیا جبر سمجھ رہی ہے اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیئے۔ بہر حال افعال حضرات انبیار کے بھی ارادی ہیں فرق اتنا ہے کہ وہ مجسم نورُ ہیں اس لئے صورت خطا بھی ان کی طاعت ہے، اور ہمارے قلوب میں چونکہ ظلمت بھی ہے اس لئے نہ ہمارا وارد وحی ہے' اور نہ وہ ہمارے لئے باطناً امر من اللہ ہے۔ اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ظاہر شرع کو چھوڑیں۔ لہذا ہمارا جو فعل اس امر ظاہری کے موافق ہو گا وہ طاعت میں درج ہو گا اور جو اس کے خلاف ہو گا وہ معصیت وخطا قرار دیا جائے گا۔ دوسرا شبہ ممکن ہے یہ ہو کہ مسلوب الارادہ ہونا تو صوفیہ کے نزدیک کمال عبدیت ہے اور جگہ جگہ اولیاء و انبیار کی شان یہی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے اندر فعل الہٰی کے تصرف کا مشاہدہ کرتے اور خوب سمجھتے ہیں کہ ہم بمنزلہ ظروف خالیہ کے ہیں۔ بھلا بُرا جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے ہوا ہے کہ تصرف کا حق اس کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ اور اسی بنا پر مدح وذم ان کے نزدیک یکساں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کو علم الیقین ہے کہ سب من اللہ ہے۔ لہذا خوب سمجھ لو اور یاد رکھو کہ اس کا مطلب اُس ارادہ کی نفی نہیں ہے جو صدور فعل سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ مراد ہو تو ساری شریعت ہی اُٹھ جائے اور اللہ کا قانون جو بغرض تنفیذ بھیجا گیا ہے معطل ہو جائے۔ نہ سارق کا ہاتھ کاٹا جائے کہ وہ بھی من اللہ ہوا ہے اور نہ زانی کو سنگسار کیا جائے کہ وہ بھی تصرف الہٰی ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہی مسلوب الارادہ اور مخلوق کو ظروف خالیہ سمجھنے والے حضرات ہم دیکھتے ہیں کہ قانونِ الہٰی کے حامل اور سب سے زیادہ اس پر عامل ہوئے اور اس کی تنفیذ کا جتنا اہتمام کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے مگر حدود و تعزیرات کا اجراء نہ ٹلے' ان حضرات نے کیا ہے دُنیا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا مسلوب الارادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ارادۂ نفسانی اور اس کا استقلال سلب ہو چکا ہے کہ ان کا ارادہ ارادۂ الہٰیہ کے ماتحت و تابع بن گیا ہے۔ جو بھی اللہ کا ارادہ ہوتا ہے وہی ان کا ارادہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ خلاف کرنے کا ان میں مادہ ہی نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اُس ارادہ سے کرتے ہیں جو تابع ہے رضائے حق کے کہ پہلے حکم الہٰی

کا علم ہو جاتا ہے خواہ فرشتہ کے ذریعہ ہو یا الہام و القا کے ذریعہ جس کا نام وارد قلبی و خواطر قلوب ہے۔ اس کے بعد فعل کا ارادہ کرتے ہیں۔ برخلاف ہمارے کہ ہم شریعت کے مکلف ہیں اور جان بوجھ کر کہ اللہ کی رضا اس فعل میں ہے' اس کے خلاف کا ارادہ اور پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے افعال کا صدور نفسانی ارادہ کی طرف منسوب ہے اور مستحق سزا ہے۔ رہا یہ امر کہ ہوا وہ بھی بامر تقدیری ہے۔ سو بے شک صحیح ہے۔ مگر اس کا علم ہمیں صدور فعل کے بعد ہوا ہے۔ کیونکہ نہ لوح محفوظ کو ہم نے دیکھا اور نہ دیکھ کر فعل کا ارادہ کیا۔ پس کتنا فرق ہے اس میں کہ ایک شخص کو امر مقدر یعنی تجویز خداوندی کا پہلے علم ہو جائے اور وہی اس کے لئے محرک ہو فعل کا' اور اس میں کہ امر تقدیری سے جاہل و ناواقف بن کر فعل کا محرک بنائے ذاتی قصد نفسانی ارادہ کو اور پھر اس کو سر چپکائے مقدر کے۔ ایک ڈاکٹر فصد کھولتا ہے اور خون نکالتا ہے۔ تو وہ محسن و مستحق حمد ثنا ہے۔ اور ایک ڈاکو چھری مارتا ہے قتل کے ارادہ سے مگر وہ پڑ جاتی ہے رگ پر اور فصد کا کام دے جاتی ہے' وہ مجرم اور مستحق سزائے قتل ہے۔ طرہ براں عامی شخص کی یہ تحویل بھی صرف غلطیوں میں ہے۔ ورنہ طاعات اور خوبیوں کو پھر بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے' بلکہ ان پر خوش ہوتا' ناز کرتا' دوسروں سے مدح سرائی چاہتا' اور ان کے صلہ اور انعام کا اللہ پر حق جتاتا ہے۔ طاعت کے متعلق اس کا یہ رویہ اور اقتضار طبعی اس پر حجت ہے کہ معصیت و خطا کی بھی شان یہی ہونا چاہیے تھی کہ روتا' بلبلاتا' شرماتا اور تڑپتا۔ مگر اپنے عیب کو براہ تکبر اپنی طرف منسوب کرنا گوارہ نہ کرتے ہوئے متھے مار رہا ہے تقدیر کے اور منسوب کر رہا ہے اللہ سبحانہ کی طرف۔ ورنہ کم از کم صدور طاعت پر جیسا سکون و سرور لاحق ہوا ہے ایسا ہی صدور معصیت پر اضطراب و حزن لاحق ہوتا اور پھر یوں کہتا کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ مزید براں۔ تقدیر کے سامنے اگر سر جھکانا اس کو نصیب ہو گیا ہے جیسا کہ صدور معصیت کے وقت اس کا دعویٰ ہے تو جس وقت حق تعالیٰ اسی معصیت کا نام رکھ کر اس کو قانونی سزا دلائے مثلاً سنگسار کرائے یا ہاتھ کٹوائے اگر اس پر بھی اسی طرح سر جھکائے رہے کہ یہ بھی امر مقدر اور من اللہ ہے تب تو دعوے کا ثبوت دے دیا۔ اور اگر غصہ بڑھتا ہے کہ واہ صاحب خود ہی کرائیں اور

خود ہی پڑوائیں تو معلوم ہوا کہ محض دھوکا دینا مقصود ہے رضا بر قضا خاک نہیں۔ ورنہ
جس نے معصیت صادر کرائی اسی نے سزا بھی دلائی ہے۔ اس کے کیا معنی کہ اُس وقت
راضی و مگن تھے اور اب ناخوش ہو گئے اور جھلا اُٹھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دو
شخص جہنم میں پڑے ہوئے بہت شور وغوغا مچائیں گے۔ حکم ہوگا ان کو سامنے لاؤ۔
چنانچہ دربار الٰہی میں پیش کئے جائیں گے۔ دریافت کیا جائے گا کہ کیوں چیخ چلا رہے ہو؟
عرض کریں گے بار الہٰا تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ توبہ ہے اب ہم پہ رحم فرما دیجیے۔
حکم ہوگا توبہ کا زمانہ گزر چکا واپس جاؤ جہنم میں۔ چنانچہ فرشتے پھر ان کو کشاں
کشاں جہنم کی طرف لے جائیں گے کنارہ پہ پہونچ کر ایک تو کھڑا ہو جائے اور دوسرا
اپنے آپ کو جہنم میں جھونک دے گا۔ اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تم کھڑے کیوں
ہو گئے؟ عرض کرے گا کہ رب العزت اس امید پہ کہ آپ کا کرم جس بدحال کو ایک
مرتبہ جہنم سے نکال لیتا ہے دوبارہ اس میں نہیں ڈالا کرتا۔ میں ایسا بدنصیب کیوں
بن گیا کہ جہنم سے نکالنے کے بعد پھر اُسی میں جھونکا جاؤں۔ حکم ہوگا اچھا جاؤ جنت
میں۔ دوسرے سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ایسا خیال کیوں نہ کیا اور بے دریغ
جہنم میں کیوں چلے گئے؟ عرض کرے گا کہ بار الہٰا آپ کے حکم کی تعمیل میں کہ اگر آپ
کی رضا اسی میں ہے تو سر آنکھوں پر۔" راضی ہوں میں اسی میں جس میں تری رضا ہے"۔
حکم ہوگا اچھا جاؤ جنت میں۔ دیکھا آپ نے رضا بر قضا کا ثمرہ اور کبھی آپ نے کلُّ مِّنْ
عِنْدِ اللّٰہِ کے سامنے سر جھکانے کی حقیقت اگر واقعی صدور معصیت کے وقت آپ
کی رضا بر قضا حقیقی ہے تو جہنم میں جانے پر امتحان ہو جائے گا اور پھر یقیناً ارتکاب
معاصی کا انجام بھی نجات و دخول جنت ہوگا۔ ورنہ یہاں باتیں بنانے سے علماء
بلکہ انبیاء کو بھی اگر ساکت ولاجواب کر دیا تو کیا حاصل اور محض زبان درازی ہے۔
حضرات انبیاء کی یہی شان ہے کہ اپنے اندر اور تمامی مخلوق کے اندر تصرفات الٰہیہ
کو ہمہ وقت جاری وساری دیکھتے ہیں۔ اس لئے رضا بر قضا اور شان تسلیم وتفویض
کے تقاضہ سے سب کچھ من اللہ سمجھتے اور اُن کے سر امور تکونیہ کے سامنے جھکتے
ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی امور تشریعیہ یعنی قانون الٰہی کو بھی جس کا حامل ومنفذ
بنا کر ان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے من اللہ سمجھتے اور اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور اسی

میں ان کا ابتلا وامتحان ہوتا ہے کہ کبھی ان کے لئے فعل ایسا مقدر کیا جاتا ہے جس میں تکوین کہتی ہے کرو' اور تشریع کہتی ہے نہ کرو۔ اور یہی تلوار سے زیادہ تیز بال سے زیادہ باریک راستہ ہے۔ مگر بحمد اللہ بڑی خوبی سے یہ سرداران خلق اس کو عبور کرتے ہیں کہ امر تکوینی کا امتثال بھی کیا اور فوراً آگیا۔ اور امر تشریعی کے امتثال میں قصور پاکر روئے اور فوراً آروئے۔ مگر اس قصۂ زید و زینب میں امتحان کی دوسری شان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امتثال فرمایا امر ظاہر کا اور فتنہ و ہیجان کی رعایت کو ترجیح دے کر حضرت زید کو مشورہ دیا حسن معاشرت کا۔ پھر نظر گئی امر مقدور اور تکوین باطنی پر تو ندامت ہوئی اور عتاب ہوا اپنی ذات مطہرہ پر۔ لیکن دیگر انبیاء میں عموماً اس کا عکس ہوا ہے کہ امر باطنی کا امتثال سبب ہوا ہے خلاف امر ظاہر کا۔ اس میں خاص نکتہ اور دقیق اشارہ ہے اس طرف کہ طبیعت محمدیہ نے عمل کے درجہ میں امر ظاہری کو امر باطنی پر ترجیح دی اور شریعت ظاہریہ کا احترام غالب رکھا ہے امور باطنیہ پر۔ ذرا دیکھو عظمت اس شریعت بیضاء کی جس کو آج امت ہی پامال کر رہی ہے اور اپنے خیالی تصوف کو بھی اس پر ترجیح دے کر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اور ذرا سمجھو احترام حاملین شریعت یعنی علماء امت کا کہ ان کی غلطی بھی دوسروں کے صواب سے عندالرسول راجح العمل ہے۔ اور اس میں خصوصی سبق اہل باطن بلکہ اہل مشاہدہ کو ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۴) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اللہ تمہیں معافی بخشے تم نے اس سے پیشتر ان کو اجازت کیوں دی کہ وہ بھی تم پر ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور وہ بھی تم کو معلوم ہو جاتے جو جھوٹے ہیں۔"

واقعہ یہ تھا کہ ۹ھ میں قیصر روم نے دو لاکھ باقاعدہ لشکر سے مدینہ پر حملہ کرنے کا ایسے وقت ارادہ کیا جب کہ گرمی شدید پڑ رہی اور کھجور کی فصل جس پر اہل عرب کا گزران تھا تیار کھڑی تھی۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تہیہ فرمایا کہ اس ٹڈی دل کو شام وعرب کی سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ اس غزوہ کا نام غزوۂ تبوک ہے۔ یہ غزوہ ہر جہت سے سخت ترین غزوہ تھا جس نے کھرے اور کھوٹے کو

علیحدہ کر کے رکھ دیا اور اسی لیے اس کو فاضحہ یعنی رسوا کرنے والا بھی کہتے ہیں کہ منافقوں کی اس میں قلعی کھل گئی۔ جب آپ نے سفرِ جہاد کا اعلان فرمایا تو منافقوں نے طرح طرح کے بہانے اور سفر سے معذوری کے جھوٹے اعذار پیش کیے۔ جو بھی کوئی عذر لایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرما کر اجازت دے دی کہ بہتر ہے اگر نہیں جا سکتے تو گھر بیٹھو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ منافقوں کی چال تھی تاکہ جنگ میں بھی نہ جانا پڑے اور نفاق پر بھی پردہ پڑا رہے۔ آپ کو اجازت نہ دینا چاہیے تھی کہ جانے نہ جانے کا مدار عذر کی حقیقت پر رہتا اور آپ کی اجازت کو آڑ نہ بنایا جاتا۔ دنیا خود دیکھ لیتی کہ فلاں شخص واقعی معذور ہے اور فلاں شخص محض حیلہ جو ہے)۔ اس میں تین شبہات ہیں۔ اوّل وہی کہ عتاب ہے سید الانبیاء پر۔ دوّم اظہار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا اور سچا معلوم نہ تھا اور مومن و منافق میں امتیاز نہ فرما سکے۔ سوّم عفو مثبت خطا ہے (کہ معافی اس کو دی جاتی ہے جو غلطی کرے)۔ اس کے متعلق بھی حضرت ممدوح نے اسی کے قریب قریب فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا عفو و مسامحت اور بہترین طریق سے مدافعت کا۔ حتیٰ کہ ارشاد ہوا ہے۔ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اے محمد اگر تم ترش زبان اور سخت دل ہوتے تو لوگ کبھی کے تمہارے پاس سے بھاگ لیے ہوتے لہٰذا ان کی غلطیوں کو معاف کرتے رہو اور معاملات میں اُن کا مشورہ لے لیا کرو۔ چنانچہ مخلوق کے ساتھ آپ کا یہی (نرم اور چشم پوشی کا ہمیشہ) برتاؤ رہا۔ جب منافقین آپ کے پاس آئے اور عذرات پیش کر کر کے سفر سے معافی ملنے کی درخواست کی تو آپ نے باوجودیکہ ان کے نفاق سے واقف تھے طبعی شفقت و مرحمت کی بنا پر۔ اور نیز اس لیے کہ آپ کو معاشرت میں بہترین صورت اختیار کرنے کا حکم تھا اور متعدد آیات میں آپ کو اس کی ترغیب دی گئی تھی، صرف ان کی ظاہری صورت پر حکم لگایا اور ان کو (مدینہ میں رہ جانے کی) اجازت دے دی۔ اس کے بعد خود ہی آپ کے قلب میں خیال پیدا ہوا کہ ان کا تو پردہ کھلتا اور کھوٹ ظاہر ہونا چاہیے تھا۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت میں شرم و حیا کا مادہ زیادہ تھا۔ چنانچہ (جب طعام ولیمہ کھا چلنے کے بعد بھی لوگ نہ اٹھے تو) حق تعالیٰ

نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ہ کہ مسلمانو! تمہارے اس طور طریق سے نبی کو ایذا پہونچتی ہے اور وہ اگر تم سے (یہ کہتے ہوئے کہ اب رخصت ہو جاؤ) شرماتے ہیں مگر اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ اس بنا پر آپ کی یہ خواہش تھی کہ حق تعالیٰ ہی اس کی بھی کفالت فرمائے اور عتاب الٰہی کی صورت میں کوئی آیت قرآنیہ نازل فرمادے تاکہ مجھ پر کوئی بات بھی نہ آوے اور نصیحت بھی زیادہ مؤثر بن جائے اور تنبیہ بھی ہو جائے کہ آئندہ نبی کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کبھی نہ کریں۔ کیونکہ نزول آیت سے یہ سبق ملے گا کہ منافقوں کے برتاؤ پر گرفت و مخاصمت میں اللہ اپنے نبی کا وکیل ہے) جو عالم الغیب اور شدید البطش ہے)۔ غرض صورت عتاب متعدد مصالح کو متضمن ہے' ورنہ حقیقت میں عتاب ہی نہیں۔ صرف حبیب کی اپنے محبوب کے بدلہ مقدمہ میں پیروی ہے (کہ تم بیٹھو ہم سب دیکھ لیں گے بس اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی مالی مقدمہ میں کوئی وکیل اپنے وکیل سے کہے اللہ تم کو معاف کرے تم نے ایسی غلطی کیوں کی کہ اس بدمعاش کو قرض دے کر اس کا کام چلا دیا۔ جب تک در بدر بھیک مانگتا نہ پھرتا اس کو تو کھوٹا پیسہ بھی نہ دینا چاہیئے تھا)۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ آپ کو عذر کرنے والوں میں سچے اور جھوٹے کا امتیاز نہ تھا کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں۔ آپ سے تو کیا چھپا رہ سکتا تھا۔ جب کہ اس زمانہ کا اہل فتح بھی اس زمانہ کے سچے اور جھوٹے سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔ حالانکہ تمامی اہل فتوح کو جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت کی بدولت نصیب ہوا ہے کہ انوار محمدی کے ایک بال برابر مقدار سے ان کو سیرابی بخشی گئی ہے (اور اس کی روشنی سے دل کی تہ میں چھپا ہوا نفاق اور کاذب کا کذب نظر آجاتا ہے)۔ پھر حضرت کا تو کیا پوچھنا جب کہ حدیث انزل القران علی سبعۃ احرف میں معلوم ہو چکا کہ آپ کے علم کی کیا کیفیت تھی۔ ۱۲

امام بیضاوی نے اس جگہ بڑی غلطی کھائی ہے کہ لکھتے ہیں عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ اشارہ ہے کہ در بارۂ اذن منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا صادر ہوئی کیونکہ معافی کسی غلطی ہی پر ہوا کرتی ہے۔ حاشیہ پر شیخ الاسلام علامہ زکریا نے لکھا ہے کہ اس

میں امام بیضاوی نے زمخشری کا اتباع کیا ہے اور زمخشری کے بارہ میں علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ اس مقام پر زمخشری نے بڑی فاش غلطی کھائی میں حیران ہوں کہ اس قسم کے اشارات سے لطائف کا استخراج بھی ان کو یاد نہ رہا یعنی معافی کا سب سے پہلے ذکر کرنا (آخر کیا اشارہ کر رہا ہے یہی تو) کہ مخاطب مستحق تعظیم اور واجب الاحترام اور قابل توقیر ہے۔ اور واقعہ ہے کہ ذات محمدی معظم و محترم ہے۔ پھر ایسے موقع پر جہاں اظہار عظمت ہو رہا ہو عفو کا لفظ لا کر اسکی خطاء و غلطی کا اظہار کرنا کیسے مناسب ہو سکتا ہے۔ (اگر خطا کا اشارہ مقصود ہوتا تو خطا وار چونکہ مستحق تعظیم و احترام نہیں رہتا۔ لہذا پہلے خطا کا اظہار کیا جاتا اور یوں کہا جاتا تم نے اجازت کیوں دی تھی ؟ خیر جاؤ اب کے تو ہم نے معاف کر دیا مگر آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا) پس یہاں مقتضاءِ اشارہ یہ ہے کہ اظہار عفو بھی تعظیم ہی کے لئے ہے۔ جیسے بڑوں سے کہا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو معاف بخشے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا۔ نیز کہا کرتے ہیں اللہ آپ سے راضی ہو میری درخواست کا کیا جواب ہے ؟ (اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ آپ سے ناراض ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ راضی ہو جائے)۔ نیز علامہ تفتازانی لکھتے ہیں زمخشری کو زیبا نہ تھا کہ اس بری عبارت سے مضمون ادا کرتے جب کہ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کے احترام کی کتنی رعایت فرمائی ہے کہ عفو کو پہلے ذکر کیا (تاکہ خطا کا ثبوت و انتساب ہی نہ ہو سکے)۔ پھر اذان کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو آپ کے علو مرتبہ اور قوت تصرف کی خبر دے رہا ہے (کیونکہ اجازت دینا بزرگ یا حاکم ہی کا منصب ہوتا ہے۔ چھوٹے سے کوئی نہیں کہا کرتا کہ آپ نے اجازت کیوں دے دی)۔ پھر مان لو کہ مقصود انکار ہی ہو (کہ اجازت دینی نہ چاہیے تھی) تب بھی کلام بصورت استفہام آیا (کہ اجازت آپ نے کیوں دی ؟ اس کی کوئی معقول وجہ ہو تو بیان فرمائیے۔ یہ طرز اختیار نہ کیا کہ تمہارا اجازت دینا غلط اور خطا تھا یا تم کو اجازت دینے کی کوئی حق نہ تھا پس جس ذات مقدسہ کی حق تعالیٰ اتنی رعایت فرما دیں وہاں یہ کہہ دینا کہ عفو اشارہ کر رہا ہے خطا کی طرف ایک فاش غلطی ہے)۔ علاوہ ازیں اللہ تم کو معاف کر دے (خطا ہی کے موقع پر نہیں بلکہ) اولیٰ اور افضل کے چھوڑنے پر بھی کہہ دیتے ہیں۔ (جیسے کہا کرتے ہیں اللہ معاف فرمائے مجھ سے تو نفلیں کھڑے

ہو کر نہیں پڑھی جاتیں) بلکہ کبھی محض تعظیم و جلالت شان ظاہر کرنے کے لیئے بولتے ہیں (جیسے کسی حاکم کو خطاب کریں اللہ آپ کو معافی بخشے میرے معاملہ میں آپ نے کیا کیا)۔ نیز علامہ سیوطی نے بیضاوی کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس بارہ میں بیضاوی نے زمخشری کا اتباع کیا ہے۔ حالانکہ صاحب انتصاف کہتا ہے کہ یہ دو باتوں سے خالی نہیں۔ یا تو مُرادِ خداوندی یہ نہیں ہے جو بیضاوی نے بیان کی ہے۔ تب تو اس کا خطا ہونا ظاہر ہے۔ اور اگر یہی مُراد ہے تب بھی بیضاوی نے خطا کی کہ اللہ پاک نے تو جلالت شان محمدی کی رعایت فرما کر کنایہ و اشارہ کا استعمال کیا۔ مگر بیضاوی نے بڑی صفائی سے اس کا اظہار کر دیا۔ کیا آداب الہیۂ سے سبق لے کہ ہمیں ادب کا برتاؤ تہ کرنا چاہیئے خصوصًا در بارۂ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز قاضی عیاض نے شفاء میں لکھا ہے کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ کلام شروع کرنے کے لئے ہے جیسے (مضمون شروع کرنے سے قبل محاورہ ہے) اللہ آپ کو صلاحیت بخشے اور اللہ آپ کو عزت بخشے (اس کے آگے درخواست کا مضمون لایا جاتا ہے)۔ اور اسی نکتہ کی وجہ سے دیندار اتقیاء نے تفسیر کشاف کے پڑھنے اور پڑھانے سے منع کیا ہے (کہ مفسر نے اس میں ورع و احتیاط کا التزام نہیں رکھا)۔ واللہ اعلم۔

(۳۵) وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ " ہم عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں"۔ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ اس عذاب سے مُراد عذاب دنیوی ہے یا عذاب اُخروی؟ اور آیت سے تو معلوم ہوتا ہے بلوغ دعوت شرط ہے (کہ جب تک رسول کی معرفت احکام الہیہ قوم کو پہونچ نہ جائیں عذاب نہ دیا جائے گا) اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شرط نہیں (چنانچہ منقول ہے) کہ پاگل اور مخبوط الحواس کو جنہیں سمجھ نہیں ہے قیامت کے دن بغرض امتحان آگ میں گھسنے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر انہوں نے کہنا مان لیا تو جنت میں بھیج دیا جائے گا (کیونکہ معلوم ہوا راحت اور تکلیف کا شعور نہیں رکھتا)۔ اور اگر کہنا نہ مانا تو دوزخ میں ڈالا جائے گا (کیونکہ معلوم ہوا عقل رکھتا ہے لہذا رسول آئے یا نہ آئے ایمان نہ لانے پر عذاب کا مستحق ہے)۔

آپ نے فرمایا دنیوی عذاب مثلاً خسف و رجم وغیرہ کے لیئے تو بلوغ دعوت شرط ہے جب تک رسول نہ آئے گا اور قوم پر اس کی نافرمانی کرنے سے حجت پوری نہ ہوجائے گی نہ

ان کو زمین میں دھنسایا جائے گا نہ اُن پر پتھر برسائے جائیں گے۔ مگر عذاب اُخروی کے لئے نبی کا آنا شرط نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قوم یاجوج وماجوج میں سے ایک کا بھی دوزخ میں جانا صحیح نہ ہوتا (کیونکہ اُن کی جانب کوئی بھی پیغمبر نہیں آیا)۔ حالانکہ دوزخ میں جانے والوں میں بڑی تعداد انہیں کی ہوگی۔ میں نے کہا ایک حدیث میں تو آیا ہے کہ شب معراج میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ان پر گزر ہوا اور آپ نے ان کو عبادت خدا کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے انکار کیا لہذا (حجت پوری ہوگئی اور) وہ بھی نافرمان بنی آدم کے ساتھ جہنمی بن گئے۔ آپ نے فرمایا (یہ قصہ غلط ہے) ایسا نہیں ہوا۔ جامع کتاب کہتے ہیں محدثین کا قول بھی یہی ہے کہ حدیث مذکور کی سند میں نوح ابن ابی مریم آیا ہے جو جھوٹی حدیثوں کے گھڑنے میں مشہور ہے اور جس کے بارے میں امام ابن حبان نے فرمایا ہے کہ اس میں ہر چیز موجود ہے بجز سچائی کے (یعنی کذاب ہے سچ بولنا جانتا ہی نہیں) واللہ اعلم۔

(۳۶) میں نے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شان تو حق تعالیٰ نے اس ظاہر فرمائی وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ اور تمہارے رفیق (یعنی محمدؐ) دیوانہ نہیں ہیں۔ اور حضرت جبریل کے بارہ میں ارشاد ہوا رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین "سفیر الٰہی ہیں' عالی مقام ہیں' وہاں (یعنی گروہ ملائکہ میں) سردار ہیں' صفت امانت میں ممتاز ہیں"۔ فرمایا کہ قرآن کا نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نور حق سے ہوتا تھا اور اس کی عبارت اس حالت کو اخذ کرتی تھی جو اس وقت آپ پر غالب ہوتی تھی۔ اور اُس وقت آپ پر تواضع کی شان کا غلبہ تھا کہ حضرت جبریل کو بڑا اور اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتے تھے۔ اور ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ اپنے ماقبل یعنی حضرت جبریل کی طرف جو اوصاف منسوب ہوئے ان کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔ گویا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جبریل کے بارہ میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی خبر تم کو وہ پیغمبر دے رہا ہے جس کی سچائی وامانت سے اور اس سے کہ جو بات ہے وہ سمجھ کر کہتا ہے تم لوگ واقف ہو۔ اور جب مخبر اس درجہ کا ہو تو خبر ضرور قابل وثوق ہوگی۔ وہ دیوانہ نہیں ہے کہ جس بات کا علم نہ رکھتا ہو اس کو زبان سے نکالے غرض

نہ ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ ماقبل کو مخاطبین کی عقل میں بٹھانے کے لئے ہے۔ لہذا یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں تو صفت سلبیہ پر اکتفا فرمایا (کہ جنون کی نفی فرمادی) اور حضرت جبرئیل کی تعریف میں بڑے بڑے اوصاف بیان فرمائے۔

(۲۷) وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ہ ستارہ کی قسم جب وہ اترنے لگے کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ راستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں میں نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ثابت کرنے میں حق تعالیٰ نے جماد محض یعنی ستارہ کی قسم کیوں کھائی اور اس میں اور نور رسالت میں کیا مناسبت ہے جس کی بناء پر قسم کھانا موزوں ہو؟" فرمایا ستارہ کی قسم محض اس کے جماد ہونے کی وجہ سے نہیں کھائی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں وہ نور حق موجود ہے جو بر و بحر کی اندھیریوں میں راستہ ملنے کا ذریعہ ہے۔ فرض کرو دو آدمی سفر کے لئے وطن سے چلے اور راستہ بھول گئے۔ نہ کوئی ساتھ ہے نہ خورد و نوش کا سامان پاس ہے۔ حتیٰ کہ دونوں کو یقین ہو گیا اب مر جائیں گے اور بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کو ستاروں کی شناخت اور ان کے ذریعہ سمت سفر اور راستہ معلوم کرنے سے واقفیت بھی اس لئے وہ تو رات آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا اور جب ستارے نمودار ہوئے تو ان کے پیچھے لگ گیا۔ حتیٰ کہ منزل مقصود پر پہونچ گیا مگر دوسرے شخص کو نہ ستاروں کی شناخت تھی اور نہ طریقہ معلوم تھا کہ ان کے ذریعہ راستہ کا پتہ کیونکر چلا کرتا ہے اور نہ اس نے اپنے ساتھی کی تقلید کی (کہ واقف کا دامن پکڑ کر پیچھے ہو لیتا)، تو ظاہر ہے کہ جنگلوں میں بھٹکتا پھرے گا اور آخر مر رہے گا مرنے کے بعد بھی نعش پر گرمی و سردی کا اثر پڑے گا اور اس کی وجہ سے سوکھا چنا بن جائے گا۔ یہی حالت ہے لوگوں کی پیغمبر کے ساتھ کہ ایک فریق ان کو سچا سمجھتا اور ان کے پیچھے لگ لیتا ہے۔ حتیٰ کہ دار النعیم اور مقام کریم و عطاء عظیم پر جا پہونچتا ہے جیسے ستارہ کے پیچھے لگ لینے والا مسافر اس مقام پہونچ گیا جہاں اعزہ و احباب بھی موجود ہیں اور خورد و نوش کی تمام لذتیں بھی فراہم ہیں۔ اور دوسرے فریق نے رسول کو جھوٹا سمجھا اور اس کے اتباع سے گریز کیا تو غضب خداوندی میں مارا مارا پھرا حتیٰ

کہ مر گیا اور جہنم نے اپنی آگ سے اس کو جھلسایا اور خنکی سے اس کو ٹھٹھرا دیا۔ جیسے دوسرے مسافر کو بعد مرگ گرمی و سردی نے سکھا دیا۔ ستارہ اور پیغمبر چونکہ راہنمائی کے بارہ میں ہم شکل تھے اس لئے صحت رسالت پر ستارہ کی قسم کھائی۔ ورنہ درحقیقت، تو نورِ حق کے ایک فرد کی جس سے لوگ واقف تھے قسم کھا کر نورِ حق کا دوسرا فرد جس سے وہ ناواقف تھے محقق فرمایا ہے۔ میں نے عرض کیا اور آدھی رات سے کیا مراد ہے؟ فرمایا جبکہ وہ سطِ فلک سے نیچے اُتر آئے۔ کیونکہ جب تک بیچ آسمان پر رہے گا تو کوئی بھی اس سے راستہ معلوم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ کسی ایک جانب کو مائل ہی نہیں ہوا تو کسی جہت کا پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ واللہ اعلم۔

(۳۸) ارشاد فرمایا کہ الصمد حق تعالیٰ کا ایسا نام ہے کہ تمامی مخلوقات اس سے سیراب کی جاتی ہے۔ خواہ درخت ہو یا پتھر، اور مٹی ہو یا ڈھیلا، اور ذی روح ہو یا غیر ذی روح۔

(۳۹) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ہ (اے محمدؐ) ہم نے تم کو فتح بخشی تاکہ اللہ بخش دے تمہارے اگلے پچھلے گناہ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دے اور تم کو راہِ مستقیم پہ چلائے اور تمہاری مدد فرمائے زبردست مدد، میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ فتح سے کیا مراد حق تعالیٰ کا مشاہدہ ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ امر طے شدہ تھا کہ مخلوق ساری حق تعالیٰ کی معرفت سے فائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر سب ہی عارف باللہ ہو جاتے تو صرف ایک گھر (یعنی دارِ جنت) رہ جاتا۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے گھر دو تجویز فرماتے ہیں (یعنی دارِ دوزخ بھی بنایا ہے)۔ لہٰذا بجز ان کے جن پر رحمت نازل فرمائی منظور تھی باقی سب پر حجاب ڈال دیا اور اپنے فعل کے مشاہدہ سے بھی ان کو روک دیا اور اپنی ذات پاک کے مشاہدہ سے بھی روک دیا۔ کیونکہ اگر حجاب اٹھا دیتا اور حقیقت مکشوف ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے اس کے ارشاد کے موافق کہ وہ فرماتا ہے هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ہ ہم انسان کی شہ رگ سے

بھی زیادہ قریب ہیں وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِی عَنِّی فَاِنِّی قَرِیْبٌ ۵ اور جب (اے محمد) تم سے میرے بندے دریافت کریں میرے متعلق تو بتا دو کہ بلاشبہ میں قریب ہوں۔ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۔ اس سے کم ہوں یا زیادہ بہرحال اللہ اُن کے ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہوں (نیز ان کو نظر آتا کہ) اُن کے تمامی افعال اللہ کے مخلوق ہیں اور وہی ان کا خالق ہے نہ کہ وہ خود۔ اور وہ خود تو بمنزلہ ظروف اور خالی اجسام کے ہیں جن کو حق تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۵ اور اللہ ہی نے پیدا کیا تم کو اور تمہارے اعمال کو جو تم کرتے ہو۔ اور جب کہ سب کو یہ دونوں مشاہدے واقعہ کے موافق ہوتے تو کوئی بھی کبھی معصیت نہ کر سکتا اس لئے کہ معصیت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ اللہ سے پس پردہ ہو، اللہ کو بھولا ہوا ہو، اللہ سے بے خبر و غافل ہو۔ اور مومنین اس کا اگرچہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہاں اللہ ہی ہم میں فاعل و متصرف ہے اور اسی کا ارادہ غالب ہے مگر یہ اعتقاد کبھی سامنے آتا ہے اور کبھی اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور اس کا سبب وہی حجاب ہے کہ ان کا یہ اعتقاد محض ایمان بالغیب ہے، مشاہدہ و معاینہ کا نہیں۔ (یعنی بغیر دیکھے محض بتانے سے مان لیا ہے اس لئے جگنو کی روشنی کے مثل ہے کہ کبھی چمکی اور کبھی بجھ گئی)۔ اور جس پر حق تعالیٰ فضل فرماتا ہے اس سے حجاب دور کر دیتا ہے اور اپنے مشاہدہ سے اس کو نواز دیتا ہے۔ لہٰذا اس کو حق ہی حق نظر آتا ہے کہ حق ہی کی طرف سے ابتدا ہے اور حق ہی کی طرف انتہا۔ بس یہ ہے جس کی طرف فتح مبین سے اشارہ کیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ فتح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کب حاصل ہوئی؟ فرمایا بچپن سے، کہ آپ پر حجاب کسی وقت بھی نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ فتح تو ہر نبی کو بلکہ ہر عارف کو حاصل ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کون خصوصیت ہوئی۔ (جو اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ سے تعبیر فرمایا کہ ہم نے تم کو فتح نصیب فرمائی)۔ فرمایا فتح بلحاظ قوت و ضعف بہت مختلف ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اس کی طاقت کے موافق دی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں عقل اور روح اور نفس اور ذات اور سِر اور حفظ غرض ہر لحاظ

سے جو قوت موجود ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ حتیٰ کہ تمامی اہلِ فتح خواہ انبیا ہوں یا اولیاء سب کو جمع کیا جائے اور قوت جس کا ہم نے اشارہ کیا ہے مجموعہ پر ڈالی جائے تو سب (رانگ کی طرح) پگھل جائیں اور اُن کے ابدان پاش پاش ہو جاویں۔

ف ممکن ہے وہی جبر کا شبہ ہو۔ اس لئے گزشتہ تقریر پر نظر ڈال لی جائے اور دو باتیں یہاں اور سمجھ لی جاویں۔ اول یہ کہ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اعمال کو بندوں کی طرف منسوب کر رہا ہے کہ وہ اعمال جو تم کر رہے ہو اللہ ہی کے مخلوق ہیں لہٰذا نقلاً آیت قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ اعمال میں عامل کے ارادہ کو دخل ہے۔ دوم عقلاً ہمیں اپنے ہاتھ کی اختیاری حرکت میں اور رعشہ کی اضطراری حرکت میں فرق معلوم ہو رہا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ دونوں کو غیر اختیاری و جبری بنا کر یکساں بنا دیں۔ البتہ بندوں کے ظروف خالیہ اور حق تعالےٰ کے فاعل و متصرف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے فعل و تصرف ہی کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جن میں ارادۂ انسانی کا واسطہ نہیں ڈالا جاتا جیسے رعشہ کی حرکت دینا کہ یہ بھی من اللہ ہے مگر اختیاری ہے۔ اسی ارادہ کے توسط و عدم توسط پر عذر و عفو اور سزا و جزا کا مدار ہے تلوار پر باوجودیکہ ارادہ سے محروم ہے محض توسط و آلہ ہونے کے سبب خون کی آلودگی و شکستگی کا اثر آتا ہے اور مالک کی رغبت و نفرت کا سبب بنتا ہے تو کیا پوچھنا جبکہ ارادہ و اختیار کا واسطہ بھی درمیان میں پڑ جائے۔ دوسری بات یہ کہ حق تعالیٰ کے فعل و تصرف کا مشاہدہ مانع و زاجر ہے معصیت سے۔ اور ہم معصیت کے ارتکاب ہی پر اس کو دلیل لاتے ہیں اپنے بے قصور ہونے کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم مشاہدے سے محروم ہیں اور اس کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہمیں دعوےٰ ہے کہ ہاں عنقریب دنیا چھوٹے گی اور ہم قبر کے گڑھے میں جا سوئیں گے۔ مگر اسی کو دنیا طلبی کا آلہ بنائے ہوئے ہیں کہ مرنا تو ہے ہی، لہٰذا خوب کما لو جو کمانا ہے اور مزے اُڑا لو جو اُڑانا ہے۔ یہ علامت ہے کہ ہم نے موت کی کو نہیں سمجھا۔ جس وقت اس کا مشاہدہ ہوگا اور وہ نظر کے سامنے آ کھڑی ہوگی کہ روح قفسِ عنصری سے نکلنے لگے گی تب معلوم ہوگا کہ موت کے یقین کا کیا اثر ہوتا ہے۔ غرض یہ خود مشاہدۂ فعل الٰہی ہے

غفلت و بیخبری کا ثمرہ ہے کہ اس کو معاصی میں اپنی بے قصوری کا آلہ بنا لیا ہے۔ اگر حقیقی مشاہدہ نصیب ہو تو معصیت کا صدور ہی نہ ہو سکے گا، اور اگر ہو گا تو روتے روتے بُرا حال ہو جائے گا۔ نہ یہ کہ حق سبحانہ پر...... بے باکانہ الزام اور آئندہ معاصی پر دلیر کرنے والا سکون۔ چنانچہ جن کو یہ مشاہدہ ہوا ہے اُن کے حالات بتا رہے ہیں کہ ان سے زیادہ طاعت کا ذخیرہ کوئی نہ لا سکا۔ پس اگر عالم میں فعلِ الٰہی و تصرفِ خداوندی کا یہ مقتضا ہوتا جو ہم نے اس کے ایمان بالغیب میں سمجھ رکھا ہے تو مشاہدہ والوں پر تو اس سے بدرجہا زیادہ اپنی بے قصوری اور افعال کے جبری و اضطراری ہونے کا یقین اور معاصی پر جرأت و دلیری کا اثر طاری ہوتا۔ اور جب صورت حال اس کے برعکس ہے تو معلوم ہوا ہم نے ایمان بالغیب میں بھی اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اپنے کو حقیقت شناس سمجھ کر اللہ پر گرفت اور اس کی طرف ظلم منسوب کرو، دعا مانگو کہ حق تعالیٰ حقیقت شناس بنائے۔ واللہ اعلم۔

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا ۔۔۔ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

ابو یحییٰ شریف تلمسانی نے اس حقیقت کی جستجو میں بہت کچھ دماغ و عقل کو دوڑایا اور آخر اس حد تک پہونچے کہ گناہ کے تین درجے ہیں۔ ایک محل صدور یعنی نفس امارہ۔ ایک اس کی حقیقت یعنی خلاف حکم کرنا۔ ایک اس کا اثر یعنی ظلمت قلب جس کا ذکر آیت کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ میں ہے کہ زنگ آ گیا ہے اُن کے دلوں پر۔ اور جس طرح گناہ کا اطلاق اپنی حقیقت یعنی مخالفت پر ہوتا ہے اسی طرح محل صدور اور اثر پر بھی مجازاً اس کا اطلاق ہوتا ہے نیز مغفرت کا اشتقاق غفر بمعنی ستر سے ہے جس کا ترجمہ ہے چھپانا اور اس کے بھی تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ جو سب میں زیادہ قوی ہے یہ ہے کہ شئے کا وجود ہی نہ رہے۔ یعنی پردۂ عدم میں چھپ جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کا وجود تو ہو مگر اس کا ادراک کر لینے والا حاسہ نہ ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ وجود بھی ہو اور حاسہ مدرکہ بھی ہو مگر درمیان میں کوئی چیز آڑ بن جائے کہ ادراک نہ ہو سکے۔ مثلاً رات کا وقت کہ آفتاب کا وجود ہی نہ رہا اور وہ پردۂ عدم میں چھپ گیا۔ یا دن کا وقت

اندھے کے لئے کہ آفتاب موجود ہے مگر اس کو دیکھنے والی بصارت مفقود ہے۔ یا گھٹا کا سماں کہ آفتاب بھی موجود ہے اور بصارت بھی موجود ہے مگر ابر حائل ہوگیا جس کی وجہ سے آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ اور یہ چھپنے کا ضعیف ترین درجہ ہے کہ ذرا بادل ہٹ جائے تو سورج نظر آجائے گا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گناہ سے آیت ما تقدم من ذنبك وما تاخر میں محل صدور اور حقیقت گناہ مراد ہے نہ کہ اثر۔ اور مغفرت سے مراد اعلیٰ درجہ یعنی پردۂ عدم میں چھپانا ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے آپ سے نفس امّارہ اور مادۂ مخالفت کو معدوم فرما دیا۔ اس سے اثر کا معدوم ہونا خود لازم آجائے گا۔ اور اگر اثر مراد لیا جاتا کہ ظلمت گناہ کو دور فرما دیا تو محل صدور یعنی نفس اور حقیقت یعنی خلاف حکم کا صدور منتفی نہ ہوتا۔ اور یہ اوّل تو عصمت سے خلاف ہوتا کہ اگرچہ زنگ اتر گیا مگر مادۂ مخالفت موجود ہے تو عصمت کہاں رہی۔ دوم اتنا تو عام مسلمان بلکہ گناہگار میں بھی پایا جاتا ہے کہ توبہ کر لے گا تو اثر گناہ یعنی زنگ دُور ہو جائے گا مگر نفس امارہ اور نفس مخالفت باقی رہے گی۔ پس اگر گناہ سے مُراد حقیقت گناہ یعنی مخالفت لی جائے تب تو لفظ مِنْ بمعنی عَنْ ہوگا اور یہ ترجمہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے مخالفت سے جو شئے مقدم ہے یعنی محل صدور اور نفس امارہ اس کو بھی معدوم فرما دیا۔ اور نیز مخالفت سے جو شئے مؤخر ہے یعنی اثر گناہ اور ظلمت قلب اس کو بھی معدوم فرما دیا۔ اور اگر گناہ سے مُراد حقیقت و مجاز دونوں لئے جائیں تو ما تقدم سے مُراد حقیقت گناہ ہے کہ فعل مخالفت کو معدوم فرما دیا، اور ما تاخر سے مراد اثر گناہ ہے کہ زنگ و ظلمت کو بالکل مٹا دیا۔ کیونکہ مخالفت کا وجود مقدم ہوتا ہے اور اثر کا وجود مؤخر۔ ۱۲۔

علامہ مذکور کی تقریر سے مطلب تو قریب قریب وہی ادا ہوگیا جو حضرت ممدوح نے بیان فرمایا۔ مگر فتح کی تفسیر شیخ کے موافق نہ ہو سکی۔ حالانکہ مسئلہ کی روح وہی ہے۔ انہوں نے فتح سے مُراد لیا قضا و قدر۔ یعنی اے محمد ہم نے تمہارے لئے مقدر فرمایا۔ مگر مقتضیٰ بہ کو معین نہ کیا کہ کیا مقدر فرمایا۔ جب تک وہ معین نہ ہو مغفرت و تکمیل نعمت اور ہدایت و نصرت کی تفریع کس پر ہوگی۔ اور شیخ کی تفسیر نے سب مراحل طے کر دیئے کہ اے محمد ہم نے تم کو مشاہدۂ کاملہ نصیب فرمایا تاکہ مادۂ گناہ تم سے معدوم ہو جائے، اور تاکہ نعمت الٰہیہ تم پر تمام ہو جائے، اور تاکہ تم کو ہدایت اور

معارف حاصل ہوں، اور تاکہ تم ملک حقائق کے منصور و فاتح قرار پاؤ۔ واللہ اعلم۔

(۴۰) فلا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (وہی غیب کا حال جاننے والا ہے پس کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔ مگر ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمالے (تو اس کو غیب کی بات بتا دیتا ہے اور) اس کے آگے اور پیچھے نگہبان چلتے ہیں۔ تاکہ معلوم فرمائے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہونچا دیئے اور اللہ نے احاطہ کر رکھا ہے ان کی سب چیزوں کا اور گن رکھا ہے ہر شے کو"۔ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ اپنے غیب پر بجز پیغمبر کے کسی کو مطلع نہیں کرتا حالانکہ اولیاء عارفین کو بھی کشف ہوتا ہے اور وہ غیب کی بات مثلاً ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی بتا دیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ آیت سے مقصود کاہنوں اور عرائین کا نکالنا ہے کہ جنات ان کے تابع ہوتے تھے (جو اوپر تلے چڑھ کر آسمان کے قریب پہونچ کر دنیا میں ہونے والے واقعات کا اہل تصرف فرشتوں میں جو تذکرہ ہوتا تھا اس کو سن لیتے اور ان کاہنوں کو پہونچا دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس ایک بات میں اپنی طرف سے دس جھوٹ ملا کر غیب دانی کا سکہ جماتے اور) اہل عرب ان کے معتقد ہو جایا کرتے کہ ان کو غیب کی ہر بات معلوم ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عقیدۂ فاسدہ کو جس طرح نفس الامر میں دور فرمایا کہ آسمان پر چوکیدار بناکر فرشتے تعینات فرما دیئے۔ تاکہ غیبی خبر معلوم کرنے کے لئے اگر جنات میں سے کوئی آسمان کے پاس آئے شہاب ثاقب مار کر اس کو جلا دیا جائے۔ اسی طرح قولاً اس عقیدۂ باطلہ کا ازالہ فرمایا پس مقصود اپنے بندوں کو باطل سے پھیر کر حق پر لا جمع کرنا ہے۔ اور اولیاء اللہ تو حق میں شامل ہیں لہٰذا وہ خارج نہ ہوں گے۔ نیز فرمایا کہ اکثر الفاظ عام ہوتے ہیں مگر اس کے نور کے تار بعض افراد کو مخصوص بنا دیا کرتے ہیں لہٰذا عارف کی نظر نور کے تاروں پر جایا کرتی ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ان کا نزول فلاں فلاں مثلاً صرف زید عمر بکر پر ہو رہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہے کہ فقط یہی افراد مراد ہیں۔ دوسرے لوگ مراد نہیں۔ اور اگر دیکھتا ہے کہ نور کے تار تمامی افراد ہیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تو کلام اللہ کے دہن مبارک سے نکلنے کے قبل ہی یہ معلوم ہو جاتا تھا۔ کیونکہ وہ نور کے تار اول آپ کے قلب پر پڑا کرتے تھے تاکہ آپ مراد

خداوندی کو سمجھ لیں۔ (حضرت ممدوح کی مراد اس سے عام مخصوص البعض تھا کہ آپ اُمّی محض اور علمی اصطلاح سے ناواقف تھے) میں نے عرض کیا کہ پھر بھی آیت شریفہ میں رسول کی تخصیص ولی کو تو خارج کر دے گی۔ فرمایا غیر الرسول کو خارج کر یگی اور ولی تو (خادم الرسول ہونے کے اعتبار سے) رسول کے حکم میں داخل رہے۔ دیکھو اگر نواب یا جاگیر دار کاشتکاروں کی جانچ کے لئے اپنے علاقہ میں گشت کرے گا تو تنہا نہ جائے گا۔ اس کے ہمراہ اس کے خواص و مصاحبین اور نوکر چاکر بھی ضرور ہوں گے۔ اور جس موضع میں وہ جائے گا وہاں یہ بھی جائیں گے، اور جو کھیت و باغات وغیرہ وہ دیکھے گا ان کو یہ بھی دیکھیں گے۔ اسی طرح پیغمبر کے لئے بھی اُمت میں خدمتگار و غلام اور احباب و اصحاب ضرور ہوں گے۔ تو جن مغیبات پر پیغمبر کو مطلع کیا جائے گا ان کا کچھ حصہ ان ہمراہیوں اور اصفیاء اُمت کو بھی ضرور ملے گا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ آیۃ شریفہ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط اللہ ہی کو علم ہے قیامت کا (کہ کب آئے گی) اور وہی بارش برساتا ہے (کسی کو خبر نہیں کب برسے گی) اور وہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے (نر ہے یا مادہ) اور کسی کو خبر نہیں کہ کل کو کیا کرے گا اور کسی کو پتہ نہیں کہ کس زمین میں جا کر مرے گا۔ نیز حدیث میں ہے خمس لا یعلمھن الا اللہ پانچ چیزوں کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں یہی پانچ چیزیں گنوائیں۔ اس میں علماء و محدثین کا بہت اختلاف ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ان پانچ چیزوں کا علم تھا یا نہیں؟ فرمایا حضرتؐ سے یہ چیزیں کیسے مخفی رہ سکتی ہیں جب کہ اُمت کے اہل تصرف اولیاء بغیر اس کے کہ یہ چیزیں ان کو معلوم ہوں اور بغیر تصرف عوالم کی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ شب قدر کی بابت بھی علماء میں اختلاف ہے کہ اس کا علم آپ کے ذہن سے نکال لیا گیا تھا اور اسی لئے آپ نے فرمایا کہ اس کو تلاش کرو۔ انتیسویں شب میں، یا ستائیسویں میں، یا پچیسویں میں۔ ورنہ اگر آپ کو علم ہوتا تو معین تاریخ بیان فرماتے (کہ فلاں تاریخ میں ہوگی)۔ اس پر حضرت ممدوح کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ سبحان اللہ اگر شب قدر آوے اور میں مُردہ پڑا

ہوں کہ گدھے کی طرح پیٹ پھول کر میری ٹانگ بھی اوپر اُٹھ گئی ہو تو اس حالت میں بھی واللہ مجھے اُس کا علم ہو جائے گا۔ پھر سید الوجود صلے اللہ علیہ وسلم سے تو مخفی کیسے رہ سکتی ہے؟!

چنانچہ حضرت ممدوح نے متعدد سالوں میں شب قدر کا اُس کے آنے سے قبل تعین فرما کر ہمیں تاکید فرمائی کہ اس میں عبادت کا اہتمام کریں۔ ایک مرتبہ ماہ رجب میں تعیین فرمایا۔ دوسرے سال ماہ شعبان میں، اور تیسرے سال ماہ رمضان میں اور چوتھے سال شب عید الفطر میں، اور فرمایا کہ وہ ہر سال منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح جمعہ کی ساعت مقبولہ کا تعین فرما کر ہمیں بتادیا کرتے تھے۔

ف - یہ آیت شریفہ سورۂ جن کی ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے جنات کو آگ سے پیدا فرمایا ہے اس لئے وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ اور ان کی رفتار بھی بجلی کی طرح بہت سریع ہے کہ ایک لمحہ میں ہزاروں میل طے کر لیتے ہیں۔ شیاطین بھی جنات ہی کی ایک قسم ہیں جن کی سرشت کفر و طغیان پر رکھی گئی ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو امور خیر کی ترغیب دیتا ہے، اور ایک شیطان ہے جو اس کو کفر و معاصی پر چلانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس شیطان کو ہمزاد کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے۔ مشرکین میں بعض لوگ سفلی عملیات کے ذریعہ ان کو اپنا مسخر و تابع بنالیا کرتے اور ان کے ذریعہ ملکوں ملکوں کی وہ چیزیں جو انسان کی نظر سے اوجھل ہیں معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر لوگوں کو بتا کر اپنی غیب دانی کا سکہ جمایا کرتے تھے۔ ان کا نام کاہن تھا اور جس قدر بھی زیادہ ہمزاد کسی کے مسخر ہوتے تھے اسی قدر وہ بڑا کاہن سمجھا جاتا۔ حتیٰ کہ تقدیری معاملات جو لوح محفوظ سے منتقل ہو کر یکے بعد دیگرے آسمانی فرشتوں کی معرفت فلک دُنیا کے اُن فرشتوں پر ڈالے جاتے تھے جن کو عالم دُنیا میں اُن کے جاری کرنے کا واسطہ بنایا گیا تھا تو بعض دفعہ ان مسخر شیاطین کو قبل از تنفیذ اس کی بھی اطلاع مل جاتی تھی کہ ایک دوسرے کے کندھوں پر اوپر تلے چڑھ کر آسمان دُنیا کے قریب تک پہونچتے اور فرشتوں میں جو چرچا اور تذکرہ ہوتا کہ فلاں کام فلاں وقت ہوتا ہے اس کو لے اڑتے اور اپنے کاہن کو سُنایا کرتے۔ یہ لوگ اس میں دس باتیں اپنی طرف سے ملاتے اور لوگوں کو

سنا کر اپنا معتقد وگرویدہ بنایا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ سب کچھ مادیات اور طبعیات کا کھیل تھا۔ مگر عام انسانوں کی طاقت سے چونکہ بالا اور نظروں سے اوجھل قصہ تھا اس لئے لوگ حیران ہوتے خصوصاً جب قبل از وقت ایک بات کو سنتے اور اسی کے موافق پاتے تو ان کی عقیدت بڑھتی اور کاہنوں کو عالم الغیب اور متصرف عالم سمجھ کر گویا ان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ تک یہ صورت قائم رہی۔ حتیٰ کہ آپ کے قرب ولادت کی خبریں جو عرب کے مشہور کاہنوں نے لوگوں کو سنائیں وہ بھی اسی قبیل سے تھیں۔ مگر چونکہ آپ پر کلام اللہ کا نزول ہونا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے جنات وشیاطین کی آسمان تک رسائی نہ ہونے کا انتظام فرمادیا کہ فرشتے تعینات کر دیئے۔ اگر کوئی جن یا شیطان چوری چھپے آوے تو آگ کے انگارے اس پر مارے جائیں چنانچہ شہاب ثاقب اسی کا نام ہے۔ یہ اس غرض سے تھا کہ نظام عالم اور مادی طاقتوں کو بحالہا قائم رکھتے ہوئے کہ ابتلاء وامتحان کا مدار اسی پر ہے وحی الٰہی جو نبی تک پہونچنی ہے محفوظ ہوکر پہونچے اور پہلے سے کوئی اچک کر اپنے کاہن کو نہ پہونچا دے۔ ورنہ دعوئے نبوت اور ثبوت وحی میں خلل واشتباہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح پر کلام اللہ اور نیز وہ واقعات مستقبلہ جن کا اظہار بزبان پیغمبر ہونا تھا سب دائرۂ حفاظت میں آ گئے۔ مگر دنیوی ممالک اور بلاد بعیدہ کی خبروں کا معلوم کرنا بدستور رہا اور اب تک جاری ہے۔ کہ جنات کو مسخر بنا کر ان سے طرح طرح کے وہ کام لیتے ہیں جو انسانی طاقت سے باہر ہیں مگر جنات کے لئے وہ معمولی باتیں ہیں۔ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی غیب کی خبریں سنتے تھے اس لئے آپ کو کاہن سمجھتے اور اسی لفظ سے آپکو یاد کیا کرتے تھے۔ کاہنوں کی دی ہوئی خبریں جنات اور ہمزاد شیاطین وخبائث کے ذریعہ حاصل کی ہوئی ہیں جن کی قوت رفتار لوگوں کی نظروں سے مخفی ہے۔ اور ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ٹیلگراف یا ٹیلیفون کے ذریعہ ایک لمحہ میں لندن کی خبر کا معلوم کر لینا۔ یا ریڈیو میں امریکہ کی خبر کا ایک سکنڈ میں اپنے کانوں سن لینا۔ کہ برقی طاقت یا ہوائی قوت واسطہ بنی ہوئی ہے جو نظر نہیں آتی۔ پس اگر کوئی شخص ان مصنوعات الٰہیہ کے ذریعہ ملکوں ملکوں کی خبریں معلوم کر کے غیب دان کہلایا جا سکتا ہے تو کاہن بھی غیب دان سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح منجم ہو یا رمال اور جفار ہو یا عراف

محض ستاروں کی رفتار یا دیگر علوم ظنیہ کے واسطے سے وہ آئندہ کے واقعات پر بھی جو حکم لگاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر سے مان سون اٹھتا ہوا دیکھ کر بروئے حساب یہ حکم لگانا کہ فلاں جگہ پر فلاں دن بارش ہو گی۔ یا مثلاً کسی تپ زدہ کو معمولی مقدار سے دو چند کنین کھلا کر یہ حکم لگانا کہ کل کو اسے بخار ہرگز نہ آئے گا۔ پس اگر اس کا نام علم غیب رکھا جا سکتا ہے تو منجم وجفار وغیرہ کے علم کو بھی علم غیب کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم غیب کی حقیقت وہ علم ہے جس میں کسی مخلوق کا بھی واسطہ نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صرف اللہ ہی کا علم ہے اور اسی لئے وہ ذاتی اور قدیم وازلی ہے۔ اسی لئے عقیدہ ہے کہ عالم الغیب بجز اللہ کے کوئی نہیں ہے اور اسی لئے اس آیت میں بھی فلا یظہر علی غیبہ سے غیب کو اپنی طرف منسوب اور اس کا اظہار فرمایا کہ غیب صرف اللہ کا ہے اور اسی کے لئے مخصوص ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ جیسے ایجاد اور تخلیق مخصوص ہے اللہ سبحانہ کے ساتھ کیونکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ توسط مادہ کے بغیر نیست کو ہست فرمائے۔ پس والدین کو بچہ کا خلاق نہیں کہہ سکتے اگرچہ بچہ کا وجود بظاہر ان سے صادر ہو رہا ہے کیونکہ اس میں مادۂ منویہ اور عالم اسباب کی مصنوعات الہٰیہ کا واسطہ پڑا ہوا ہے۔ اور نہ ٹیلیفون وغیرہ ایجادات جدیدہ کو حقیقتاً ایجاد کہا جا سکتا ہے جب کہ تصرف ہے ان ہی مادیات میں جن کو حق تعالیٰ نے بصورت خاصیت یہ قوتیں بخشی ہیں اور دو چار مختلف مصنوعات الہٰیہ کی باہم ترکیب وخلط سے ایک نئی صورت بن گئی ہے۔ لہٰذا خالق وموجد بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اس لئے کہ اس کی تخلیق ذاتی اور بلاواسطہ ہے اور وہ معدوم کو موجود بنانے میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہے۔ رہا یہ فرق کہ اہل کشف اولیاء اور مہبط وحی حضرات انبیاء علیہم السلام بھی تو غیب کی خبریں دیتے ہیں، ان کی خبروں میں اور کاہن ومنجم وغیرہ اہل باطل کی خبروں میں کیا فرق ہے؟ اس کو حق تعالیٰ شانہ نے اس آیت شریفہ میں ظاہر فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل باطل کی خبروں میں توسط ہے مادیات وعلوم ظنیہ کا یا کلمات شرکیہ وارواح خبیثہ کا، اور حضرات انبیاء کی اطلاعات میں تمامی اسباب عادیہ کا پردہ چاک کر دیا گیا ہے اور براہ راست اللہ عالم الغیب کی طرف سے مطلع فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ یقینی بھی ہوں گی، اور ان کا انتساب خالص

اللہ کی طرف ہوگا' اور وہ دلیل نبوت یعنی معجزہ بھی نہیں گی' اور ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوگا۔ برخلاف اہلِ باطل کی اطلاعات کے۔ اُن کے وسائط سب ظنی اور مخلوق من اللہ ہیں۔ لہٰذا اسباب ہی کی طرف منسوب ہیں۔ اور چونکہ دعویٰ کیا جاتا ہے اُن کے یقینی ہونے کا اور اُن کے ذریعہ مقابلہ کیا جاتا ہے معجزۂ انبیاء و مکاشفات اولیاء کا اس لیے ان کا انکار ضروری ہوگا اور ان کے ساتھ عقیدت قریب بکفر ہوگی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے اونٹنی سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور یہ عالم اسباب میں اس قانون کے ماتحت ہے جس کو حق تعالےٰ نے بطریق عادت دنیا میں جاری فرمایا اور ایک معمولی بات بن گئی ہے۔ مگر بدعاء صالح علیہ السلام پتھر سے اونٹنی کا بچہ پیدا ہونا ایک معجزہ ہے۔ ہر چند کہ ہر اونٹنی سے بچہ پیدا فرمانا حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے مگر قانونِ عادت کے ماتحت ہونے کے سبب منسوب ہوگا۔ اسباب کی طرف اور پتھر سے بچہ پیدا ہونے میں چونکہ اسباب عادیہ چاک ہوچکے اور وہ خالص قانون قدرت الٰہیہ کے ماتحت ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف ہوگا اور نبی کے لئے دلیل نبوت قرار پائے گا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ کاہن و منجم وغیرہ کی اطلاعات نہ محفوظ ہیں نہ کسی کے لیے مخصوص۔ ایک کاہن جو خبر اپنے مسخر جن کے ذریعہ حاصل کر رہا ہے وہی خبر دوسرا کاہن اپنے مسخر جن کے ذریعہ حاصل کر سکتا بلکہ کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلے لے آوے' اور ممکن ہے وہ پہلے لے آوے۔ اور جو بھی پہلے لے آئے گا دوسرے کو اس کا نقال و سارق کہا جا سکتا ہے۔ یہی حال نجوم و جفر وغیرہ کا ہے کہ جو کوئی بھی ریاضی و حساب و علم کواکب سے کام لے گا وہ امر مخفی کو معلوم کر لے گا۔ برخلاف نبی کی اطلاعات کے کہ وہ محفوظ ہوتی ہیں اور نا ممکن ہے کہ کوئی دوسرا ان کو معلوم کر سکے۔ پہلا فرق فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ سے واضح فرمایا کہ غیب اللہ کا ہے اور اس کا علم اسی کے لیے مخصوص ہے۔ بلا توسط مادیات و علوم عادیہ اس پر آگاہی بجز رسول کے کسی دوسرے کو نہیں دی جاتی۔ لہٰذا وہ ولادت عیسیٰ اور ولادت ناقۂ صالح علیہ السلام کی طرح خاص اللہ کی طرف منسوب ہے' اور اسی لیے اس کا نام معجزہ ہے' اور وہ نبوت کی علامت ہے' اور اس کا ماننا ہے۔ برخلاف منجم و کاہن وغیرہ کی خبروں کے کہ وہ مادیات اور اسباب عادیہ کی

طرف منسوب ہیں، اور اس لئے یقینی بھی نہیں، اور ان کا ماننا بندہ اسباب بننا ہے۔
یہی سبب ہے کہ منجم و کاہن حریص و دنیا طلب متکبر اور خدا سے غافل بلکہ دل میں
گویا خدائی کا دعویٰ کرنے والا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے معتقدین پر بھی بُرا
اثر پڑتا ہے کہ اسی کو عالم الغیب سمجھتے اور اس کی گویا پرستش کرنے لگتے ہیں برخلاف
نبی و ولی کے جتنا بھی منجانب اللہ اُن پر مغیبات کا انکشاف ہوتا ہے اسی قدر وہ زاہد و
خائف اور خاشع و خاضع بنتے اور حق تعالیٰ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اسی طرح اُن
کے معتقدین پر اچھا اثر پڑتا ہے کہ وہ پیغمبر کو نہ خدا سمجھتے ہیں نہ عالم الغیب، بلکہ مہبط وحی
اور محترم عند اللہ قرار دے کر اللہ کی دی ہوئی اطلاعات کا مظہر و مخبر مانتے ہیں، اور
شانِ توحید میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں کے اثرات و نتائج کا فرق ایسا
جلی ہے کہ ان کے ذریعہ عامی بھی حق اور باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ اور
دوسرا فرق فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ سے ظاہر فرمایا گیا کہ بلا توسط
اسباب جو خبر نبی کو دیجاتی ہے اس پر آگے پیچھے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ چوکی تعینات
ہوتا ہے کہ کوئی جن یا بشر اداس تک رسائی نہیں پا سکتا، اور نہ کوئی سبب مادی یا
علم یا تجربہ ان کا شریک وسہیم بن سکتا ہے۔ برخلاف منجم و کاہن وغیرہ کی خبروں کے کہ
وہ چوراہے کی پڑی ہے جس کا دل چاہے اُٹھا لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بات ثبوت
بنا کر پیغمبر سے پوچھو اور وہی بات دنیا بھر کے منجمین و کاہنین کو جمع کر کے پوچھو پیغمبر کو
حق تعالیٰ اس کی اطلاع دے گا اور کاہنین لاکھ کوشش کر لیں مگر کبھی معلوم نہ کر سکیں
گے۔ یہی فرق تصرفات عالم کے متعلق سحر اور معجزہ میں ہے کہ معجزہ بلا واسطہ خالص
من اللہ ہوتا ہے۔ اور سحر میں ذریعہ تصرف گندے عملیات و شرکیہ کلمات و ارواح
خبیثہ و اسباب خفیہ ہوا کرتے ہیں، صورۃً دونوں تصرف اگرچہ ایک طرح کے معلوم ہوتے
ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے بہت فرق ہے۔ چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ
پر جادوگروں نے اپنی لاٹھیوں کو اور رسیوں کو سانپ بنایا کہ ان کے علم سفلی اور
کلمات شرکیہ کی خاصیت نے ناظرین و حاضرین کی نگاہوں پر یہ اثر ڈالا کہ لاٹھیاں انکو
سانپ نظر آئیں۔ مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا کسی عمل یا مادی
شے کے واسطہ سے نہ تھا۔ بلکہ محض کرشمہ قدرت الٰہیہ اور خارق عادت امر تھا۔ لہذا نظر

کی بندش نہ تھی بلکہ حقیقت تھی کہ لاٹھی متبدل اور منقلب ہوگئی تھی سانپ کی حقیقت وماہیت کی طرف۔ چونکہ مکاشفات واطلاعات امور مخفیہ میں اور تصرفات عالم وتقلیب ماہیاتہ میں صورۃً اشتباہ تھا اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان اس لئے کافروں نے ہمیشہ حضرات انبیاء کو کاہن اور ساحر کہا۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں بھی یہ گندے الفاظ استعمال کئے گئے۔ لہذا حق تعالےٰ نے دونوں کا فرق واضح فرمایا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ کاہن یا ساحر کتنا ہی اپنے فن کا صاحب کمال کیوں نہ ہو جس وقت اس کا مقابلہ ہوگا نبی سے اس کا فن یقیناً معلق ہوگا اور کبھی کام نہ دے سکے گا۔ کہ حق اور باطل کا مقابلہ ہونے پر عادت الہیہ کا تقاضا ہے کہ ضرور قدرت کا اظہار فرمائے تاکہ دودھ جُدا ہوجائے اور پانی جدا۔ حضرت شیخ کا مقصود یہ ہے کہ اس آیت شریفہ میں نفس علم غیب یا اس کی مقدار وغیرہ کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ اہلِ حق کے مکاشفات میں اور اہل باطل مدعیان غیب کی اطلاعات میں فرق دکھانا مقصود ہے کہ وہ من اللہ حق ہیں اور یہ باطل۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باشارۃ النص رسول کے ساتھ خادمان رسول یعنی اولیاء امت بھی شامل ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اطلاع مغیبات کی مقدار میں دونوں مساوی نہیں۔ پھر مخلوق اور خدا میں تو مساوا کا کیا سوال ہوسکتا ہے۔ نیز مغیبات خمسہ میں شیخ کی رائے ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان پر مطلع فرمادیا گیا بلکہ اہلِ تصرف اغواث واقطاب کو بھی مطلع کردیا گیا ہے کہ ان پر مطلع ہوئے بغیر وہ اپنی خدمت مفوضہ یعنی تصرفات عوالم کو انجام نہیں دے سکتے۔ لہذا آیت شریف اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعۃِ الآیہ اور حدیث شریف خمس لا یعلمھن الا اللہ میں حصر صرف جنات وشیاطین اور کاہن ومنجم وغیرہ کے علوم کو خارج کرنے کے لئے۔ کہ ان پانچ چیزوں تک نہ جنات وشیاطین کی رسائی ہوسکتی ہے اور نہ وہ مادیات یا علوم ریاضیہ کے تحت میں آسکتے ہیں اُن کا علم صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اُس نے اہل حق یعنی رسول وخواص اُمت کو ان پر مطلع فرمایا ہے۔ اہلِ باطل کو مطلع نہیں فرمایا پس منجم اور کاہن وغیرہ اگر ان کے متعلق کوئی خبر دے گا تو وہ محض اٹکل اور رجماً بالغیب ہوگا کہ بچہ کے تیر کی طرح اتفاقیہ ٹھیک پڑ گیا پڑ گیا ورنہ غلط ہوگیا۔ چنانچہ تجربہ ہوا ہے کہ

جوتسی پنڈت جو دو دو ٹکے کی خاطر دردازہ دروازہ مارے مارے پھرتے ہیں حاملہ عورت کے استفسار پر اس سے کہتے ہیں کہ لڑکا پیدا ہوگا اور یہ بشارت سُنا کر اچھا خاصہ وصول کر لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کی پڑوسن کے کان میں چپکے سے کہہ جاتے ہیں کہ اس کے لڑکی پیدا ہوگی۔ جب وضع حمل ہوتا ہے تو اگر لڑکا ہوا کہہ دیا دیکھ کیسی سچی بات بتائی تھی۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کہہ دیا پوچھ لے اپنی پڑوسن سے میں کہہ گیا تھا کہ لڑکی ہوگی، صرف تیرے خوش کرنے کو تجھے لڑکا بتایا گیا تھا۔ بہرحال اپنی جیت اور اپنے علم کی ساکھ کے دونوں پہلو بچانے کی چال چل جاتے ہیں۔ برخلاف نبی و رسول اور اقطاب، والغوات کے کہ مغیبات خمسہ سے متعلق وہ جو کچھ بتائیں گے چونکہ عالم الغیب عزاسمہٗ کی طرف سے ان کو اس پر مطلع کیا گیا ہے اس لئے وہ واقعہ کے بالکل موافق ہوگا اور نہ اس میں چال ہوگی نہ ذو معنیین کا احتمال ہوگا اور نہ واقعہ کے خلاف ہوگا۔ اس کو غور سے سمجھو کہ بڑے کام کی بات ہے۔

جن علماء نے مغیبات خمسہ کی اطلاع حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کی ہے۔ غالباً اُن کا مطلب یہ ہے کہ ان پانچوں چیزوں کا علم اہل حق کے لئے بھی عمومی اور تحت عادتِ جاریہ نہیں۔ بلکہ خصوصی اور تحت قدرت الہیہ ہے کہ جب اللہ چاہے اور جس کے لئے چاہے بوقت ضرورت مطلع فرمادے۔ دیگر معلومات رسالت کی طرح نہیں کہ ان کا حصول دائمی اور لوازم نبوت میں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصہ سے جو سورۂ کہف میں مذکور ہے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت خضر علیہ السّلام تکوینی خدمت پر مامور تھے، اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام صاحب تشریع اور قانون الٰہی کی خدمت پر مامور تھے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے منصب اور خدمات مفوضہ کے علوم سے نوازا گیا تھا۔ اور تکوین و تشریع میں اکثر اختلاف رہتا ہے۔ چنانچہ ذرا سی مرافقت میں تین قصے ایسے پیش آگئے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ان پر خلاف شرع ہونے کی گرفت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ جن مصالح مخفیہ اور نتائج مغیبہ پر فعل کے وقت خضر علیہ السلام کو بوجہ خادم تکوین ہونے کے مطلع کیا گیا تھا اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کر دیا جاتا تو اعتراض ہی کیوں فرماتے۔ چنانچہ بعد میں جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان پر آپ کو مطلع کیا تو آپ کا وہ خلجان جو ایک اہل حق کے خلاف شرع امر کرنے

سے لاحق ہوا تھا دور ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ تشریع کے علوم دوسرے ہیں اور اہل تکوین کے علوم دوسرے۔ اہلِ تکوین کے علوم دوسرے۔ اہل تکوین کے لئے واقعات کا علم ضروری ہے' اور اہل تشریع کے لئے صرف قانون الہٰی کی دفعات کا علم ضروری ہے بلکہ اہل تشریع کو اگر تکوینی واقعات کا علم ہو تو تشریعی خدمت کا انجام پانا مشکل پڑ جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اگر وہ مغیبات معلوم ہوتے جو حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھے تو تشریع پر وہ قوت کہ ناگواری و گرفت کو ضبط نہ فرما سکے' کبھی قائم نہ رہتی۔ اور اس کا نام تشریعی قانون میں مداہنت رکھا جاتا۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا ماحصل بھی یہی تھا کہ سیدنا داؤد علیہ السلام سے واقعہ کا علم مخفی رہا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے گو تدبیر سے اس کا پتہ چلایا مگر ذاتی علم ان کو بھی نہ تھا۔ باایں ہمہ منصب تشریع افضل اور تشریعی حکم اگرچہ خلاف واقعہ ہو احب عند اللہ ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صاحب تشریع کے لئے عموماً عدم علم تکوین ضروری ہے۔ یعنی اُن کے لئے علم غیب کمال نہیں بلکہ عدم علم غیب ہے۔ کہ قانونی تنفیذ میں پختگی و یکسوئی اسی پر موقوف ہے۔ حضرات انبیاء پر صورت عتاب کی وجہ بھی چنانچہ یہی ہے کہ تکوین کے علم غیب پر اطلاع ہوئی تو اس کی تعمیل میں لپکے لہٰذا عصمت کا خلاف نہ ہوا' مگر پھر تشریع پر نظر گئی تو اُس کے خلاف ہونے کی وجہ سے اپنے کو گناہ گار قرار دیا اور گریہ و زاری ہونے لگی۔ پس اگر ان حضرات کو علوم غیب دے دئے جائیں تو عمر بھر میں لاکھوں کروڑوں صورتیں ایسی پیش آئیں گی کہ واقعہ اور تکوین کچھ ہے اور تشریعی حکم کچھ اور ہے اس لئے علم غیب کی بناء پر تکوین کی موافقت میں لپکا کریں گے اور پھر ان کو تشریع کے خلاف پاکر رویا کریں گے۔ اس طرح تو بیشمار واقعات پیش آئیں گے جنمیں گناہ کی صورت ہوگی اور پھر اس پر صورت عتاب کا ترتب ہوگا۔ غرض یہ قانون الٰہی کہ لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ بظاہر اس کی رہبری کر رہا ہے کہ ہر دو محکمہ کے علوم جُدا اور باہم متضاد ہیں۔ مگر تشریعی محکمہ افضل ہے کہ نظام عالم کا بقا اسی پر ہے۔ اور اجتہاد و فہم و عقل کا امتحان بھی اسی میں ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ واقعات مغیبہ اور تکوینیات مخفیہ کو مستور رکھا جائے۔ اور چونکہ کمال کا موقوف علیہ خود کمال بنا اس

اس لئے ان حضرات نے مغیبات خمسہ کے متعلق حکم لگایا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی مخفی تھے۔ اور یہ اخفا آپ کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال تھا۔ کہ منصب تشریع کے لئے کمال یہی عدم علم ہے۔ مثلاً آپ کو علم ہوتا کہ قیامت آنے میں ابھی دو ہزار برس باقی ہیں تو دجال کے فتنہ سے جو قرب قیامت ہو گا آپ اس اہتمام کے ساتھ صحابہ کو نہ ڈرا سکتے جس اہتمام کے ساتھ اب ڈرایا کہ ممکن ہے چند سال بعد آجائے اور صحابہ ہی اس کو دیکھ لیں۔ اور جب تخویف میں یہ اہمیت نہ ہوتی تو تشریعی انداز میں نقص آجاتا۔ حالانکہ تشریع ہی افضل المناصب ہے۔ غرض علماء کے دونوں فریق عاشقان رسول ہیں اور ہر ایک اپنے علم وفہم کے موافق چلا ہے کہ جس نے مغیبات خمسہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم ثابت کیا ہے اُس نے اسی کو کمال سمجھا ہے۔ اور جس نے اس کا انکار کیا ہے اُس نے عدم علم ہی کو کمال سمجھا۔ لہذا ہمیں کسی پر اعتراض کرنا چاہیے کہ وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ واللہ اعلم۔

حق تعالیٰ توفیق بخشے کہ رسول کے ساتھ خادمان رسول کی محبت واحترام ہمارے دلوں میں قائم رہے کیونکہ یہ حضرات باغ انوار الہیہ میں اپنے پیغمبر کے ساتھ گشت لگانے والے ہیں ان کی اجتہادی خطا تو انشاء اللہ قلمزد اور معاف ہو جائے گی، بلکہ اگر منشا مستحسن یعنی محبت وتعظیم ہے تو اجر ملنا بھی متوقع ہے۔ مگر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الوان نسبت میں کسی لون کے ساتھ اگر بغض وعناد ہوا تو بڑا خطرناک اور یقیناً موجب خسران وحرمان ہے۔

اللہم اجعل ما کتبناہ خالصاً لوجہک الکریم موجبا لرضوانک العمیم وانفع بہ من قرأہ او کتبہ او سعی فی شئی منہ بجاہ من ہو بالمؤمنین رؤف رحیم علیہ افضل الصلوۃ وازکی التسلیم ہ

تمت

تبریز دیوبندی ترجمہ کے حصہ اول کے چند اہم حوالے

پیر صاحب عورت کی صورت میں آ کر مرید کا امتحان لیتے رہے۔ ص ۱۴

ہمیشہ اہل سنت کا ممدوح اور تائید۔ ص ۲۶

پیر صاحب روحانی طور پر رات کو بھی مریدوں کے گھر حاضر و ناظر۔ ۲۹

پیر صاحب مرید سے نہ رات کو جدا نہ دن کو۔ ص ۳۰

پیر صاحب مریدوں کے گناہوں کو بھی جانتے ہیں۔ ص ۴۰، ۴۱

پیر صاحب کو علم کے مرید نے بیوی کی شرم گاہ پر نظر ڈالی۔ ص ۴۱

دو بیویوں کے ساتھ ہم بستری کرنے والا واقعہ۔ ص ۴۱

پیر صاحب نے مرید کو بیوی سے ہمبستری کرتے ہوئے پایا۔ ۴۸

عورت کی شرم گاہ کی رطوبت والا واقعہ۔ ص ۲۲۶

شیخ نے الابریز میں درج کرامات کو چیک کیا۔ ص ۴۴

امور تکوینی اور غوث، قطب۔ ص ۴۶

شیخ علم عورت کا لڑکا ہوگا۔ ص ۳۱، ۴۰، ۴۵، ۵۰

شیطانی خواب پر تبصرہ۔ ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۷

معجزہ و کرامت پر گفتگو۔ ص ۱۳۳

کسی عالم کے لئے ضروری نہیں کہ اجمالاً علم رکھتا ہو۔ ص ۱۳۵

حضور ﷺ خود بھی تشریف لا سکتے ہیں۔ ص ۱۷۲

کیا حضرت آدم و حوا نے شرک کیا؟ جواب۔ ص ۲۱۲

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اختلاف۔ ص ۲۲۵

زلزلہ آنے کی وجہ۔ ص ۲۶۹

اولیاء اللہ زمین کے ستون۔ ص ۲۸۳